رجسٹرڈ نمبر اے ۴۶۶

نگار

قیمت ۸

ہمیشہ یاد رکھئے

کہ پرچہ نہ پہونچنے کی اطلاع اگر اُسی مہینہ کے اندر نہ دی گئی تو آیندہ مہینہ کے اخیر تک پانچ پیسہ کے ٹکٹ آنے پر پرچہ دوبارہ روانہ ہوگا (کیونکہ ڈاک خانہ اب پچھلے پرچوں کا محصول پنچ گنا وصول کرتا ہے) اور اُس کے بعد قیمتاً یعنی ۸ر کے ٹکٹ موصول ہونے پر۔

منیجر "نگار"

نگار بک ایجنسی لکھنؤ

تصانیف نیاز فتحپوری

نگار بک ایجنسی لکھنؤ

نگارستان

حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور افسانوں کا مجموعہ۔ نگارستان نے ملک میں جو درجۂ قبول حاصل کیا اُس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل کئے گئے۔

قیمت دو روپیہ (عار) علاوہ محصول

جمالستان

اڈیٹر نگار کے مقالات ادبی کا دوسرا مجموعہ جس میں ۲۲ افسانے سنہ ۳۳ء تک کے درج ہیں۔ زبان قدرت بیان علو تخیل اور پاکیزگی خیال کے بہترین شاہکار کے علاوہ بہت سے اجتماعی و معاشری مسایل کا حل بھی آپ کو اس مجموعہ میں نظر آئے گا۔ ہر افسانہ اور ہر مقالہ اپنی جگہ معجزۂ ادب کی حیثیت رکھتا ہے۔ قیمت چار روپیہ (للعہ) علاوہ محصول

خریداران نگار سے ایک روپیہ کم

مکتوبات نیاز

اڈیٹر نگار کے تمام وہ خطوط جو نگار میں شایع ہوئے ہیں نیز وہ جو شایع نہیں ہوئے۔ جذبات نگاری اور سلاست بیان رنگینی اور البیلے پن کے لحاظ سے فن انشاء میں یہ بالکل پہلی چیز ہے جس کے سامنے خطوط غالب بھی پھیکے معلوم ہوتے ہیں مع تصویر حضرت نیاز ۲۸ پونڈ کے کاغذ پر مجلد شایع ہوئی ہے۔

قیمت دو روپیہ آٹھ آنے (عہ) علاوہ محصول

شہاب کی سرگزشت

حضرت نیاز کا وہ عدیم النظیر افسانہ جو اُردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہے۔ اس کی زبان اس کی تخیل اس کی نزاکت بیان اسکی بلندی مضمون اور اس کی انشاء عالیہ سحر حلال کے درجہ تک پہونچی ہے۔

قیمت ایک روپیہ (عہ) علاوہ محصول

اُردو شاعری

یعنی جنوری سنہ ۳۵ء کا نگار جس میں اُردو شاعری کی تاریخ، اسکی عہد بہ عہد ترقی اور ہر زمانہ کے شعراء پر بسیط نقد و تبصرہ کیا گیا ہے مع انتخاب کلام، اس کی موجودگی میں آپ کو کسی اور تذکرہ دیکھنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی اور جس میں سات مضامین اڈیٹر نگار کے لکھے ہوئے ہیں حجم ۵۶۲ صفحات۔ قیمت عار علاوہ محصول

ہندی شاعری

یعنی جنوری سنہ ۳۶ء کا نگار جس میں ہندی شاعری کی تاریخ اور اس کے تمام ادوار کا بسیط تذکرہ موجود ہے اس میں تمام مشہور ہندی شعراء کے کلام کا انتخاب مع ترجمہ کے درج ہے۔ ہندی شاعری کی اصل قدر و قیمت کا اندازہ مقصود ہو تو اُردو میں آپ کے لئے صرف یہی ایک مجموعہ کافی ہے۔ قیمت عمر علاوہ محصول

ہندوستان کے اندر سالانہ چندہ پانچ روپیہ ششماہی تین روپیہ
ہندوستان سے باہر سالانہ چندہ آٹھ روپیہ یا بارہ شلنگ

نگار

ششماہی چندہ میں "نگار" کا جنوری نمبر
بوجہ اضافۂ ضخامت وقیمت شامل نہ ہوگا۔

۸۹۱۶۴۳۰۵
ن ۲۲
۷۵۹۷

ہمیشہ یاد رکھئے کہ پرچہ نہ پہونچنے کی اطلاع اگر اُسی مہینے کے اندر نہ دی گئی تو آیندہ مہینے کے اخیر تک پانچ پیسے کے ٹکٹ آنے پر دوبارہ روانہ ہوگا (کیونکہ ڈاک خانہ اب پچھلے پرچوں کا محصول پنج گنا وصول کرتا ہے) اور اُس کے بعد قیمتاً یعنے ۸ ؍ کے ٹکٹ وصول ہونے پر۔

منیجر "نگار"

جلد (۲۸)	فہرست مضامین اگست سنہ ۱۹۴۰ء	شمار (۲)

ملاحظات ــ قرآن کا کلام خدا ہونا کیا معنی رکھتا ہے ــ ہندوستان کے چند اور مرتد مسلمان ---------- ۲
عربوں کی سیاسی بیداری ---------- محمد عتیق صدیقی ---------- ۹
ریڈیو کے آس پاس ---------- (پروفیسر) رشید احمد صدیقی ایم۔اے ---------- ۲۵
مرزا ابو الحسن آصف خاں ---------- کوثرؔ چاندپوری ---------- ۳۰
سیفو ---------- ل۔ احمد اکبرآبادی ــ (اخذ و اقتباس از ہندستانی) .. ۴۱
کیا قرآن خدا کا کلام ہے؟ ---------- اما م۔ اکبرآبادی ---------- ۵۵
نیازؔ کی آزاد خیالی ---------- محمد عبد الشکور فکر ندوی ---------- ۵۸
باب الاستفسار (لوحِ محفوظ اور عذاب و ثواب) ---------- ۶۱
مطبوعات موصولہ ---------- ۶۵
دُنیا میں صرف ایک ملحد ہے اور ایک مسلمان! ---------- ۷۱
منظومات ---------- ماہر القادری ــ طفیل احمد خاں ــ فضل الدین اثر ــ خلیل اللہ قریشی ---------- ۷۷

نگار

اڈیٹر: نیاز فتحپوری

جلد - ۳۸	اگست سنہ ۳۰ء	شمار - ۲

ملاحظات

قرآن کا کلام خدا ہونا کیا معنی رکھتا ہے

یہ ہے اصل بحث جو میرے اور ہندوستان کے بعض مولویوں کے درمیان مابہ النزاع ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ قرآن انسانی کلام نہیں بلکہ خدا کا کلام ہے اور اس کے ثبوت میں وہ "وحی یوحیٰ" اور "لوحِ محفوظ" والی آیات کو پیش کرتے ہیں میں کہتا ہوں کہ قرآن کا وحی ہونا اس کو مستلزم نہیں کہ اسے خدا کا کلام سمجھا جائے اور "لوح محفوظ" کے جو معنی عام طور پر سمجھے جاتے ہیں وہ بھی میرے نزدیک درست نہیں (ملاحظہ ہو نگار جولائی سنہ ۳۰ء)۔ اس پر مجھے جتنی گالیاں مولویوں اور عام مسلمانوں کی طرف سے (جو اُن کے پروپاگنڈا کے زیر اثر ہیں) دیجا سکتی تھیں، مل چکی ہیں اور مل رہی ہیں، لیکن مجھے یقین کے ساتھ معلوم نہیں کہ جو دلایل میں نے اس عقیدہ کی تردید میں پیش کئے ہیں ان کا بھی جواب کسی نے دیا یا نہیں۔ میں نے دیکھا تو نہیں لیکن سُنا ہے کہ شاید اخبار زمزم میں دارالمصنفین کے کسی رفیق نے کوئی جواب شایع کیا ہے اور اخبار حق میں بھی کسی مولوی صاحب نے خامہ فرسائی کی ہے۔ بہر حال یہ دونوں مضامین میرے سامنے نہیں ہیں۔ اس لئے میں نہیں کہہ سکتا کہ ان میں کیا ہے اور وہ میرے لئے باعث تسکین ہو سکتے ہیں یا نہیں۔

ان لوگوں کی طرف سے سب سے بڑی غلطی یہ ہوتی ہے کہ جو کچھ میری تردید میں لکھتے ہیں وہ میرے پاس نہیں بھیجتے حالانکہ اُصولاً اسے نگار ہی میں شایع ہونا چاہئے، تاکہ نگار کے مطالعہ کرنے والوں میں جو گمراہی میرے مضامین سے پیدا ہوتی ہے وہ دور ہو سکے۔ اس کے علاوہ دوسری غلطی یہ کرتے ہیں کہ میرے شبہات ہوتے ہیں عقل کی بنا پر یا بطور استشہادِ قرآنی پر، اور وہ جواب دیتے ہیں روایات سے۔ یعنی اگر میں یہ کہتا ہوں کہ فلاں بات فلاں عقلی دلیل کی بنا پر یا فلاں آیت کی رو سے قابل قبول نہیں، تو وہ اس دلیل کی تردید تو کرتے نہیں بلکہ صرف احادیث و تفاسیر، اور اقوال اکابر سلف پیش کر دیتے ہیں یعنی ایک طرف وہ مجھے مرتد، ملحد و کافر بھی کہتے جاتے ہیں اور دوسری طرف دلیلیں پیش کرتے ہیں وہ جو ایک مسلمان ہی کے لئے قابل قبول ہو سکتی ہیں۔ چنانچہ میں نے سنا ہے کہ ایک مولوی صاحب نے تو جواب میں یہانتک لکھ دیا کہ "قرآن کو تو خدا کا کلام کفار قریش نے بھی مان لیا تھا"۔ یہ سنکر مجھے بہت ہنسی آئی۔ اگر وہ مجھے ملتے تو میں انکو صرف یہ جواب دیتا کہ "مولانا بحمد اللہ میں کفار قریش میں سے نہیں ہوں، اور نہ کفار قریش کو اتنی اہمیت دیتا ہوں کہ اُن کا کسی بات کو مان لینا میرے لئے دلیل ہو سکے"۔

میں نے عبد الماجد صاحب دریابادی کو بھی لکھا تھا (جو اسوقت اسلامی دنیا کے تنہا محتسب ہیں) کہ نگار کے صفحات، اُن کی گالیوں کے لئے کُھلے ہوئے ہیں، (کیونکہ سوائے گالیاں دینے کے انھیں اور آتا ہی کیا ہے) میں اُنکے ہر ہر لفظ کو بجنسہٖ شایع کرنے کا وعدہ کرتا ہوں، لیکن اس بات کا انھوں نے کوئی جواب نہ دیا۔

یہ بات کسی طرح میری سمجھ میں نہیں آتی کہ میں عقاید میں کیوں کسی کی تقلید کروں اور مجھے کیوں اس پر مجبور کیا جائے کہ میں اسلام کا مطالعہ دوسروں کی نگاہ سے کروں۔ جس طرح عبد الماجد دریابادی۔ سید سلیمان ندوی۔ مناظر احسن گیلانی یا دوسرے مولویوں کو اسلام کے سمجھنے کا حق حاصل ہے اسی طرح مجھے بھی ہے۔ میں بھی مسلمان ہوں میں بھی اسلام کی خدمت کر سکتا ہوں اور جس طرح وہ میرے عقیدہ کو الحاد و ارتداد سے تعبیر کر سکتے ہیں، اسی طرح میں بھی ان کے اقوال کو لغو و جہل قرار دے سکتا ہوں۔ قرآن شریف ان کے سامنے بھی ہے، میرے سامنے بھی، جس طرح انھیں تفکر و تدبر کی دعوت دی گئی ہے، مجھے بھی دی گئی ہے، لیکن اس کا جواب ان کے پاس صرف ایک ہوا کرتا ہے، وہ یہ کہ قرآن کو سمجھنے کے لئے جو خصوصیات ایک شخص میں پائی جانی چاہئے، وہ مجھ میں نہیں ہیں۔ گویا اس سے مدعا یہ ظاہر کرنا ہے کہ قرآن کو وہی شخص سمجھ سکتا ہے جو ان کے عقاید کے مطابق پہلے ہی سے مسلمان ہے اور خود اپنی عقل سے کام لینا گناہ سمجھتا ہو۔ اگر واقعی قرآن پاک کے سمجھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ پہلے ایک شخص اپنے آپ کو ایک قدامت پرست مسلمان ثابت کرے، تو بیشک مجھے اپنی غلطی تسلیم ہے، لیکن اگر قرآن "ذکریٰ للعالمین" ہے اور وہ تمام نوع انسانی کو دعوت دیتا ہے تو میں نہیں سمجھ سکتا کہ مولویوں کا یہ کہنا کہ قرآن پاک کا سمجھنا صرف مولویوں ہی کے لئے مخصوص ہے، کہاں تک قابل قبول ہو سکتا ہے

میں اگر قرآن پاک کو خدا کا کلام نہیں مانتا تو اس کا سبب صرف یہ ہے خود قرآن سے یہی بات میری سمجھ میں آتی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس عقیدہ سے میں خدا اور رسول کی توہین و تکذیب کرتا ہوں، حالانکہ میری رائے میں خدا اور رسول اللہ کی حقیقی عظمت اسی میں ہے کہ اسے کلام انسانی سمجھا جائے (جس پر میں تفصیل کے ساتھ اسی مہینے کی اشاعت میں کسی دوسری جگہ اظہار خیال کر چکا ہوں)

وہ کہتے ہیں کہ یہ عقیدہ اسلاف کے عقیدہ کے خلاف ہے، میں کہتا ہوں کہ اسلام نام اسلاف کی پیروی کا نہیں بلکہ قرآن کی پیروی کا ہے۔ اگر اسلاف یہ عقیدہ رکھتے تھے تو وہ خود اس کے ذمہ دار تھے، ہم اس کے ماننے پر کیوں مجبور ہوں اور اگر صرف کسی کو مرتد و ملحد کہکر قرآن کا کلام الٰہی ہونا ثابت کیا جا سکتا ہے، تو اس سے زیادہ ان کی "بے مایگی" اور کیا ہو سکتی ہے۔

ہمارے علماء کا یہ طرزِ عمل کہ وہ اپنے یا اپنے اقوال کے خلاف کوئی بات سننا گوارا کر ہی نہیں سکتے اور فوراً مشتعل ہو کر لوگوں پر جنت کا دروازہ بند کر دیتے ہیں، یادگار ہے اس کلیسائی دور کی جب مذہب نام تھا بے چون و چرا پادریوں کی تقلید کا (کیونکہ عیسوی مذہب کسی عقلی بحث کا حریف نہ ہو سکتا تھا) اور چونکہ تاریخ اسلام میں بھی ایک زمانہ ایسا آیا تھا جب شاہانِ اسلام سیاسی اغراض کی بنا پر ملاؤں سے غلط فتوے حاصل کیا کرتے تھے اور مولوی اپنی حمایت میں حکومت کی تلوار سے فائدہ اُٹھاتے تھے، اس لئے وہ انانیت اب بھی چلی آتی ہے، لیکن ان کو سمجھنا چاہئے کہ مذہب کے باب میں اب ان اوچھے ہتھیاروں سے کام لینے کا زمانہ ختم ہو چکا ہے۔ جن نئے ہتھیاروں سے مذہب پر حملہ ہو رہا ہے، انھیں ہتھیاروں سے جواب دینا پڑے گا، محض غیظ و غضب، یا کافر سازی سے کام نہیں چل سکتا۔ اور یہی ہے وہ اصولی اختلاف میرے اور مولویوں کے درمیان جس کو وہ میرے کفر و الحاد کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔ چونکہ میں اسلام کو تبلیغی اور فطری مذہب سمجھتا ہوں، اس لئے میرا عقیدہ ہے کہ اس کی ہر ہر بات عقل پر پوری اُترنا چاہئے اور اسی لئے میں مسلمانوں کے عام عقاید کو درست نہیں سمجھتا اور قرآن پاک سے سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں۔

پھر اگر واقعی مجھ سے قرآن مجید کے سمجھنے میں غلطی ہوتی ہے تو اس پر مجھ کو متنبہ کرنا چاہئے، نہ یہ کہ صرف بدنفسی سے کام لیکر جاہل مسلمانوں کو میرے خلاف مشتعل کیا جائے، اور بازاری لب و لہجہ میں مجھ پر لعن طعن کی جائے۔

مولویوں کا ایک اعتراض مجھ پر یہ بھی ہے کہ قرآن کی آیات کا مفہوم متعین کرنے کے لئے مجھے تاویل کا کیا حق حاصل ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ آیا قرآن میں تاویل ہو سکتی ہے یا نہیں۔ اگر ہو سکتی ہے تو انھیں اور مجھے دونوں کو برابر کا حق حاصل ہے اور اگر نہیں ہو سکتی، تو وہ قرآن کے ہر ہر لفظ کے صرف ظاہر معنی مراد لینے پر مجبور ہوں گے درانحالیکہ یہ ممکن نہیں۔ متعدد آیات کلام مجید میں ایسی پائی جاتی ہیں جن میں ایک ہی لفظ کے معنے مقصود کے لحاظ سے کہیں کچھ اور کہیں کچھ لئے جاتے ہیں۔

علمائے کرام جواب دیں

بہرحال میرے دل میں جو شبہات اس وقت پیدا ہو رہے ہیں ان کو یہاں بیان کرتا ہوں اور علمائے کرام سے استدعا کرتا ہوں کہ وہ ان کے دور کرنے کی کوشش فرمائیں :-

(۱) قرآن مجید کو خدا نے پیدا کیا ہے یا خدا کے ساتھ وہ بھی از خود وجود میں آیا ہے - دوسری صورت فرض کرنا ممکن نہیں کیونکہ اس طرح قرآن کو بھی خدا کی طرح قدیم ماننا پڑے گا حالانکہ قدیم ذات صرف خدا کی ہے اور اگر اول صورت مانی جائے تو قرآن کو "شئے مخلوق" ماننا پڑے گا - لیکن "شے" کے متعلق یہ ارشاد ہے کہ "کل شئے ہالک الا وجہہ" اس لئے نتیجہ یہ نکلا کہ قرآن فنا ہو جانے والی چیز ہے اور اس لئے وہ خدا کا کلام نہیں ہو سکتا۔

(۲) اگر قرآن شریف نام ہے اُن الفاظ یا حروف کا جو کاغذ پر منقوش ہوتے ہیں جو پریس کے ذریعہ سے چھاپے جاتے ہیں اور جو انسان کی زبان سے ادا ہوتے ہیں، تو کلام مجید کا ہر نسخہ، کلام خداوندی ہے اور جو نسخہ ان میں سے ضایع ہو جائے، اس کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ خدا کا کلام ضایع ہو گیا۔

(۳) اگر قرآن پاک خدا کا کلام ہے تو اس کی دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں، یا تو اس کو خدا کی عین ذات تصور کیا جائے یا صفات خداوندی میں شامل کیا جائے - قرآن کو خدا کی عین ذات نہیں کہہ سکتے یعنی ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ قرآن خدا ہے اور خدا قرآن ہے - اس لئے لامحالہ اسے "صفتِ ربانی" ماننا پڑے گا - لیکن چونکہ خدا کی ہر صفت اسکی ذات سے جدا نہیں ہے اس لئے یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ الفاظ یعنی عربی زبان بھی خدا کی طرح قدیم ہے۔

(۴) اگر یہ تسلیم کیا جائے کہ قرآن کا ہر ہر لفظ "نطق خداوندی" ہے جو جبرئیل کے ذریعہ سے آنحضرت تک پہونچایا گیا تھا تو اس کے معنے یہ ہوں گے کہ رسول اللہ نے بھی اسی طرح اس کو نطق کیا تھا جس طرح خدا نے کیا تھا بلکہ ہم لوگ سب اسی طرح اس کو ادا کرتے ہیں جس طرح خدا نے ادا کیا تھا اور اس طرح گویا رسول اللہ اور ہم سب اس صفت میں خدا کے سہائش قرار پائیں گے جو بالکل محال ہے۔

(۵) قرآن شریف جس سلسلہ سے نازل ہوا تھا وہ موجودہ ترتیب سے بالکل مختلف ہے - اس لئے وہ قرآن جو اسوقت ہمارے سامنے موجود ہے، اس قرآن سے بہ لحاظِ ترتیب مختلف ہے جو لوحِ محفوظ میں پایا جاتا تھا - اس کے معنے یہ ہوئے کہ اصل قرآن میں تغیر پیدا ہوا اور ہر تغیر پزیر چیز حادث ہے، حالانکہ خدا کی طرح اس کے کلام کو بھی غیر فانی ہونا چاہئے۔

(۶) کہا جاتا ہے کہ قرآن شریف نجماً نجماً نازل ہوا ہے یعنی اس کی ہر آیت خاص وقت اور خاص حالات میں جناب رسالتمآب پر نازل ہوئی ہے جس کو اصطلاح میں "شانِ نزول" کہتے ہیں - اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جب تک وہ خاص وقت نہ آیا تھا وہ آیت بھی موجود نہ تھی، اس لئے یہ کہنا کہ پورا قرآن لوحِ محفوظ میں ازل سے درج تھا بے معنی

ہو جاتا ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ خدا کو معلوم تھا کہ فلاں وقت فلاں واقعہ پیش آئے گا اور اسی علم کی بنا پر پہلے ہی سے تمام آیات لوحِ محفوظ میں لکھ لی گئی تھیں، تو پھر ان واقعات و حالات کے متعلق کیا کہا جائے گا جو کلام مجید میں اس انداز سے بیان کئے گئے ہیں گویا وہ قرآن کے وجود میں آنے سے پہلے ہو چکے ہیں۔

(۷) اگر قرآن مجید پہلے سے لوحِ محفوظ میں موجود تھا تو پھر اُن آیات کے متعلق کیا کہا جائے گا جو لفظ قُل سے شروع ہوتی ہیں، یعنی جن میں رسول اللہ سے خطاب کر کے کہا جاتا ہے کہ "ایسا کہو" درانحالیکہ اُس وقت رسول اللہ کی ذات دُنیا میں موجود نہ تھی۔ اسی طرح اُن دعاؤں کی کیا تاویل کی جائے گی جن کی تعلیم رسول اللہ کو دی گئی۔ پھر کیا رسول اللہ کی پیدائش سے قبل یہ تمام دعائیں مرتب کر لی گئی تھیں اور اس کی کیا ضرورت تھی؟

(۸) اگر قرآن مجید خدا کا کلام ہے تو پھر "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" کے یہ معنے ہوں گے کہ وہ خود اپنے نام سے قرآن مجید کو شروع کرتا ہے اور خود اپنی ہی ذات سے خطاب کرتا ہے جو بالکل بے معنی سی بات ہے۔

سورۂ فاتحہ میں الحمد للہ سے لیکر مالک یوم الدین تک دعا کا انداز ایسا ہے گویا مخاطب سامنے نہیں ہے اور پھر دفعتاً "ایاک نعبد" سے اندازِ تخاطب بدل جاتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خدا کو حاضر مان کر خطاب کیا جا رہا ہے۔ کیا اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ یہ دونوں ٹکڑے علٰحدہ علٰحدہ دو مختلف موقعوں پر رسول اللہ کی زبان سے نکلے تھے۔ اگر سورۂ فاتحہ پہلے سے لوحِ محفوظ میں منقوش ہوتی تو اس کا اندازِ تخاطب یہ نہ ہوتا۔

(۹) قرآن شریف میں بہ کثرت ایسے واقعات اور ایسی شخصیتوں کا ذکر پایا جاتا ہے، جن کا تعلق بالکل عہدِ نبوی سے ہے۔ مثلاً ابولہب یا کفارِ مکہ اور اُن کے اصنام وغیرہ۔ پھر اگر قرآن مجید ازل سے یا خلقِ عالم کے وقت لوحِ محفوظ میں منقوش تھا (جیسا کہ عام عقیدہ ہے) تو اس کے معنے یہ ہوں گے کہ یہ سب کچھ بہ صورتِ مقدرات طے ہو چکا تھا اور قرآن مجید کی حیثیت ایک ایسی تاریخی کتاب کی ہو جاتی ہے جس میں واقعات کے ظہور سے پہلے صرف ان کے وقوع کی پیشین گوئی کی گئی ہے۔ درانحالیکہ کسی مسلمان کا یہ عقیدہ نہیں ہے۔

(۱۰) خدا کو سمیع و بصیر بھی کہتے ہیں، لیکن اس کی سماعت و بصارت، کان اور آنکھ کی محتاج نہیں، پھر کیا وجہ ہو کہ جب اس کی صفت نطق کا ذکر کیا جائے تو اس سے مراد وہ "نطق" ہو جو الفاظ کا محتاج ہے۔ جس طرح اسکو سننے اور دیکھنے کے لئے کان اور آنکھ کی ضرورت نہیں، اسی طرح کلام کے لئے زبان یا الفاظ سے اسے بے نیاز ہونا چاہئے اور اس صورت میں الفاظِ قرآنی کو "خدا کا کلام" کہنا گویا یہ کہنا ہے کہ وہ زبان و الفاظ کا محتاج ہے۔

یہ ہیں چند منجملہ اور شبہات کے جنکی بنا پر میں قرآن پاک کو "منطوق خداوندی" سمجھنے سے مجبور ہوں۔ لیکن اگر

ان تمام باتوں کے جواب میں یہ کہا جائے کہ کلامِ خداوندی سے مراد قرآن کے الفاظ و حروف نہیں ہیں، بلکہ ان کا مفہوم مراد ہے، تو میں بھی یہی کہتا ہوں کہ خدا نے علی وجہ البصیرت تمام احکام رسول اللہ پر نازل کئے جنھیں آپ نے اپنی زبان میں لوگوں کے سامنے پیش کر دیا۔

ہندوستان کے چند اور مرتد مسلمان

جناب فضل الدین انترام - اے - آگرہ - تحریر فرماتے ہیں:-

قرآن یا اس سے متعلق موضوعات پر آپ جو کچھ لکھتے ہیں وہ آنکھیں کھول دینے والی چیز ہوتی ہے اور یقیناً موجودہ مسلمانوں کے حق میں بڑی خدمت ہے - آپ کو تو معلوم ہے کہ میں ہر سال نگار کے کچھ پرچے گنوا بیٹھتا ہوں - واقعہ یہ ہے کہ میں بعض لوگوں پر اس قسم کی تحریروں کا اثر دیکھنے کے لئے انھیں دیدیتا ہوں اور مجھے اپنے تجربہ کا بڑا صلہ مل جاتا ہے جب میں یہ دیکھتا ہوں کہ وہ لوگ بھی جو زندگی میں حدودِ آب و گل سے آگے کچھ دیکھنے یا سوچنے کے عادی نہیں ہیں آپ کی تحریر پڑھکر سوچنے لگتے ہیں۔ مسلمان قوم کے زوال کی غالباً تنہا وجہ یہی ہے کہ اس نے ہر چیز کے متعلق سوچنا بند کر دیا ہے۔ میں بھی مسلمان قوم کی سب سے بڑی خدمت یہی سمجھتا ہوں کہ اسے از سرِ نو سوچنے کا عادی بنا دیا جائے - قرآن سے متعلق پچھلے مہینے آپ نے جو کچھ لکھا ہے، اس کی کامیابی کا اندازہ اس سے لگا لیجئے کہ جب مینے جولائی کا نگار ایک صاحب کو جو دُنیاداری میں صبح سے شام تک لگے رہتے ہیں پڑھنے کے لئے دیا تو انھوں نے اسی دن رات کو مجھ سے تقریباً ایک گھنٹہ گفتگو کی اور یہ سب گفتگو آپ کی موافقت میں تھی۔ وحی کی جو توضیح آپ نے کی ہے وہی توضیح بعض تعلیم یافتہ عیسائی بھی کرتے ہیں۔ ان میں سے مجھے پنجاب کے پادری عبدالکریم ہمیشہ یاد رہیں گے۔ وحی کی توضیح کے ساتھ ساتھ انھوں نے یہ بھی واضح کیا تھا کہ انجیل "کلامِ خدا" نہیں بلکہ "عرفِ کلامِ خدا" ہے۔

یہ کہنا کہ خدا کے تمام منصوبے اور ارادے کسی ایک کتاب پر ختم ہو جاتے ہیں، خدا کی برتری کو ٹھیس لگاتا ہے — اور اس میں کوئی شک نہیں کہ الفاظ کی تصنیف کا ذمہ دار خدا کو ٹھہرانے سے رسول اپنی حیثیت سے بہت گر جاتے ہیں۔

(نگار) اس مہینے کا نگار ملاحظہ فرمانے کے بعد ذرا تفصیل کے ساتھ اپنی رائے لکھئے اور دوسروں کو دکھا کر اُن سے بھی پوچھئے وہ کیا کہتے ہیں۔

جناب مسلم حیدر آبادی فرماتے ہیں :

میں نے حیدر آباد کے اخبارات کو توجہ دلائی ہے کہ ماہ جون وجولائی کے نگار میں قرآن مجید کے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے، اس پر اکثر حضرات (جو مستند علماء کرام سے نہیں ہیں) ذریعۂ اخبارات بلا دلیل نیاز کے ارتداد کو ظاہر کر رہے ہیں۔ اس لئے ضرورت ہے کہ پہلے مستند علماء کرام اس مسئلۂ خاص میں قرآن مجید ہی سے نیاز کا ارتداد ثابت کریں۔

- - - - - - - - - -

(نگار) معاف فرمائیے آپ نے ان اخبارات سے صحیح مطالبہ نہیں کیا۔ جو علماء کرام وحی کے معنے خدا کا کلام یا "منطوق خداوندی" قرار دیتے ہیں، وہ نہایت آسانی سے میرا ارتداد بھی قرآن پاک سے ثابت کر سکتے ہیں۔

آپ کو تو یہ کہنا چاہئے کہ جو عقلی دلائل میں نے پیش کئے ہیں ان کا جواب دیں اور عقل ہی سے دیں اگر اسلام بے عقلوں کا مذہب نہیں ہے۔

جناب ظہیر احمد صاحب - مظفر نگر - فرماتے ہیں :

میں نے اخبار حق میں آپ کے خلاف کچھ تحریریں پڑھیں، میں نے اس کو خط لکھا ہے کہ جو خیالات نیاز صاحب کے ہیں وہ آجکل اکثر نوجوانوں کے ہیں — ان کو آپ جبراً اپنے اعتقادات کا پابند نہ بنائیں اور اظہار غصہ کے بجائے دلائل بیان کریں۔ میں نے اُن کو لکھا ہے کہ کوئی بھی مذہبی کتاب الہامی نہیں ہے — انسان الہامی کتب کے پیش کردہ اُصول سے بہتر اُصول بنا سکتا ہے۔ انسان کی رہنمائی کے لئے "انسانیت" کافی ہے۔

- - - - - - - - - -

(نگار) کیا آپ کو یقین ہے کہ حق جس کے یہاں معیار صحافت نام ہے صرف گالیاں دینے کا وہ آپ کی اس تحریر کو شائع کر دے گا۔ کبھی نہیں — عقل کی بات کا جواب مولویوں کے پاس اب فتوائے کفر و ارتداد کے سوا کچھ نہیں ہے۔

رفتار جنگ

افسوس ہے کہ اس مہینہ ملاحظات کے صفحات مجھے خود اس جنگ کے لئے وقف کر دینے پڑے جو میرے خلاف جاری ہے اور مغربی جنگ کے متعلق کوئی رائے زنی نہ کر سکا، حالانکہ اسوقت دُنیا جن گھڑیوں سے گزر رہی ہیں وہ نہایت اہم ہیں۔

ہٹلر کی پیشکش صلح برطانیہ نے رد کر دی اور اب نازی حکومت کو سوائے اس کے کوئی چارہ نہیں کہ وہ برطانیہ پر حملہ کرے، لیکن یہ حملہ کب اور کس طرح ہوگا اس کا معلوم کرنا بہت مشکل ہے، ہو سکتا ہے کہ وہ پہلے اسپین کی مدد سے جبرالٹر لینے کی کوشش کرے یا آئرلینڈ پر حملہ کر کے بحر اٹلانٹک کی طرف سے امریکہ اور برطانیہ کے درمیان خطِ فاصل کھینچے لیکن وہ ایسا کرنے سے قبل بلقان کی طرف سے مطمئن ہو جانا ضروری سمجھتا ہے، کیونکہ روس نے بسریبا کا علاقہ لیکر اور بالٹک ریاستوں کو بالشویک اصول حکومت تسلیم کرنے پر مائل کر کے جرمنی کو پس و پیش میں ڈالدیا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو وہ برطانیہ پر حملہ کرے اور اِدھر روس اور بلقان کی سلافی حکومتیں مشرق کی طرف سے اس پر حملہ کر دیں۔ بہرحال جاڑوں کی آمد سے قبل ہی "ہورہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا"

عربوں کی سیاسی بیداری

(مسلسل)

جزیرہ نمائے عرب جنگ عظیم کے بعد

نجد و حجاز جنگ کے بعد جزیرہ نمائے عرب میں سب سے بڑی تبدیلی یہ ہوئی کہ عثمانی حکومت کی جگہ عربی حکومت کا قیام عمل میں آیا اور پانچ نئی ریاستیں قایم ہوگئیں (۱) حکومت حجاز (شریف حسین)۔ (۲) سلطنت نجد (ابن سعود) (۳) امامت یمن (امام یحییٰ) (۴) حکومت عسیر (سید محمد بن علی ادریسی) (۵) حکومت شامار (Shammar) (ابن الرشید) اس تبدیلی نے عربستان کی تاریخ میں ایک نئے باب کا آغاز کیا نئے نئے پیچیدہ مسائل بھی پیدا ہوئے مگر اُن کا تمام تر تعلق نوزائیدہ حکومتوں کے داخلی و خارجی مسائل سے تھا۔ ابن الرشید اور ابن سعود کے مابین شدید کشیدگی تھی اور یہ کوئی نئی چیز نہ تھی بلکہ مدتوں سے خاندانی دشمنی کا ایک سلسلہ چلا آرہا تھا۔ دوسری طرف امام یحییٰ اور ادریسی کے تعلقات بھی بیحد ناخوشگوار تھے، اس کے وجوہ آگے بیان کئے جائیں گے۔ سب سے زیادہ اہم ابن سعود اور شریف حسین کی کشیدگی تھی جس نے بڑھتے بڑھتے بیحد نازک صورت اختیار کرلی تھی۔ جنگ کے خاتمہ اور صلح کے بعد عربستان کو جو بھی فوائد حاصل ہوئے ہوں مگر اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اُسوقت جزیرہ نمائے عرب میں حقیقی صلح کا کہیں دور دور پتہ نہ تھا اور طرح طرح کے مصائب کے بادل منڈلا رہے تھے۔

شریف حسین کو اُسوقت دو حیثیتیں حاصل تھیں یعنی وہ ارض مقدس کا حکمراں بھی تھا اور عربوں کی فوجی تحریک کا قاید بھی۔ موخر الذکر حیثیت نے اگر ایک طرف اسکی حیثیت بلند کردی تھی تو دوسری طرف پریشان کن حد تک اُسکی ذمہ داریاں بھی بڑھا دی تھیں۔ ایک طرف ہندوستان کے مسلمان ناراض تھے کہ اُس نے سلطان کے ساتھ غداری کی ہے اور اُس کی مخالفت میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھا۔ دوسری طرف قوم پرور عرب مجبور کر رہے تھے کہ وہ انگریزوں اور فرانسیسیوں سے ایفاء عہد کا مطالبہ کرے۔ ابن سعود کی دشمنی نے شریف حسین کی حیثیت اور زیادہ نازک

کر دی تھی۔ اُس کو اپنی اور ابن سعود دونوں کی جنگی طاقت کا پورا پورا احساس تھا اور سمجھ رہا تھا کہ اگر کسی دن نجد و حجاز بر سر پیکار ہوئے تو اُس کے لئے برطانیہ کی امداد ضروری ہوگی۔ اسی خیال سے وہ برطانیہ و فرانس کو اُن کے وعدے پورے کرنے کے لئے زیادہ مجبور کرنا بھی مناسب نہیں سمجھتا تھا۔ اس میں شبہ نہیں کہ اگر ابن سعود اور شریف حسین کے تعلقات خوشگوار رہتے تو شاید برطانیہ و فرانس کو اپنے وعدے پورے کرنے پڑتے۔

جہاں تک بغاوت کی تیاریوں کا تعلق تھا شریف حسین نے بڑی دور اندیشی کا ثبوت دیا تھا مگر بغاوت کے بعد جب عربستان میں نئے دور کا آغاز ہوا تو شریف حسین سے اُسی قدر ناعاقبت اندیشی بھی ظاہر ہوئی۔ سب سے بڑی غلطی اُس سے یہ ہوئی کہ اُس کے دماغ میں یہ خیال جم گیا کہ بغاوت کی چونکہ اُس نے قیادت کی ہے اس لئے ہمسایہ حکومتوں پر اس کو ایک گونہ تفوق حاصل ہے۔ جہاں تک برطانیہ کے ساتھ تعلقات پیدا کرنے اور بغاوت کے آغاز کا تعلق تھا ابن سعود اور ادریسی دونوں نے شریف حسین کے ان اقدامات کو پسندیدہ نظروں سے دیکھا اور قومی تحریک کی قیادت اس کو بخوشی سونپ دی اور ہر ممکن امداد کا وعدہ کیا مگر اُن لوگوں کو کبھی اُس کا گمان نہیں ہوسکتا تھا کہ آگے چل کر شریف حسین خود ان لوگوں کے داخلی معاملات میں بھی دست اندازی کرے گا۔

خود ابن سعود کو وہابی تحریک کے سردار کی حیثیت سے ایک خاص اہمیت حاصل تھی اور یہ صرف نجد ہی تک محدود نہ تھی بلکہ تمام عربستان میں اُس کو وقعت کی نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا۔

شریف حسین اور ابن سعود میں پہلا تصادم مئی سنہ ۱۹ء میں ترابیہ (Turabea) کے نزدیک ہوا اس لڑائی میں ابن سعود کو کامیابی ہوئی اور اگر عین موقعہ پر برطانیہ، شریف حسین کی حمایت کے لئے میدان میں نہ آجاتا تو ابن سعود کی فوجیں بلا روک ٹوک حجاز تک پہونچ جاتیں۔ اس واقعہ نے شریف حسین اور اُسکے بیٹوں کی آنکھیں کھولدیں اور اُن کو اپنی جنگی کمزوریوں اور ابن سعود کی طاقت کا صحیح اندازہ ہوگیا۔ اس موقعہ پر سب سے بہتر راہ یہ تھی کہ شریف حسین اور ابن سعود کے مابین صلح کرادی جاتی اور یہ فرض برطانیہ کا تھا۔ خود شریف حسین کے لئے بھی ضروری تھا خواہ اُس کو ابن سعود کو کچھ دینا ہی کیوں نہ پڑتا۔ مگر برخلاف اس کے شریف حسین نے ابن سعود کے قدیم دشمن ابن الرشید سے معاہدہ کی پالیسی کو پسند کیا۔ اسی سلسلہ میں کچھ اور قبائلی سرداروں سے بھی اُسنے معاہدے کئے اور امام یحییٰ پر بھی اثر ڈالنے کی کوشش کی۔

جنوری سنہ ۲۱ء میں برطانوی افواج نے حدیدہ (Hudaida) خالی کیا اور اُس کے ساتھ ہی ادریسی نے اُس پر قبضہ کر کے عسیر کی سلطنت میں اُس کو شامل کرلیا۔ عثمانی دور میں یہ بندرگاہ یمن کا تھا اب ادریسی کے قابض ہو جانے کی وجہ سے یمن کی تجارت کو اس سے بیحد نقصان پہونچنے کا خطرہ تھا، اس واقعہ نے عربستان میں ایک نئی خانہ جنگی کا آغاز کیا۔ اس موقعہ پر شریف حسین نے کچھ تو ابن سعود کے دوست ادریسی کو

نقصان پہونچانے کے خیال سے اور کچھ امام یحییٰ کو اپنا ہمدرد بنانے کے لئے امام یحییٰ کی حمایت کی۔ اسی سال ابن سعود نے اپنے قدیم دشمن ابن الرشید کو شدید شکست دی اور حکومت شامر (Shammar) کو اپنی حکومت میں شامل کرلیا جس کی وجہ سے حکومت نجد کا ڈانڈا عراق کی سرحد سے مل گیا اور عربستان میں ابن سعود کی طاقت بھی بہت بڑھ گئی۔ دوسری طرف شریف حسین کے ایک ایسے دوست کا خاتمہ ہوگیا جس کی ہمدردیاں شریف حسین نے ابن سعود کا مقابلہ کرنے کے لئے حاصل کی تھیں۔

قاہرہ کانفرنس کے کم وبیش چار ماہ بعد ۱۹۲۱ء کے موسم بہار میں برطانیہ نے شریف حسین سے ازسرنو گفت وشنید شروع کی اور ایک نئے معاہدہ کا مسودہ طیار کرکے لارنس کو شریف حسین کے پاس روانہ کیا، اس معاہدہ کی دفعات اس درجہ نامعقول تھیں کہ ہر وہ شخص جو عرب مسئلہ کی نوعیت سے واقف ہوتا کسی حالت میں اُس کو قبول نہ کرتا۔ اس کا اصل سبب یہ تھا کہ برطانیہ کو شریف حسین اور ابن سعود کی کشیدگی کا پورا پورا علم تھا نیز اس کا احساس تھا کہ برطانوی حمایت کے بغیر شریف حسین ابن سعود کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ صورت حال کی اس نزاکت سے برطانیہ نے فائدہ اُٹھانے کی کوشش کی۔ اس مسودہ میں سب سے زیادہ قابل ذکر چیز یہ تھی کہ اس کی رو سے ایک طرف شریف حسین کے اختیارات محدود ہوجاتے تھے اور دوسری طرف عراق وفلسطین کے علاقوں میں برطانیہ کو "خاص حیثیت" حاصل ہوجاتی تھی۔ صاف الفاظ میں یوں بھی کہا جاسکتا کہ سین ریمو کانفرنس (San Remo Conference) میں برطانیہ کے لئے جو انتدابی حیثیت طے پائی تھی اور جس کو قبول کرنے سے عربوں نے انکار کردیا تھا اُس کو اب نئے انداز میں قبول کرانے کی کوشش کی جارہی تھی، شریف حسین کو اس مسودہ سے بیحد تکلیف ہوئی اور اُس نے لارنس کو بُری طرح پھٹکارا۔

۱۹۲۳ء کے موسم بہار میں پھر گفت وشنید کا آغاز ہوا جس کا سلسلہ کم وبیش ایک سال تک جاری رہا۔ اس مرتبہ مابہ النزاع مسئلہ فلسطین کا تھا۔ برطانیہ کی خواہش تھی کہ شریف حسین فلسطین کے انتداب کو نیز اُس برطانوی پالیسی کو تسلیم کرے جس کا اظہار بالفور اعلان میں کیا گیا تھا (یہاں پر یہ یاد دلادینا ضروری ہے کہ اس اعلان میں فلسطین میں بسنے والے عربوں سے صرف اُن کی شہری اور مذہبی آزادی کے تحفظ کا وعدہ کیا گیا تھا) پہلے تو شریف حسین اس پر اڑا رہا کہ برطانیہ نے دوران جنگ میں جو وعدے عربوں سے کئے تھے اُن کو پورا کیا جائے۔ بعد میں اُس نے خود ایک تجویز پیش کی کہ فلسطین میں ایک قومی حکومت قایم کی جائے جس میں یہودیوں کو بھی نمایندگی حاصل ہو مگر کسی حال میں بھی اس کی "سیاسی واقتصادی آزادی" دوسری عرب حکومتوں سے کم نہ ہو اور اُس کو عرب حکومتوں کے وفاق میں شرکت کا بھی حق دیا جائے۔

۱۸ اگست ۱۹۲۳ء کو شریف حسین نے برطانوی وزیر اعظم ریمزے میکڈانلڈ کو ایک پرزور خط لکھا جس میں

اُن وعدوں کو پورا کرنے کا مطالبہ کیا گیا تھا جو دوران جنگ میں عربوں سے کئے گئے تھے۔ ابھی اس خط کو لکھے ہوئے پورا ایک مہینہ بھی نہیں گزرا تھا کہ وہابی فوجوں نے حجاز پر قبضہ کرلیا اور شریف حسین کو حکومت حجاز سے دستبردار ہونا پڑا۔ اُس نے انگریزوں سے امداد طلب کی مگر اس کو صاف جواب دیدیا گیا کہ یہ کوئی سیاسی لڑائی نہیں بلکہ مذہبی لڑائی ہے اور برطانیہ کو اس میں مداخلت کا کوئی حق نہیں ہے۔ بالآخر پورے حجاز پر ابن سعود کا قبضہ ہوگیا اور جنوری سنہ ۲۶ء میں ابن سعود کو حجاز کا باضابطہ بادشاہ تسلیم کرلیا گیا۔

اس جدید دور نے عربستان میں ایک نئے باب کا آغاز کیا جس میں ابن سعود کی ذات بہت نمایاں ہے اسکے ساتھ ہی مغربی عربستان کی زندگی میں انقلابی تبدیلی کا ظہور ہوا۔ ملک میں ایک نئی حکومت قایم ہوئی جس نے عوام کے اندر شہری فرائض کا احساس پیدا کیا قدیم عربی روایات اور اسلامی فقہ کی تجدید ہوئی۔ ابن سعود کے سامنے چند اہم اور پیچیدہ مسایل بھی تھے جن کا فوری حل ضروری تھا یہ مسایل صرف داخلی نہ تھے بلکہ اُن کو بین الاقوامی اہمیت بھی حاصل تھی۔ سب سے بڑی پیچیدگی یہ تھی کہ وہ ایک طرف اسلام کے ارض مقدس کا حکمراں تھا اور دوسری طرف اُس کو وہابی تحریک کی سرداری بھی حاصل تھی اور وہابیوں اور دوسرے اسلامی گروہوں میں شدید اختلافات تھے۔ اُس کے بعد حدودِ حکومت کے تعین کے متعلق کچھ پیچیدگیاں پیدا ہورہی تھیں۔ تیسرا اہم مسئلہ برطانیہ اور دوسرے ممالک سے دوستانہ تعلقات پیدا کرنے کا تھا۔ ان تمام مسایل کو ابن سعود نے بڑی دور اندیشی و تدبر کے ساتھ حل کیا۔

مئی سنہ ۲۷ء میں ابن سعود نے برطانیہ کے ساتھ ایک معاہدہ کیا جو "معاہدۂ جدہ" کے نام سے مشہور ہے۔ یہ معاہدہ متعدد اعتبار سے اُس مسودہ سے بالکل مختلف ہے جو شریف حسین کے سامنے لارنس نے پیش کیا تھا۔ اس معاہدہ میں سب سے اہم چیز یہ ہے کہ عراق و فلسطین کے علاقہ میں برطانیہ کی "خاص حیثیت" کا کوئی ذکر نہ تھا، جس سے بالفور اعلان کی تائید ہوتی۔ اس معاہدہ کی رو سے "جلالۃ الملک عبدالعزیز بن عبدالرحمٰن آل فیصل السعود" کو نجد و حجاز کا بادشاہ تسلیم کیا گیا۔ اس معاہدہ کی مدت صرف سات سال تھی چنانچہ سنہ ۳۴ء میں طرفین نے اسکی تجدید کی۔

برطانیہ کے ساتھ خوشگوار تعلقات پیدا کرنے کے بعد ابن سعود نے اپنی پوزیشن کو مضبوط کرنے کے لئے اُن غیر حکومتوں سے معاہدے کئے جن کا تعلق اسلامی ممالک سے تھا۔ چنانچہ ایک طرف ہالینڈ، فرانس، روس اور اٹلی، دوسری طرف ایران و ترکی سے معاہدے کئے۔ عرب نقطۂ نگاہ سے سب سے زیادہ اہم معاہدے وہ ہیں جو ابن سعود نے عرب حکومتوں سے کئے ہیں یعنی یمن، عراق اور مصر سے، جنھوں نے اقتصادی اور تمدنی ترقی کی وہ تمام شاہراہیں کھولدیں جو ابتک بند تھیں۔ ابن سعود کے دورِ حکومت میں سب سے بڑی تبدیلی یہ ہوئی کہ نجد کے خانہ بدوش عربوں کو اُس نے بستیوں میں آباد کیا اسوقت تک کم و بیش اُن کی ستر نو آبادیاں قایم ہوچکی ہیں ان

بستیوں میں چار سو سے لیکر چھ ہزار تک لوگ آباد ہیں اور اب بجائے صحرانوردی کے وہ زرعی زندگی گزار رہے ہیں۔ یہ ابن سعود کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔ ابن سعود کے زمانہ تک عربستان میں باربرداری کا کام اونٹوں سے لیا جاتا تھا۔ لیکن اب یہ کام موٹر لاریوں اور موٹر ٹرک سے لیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ رسل و رسایل اور آمد و رفت کے جدید ترین وسایل کو بھی ملک میں روشناس کیا جا رہا ہے۔ وہ سڑکیں جن پر پہلے کارواں گزرا کرتے تھے اب وہاں موٹر دوڑتے نظر آتے ہیں۔ ملک میں ہر طرف سڑکوں کا جال بچھ گیا ہے اور انسان بہ آسانی جدہ سے لیکر مدینہ تک اور بحر احمر سے لیکر ابنائے فارس تک موٹر پر سفر کر سکتا ہے۔ بڑے بڑے شہروں میں لاسلکی کے اسٹیشن قایم ہیں۔ نئی نئی معدنیں تلاش کی جا رہی ہیں۔

تاریخ انتداب عرب

جنگ عظیم کا اختتام عربستان کے شمالی علاقہ کے لئے مصائب اور خلفشار کا ایک طوفان عظیم اپنے ساتھ لایا۔ وہ علاقے جو فرانس کے زیر انتداب تھے وہاں مصائب و کشمکش کی تمام ذمہ داری یورپی طاقتوں کے اشتعال انگیز اقدامات کے سر ہے۔ فرانس و برطانیہ نے اپنے خود عاید کردہ فرض کو ادا کرنے کے لئے سین ریمو (San Remo) کانفرنس کی تجاویز کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی اور اس سلسلہ میں یہ فساد و خونریزی ناگزیر تھی۔

انتداب خود مجلس اقوام کا عاید کردہ نہ تھا۔ بلکہ یہ تجویز تھی اُس سپریم کونسل ( ) کی جو اٹلی، فرانس اور برطانیہ کے نمایندوں پر مشتمل تھی اور یہی تین طاقتیں تھیں جن کے مفاد عثمانی سلطنت کے علاقوں سے وابستہ تھے۔ چنانچہ انھوں نے اطمینان کے ساتھ عثمانی حکومت کے حصے بخرے اپنے اپنے مفاد کے مطابق کئے۔ مجلس اقوام نے عثمانی سلطنت کے متعلق یہ اُصول قایم کر دیا تھا کہ انتداب کے سلسلہ میں متعلقہ علاقہ کے باشندوں کی خواہش کا احترام ضروری ہے مگر اس اُصول کو سپریم کونسل کے ممبروں نے قطعاً پس پشت ڈال دیا جہاں تک ملک کے بسنے والوں کی خواہش کا تعلق ہے، اُس کا علم اتحادیوں کو پورا پورا تھا، کیونکہ کنگ کرین کمیشن رپورٹ (King Crane Commission Report) اور دمشق کانگرس کی تجاویز اُنکے پاس موجود تھیں۔ مگر اس معاملہ میں فرانس و برطانیہ کی رہنمائی صرف اُن کے مفاد نے کی۔

سپریم کونسل نے مجلس اقوام کے ایک اور اُصول کو ٹھکرا دیا جس میں واضح انداز میں تاکید کی گئی تھی کہ عثمانی سلطنت کی بعض قومیں جو منازل ترقی طے کر چکی ہیں اور وہ آزاد اقوام کے دوش بدوش کھڑی ہو سکتی ہیں اُن کو صرف تھوڑے عرصہ کے لئے معمولی طور پر زیر انتداب رکھا جائے تاکہ وہ سیاسی اور انتظامی امور میں پختہ کار ہو جائیں اور خود اپنے پیروں پر کھڑی ہو سکیں۔ جہاں تک عراق و شام کا تعلق ہے سین ریمو کانفرنس نے اس اُصول کا برائے نام ہی سہی مگر احترام کیا۔ لیکن فلسطین کے مسئلہ میں تو ان لوگوں نے کمال ہی کر دیا

یہاں تو برائے نام بھی اس اصول کی پابندی ضروری نہیں سمجھی گئی۔ فلسطین کا انتداب برطانیہ کو سونپا گیا اور اُس سلسلہ میں آزادی تسلیم کرنے کا کوئی ذکر ہی نہیں آیا۔

انقلابی علاقہ کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا:۔

(۱) عراق مع ولایت بصرہ، موصل اور بغداد (برطانیہ) —— (۲) فلسطین (برطانیہ) ——

(۳) شام کا مشرقی اور مغربی علاقہ اور لبنان (فرانس) —— (۴) عراق۔

عراق سین ریمو کانفرنس کے فیصلہ کی اشاعت کے ساتھ ہی عربستان میں شدید خلفشار کے آثار نظر آنے لگے۔ عراق میں تو باضابطہ بغاوت ہوئی۔ اگرچہ یہ بغاوت کامیاب نہیں ہوئی اور عراق بارہ سال تک زیر انتداب نہیں رہا مگر حکومت کی پالیسی میں تبدیلی یقینی طور پر ہو گئی۔ عراق کا بادشاہ فیصل کو منتخب کیا گیا اور اس انتخاب میں کسی قسم کی بے عنوانی نہیں ہوئی مگر اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ فیصل کے انتخاب کے لئے زمین انگریزوں نے تیار کی۔ یہ قصہ ۲۳ اگست سنہ ۲۱ء کا ہے، اور یہ دور فیصل کے انتقال کے وقت (۸ ستمبر سنہ ۳۳ء) تک جاری رہا۔ فیصل کے دورِ حکومت میں ملک نے سیاسی ارتقار، دستوری ترقی اور آزادی کی منزلیں بڑی تیزی کے ساتھ طے کیں۔ فیصل خداداد قابلیت اور عجیب وغریب اہلیت کا مالک تھا۔ ملک کے اہم ترین اور پیچیدہ مسایل کو اُس نے جس خوبی کے ساتھ سلجھایا ہے اس کی دوسری مثال ملنی مشکل ہے۔

۳ اکتوبر سنہ ۳۲ء کو عراق کو باضابطہ مجلس اقوام کا ممبر تسلیم کیا گیا اور یہ اُس کی دستوری ترقی کی آخری منزل تھی۔ اس درمیانی دور میں برطانیہ و عراق کے مابین چار معاہدے مختلف اوقات میں ہوئے اور ہر معاہدہ کے وقت دونوں میں شدید کشاکش رہی۔ ہر موقعہ پر برطانیہ نے کھا پھر اگر عراق سے سین ریمو کانفرنس کے فیصلوں کو تسلیم کرانے کی کوشش کی اور دوسری طرف عراق نے خود برطانیہ سے زیادہ سے زیادہ فایدہ اُٹھانا چاہا۔ دونوں ملکوں کے بیچ میں فیصل کی ذات حایل تھی جو توازن برابر کرنے کی کوشش کرتا۔ بعض وقت صورت حال اس درجہ نازک ہو جاتی کہ ظاہراً مصالحت کے سب دروازے بند نظر آتے۔ فیصل ایک طرف برطانیہ کو دباتا اور دوسری طرف قوم پرور عرب لیڈروں کو زیادہ وسیع نقطۂ نظر رکھنے کی تعلیم دیتا۔ غرض یہ فیصل ہی کی ذات کا کرشمہ تھا کہ ہر بار اُلجھے ہوئے مسایل سلجھ جاتے اور مصالحت ہو جاتی۔

عراق کی آبادی تقریباً تیس لاکھ نفوس پر مشتمل ہے۔ زیادہ تعداد مسلمانوں کی ہے۔ ایک لاکھ بیس ہزار کے قریب عیسائی اور اسی ہزار کے قریب یہود عراق میں آباد ہیں۔ یہودیوں کی بیشتر آبادی بغداد میں ہے۔ ملک کی ۲/۳ آبادی خالص عرب ہے۔ ۱/۳ حصہ میں بیشتر آبادی کردیوں کی ہے جو سنی مسلمان ہیں۔ اُن کی تعداد کوئی پانچ لاکھ ہو گی اور اُن کی بیشتر آبادی ولایت موصل کے شمال میں ہے۔ عراق میں ۳۵ ہزار کے قریب نسطوری عیسائی بھی پائے

جاتے ہیں۔ ان کے علاوہ کچھ اور بھی چھوٹی چھوٹی اقلیتیں ہیں۔ شروع میں ان اقلیتوں کی وجہ سے بڑے بڑے اُلجھاؤ پیدا ہوئے مگر فیصل نے اس مسئلہ کو بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ حل کیا اور اب تمام اقلیتیں سکون و اطمینان کی زندگی بسر کر رہی ہیں

شام و لبنان

جنگ کے بعد عراق نے جو ترقی کی اُس کا ذکر اوپر آچکا ہے لیکن جہاں تک شام کا تعلق ہے اُس کا دامن اُن ترقیوں سے قطعاً "پاک" ہے۔ عربستان کا یہ علاقہ فرانس کے حصہ میں آیا خلفشار اور خونریزی شام میں بھی ہوئی مگر کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ سنہ ۱۹۳۶ء میں فرانس و شام کے مابین ایک معاہدہ ہوا ہے جس سے مستقبل کے متعلق کچھ امید بندھی ہے۔ لیکن انتداب کے وقت سے لیکر اس معاہدہ کے وقت تک شام نے سوا تباہی و بربادی کے اطمینان و بہبود کی شکل نہیں دیکھی۔

سین ریمو کانفرنس میں فرانس نے کوشش کرکے شام و لبنان کا انتداب حاصل کیا اور دونوں علاقوں میں جداگانہ انداز کی حکومتیں قایم کیں اس کی وجہ یہ تھی کہ فرانس دونوں علاقوں سے جداگانہ انداز اور مختلف نوعیتوں کے فایدے اُٹھانا چاہتا تھا۔ لبنان کا علاقہ مشرق قریب میں فرانس کے اثر اور رسوخ کا آہنی قلعہ تھا۔ اسی علاقہ میں فرانس کے قدیم دوست، میرونائٹ عیسائی آباد تھے۔ ان کے علاوہ اور دوسرے فرقے بھی وہاں جو آباد تھے وہ بھی فرانس کو اپنا نجات دہندہ سمجھ رہے تھے۔ برخلاف اس کے شام میں عرب مسلمان آباد تھے اور دمشق تو عربستان کی قومی تحریک کا مرکز ہی تھا چنانچہ فرانس نے لبنان کو مضبوط اور شام کو کمزور کرنے کی پالیسی اختیار کی۔ اس سلسلہ میں فرانس نے جو سب سے پہلا قدم اُٹھایا وہ یہ تھا کہ شام کے علاقہ سے کچھ حصہ نکال کر لبنان میں شامل کرکے اُس کا رقبہ بڑھا دیا۔ یہ نیا علاقہ شمال و جنوب اور مشرق سے لیا گیا۔ اس اضافہ کی وجہ سے ایک طرف کچھ ساحلی علاقہ لبنان میں شامل ہوگیا اور طرابلس، بیروت اور سیڈون وغیرہ کے ساحلی شہر اُس میں شامل ہوگئے اور بعلبک اور بقاع کے زرخیز میدان بھی اس کو مل گئے۔ اس کی وجہ سے دوسری طرف شام کی بحری تجارت کا تقریباً بالکل خاتمہ ہوگیا اور اُن علاقوں کی مسلمان آبادی بھی اس سے بیحد برافروختہ ہوئی کیونکہ لبنان میں عیسائیوں کی اکثریت تھی۔

اپنے اثر والے علاقہ میں اضافہ کرنے کے بعد فرانس نے اُس اتحاد کو ختم کرنے کی کوشش کی جو فیصل کی عربی حکومت کے دور میں ملک کو حاصل تھا۔ چنانچہ ملک کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا۔

(۱) حکومت لاذقیہ:- یہ علاقہ لبنان اور سنجاق اسکندرونہ کے درمیان واقع ہے اور اسکا دار السلطنت لاذقیہ ہے

(۲) جبل دروز:- یہ دمشق اور ماوراء یردن کی سرحد تک ہے اور پہاڑی علاقہ ہے اسکا دار السلطنت سویدہ ہے

(۳) حکومت شام:- اس کا دار السلطنت دمشق ہے اور باقی ماندہ انتدابی علاقہ پر مشتمل ہے۔

اُن کے علاوہ اور بھی چھوٹی چھوٹی ریاستیں فرانس نے قایم کی ہیں۔

شام ولبنان کی آزادی

فرانسیسی انتداب کی تاریخ بہ آسانی تین حصوں میں تقسیم کی جاسکتی ہے۔ پہلے دور (سنہ ۲۰ء سے سنہ ۲۶ء) کو دورِ تاریک سے تعبیر کرنا زیادہ مناسب ہے۔ یہ ناعاقبت اندیشی اور ظلم وحماقت کا وہ دور تھا جس میں حکمران طبقہ نے نفرت اور بے اطمینانی کی تخم ریزی کی اور اس کا ثمر سنہ ۲۶ء کی بغاوت کی شکل میں اُن کو ملا۔ یہ دور اسی بغاوت کے ساتھ ختم ہوگیا۔ دوسرا دور (سنہ ۲۶ء سے لیکر سنہ ۳۶ء تک) گفت وشنید کا دور ہے۔ فرانس کو اس دور میں تمام دنیا کے سامنے اپنی نااہلی اور خام کاری کے لئے رسوا ہونا پڑا۔ اسی زمانہ میں فرانس نے عرب لیڈروں سے مصالحت کی بھی کوشش کی مگر ناکامی ہوئی تیسرا دور سنہ ۳۶ء سے شروع ہوتا ہے۔ اس کی ابتدا اُس معاہدہ سے ہوتی ہے جو فرانس نے بعد از خرابیِ بسیار شام سے کیا۔

پہلا دور مارشل لا اور کشت وخون کا دور تھا جس میں فرانس نے جی کھول کر ظلم کیا۔ بالآخر سنہ ۲۵ء میں تنگ آمد بہ جنگ آمد عربوں نے بغاوت کی۔ یہ قصہ ۲۱ر جولائی کا ہے۔ اس موقعہ پر فرانسیسی فوجوں کو شدید نقصان اُٹھانا پڑا۔ فرانس نے فوراً تیس ہزار آزمودہ سپاہیوں کی ایک فوج روانہ کی مگر باغیوں نے اُنکو بھی شکست دی اور کوئی ½ فرانسیسی فوج اس معرکہ میں کام آئی اور تمام سامان حرب بھی باغیوں نے لوٹ لیا باغی فوج بڑھتی ہوئی دمشق تک پہونچ گئی۔ اس موقعہ پر عرب لیڈر جو قید تھے وہ جیل خانوں سے نکل بھاگے اور باغیوں سے آملے یہ تقریباً سب کے سب دروزی عیسائی تھے۔ اب اس بغاوت نے بالکل قومی رنگ اختیار کرلیا۔ اس بغاوت کو دبانے کے لئے فرانس نے بعض ایسے انسانیت سوز مظالم کئے ہیں کہ ان کی دوسری مثال شاید ہی دنیا کی تاریخ میں مل سکے۔ بہرحال بغاوت بڑی حد تک کامیاب ہوئی اور حکومت نے اپنے انداز میں تبدیلی پیدا کی۔

اس دور کی ابتداء ام، پونسوٹ (M. Ponsot) کے ہائی کمشنر کے عہدہ پر تقرر سے ہوتی ہے یہ ایک تجربہ کار سولیین تھے، انھوں نے سب کو خوش رکھنے کی کوشش کی اور عرب حلقوں میں اچھی نظروں سے دیکھے جاتے تھے مگر اس کے باوجود فرانس اور شام کے مابین کوئی معاہدہ نہ ہوسکا۔ ام، پونسوٹ نے اپنے تقرر کے چوتھے سال جمہوری حکومت کے قیام کا اعلان کیا اور کچھ عرصہ کے بعد نئے دستور کے ماتحت انتخابات عمل میں آئے۔ اس موقعہ پر انھوں نے اپنی غیر جانبداری کا پورا ثبوت دیا۔ اس چیز نے اُن کو عرب حلقوں میں بیحد مقبول بنا دیا۔ ام پونسوٹ نے اپنے قیام کے آخری سال میں ایک نئے معاہدہ کا مسودہ عرب جمہوریت کے سامنے پیش کیا مگر عرب لیڈروں نے اس کو قبول کرنے سے انکار کردیا۔ اسی سلسلہ میں دو قوم پرور عرب لیڈرو

نے شامی کابینہ سے استعفیٰ بھی دیدیا۔ اب پھر عربوں میں جوش و خروش کے آثار نظر آنے لگے۔ اسی زمانہ میں ام، پونسوٹ نے اپنے عہدہ کی مدت پوری کی اور ان کی جگہ پر ام، ڈی، مارٹل (M. D. Martel) کا تقرر ہوا انھوں نے پہلا کام یہ کیا کہ شامی کابینہ کے وزیر اعظم کو بلا کر اس مسودہ پر دستخط کرنے کا مطالبہ کیا۔ یہ وزیر اعظم فرانسیسی حکومت کے نامزد کردہ تھے، انھوں نے اُس مسودہ پر دستخط کر دے۔ مگر جب یہ مسودہ مجلس ملی کے سامنے پیش ہوا تو ممبروں کی اکثریت نے اُس کو مسترد کر دیا اس کے جواب میں ام، ڈی، مارٹل نے مجلس ملی کو غیر تعینہ مدت کے لئے معطل کر دیا۔ اسی سلسلہ میں ٹاؤن ہال میں جلسہ ہو رہا تھا کہ یکایک پولیس نے چھاپا مارا اور بیشتر لیڈروں کو گرفتار کر لیا۔ اُن لوگوں پر جرم ثابت نہ ہو سکا مگر اُن کو جلاوطن کر دینا حکومت نے مناسب سمجھا۔ اس چیز نے تمام ملک میں اِس سرے سے لیکر اُس سرے تک آگ لگا دی اور پورے ملک میں مکمل ہڑتال کی گئی۔ ابھی ہڑتال ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ کچھ اور عرب لیڈروں کو گرفتار کیا گیا۔ حکومت کے اِس اقدام نے آگ پر تیل کا کام کیا اور ملک بھر میں بغاوت کی فضا پیدا ہو گئی اور ہڑتال برابر جاری رہی، جس کی وجہ سے ملک کے کاروباری حلقہ میں جمود پیدا ہو گیا۔ اس کا سلسلہ چھ ہفتوں تک جاری رہا اور حکومت کی انتھک کوششوں کے باوجود ہڑتال ختم نہ ہو سکی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فرانسیسی حکومت کو اپنی پالیسی میں تبدیلی کرنی پڑی یعنی فرانس اور شام کے مابین ایک معاہدہ ہوا جو انگلستان اور عراق کے معاہدہ کے طرز کا تھا۔

فرانس نے شام میں جو تجربات حاصل کئے اس کی قیمت بھی اُس کو بہت زیادہ ادا کرنی پڑی۔ ہزاروں فرانسیسی جانیں ایک طرف ضایع ہوئیں اور دوسری طرف فرانسیسی خزانہ پر فوجی اخراجات اور دوسری ضروریات کے سلسلہ میں ۱۲ کرور پونڈ (تقریباً ایک ارب ۴۴ کرور روپیہ) کا بار پڑا۔

فلسطین سب سے آخر میں فلسطین کے ناکام انتداب کا نمبر آتا ہے۔ انتداب فلسطین کی تاریخ کا جہاں تک تعلق ہے انگریزی اور یورپ کی دوسری زبانوں میں بہت کافی مواد موجود ہے۔ لیکن اول تو وہ حد درجہ منتشر ہے اور اگر یکجا بھی کر لیا جائے تو اس کو ہاتھ لگانے میں بیحد احتیاط اور پھونک پھونک کر قدم رکھنے کی ضرورت ہے۔ جو غیر جانبدار اور دیانتدار مصنفین ہیں اُن کی تصانیف بھی بہت کم پائی جاتی ہے کیونکہ معلومات کے عربی ذرایع اُن کی دسترس سے باہر ہوتے ہیں دوسری طرف صیہونی پروپیگنڈے کا بحر ناپیدا کنار ہے جو یورپ کے گوشہ گوشہ میں ٹھاٹھیں مارتا نظر آتا ہے۔ عموماً دنیا کے قابل ذکر پریس (Press) اور مغربی جمہوریتوں کے خبر رساں ادارے یہودیوں کی جنبش ابرو پر گردش کرتے نظر آتے ہیں اور خصوصاً انگریزی بولنے اور سمجھنے والی دنیا کے تو تقریباً تمام اخبارات اُن کے ہاتھ میں ہیں۔ برخلاف اس کے عرب ابھی اول تو پروپیگنڈے سے میدان میں طفل مکتب ہیں اور دوسرے مالی اعتبار سے عربوں کو اس کی استطاعت نہیں کہ اس باب میں وہ

روپیہ پانی کی طرح بہا سکیں یہی وجہ ہے کہ دُنیا کی کسی زبان میں شاید ہی عرب نقطۂ نگاہ سے کوئی کتاب اس موضوع پر نظر آئے۔ یہودیوں کے پاس دولت کی کمی نہیں اور وہ بے دریغ دولت اس مقصد کے حصول کے لئے صرف کر رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ گزشتہ بیس سال سے دنیا فلسطین کے مسئلہ کو صیہونی زاویۂ نگاہ سے دیکھنے کی عادی ہو گئی ہے۔

معلومات کا دوسرا اہم ذریعہ برطانوی سرکاری محکمہ ہو سکتا تھا مگر وہاں بھی میدان صاف نظر آتا ہے۔ حکومت برطانیہ کے قبضہ میں بعض اہم دستاویزیں ہیں جب تک وہ شایع ہو کر عوام تک نہ پہونچیں اُسوقت تک مسئلہ فلسطین کے متعلق کوئی صحیح رائے قایم نہیں کی جاسکتی۔ یہی وجہ تھی کہ دار العوام اور دار الامراء کے ممبروں نے بارہا حکومت سے ان دستاویزوں کی اشاعت کی اپیل کی مگر حکومت نے توجہ نہ کی یہودیوں کے لئے دوسری آسانی یہ ہے کہ متذکرۂ بالا دونوں ایوانوں میں یہودی ممبروں کی کافی تعداد موجود ہے جو ہر موقعہ پر یہودیوں کی فاضلانہ انداز میں وکالت کرتی ہے لیکن غریب عربوں کی آواز وہاں تک پہونچانے کا کوئی ذریعہ نہیں۔

معلومات کا ایک اور ذریعہ ہے اور وہ پرمانٹ مینڈیٹ کمیشن (Permanent Mandates Commission) کی کارروائیوں کی کتاب ہے۔ مگر یہاں بھی اک طرفہ حالات نظر آتے ہیں۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ خود جنیوا (Geneva) میں یہودیوں کے محکمۂ اطلاعات کا ایک بہت بڑا اور باضابطہ دفتر موجود ہے جو برابر کمیشن کو فلسطین کے حالات سے باخبر رکھتا ہے۔ اس طرح کا کوئی ذریعہ عربوں کے پاس نہیں۔ فلسطین کا عربی پریس جو اطلاعات بہم پہونچاتا بھی ہے اُن کو نظر انداز کیا جاتا ہے میرے اس بیان کی تائید وزراء کی تقریروں اور سفید کاغذ (White paper) کے مطالعہ سے ہو سکتی ہے۔

شاید مسئلہ فلسطین کے مطالعہ کا سب سے بہتر طریقہ یہ ہوگا کہ وہ متعلقہ جماعتیں جو آج فلسطین پر اپنا حق ظاہر کر رہی ہیں اُن کے دعوؤں پر ایک نظر ڈال لی جائے۔

عربوں کا سب سے بڑا حق یہ ہے کہ مدت دراز سے فلسطین میں آباد ہیں اور ملک پر ان کا آج بھی قبضہ ہے اُس کے بعد عربوں کے اُن سیاسی حقوق کا نمبر آتا ہے جو شریف حسین اور برطانیہ کے معاہدہ کی رو سے اُن کو حاصل ہوئے تھے اور جنکے معاوضہ میں عربوں نے جنگ میں اتحادی طاقتوں کا پورا پورا ساتھ دیا تھا۔ اب جبکہ شریف حسین اور ہنری میک ماں (Mc Mahon) کی خط وکتابت شایع ہو چکی ہے حکومت برطانیہ یا کوئی جماعت اس کا دعویٰ نہیں کر سکتی ہے کہ ارض فلسطین کا تعلق اُس علاقہ سے ہے جس کو مستثنیٰ کر دیا گیا تھا۔

فلسطین میں آج عرب جو انتداب کے خلاف برسر جنگ ہیں اُس کا یہود دشمنی سے کوئی تعلق نہیں ہے یہ اسلام کے تمدنی اثر کا طفیل ہے کہ قرون وسطیٰ اور دور جدید دونوں دوروں میں عربوں کی تاریخ کا دامن یہودیوں پر مظالم کے داغوں سے قطعاً پاک رہا اور صرف یہی نہیں بلکہ یہودی قوم نے تو عرب حکمرانوں کی سرپرستی

میں بڑی بڑی ترقیاں کی ہیں۔ اور آج بھی ان تمام قصوں کے باوجود وہ تمام یہودی اقلیتیں جو دوسری عرب حکومتوں میں آباد ہیں اُن کے ساتھ اُس سے کہیں زیادہ اچھا برتاؤ کیا جاتا ہے جو امریکہ یا انگلستان کی حکومتیں اُن ممالک میں بسنے والے یہودیوں کے ساتھ روا رکھتی ہیں۔ عربوں کو تو انگریزوں سے بھی کوئی دشمنی نہیں وہ تو صرف اپنے اُس سیاسی حق کی حفاظت کر رہے ہیں جو اُن سے چھینا جا رہا ہے۔

فلسطین پر یہودیوں کے حقوق عربوں سے بالکل مختلف ہیں۔ اُن کا دعویٰ یہ ہے کہ فلسطین عہدِ عتیق میں اُن کا وطن تھا اور اب پھر اُن کو وہاں جاکر آباد ہونے اور یہودی ریاست قایم کرنے کا حق ہونا چاہئے۔ حالانکہ یہودیوں کے استیصال کے وقت سے لیکر آج تک (۱۸ سو سال سے) فلسطین میں یہودیوں کی بہت ہی قلیل اقلیت آباد چلی آرہی ہے۔ ۱۹۱۸ء میں جنگ کے اختتام پر فلسطین میں یہودیوں کی آبادی ۵۵ ہزار نفوس پر مشتمل تھی جو تناسب آبادی کے اعتبار سے آٹھ فیصدی ہوتی ہے۔ برخلاف اس کے عربوں کی آبادی نوے فیصدی تھی۔ مگر یہودیوں کے مطالبہ کی اصل بنیاد یہ ہے کہ جنگ عظیم کے دوران میں یہودیوں نے اتحادیوں کی جو امداد کی تھی اُس کے معاوضہ میں اُن سے وعدہ کیا گیا تھا کہ فلسطین کو ان کا قومی وطن بنا دیا جائے گا۔ اس میں شک نہیں کہ اگر بالفور اعلان وجود میں نہ آتا تو اتحادی یہودیوں کی گراں قدر خدمات سے محروم رہتے اس لئے یہودی اپنے اس دعوے میں ایک حد تک حق بجانب ہیں۔ مگر اس سلسلہ میں ایک چیز قابل غور ہے۔ اول تو یہ کہ بالفور اعلان مشروط تھا اور دوسرے یہ کہ برطانیہ نے یہودیوں سے وعدہ کرنے سے پہلے ہی عربوں سے ایک معاہدہ کیا تھا اور وہ یہ تھا کہ فلسطین میں عربوں کی آزادی برقرار رہے گی اور اس وعدے کو متعدد موقعوں پر برطانیہ نے دہرایا بھی تھا۔

بالفور اعلان میں اس کا وعدہ تو ضرور کیا گیا تھا کہ فلسطین کو ان کا قومی وطن بنایا جائے گا مگر اس شرط کے ساتھ کہ "فلسطین کی غیر یہود آبادی کے سیاسی اور مذہبی حقوق پر" یہ چیز اثر انداز نہ ہوگی۔ برخلاف اس کے یہودیوں کی کوشش یہ ہے کہ فلسطین کو صرف ان کا قومی وطن ہی نہ بنایا جائے بلکہ وہاں یہودی ریاست کا قیام بھی عمل میں آئے۔ چنانچہ ڈاکٹر وزمین (Weizmann) جو بہت بڑے یہودی لیڈر ہیں انھوں نے بارہا اس کا اعلان کیا ہے کہ صیہونیت کا مقصد یہ ہے کہ "فلسطین کو اسی طرح یہودیوں کا وطن بنا دیا جائے جس طرح امریکہ اہل امریکہ کا وطن ہے اور انگلستان انگریزوں کا"

انگریزوں نے یہودیوں سے جس وقت یہ وعدہ کیا تھا شاید وہ اسکی اہمیت اور اُسکے نتایج سے واقف نہ تھے۔ عربوں کا خیال ہے کہ انگریزوں نے ارادتاً یہ دوہری پالیسی اختیار کی مگر یہ خیال شاید غلط ہے انگریزوں نے جسوقت یہ وعدہ کیا تھا اُسوقت اُن کی موت و زندگی کا سوال درپیش تھا۔ اُن کے پاس اس کا موقعہ نہ تھا کہ اس مسئلہ کی جزئیات پر وہ غور کر سکتے۔ لیکن برطانیہ کو اُس کی اس پالیسی کے لئے کبھی بھی معاف نہیں

کیا جاسکتا جو اُس نے جنگ کے بعد اختیار کی۔ اُس وقت یہودیوں کے ارادے عالم آشکار ہو چکے تھے اور یہ چیز بھی بالکل صاف ہو چکی تھی کہ قومی وطن کی آڑ لیکر وہ فلسطین میں یہودی ریاست کے قیام کے درپے ہیں۔ انگریزوں کو دوسری طرف اس کا بھی علم ہو چکا تھا کہ عرب اپنے وطن اور اپنے سیاسی حقوق کی حفاظت کے لئے جان کی بازی بھی لگا دینے پر آمادہ ہیں۔ تاریخ پکار پکار کے کہہ رہی ہے کہ اس نوعیت کے واقعات کا اگر ابتداء ہی میں سد باب نہیں کیا جاتا تو آگے چل کر شدید خونریزی ناگزیر ہوتی ہے۔

کنگ کرین کمیشن (King Crene Commission) اور دیگر ذرایع بھی آنے والے واقعات کی پیشین گوئی کر چکے تھے۔ مگر حکومت برطانیہ نے سب کی طرف سے آنکھیں بند کرلیں یہودیوں نے فلسطین میں جو مظالم شروع کئے تھے وہ راز نہ تھے بلکہ ہر شخص اُن سے واقف تھا۔ یہودی جو روپیہ اپنے ساتھ لے گئے تھے اُس کو ملکی ترقی پر صرف کرنے کے بجائے عربوں کو اُن کے گھر بار سے محروم کرنے کے لئے پانی کی طرح بہا رہے تھے۔ حکومت برطانیہ نے پہلے تو ان حادثات کی پرواہ نہیں کی اور مداخلت کی بھی تو یہودیوں کی حمایت میں۔ اس کی دو وجہیں سمجھ میں آتی ہیں۔ اول تو یہ کہ برطانیہ نے یہودیوں سے کچھ ایسے معاہدے کئے ہیں جو ابتک ظاہر نہیں ہو سکے۔ دوسری وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ حکومت برطانیہ دنیا کے اس دور دراز گوشے میں بجائے عرب ریاست کے یہودی ریاست کے قیام کو اپنے شہنشاہی مفاد کی حفاظت کے لئے بہتر اور ضروری سمجھتی ہے۔

۱۹۳۶ء کے موسم بہاراں میں رائل کمیشن کے تقرر کا اعلان کیا گیا اور اُس کے ساتھ امید بندھ گئی کہ اب حالات کی صحیح جانچ پڑتال ہو جائے گی اور مسئلہ کے ہر پہلو پر پوری روشنی ڈالی جائے گی۔ لیکن ۱۹۳۷ء میں جب کمیشن کی رپورٹ شایع ہوئی تو تمام امیدیں مبدل بہ یاس ہو گئیں۔ اس میں کلام نہیں کہ بعض اعتبار سے کمیشن کی رپورٹ بہت زیادہ قابل ستایش ہے مگر اسی درجہ یہ ناقص و نامکمل بھی ہے۔ اکثر ایسے واقعات بھی اس رپورٹ میں موجود ہیں جو ابتک عوام کی نگاہوں سے اوجھل تھے اور سرکاری ذرایع سے وہ روشنی میں نہ آسکے تھے۔ اس رپورٹ میں برطانیہ کی بعض غلط کاریوں کو بھی عریاں کیا گیا ہے۔ نیز اُس کے مطالعہ سے اس کا بھی پتہ چلتا ہے کہ رپورٹ کے مصنفین کا یہ بھی خیال ہے کہ یہ انتداب ناقابل عمل تھا۔ مگر ان سب باتوں کے باوجود اس کا بھی صاف پتہ چلتا ہے کہ کمیشن کے ممبر یہودیوں کے بیانات اور پروپگنڈے سے بھی متاثر ہیں اور اس کا اُن کو کوئی احساس نہیں ہے کہ اس فن سے عرب ناواقف ہیں۔ اور شاید یہی وجہ ہے کہ کمیشن کے ممبروں نے عربوں کے بیانات پر ہمدردی کے ساتھ غور کرنے کے بجائے اُن کی شکایات کو نظر انداز کرنا زیادہ مناسب سمجھا ہے اس کی ذمہ داری صرف کمیشن کے ممبروں ہی کے سر نہیں بلکہ اس کی ایک اور بھی وجہ ہے اور وہ یہ کہ عربوں نے کمیشن کا مقاطعہ کیا اور کمیشن کی واپسی سے صرف چند روز قبل یہ مقاطعہ ختم کیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کمیشن نے سات آٹھ ہفتے برطانوی اور یہودی گواہوں کے

بیانات پر صرف کئے اور عربوں کے حصہ میں صرف پانچ یوم آئے۔ کل ۱۱۲ اشخاص کے بیانات کمیشن نے قلمبند کئے انمیں صرف ۱۲ عرب تھے اور سو برطانوی اور یہودی اشخاص تھے۔

کمشنروں نے مسئلہ فلسطین کے پس منظر پر بحث کرتے ہوئے بالفور اعلان اور اُن وعدوں پر بہت زیادہ زور قلم صرف کیا ہے جو یہودیوں سے برطانیہ نے دوران جنگ کئے تھے مگر برطانیہ نے جو وعدے عربوں سے کئے تھے اُن کو نظر انداز کیا گیا ہے۔ اگرچہ شریف حسین اور ہنری میک ماہن (Mc Mahon) خط و کتابت کا سرسری طور پر ذکر ہے مگر بالفور اعلان کے بعد برطانیہ نے جنوری ۱۹۱۸ء میں شریف حسین سے جو وعدہ کیا تھا یا جون ۱۹۱۸ء میں سات عرب لیڈروں کے میموریل کے جواب میں جو اعلان برطانیہ نے کیا تھا اُن کا کوئی ذکر کمیشن کی رپورٹ میں نہیں ہے۔

کمیشن نے مسئلہ فلسطین کا جو حل پیش کیا ہے وہ اِس خیال پر مبنی ہے کہ عرب اور یہودی دونوں فلسطین میں آباد ہیں اس لئے ملک کو دو حصوں میں تقسیم کیا جائے۔ کمیشن نے اس سلسلہ میں پوری اسکیم پیش کی ہے اُسکی رو سے فلسطین کا مغربی علاقہ یہودی آبادی کے لئے مخصوص ہو جاتا ہے۔ یہ مجوزہ علاقہ موجودہ یہودی آبادی کے رقبہ سے کئی گنا زیادہ ہے۔ کمیشن کی یہ بھی تجویز ہے کہ بیت المقدس اور بیت اللحم کے مقدس شہروں میں مستقلاً برطانوی انتداب کا قیام عمل میں لایا جائے اور بقیہ حصہ میں عرب ریاست قایم کی جائے اور اس کا تعلق دوسری عرب ریاستوں سے بھی ہو اور دونوں ریاستوں کو مجلس اقوام کی ممبری کا حق ہو۔ وہ مسئلہ جس کو سلجھانے کے لئے کمیشن کا تقرر ہوا تھا اُس کو کمیشن نے اور بھی اُلجھا دیا ہے۔ جس علاقہ کو یہودی ریاست میں تبدیل کرنے کی سفارش کی گئی ہے اس میں اسوقت پانچ لاکھ عرب آباد ہیں۔ اُس پر ستم یہ ہے کہ کمیشن کے ممبروں کا دعوے ہے کہ اُن کی تجویز قابل عمل بھی ہے۔ اُن کا کہنا ہے کہ اُن کی مجوزہ اسکیم تین اہم ضرورتوں کو پورا کرتی ہے۔ اول یہ کہ یہ تجویز قابل عمل ہے دوسرے برطانیہ کے تمام سابقہ وعدے اس سے پورے ہوتے ہیں جو عربوں اور یہودیوں کے ساتھ کئے گئے تھے۔ تیسرے یہ کہ عربوں یا یہودیوں کے ساتھ اس میں بے انصافی نہیں ہوتی ہے۔

فسادات فلسطین کے سلسلہ میں عام طور پر کہا جاتا ہے کہ یہ قدرتی پیداوار نہ تھے بلکہ اس کی تمام تر ذمہ داری آفندی طبقہ کی سازش، مفتی اعظم کے سیاسی اغراض، اٹلی، جرمنی اور روس کے پروپیگنڈے کے سر ہے۔ ابتداء کے فسادات کا جہاں تک تعلق ہے بعض حلقوں میں اس بیان کو تسلیم کر لیا گیا تھا۔ مگر انتدابی حکومتوں کے کمیشن کی رپورٹ نے اس مسئلہ کو صاف کر دیا کہ یہ فسادات دراصل نتیجہ ہیں اُس محبت اور لگاؤ کا جو عربوں کو اپنے وطن اور تمدن کے ساتھ ہے۔ آج بغاوت اپنے شباب پر ہے اور اُس کا سب سے زیادہ زور شہروں میں نہیں بلکہ دیہاتوں میں ہے اور اس کا فوری سبب رائل کمیشن (Royal Commission) کی تجویز تقسیم ہے جس کی وجہ سے عربوں کو

اپنا گھر بار چھوڑ کر غیر علاقے میں جا کر آباد ہونا پڑے گا۔ تقریباً تمام قومی لیڈر یا تو جیل خانوں میں ہیں یا جلا وطنی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ اور اب عنان قیادت خود مزدوروں اور کسانوں کے ہاتھ میں ہے جو اپنے گھر بار کو بچانے کے لئے اپنی جان کی بازی بھی لگا دینے پر تیار ہیں۔ اس جوش و خروش کو کسی طرح بھی غیر ملکی پروپگنڈے کا نتیجہ نہیں کہا جا سکتا۔ غیر ملکی پروپیگنڈا سلگتی ہوئی آگ پر پنکھے کا کام کر سکتا ہے مگر اس میں اتنی قوت نہیں ہوتی کہ وہ بغاوت کو مہینوں اور برسوں تک مسلسل زندہ رکھ سکے۔

اس بغاوت میں تو اعلیٰ طبقہ کے عربوں کو بھی کوئی دخل نہیں کیونکہ وہ کسان اور مزدور عرب جو بغاوت کر رہے ہیں وہ تو زمیندار عربوں سے بھی کچھ کم ناراض نہیں کہ انھوں نے اپنی جائدادیں یہودیوں کے ہاتھ کیوں فروخت کیں جس کی وجہ سے اُن کو اپنے گھر بار سے دست بردار ہونا پڑ رہا ہے۔ دوسری طرف عرب اپنے لیڈروں سے ناخوش ہیں کہ انھوں نے پہلے ہی اس خطرہ کو کیوں نہیں محسوس کیا تھا۔ غرض اسوقت عنان قیادت اُن کسانوں اور مزدوروں کے ہاتھ میں ہے خود جن کی موت و زندگی کا اسوقت سوال ہے، باغیوں کا تشدد صرف انتدابی طاقت ہی تک محدود نہیں بلکہ اس کا یکساں شکار عرب زمیندار اور وہ دلال بھی ہیں جو خرید و فروخت کے معاملات طے کر رہے ہیں۔

دوسری غلط فہمی یہ پیدا کی جا رہی ہے کہ یہودیوں کی آمد سے عربوں کو اقتصادی فوائد حاصل ہوئے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ یہودی دولت اور ذہانت سے ملک نے کچھ نہ کچھ اقتصادی ترقی ضرور کی ہے۔ عرب زمیندار اُن کی آمد کی وجہ سے مالدار بھی ہو گئے ہیں اور عرب مزدوروں کی مزدوری بھی بڑھ گئی ہے۔ مگر اُس کے ساتھ ہی یہودیوں کی آمد ملک کے لئے نئی نئی ضرورتیں اور نئے نئے بار بھی اپنے ساتھ لائی ہے۔ انتدابی پالیسی کی وجہ سے نئی نئی خدمات کی ضرورتیں پیش آئیں، حفاظت عامہ کے لئے پولیس میں اضافہ کیا گیا۔ بلا ضرورت عمارتوں کے ٹھیکے دیئے پڑے تاکہ یہودی مزدوروں کے لئے روزگار پیدا کیا جائے۔ ان سب وجوہ سے فلسطین جیسے مفلس ملک کے میزانیہ پر غیر ضروری بار ڈالا گیا۔ ان سب باتوں سے اگر قطع نظر کر لیا جائے اور یہ بھی تسلیم کر لیا جائے کہ فلسطین کو یہودیوں کی آمد سے بہت زیادہ اقتصادی فائدہ پہونچا ہے تو بھی یہ ایک بے حقیقت استدلال ہے کیونکہ اگر ایک طرف فلسطین کو یہ فوائد حاصل ہوئے تو دوسری طرف یہی چیز فلسطین میں بسنے والے عربوں کی سیاسی زندگی کا چراغ گل کر رہی ہے۔ سنہ ۱۸ء میں فلسطین میں یہودیوں کی آبادی تقریباً پانچ فیصدی تھی سنہ ۳۲ء میں یہ بڑھتے بڑھتے اٹھارہ فیصدی ہو گئی اور آجکل جس سرعت کے ساتھ یہودی مہاجرین فلسطین میں آ رہے ہیں اُس سے اندازہ لگایا جا رہا ہے کہ آئندہ دس سال میں فلسطین میں یہودیوں کی اکثریت ہو جائے گی۔ ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں موجودہ اقتصادی فوائد کی کوئی حقیقت نہیں رہجاتی۔

مسئلہ فلسطین کا کوئی معقول حل اُسوقت تک دستیاب نہیں ہو سکتا جب تک کہ حکمران انصاف سے کام نہ لے

تشدد خواہ وہ جسمانی ہو یا سیاسی لاحاصل ہے۔ اس میں شک نہیں کہ عربوں نے جب سے تشدد کی راہ اختیار کی ہے دنیا کی نظریں اُن کی طرف اُٹھ گئی ہیں اُس سے قبل بیس سال تک جنیوا، لندن اور بیت المقدس میں پُر امن انداز میں لوگوں کو متوجہ کرنے کی کوششیں کی گئیں اور وہ سب ایک ایک کرکے ناکام رہیں۔ اس سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اس تشدد سے عربوں کو جسقدر فایدہ ہوا ہے اُسی قدر اُن کی تحریک کو نقصان پہونچا ہے۔ مگر اس تشدد کو ختم کرنے کی پُر حکمت اور آسان صورت یہ ہے کہ اُس کے اسباب کا سد باب کیا جائے۔ اس تشدد کے مسئلہ پر غور کرتے وقت اس حقیقت کو پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے کہ عربوں کا تشدد نتیجہ ہے حکمران طبقہ کے اُس اخلاقی تشدد کا جو عربوں کے ساتھ اُس نے روا رکھا ہے۔ عربوں کے اس تشدد کو اب دُنیا کی کوئی طاقت اُسوقت تک روک نہیں سکتی۔ جب تک کہ حکمران طبقہ اپنے اخلاقی تشدد کو ختم نہ کردے۔

وہ لوگ جو پروپیگنڈے کے پردوں کو چاک کرکے اصل تصویر کو دیکھ سکتے ہیں ان کے لئے فلسطین کے مسئلہ کا حل تلاش کرلینا زیادہ دشوار نہیں بشرطیکہ حکمران طبقہ بھی عقل و انصاف کی راہ اختیار کرنے پر آمادہ ہو۔ ایک ایسا ملک جہاں مدت دراز سے ایک ایسی قوم آباد چلی آتی ہو جس کو اپنے وطن کے ساتھ قلبی لگاؤ ہو وہاں باہر سے کسی دوسری قوم کے آباد ہونے کا سوال پیدا ہی نہیں ہوسکتا۔ فلسطین کو یہودی ریاست میں تبدیل کرنے کی کوشش کے سلسلہ میں ابتک جو تجربات حاصل کئے گئے ہیں وہ کافی عبرت انگیز اور سبق آموز ہیں۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ عربوں کو یہودیوں کے ساتھ کوئی مخاصمت ہے بلکہ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ فلسطین کا کسان اپنے وطن سے دستبردار ہونے کے مقابلہ میں اپنی جان قربان کردینا زیادہ بہتر سمجھتا ہے اور اسباب سے قطع نظر صرف یہی ایک ایسی چیز ہے جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ فلسطین میں یہودی ریاست کے قیام کا خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہوسکتا۔ مسئلہ فلسطین کا حل تلاش کرنے کے سلسلہ میں پہلا قدم یہ ہونا چاہئے کہ اس حقیقت کو محسوس کیا جائے اور اس کو ہر وقت پیشِ نظر رکھا جائے کہ فلسطین کو یہودیوں کا قومی وطن بنانا یا وہاں یہودی ریاست کا قیام برطانیہ اور یہود دونوں کے حیطۂ امکان سے باہر ہے۔ اگر متذکرۂ بالا حقیقت کو تسلیم کرلیا جائے تو اس کو بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ فلسطین کے لئے زیادہ مناسب یہ ہے کہ وہاں عربی ریاست کا قیام عمل میں لایا جائے اور وہاں صرف اسی قدر یہودی رکھے جائیں جس سے عربوں کی اقتصادی اور سیاسی آزادی کو کسی قسم کا نقصان نہ پہونچے، سب قومیں امن و عافیت کی زندگی گزار سکیں اور سب کو یکساں حقوق حاصل ہوں۔

مسئلہ فلسطین کا یہ حل دیانتداری اور انصاف کا حل ہے اور یہ قابل عمل بھی ہے۔ اس سے فلسطین میں بسنے والے عربوں کے حقوق کی ایک طرف حفاظت ہوگی اور دوسری طرف اُن کے قومی جذبات بھی اس سے آسودہ ہوں گے۔ جہاں تک یہودیوں کا تعلق ہے اُسوقت فلسطین تمدنی اور روحانی اعتبار سے انکا قومی وطن

بھی بن سکیگا اور اُن کو فلسطین سے جو قدیم تعلق ہے اس کی بھی تجدید ہو سکے گی۔ اُس حالت میں فلسطین کے ساتھ برطانیہ کے تعلقات بھی مضبوط بنیادوں پر استوار ہوں گے۔

فلسطین کے مسئلہ کا اس سے زیادہ قابل اطمینان اور قابل عمل حل ملنا دشوار ہے۔ اگر کوئی دوسری راہ اختیار کی گئی تو اُس سے عربوں، انگریزوں اور یہودیوں کی لاتعداد جانیں تلف ہوں گی اور کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوگا یہودیوں کو یورپ کی حکومتوں میں جن مصائب کا شکار ہونا پڑ رہا ہے اُس سے اُن کو بچانے کے لئے فلسطین کے بجائے کوئی دوسرا ملک تلاش کرنا چاہئے کیونکہ فلسطین خود ایک چھوٹا ملک ہے۔ اسوقت جتنے یہودی وہاں پہونچ گئے ہیں انھیں کا بار اُٹھانے سے وہ قاصر ہے۔ سلطنت برطانیہ بجید وسیع سلطنت ہے، اُس کے ذرایع اور وسایل بھی اُسی اعتبار سے وسیع ہیں۔ اب جبکہ عربوں کی قسمت پر اُس نے یہودیوں کا حل تلاش کرنے کا بیڑا اُٹھایا تھا یہ اُس کا فرض ہے کہ اُن کو کہیں اور کسی نہ کسی طرح کھپا دے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جرمنی اور دوسری یورپی حکومتوں میں یہودیوں کے ساتھ جو انسانیت سوز مظالم کئے گئے ہیں وہ حد درجہ شرمناک ہیں اور اُن مظالم کے مصنفین کے دامن پر ابد تک رہنے والے بدنما داغ ہیں۔ مہذب حکومتوں کا فرض ہے کہ وہ اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کریں اور آج جو بار فلسطین کے کاندھوں پر ڈالا جا رہا ہے اُس کو وہ خود سنبھالیں۔

محمد عتیق صدیقی

چند سیاسی کتابیں

جدید دستور کا خاکہ :۔ از جناب زین العابدین احمد صاحب مترجمہ جناب شفیق الرحمن صاحب قدوائی بی۔ اے (جامعہ) یہ آل انڈیا کانگرس کمیٹی کا ایک پمفلٹ ہے جو موجودہ سیاسی گتھی کو سمجھنے کے لئے بہت ضروری ہے۔ قیمت ۲ر

دیہی جنس :۔ دیہی جنس اور دیہات کی نئی تعمیر پر ایسی کتاب جو دیہات سدھار کے کام کرنے والوں کے لئے مفید ہے۔ از جی۔ سی کمار پالتا صاحب۔ قیمت ۲ر

ہندوستان میں زراعت کا مسئلہ :۔ از زین العابدین مترجمہ مولوی شفیق الرحمن صاحب قدوائی بی اے (جامعہ) اس مختصر سے پمفلٹ میں کاشتکاروں کی کثرت اور زمین کی قلت کسانوں کے افلاس اور اُن کے قرضے وغیرہ سے بحث کی گئی ہے۔ قیمت ۴ر

منیجر نگار۔ لکھنؤ

ریڈیو کے آس پاس

شام کا وقت ہے برسات کا موسم، شہر کے چوراہے پر ہوٹل واقع ہے جہاں بارش سے پناہ لینے کے لئے ہر طرح کے بے فکرے۔ مراقی۔ مولوی۔ پنڈت۔ مزدور۔ طالب علم۔ پھیری والے۔ کسان۔ کارخانہ والے۔ جوان۔ بچے۔ بوڑھے۔ عورت مرد۔ ہوٹل کے برآمدہ میں ریڈیو سٹ کے آس پاس جمع ہیں۔ اندھیرا چھانے لگتا ہے۔ بادل گرجتا ہو ہے۔ مینھ برسنے لگتا ہے۔ ایک کوندا ہوا۔ زور کا ایک تڑاقا۔

مولوی صاحب:۔ ویسبح الرعد بحمدہ

ایک دیہاتی:۔ مولوی صاحب اِہی کا کرت ہو، برکھا ہوئے دیو۔

ایک نوجوان:۔ الٰہی یہ گھٹا دو دن تو برسے۔

دوسرا بے فکرا:۔ لپٹ جاتے ہیں وہ بجلی کے ڈر سے۔

ایک آواز:۔ کہو مولوی صاحب کیسی کہی؟

مولوی صاحب:۔ شامتی۔ دوزخ کا ایندھن۔

پنڈت جی:۔ شانتی، شانتی۔

بے فکرا:۔ دھن ہے مہاراج، کیا نام لیا ہے۔

پنڈت جی:۔ رام رام، کلجگ میں جو نہ ہو تھوڑا ہے۔ (بارش تیز ہو جاتی ہے)

ایک نحیف آواز:۔ (غمگین لہجہ میں)

یہ کہدو ابر و باراں سے اگر برسے تو یوں برسے

کہ جیسے خوں برستا ہے ہمارے دیدۂ تر سے

ایک بڑھیا:۔ ارے کل جیئے، تیری انھیں باتوں سے تو دنیا چوپٹ ہو رہی ہے۔

بڈھا شوہر:۔ (کھانستے ہوئے) تم کو دنیا کے چوپٹ ہونے کی پڑی ہے۔ یہاں کھانستے کھانستے ہیتھن نکلا جارہا ہے

بڑھیا:۔ ارے، تم کو کھانسنے سے تھوڑے ہی کوئی روکتا ہے۔ دُنیا چوپٹ ہو یا نہ ہو، تم تو کھانسے جاؤ۔

ایک تانگہ والا:۔ (منہ سے طبلہ بجاتے ہوئے) بڑے میاں گھر کا جھگڑا گھر میں چکانا۔ تانگہ ہانکتے تو یہ دن کا ہے کو دیکھنے پڑتے۔ چلو چھٹ کا میلہ دکھلاؤں۔

ایک کسان:۔ یہ کھادیو کا کریا۔

ایک موٹا مہاجن:۔ "بجار مندا ہوا تو آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہوگا"

طالب علم:۔ کسان سے اُلجھے تو اچھا نہ ہوگا۔

پولیس کا سپاہی:۔ کچھ برا بھی نہ ہوگا۔

اتنے میں کچھ بچوں کے رونے بلبلانے کی آواز آنے لگی۔ ماؤں نے انھیں پیٹنا اور شوہروں کو کوسنا شروع کیا جوانوں نے گانا اور ادھیڑوں نے سب کو سمجھانا شروع کیا۔ مونگ پھلی والے نے آواز لگائی، خستہ بادام لے لو۔ ہوٹل کا مالک گھومتا ہوا آیا۔ اور بالآخر یہ طے پایا کہ جب تک بارش نہ کھلے ہوٹل کے ریڈیو سٹ سے سب کی تواضع کی جائے

ریڈیو نے تھوڑی سی گھڑگھڑاہٹ کے بعد اعلان کیا:۔

"یہ دلی ہے، اس وقت سات بجے ہیں"

ایک آواز:۔ کیا بات کہی ہے گویا ہم کو معلوم نہیں۔ وقت البتہ بُرا ہے۔ گھر والی دانت پیس رہی ہوگی ہمسائی گرم مسالہ مانگنے اور چٹنی کھانے آئی ہوگی۔

دوسری آواز:۔ ارے بھائی سننے تو دو۔ گھر کا کھڑاگ کہاں چھیڑ دیا۔ وہ دیکھو کوئی صاحب بکھان دے رہے ہیں

ریڈیو:۔ ۔۔۔"یہ زمانہ بڑا نازک ہے۔ قدم پھونک پھونک کر رکھنا چاہیئے"

ایک آواز:۔ واہ بے واہ۔ بالکل اُلّو کی دم فاختہ ہی ہے ابھی کل ہی کی بات ہے۔ ایک صاحب قدم پھونک پھونک کر رکھ رہے تھے۔ سامنے سے موٹر آئی۔ ارارا دھڑام موٹر اوپر سے گزر گئی۔ مر گئے مردود نہ فاتحہ نہ درود۔

دوسری آواز:۔ بھائی زمانہ نازک ہے۔

تیسری آواز:۔ بڑا نازک جیسے صنفِ نازک۔

چوتھی آواز:۔ سبحان اللہ کیا بات پیدا کی ہے۔ ہاتھ لائیے گا۔ جناب کا تخلص۔

دور سے ایک آواز:۔ منحوس۔ (سب قہقہہ لگاتے ہیں)

ریڈیو:۔ اگر آج ہم اس بات کا عہد کرلیں کہ ہم کو اپنی حالت سدھارنی ہے تو دنیا کی کوئی طاقت نہیں جو ہم کو نیچا دکھا سکے۔

ایک آواز:۔ کہتے ہوئے شرم نہیں آتی۔ عہد کرلیں، عہد کرلیں۔ عہد کرتے کیا دیر لگتی ہے۔ سینکڑوں دفعہ عہد کئے۔ کیا ہوا۔ نمک حرام۔

دوسری آواز:۔ (بات کاٹ کر) ہا نجی، اور عہد نہ بھی کریں تو کون مائی کا لال ایسا ہو جو ہمکو نیچا دکھا سکے گا دگا کر) مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا۔ اور کیا! (مجمع سے کہیں سے ہنسنے کہیں۔ سے اُف کرنے اور کہیں سے جمائی لینے کی ملی جلی صدائیں)

(ریڈیو کے کھٹکے کی آواز آتی ہے۔ اعلان ہوتا ہے)

ریڈیو:۔ تمام دن اور نصف سے زیادہ رات تک بحث مباحثہ کے بعد بالآخر سبجکٹ کمیٹی نے یہ تجویز منظور کی:

"یہ مجلس تجویز کرتی ہے کہ وقت آگیا ہے کہ ہم کو ایسے ذرایع اور وسایل جلد سے جلد اختیار کرنے میں غیر معمولی تامل سے کام لینے کی کوئی معقول وجہ نظر نہیں آتی جن سے اُن امور کی وضاحت ہوتی ہو جو قوم اور ملک کی ایسی ترقیوں میں معین ہوتے ہیں جو زمانہ کے موجودہ مطالبات اور قوم کی گوناگوں ضروریات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ہم کو دوسری قوموں کے دوش بدوش رکھنے میں اُن تمام باتوں کا احاطہ کرلیں جو ہماری قومی روایات رواداری کو زندہ اور تابندہ رکھنے کی طرف رہبری کرنے میں اس طور پر معاون ہوتی ہوں کہ یہ ہمسایہ قوموں میں شک شبہ کے بجائے ایسا اعتماد پیدا کر سکیں۔ جو ان اغراض و مقاصد کے حصول میں معین ہوں۔ جن کے لئے ہمارے آبا و اجداد نے اپنا خون پسینہ ایک کر دینے کے لئے ایسے زریں کارنامے چھوڑے ہیں جو ہر گری ہوئی قوم کو اُبھارنے کے لئے ایسی متحرکات کی طرف لے جانے میں متعین ہونے کا امکان رکھتے ہوئے......"

سننے والوں کا سارا مجمع یک لخت گھبرا کر چیخ اُٹھتا ہے۔ کوئی رونے لگتا ہے۔ کوئی دانت پیس کر رہ جاتا ہے ایک طرف سے آواز آتی ہے۔ مارنا مارنا جانے نہ پائے۔ مدت کے بعد ہاتھ لگا ہے۔ کچھ عورتیں بیہوش ہو جاتی ہیں۔ کوئی مونگ پھلی والے کا خوانچہ لوٹ لیتا ہے کوئی پکارتا ہے۔ "فائر بریگیڈ" منیجر دوڑتا ہوا آتا ہے۔ بڑھوں کو اُٹھاتا ہے۔ پولیس کو آواز دیتا ہے۔ لفنگوں میں سے ایک آدھ کے چھانپڑ رسید کرتا ہے تھوڑی دیر میں امن ہو جاتا ہے

ایک آواز:۔ معاذ اللہ کی پناہ۔

دوسری آواز:۔ ارے بھائی لعنت بھیجو۔ تقریر سنتے سنتے تو کان پک گئے۔

ایک گرہ کٹ:۔ اس کا مزہ تو یار کمپنی باغ میں ہے۔

ایک بے فکرا:۔ کمپنی باغ کا کیا کہنا۔ "گانے لگتا ہے"۔ "سجنی کے لئے تن من دھن ہے"

ایک بچہ:۔ (رو کر) اماں پانی۔

ماں:۔ چپ رہ۔ پانی پانی، جب دیکھو پانی۔ میاں گلچھرّے اُڑائیں۔ میں دن رات ہلکان ہوں۔ آگ لگے ایسے پانی کو۔ پانی پانی۔ دن رات پانی۔

ریڈیو:۔ ہندوستان کی نجات اس وقت تک نہیں ہو سکتی......"

ایک آواز :- اماں کچھ اور لگاؤ، ہندوستان کی نجات کو ہم سے کیا جب گھروالی سے نجات نہیں تو پھر کیسی کوئی اور نجات - واہیات -

ایک عورت :- کلموا ـــ ریڈیو نے گھڑ گھڑا کر گت بدلی -

اندراں دروے کہ در دل بود، در اں یافتن

در حجاب زلفِ جاناں، نورِ ایماں یافتن

ایک قلندر :- ہُو - حق -

ایک شاعر :- کیا بات ظالم نے کہی ہے ـــ نور ایماں یافتن -

ایک صاحب :- ہوش میں آؤ - سوپ ایسے کان ہیں، لیکن سنائی نہیں دیتا - نور ایماں یافتن نہیں، بافتن ہے

شاعر :- ہوش میں آؤ - تم حسن کلام کیا جانو - زلف کے ساتھ بافتن ہی ٹھیک ہے - واہ وا -

معترض :- اور نور ایمان ؟

ایک آواز :- چُپ بے بے ایمان -

ایک بے فکرا :- ارے بھائی جانے دو - نور بات کا بھی تو کوئی حق ہے -

ایک آواز :- یار کچھ اور لگاؤ - یہ آداب تسلیمات قسم کا گانا کون سُنے - (ریڈیو میں گھڑ گھڑاہٹ)

اناؤنسر :- اب پٹیالے والے عاشق علی خاں صاحب گوسارنگ کا خیال تِرت لے میں گائیں گے - آ - آ - آ -

(گلا صاف کرنے کا جھٹکا) آ - آ - آ (گلا صاف کرنے کا جھٹکا) بھو - بھو - بھو

ایک بزرگ :- سبحان اللہ اپنے فن کا امام ہے - اب یہ لوگ کہاں اور یہ فن کہاں -

ریڈیو :- بھو - بھو - بھو - آ - آ - آ - - - - - (مجمع میں غلغشار اور چیخ و پکار)

مینجر دوڑتا ہوا آیا اور پکارا " ارے ریڈیو کس نے بگاڑا "

ایک صاحب :- جناب گھوڑ سارن ہے - (ریڈیو کی چابی بڑھ گئی)

اناؤنسر نے اعلان کیا :- " اب ٹنیچ جان ایک غزل سنائیں گی "

ایک آواز :- جزاک اللہ کیا تاریخی نام ہے -

دوسری آواز :- کیا ہندو مسلم اتحاد کا پہلو نکالا ہے -

تیسری آواز :- جی اور کیا مسجد بھی ہے باجا بھی ہے

ترے عشق میں زندگانی لٹادی

عجب کھیل کھیلا جوانی لٹادی

ایک آواز :۔ کیا پُر تاثیر شعر ہے

دوسری آواز :۔ کیوں نہیں ۔ اور بھئی جوانی تو لٹا دینے کی چیز ہی ہے (گاکر) آؤ پیا سوتی لاگے سیجر!

ایک بڈھا :۔ سرد آہ کھینچ کر، رہے نام اللہ کا ۔ اب عناصر میں اعتدال کہاں ۔

ایک لوفر :۔ رام رام جپنا۔ پرایا مال تکنا ۔

اخبار بیچنے والا لڑکا :۔ چین میں چیاؤں پیاؤں ۔ چیمبرلین کی چھتری ۔

پھیری والا :۔ ہر مال چھ پیسے کا۔ ہر مال چھ پیسے کا۔

منیجر کی کرخت دار آواز :۔ ارے نکالو اس اخبار بیچنے والے لونڈے اور بساطی کو۔ ہوٹل میں لڑائی کا مول تول ٹھیک نہیں

(ریڈیو کی گھنڈی گھمائی گئی۔ آواز آتی ہے) "آپ جتن خانم اُمور خانہ داری پر تقریر فرمائیں گی"

"گھر کی بیویوں کا فرض ہے کہ وہ اپنے بچوں"

ایک بے فکرا :۔ ارے فتو اُستاد، یہ عورتیں ریڈیو پر گھر گرہستی کا کھڑاگ پھیلاتی ہیں۔ برسات میں تو کچھ چٹ پٹی سلونی بات

فتو اُستاد :۔ ابے لمڈے کبھی تو کام کی بات سُن لیا کر گھر والی میں کیا کیڑے پڑے ہیں۔ یہی لچھن ہیں تو بیٹا بھیک مانگوگے اور بھونی بھانگ نہ ملے گی ۔

بے فکرا :۔ اُستاد تم تو سٹھیا گئے ہو۔ اپن نے کیا کہا جو لگے اول فول بکنے ۔

فتو اُستاد :۔ چپ بے نہیں دیتا ہوں ایک لپوٹا بتیسی پیٹ میں گھس جائے گی ۔

(بہت سی آوازیں) جانے دو اُستاد جانے دو ۔ لونڈا ہے کیا جانے بھلے مانسوں میں بندھا ہو تو جانے۔ (بے فکرے سے مخاطب ہوکر) اِدھر آ بے اِدھر آ۔ اُستاد کے سامنے کان پکڑ کر اُٹھ بیٹھ)

بے فکرے نے کان پکڑ کر اُٹھنا بیٹھنا شروع کیا۔

ایک آواز :۔ ایک دو ۔ تین ۔

دوسری آواز :۔ تاک دھنا دھندن ۔ تاک دھنا دھندن ۔

بچے ہنستے اور تالیاں بجاتے ہیں ۔

ریڈیو سے آرکسٹرا بجتا ہے۔ جو اسی اٹھک بیٹھک کے وزن پر ہے ۔

(پروفیسر) رشید احمد صدیقی ایم۔ اے

مرزا ابوالحسن آصف خاں

(مسلسل)

آصف خاں اور نور جہاں میں کشیدگی

شہریار نور جہاں کا داماد تھا اور نور جہاں کے ہاتھ میں سلطنت کی باگ تھی وہ شہریار کے لئے میدان صاف کر رہی تھی اور چاہتی تھی کہ شاہجہاں کی جگہ وہی شہنشاہ ہند ہو اسی لئے شاہجہاں اور جہانگیر کے درمیان اس نے اختلاف پیدا کرایا اور معمولی معمولی باتوں پر اس قضیہ کو بڑھاتی رہی، اگرچہ آصف خاں نہایت سمجھدار دور اندیش اور محتاط تھا اور وہ ان سب سازشوں کو دیکھ رہا تھا لیکن بمقتضائے احتیاط خاموش تھا تاہم شاہجہاں کو اس کی بیٹی منسوب تھی اس لئے مخالفین کو قدرتی طور پر اس کے خلاف سازشیں کرنے کا موقعہ میسر تھا چنانچہ ان کو اس ناپاک مقصد میں آسانی سے کامیابی حاصل ہوگئی اور آصف خاں شاہجہاں کی جانب داری میں متہم ہو گیا!۔ نور جہاں بھی اُس سے منحرف ہوگئی یہ وہ زمانہ تھا جب آصف خاں کی ماں اور باپ اعتمادالدولہ کا تھوڑے تھوڑے فاصلہ سے انتقال ہو چکا تھا، اس لئے نور جہاں کے دل میں بھائی کی طرف سے جو غبار پیدا ہو گیا تھا اس کا رفع کرنے والا بھی اب کوئی نہ تھا۔ حقیقت میں یہ نور جہاں کی پہلی سیاسی غلطی تھی کہ اس نے ایسے دانشمند اور تجربہ کار بھائی کو جو حکومت کا رکن رکین تھا اور ممکن تھا کہ اس گتھی کو آسانی سے سلجھا دیتا، اپنا مخالف بنا لیا۔ نور جہاں کے دل میں آصف کانٹے کی طرح کھٹک رہا تھا اور وہ اُسے اپنے مقاصد میں مخل سمجھ رہی تھی ساتھ ہی وہ شاہجہاں کو باغی قرار دیکر اس کی تنبیہ بھی کرنا چاہتی تھی بعض مشیروں نے یہ رائے دی کہ آصف خاں اور مہابت خاں کے تعلقات اچھے نہیں ہیں اگر مہابت خاں کو جو بہادر اور صاحب فوج ہے شاہزادہ پرویز کے ساتھ شاہجہاں کے مقابلہ پر بھیجدیا جائے تو وہ ضرور اس مہم کو درست طریقہ پر انجام دے گا، نور جہاں نے چند فرمان مہابت خاں کی طلب میں کابل بھیجے، مہابت خاں تجربہ کار اور جہاندیدہ جرنیل تھا وہ بیگم کی ان کارروائیوں کو پسند نہ کرتا تھا بلکہ خود نور جہاں کی طرف سے متوہم تھا، اسی لئے اس مہم پر جانا نہ چاہتا تھا تاہم اس نے لکھا کہ شاہجہاں کو باعثِ فتنہ خیال کیا جاتا ہے اور اس کا استیصال مدنظر ہے تو پہلے اس فساد کی جڑ پر کلہاڑی چلائی

جائے یعنی آصف خاں کو حضوری سے الگ کر دیا جائے میں ایسی شرط پر دربار میں آنے کی جرأت کر سکتا ہوں یہ درخواست فوراً منظور ہوگئی اور آصف خاں کو خزانہ لانے کے حیلہ سے آگرہ بھیجدیا گیا، یہ وقت بہت نازک تھا آصف خاں آگرے سے تمام روپیہ، اشرفیاں اور سونا چاندی جو اکبر کے آغاز سلطنت سے وہاں رکھی ہوئی تھی لے کر لاہور جانا چاہتا تھا اور صورت یہ تھی کہ شاہجہاں کو خزانہ کے منتقل ہونے کی اطلاعات مل چکی تھیں، وہ خزانہ پر قبضہ کرنے کے خیال سے مانڈو سے آگرہ کی طرف چل پڑا تھا بلکہ فتحپور پہونچ چکا تھا اگر آصف خاں اسوقت خزانہ لے کر روانہ ہوتا تو یقیناً شاہجہاں سے اس کا مقابلہ ہوجاتا اسوقت یا تو وہ داماد پر تلوار اُٹھاتا یا خزانہ اسکے حوالے کر دیتا اور یہ دونوں صورتیں اچھی نہ تھیں لہٰذا اس نے بڑی دانائی اور دور اندیشی سے کام لیا کہ جہانگیر کی خدمتمیں عرضی بھیجدی کہ شاہجہاں خزانہ پر قبضہ کرنے ادہر آرہا ہے اسوقت حلقہ سے خزانہ کا نکالنا مناسب نہیں ہے، میں خزانہ کو خدا کے سپرد کر کے حاضرِ خدمت ہورہا ہوں۔

اب شاہی دربار میں شاہجہاں کے استیصال کی زبردست تیاریاں ہورہی تھیں کابل سے مہابت خاں اور شاہزادہ پرویز کو اس کے مقابلہ کے لئے بلایا گیا تھا بادشاہ دمہ کے عارضہ میں مبتلا تھا شاہجہاں کے نام احکام جاری ہورہے تھے کہ دکن واپس جاؤ وہ درخواست کرتا تھا کہ پہلے حضور میں آکر مجھے اپنے جرائم معاف کرانے دیجئے پھر کہیں جاؤں گا مفسدوں نے شاہجہاں کی اس ضد کو جو سراسر خلوص و اطاعت پر مبنی تھی بغاوت اور سرکشی پر محمول کیا نورجہاں نے اس خیال کو تقویت دیکر جہانگیر کو بیٹے کی طرف سے دل برداشتہ کر دیا نوبت یہاں تک پہونچی کہ باپ بیٹے کی فوجوں میں لڑائی ہوئی اگرچہ جنگ کی ترتیب مہابت خاں کی رائے سے ہوئی تھی مگر آصف خاں بھی بادشاہ کی طرف سے تلوار میان سے نکالے داماد کے مقابلہ میں میدان میں آیا اس نے شاہجہاں کے لشکر کو شکست دیکر پیچھے ڈھکیل دیا صرف یہی نہیں کہ باپ بیٹے کی جنگ میں آصف خاں نے بادشاہ کا ساتھ دیا بلکہ اس کا دوسرا داماد اور شاہجہاں کا ہم زلف صفی خاں بھی بادشاہ کی خیر خواہی میں جان لڑا رہا تھا جس کی بدولت اُسے ہفت صدی سے سہ ہزاری کیا گیا اور سیف خاں کا خطاب دیا گیا لیکن آصف خاں کی یہ تمام خدمات اور جاں نثاریاں محض اس بنا پر کہ وہ شاہجہاں کا خسر ہے کوئی وقعت نہ رکھتی تھیں اور نورجہاں کا مقصد ہی یہ تھا کہ آصف خاں دربار سے دور رہے چنانچہ اٹھارھویں سن جلوس ۱۰۳۲ھ میں آصف خاں کو بنگالہ و اڑیسہ کی صوبہ داری پر نامزد کر کے خلعت خاصہ اور شمشیر مرصع عنایت کی گئی اس کے لڑکے ابوطالب کو دو ہزاری منصب دیکر باپ کے ساتھ کیا گیا۔[1] لیکن یہ وقت وہ تھا جب مہابت خاں اور شاہزادہ پرویز نے شاہجہاں کو دکن کی سرزمین سے نکال دیا تھا اور وہ بنگالہ کا رخ کر چکا تھا ایسی حالت میں آصف خاں کا بنگالہ

---

[1] تزک جہانگیری صفحہ ۳۶۹

جاناً نورجہاں کے سیاسی مقاصد کے بالکل ہی خلاف تھا چنانچہ آصف خاں کو اس بہانہ سے کہ پھوپی کو بھتیجے کی جدائی بہت شاق ہے واپس بلا لیا۔[۱] آخر شاہجہاں نے جو نورجہاں کا اصل حریف تھا شکست کھاکر باپ سے استدعائے معافی کی جہانگیر نے بیٹے کو معاف کیا اور یہ قضیہ اس طرح طے ہوگیا مہابت خاں کو اس سے پہلے شاہزادہ پرویز سے جدا کرکے بنگالہ بھیجدیا گیا تھا اور اس کی جگہ خان جہاں مقرر ہو چکا تھا، یہ کارروائی بھی نورجہاں کے ایما اور اشارے سے ہوئی تھی پرویز کے پاس غالباً ایسے زبردست جرنیل کا رکھنا خلافِ مصلحت تھا چنانچہ آصف خاں اور خدائی خاں کو پرویز کے پاس بھیجکر مہابت خاں کو بنگالہ روانہ کرا دیا گیا۔

آصف خاں اور مہابت خاں

مہابت خاں نے بنگالہ پہونچکر وہاں کی رعایا اور امراء پر بہت مظالم کئے بادشاہی دیوانوں اور متصدیوں کو بھی سرزمینِ بنگال سے نکال دیا رعایا نے جہانگیر سے فریاد کی، اب حالات اور تھے اگرچہ نورجہاں جس کے اشارے سے مہابت خاں نے شاہجہاں کو مصائب میں مبتلا کیا تھا دربار پر چھائی ہوئی تھی لیکن جہانگیر باوجود اس کے کہ نورجہاں سے بے انتہا محبت کرتا تھا فریادیوں کی درخواستوں پر بہت توجہ کرتا تھا، جب اس قسم کی درخواستیں پیش ہوئیں تو آصف خاں نے اسکے مظالم کو خوب بڑھا چڑھا کر بادشاہ کے سامنے بیان کیا اُسے انتقام کے لئے اچھا موقعہ ہاتھ آگیا تھا مہابت خاں کی شکایات میں ایک شکایت یہ بھی تھی کہ اس نے محلاتِ شاہی پر بھی تصرف کیا ہے، چنانچہ ایک افسر ان شکایات کی تحقیقات کے لئے بنگال بھیجا گیا اُسے حکم تھا کہ تحقیقات کے بعد مہابت خاں کو خزانہ اور ہاتھیوں سمیت دربار میں لے آئے۔

یہ سب کچھ آصف خاں کی ہدایت سے ہو رہا تھا مہابت خاں نے ہاتھی اور خزانہ بھیجدیا مگر خود نہ آیا اپنے آنے کے لئے مہلت کا طالب ہوا، آصف خاں کی طرف سے وہ مطمئن نہ تھا اور جانتا تھا کہ آصف خاں اس کی عزت و آبرو کے درپے ہے اس نے پانچ ہزار بہادر راجپوت ملازم رکھے اور دو مہینے کے بعد فوجی ساز و سامان درست کرکے آگیا۔

اس درمیان میں آصف خاں کے اشارے سے بنگال کے ہزاروں فریادی آگئے جو مہابت خاں کی زیادتیوں پر بادشاہ کو متوجہ کرتے تھے، لیکن مہابت خاں پوری تیاری کے بعد آیا تھا اُس کا زیر کرنا آسان نہ تھا۔ بادشاہ کو مہابت خاں کے آنے کی اطلاع ہوئی تو حکم دیا کہ جب تک شاہی مطالبات ادا نہ ہوں اور فریادیوں کی تکالیف رفع نہ ہوں، انصاف یہ ہے کہ مہابت خاں کو دربار میں آنے نہ دیا جائے، نورجہاں نے سفارش بھی کی لیکن بادشاہ عدالت کے مقابلہ میں بہت سخت تھا اس نے اپنے حکم کو تبدیل نہ کیا۔

---

[۱] مآثر الامراء جلد اول صفحہ ۱۵۳

شاہی ضابطہ یہ تھا کہ کوئی امیر اور منصبدار اپنی اولاد کی شادی بغیر بادشاہ کی اجازت کے نہ کر سکتا تھا مہابت خاں نے اپنی لڑکی کا عقد ایک نقشبندی بزرگ زادہ سے اذنِ شاہی کے بغیر ہی کر دیا آصف خاں نے اس امر کو اسکے غرور اور رعونت پر محمول کر کے بادشاہ کے گوش گزار کیا اور مہابت خاں کے داماد برخوردار کو گرفتار کر کے قید کر دیا، جہیز کا سامان بھی ضبط ہو گیا، اس موقعہ پر آصف خاں اگرچہ اپنی تمام سازشوں میں کامیاب ہو رہا تھا لیکن اسنے مہابت خاں کو پہچاننے میں سخت غلطی سے کام لیا اور اس کے معاملہ کو معمولی معاملہ سمجھ لیا مہابت خاں ایک زبردست، تجربہ کار، اور دور اندیش سپہ سالار تھا وہ آسانی سے دشمن کے قابو میں آنے والا نہ تھا۔

اسوقت جہانگیر کابل جا رہا تھا اور دریائے بہٹ (اٹک) کے کنارے خیمے لگے ہوئے تھے دریا پر پل باندھ دیا گیا تھا تاکہ فوج کے گزرنے میں کوئی دشواری حائل نہ ہو بادشاہ کے کوچ سے ایک روز قبل حسب دستور تمام امراء نے دریا کو عبور کیا آصف خاں، فدائی خاں، خواجہ ابوالحسن اور جملہ امیر دریا پار چلے گئے، جہانگیر اور نورجہاں چند افسروں کے ساتھ ادھر رہ گئے۔

آصف خاں نے ایسی مجرمانہ غفلت سے کام لیا کہ مہابت خاں کا کچھ خیال ہی نہ کیا اور دریا کو عبور کر کے عیش و عشرت میں مشغول ہو گیا۔ مہابت خاں نے اس موقعہ کو غنیمت جان کر سات آٹھ ہزار سوار ہمراہ لئے اور رات کے آخری حصہ میں حکم دیا کہ شور و غل مچائے بغیر بہت خاموشی سے دو ہزار سوار پل پہ چلے جائیں۔ اِدھر سے کوئی اُدھر جانا چاہئے تو اُسے نہ روکیں البتہ اُدھر کا آدمی اِدھر نہ آنے پائے اگر زیادہ شورش ہو تو فوراً پُل میں آگ لگا دی جائے، پھر چار پانچ ہزار سوار ساتھ لیکر آپ خیمۂ شاہی کی طرف گیا۔ یہ انتظام پہلے ہی کیا جا چکا تھا کہ دریا پار سے حملہ ہو تو پل میں آگ لگا دی جائے تاکہ امداد کے ذرائع بالکل منقطع ہو جائیں، جسوقت مہابت خاں نے جہانگیر کے خیمہ کو گھیرا ہے۔ بادشاہ آرام کر رہا تھا خواجہ سراؤں نے بیدار کر کے ہوشیار کیا کچھ لوگوں نے مہابت خاں کو خوابگاہ کے قریب آنے سے روکا مگر مہابت خاں کا سیلاب رکنے والا نہ تھا، بادشاہ تلوار لیکر اُٹھا مہابت خاں اس وقت قریب آچکا تھا، بادشاہ نے غضبناک ہو کر پوچھا مہابت نمک حرام یہ آنا کس قسم کا ہے؟

مہابت خاں ڈر گیا اور کورنش کے مقررہ آداب ادا کئے مخالفوں کی شکایت کی اور ملاقات کا اشتیاق ظاہر کیا اپنے ہمراہیوں کو الگ کھڑا کر دیا آپ قدمبوس ہوا اور تین دفعہ بادشاہ کے گرد پھرا، پھر عرض کیا مجھے کامل یقین تھا کہ آصف خاں ذلت و خواری کے ساتھ مجھے ہلاک کرا دیگا اس لئے مجبوراً یہاں چلا آیا اگر مجھے قابل سیاست خیال فرمایا جائے تو یہیں قتل کرا دیا جائے مگر دشمنوں کے حوالہ نہ کیا جائے، بادشاہ نے خشمگین ہو کر تلوار کے قبضہ پر ہاتھ رکھکر چاہا کہ اس کا کام تمام کر دے مگر میر منصور بدخشی نے ترکی زبان میں عرض کیا کہ غصہ کا

وقت نہیں ہے صرف تسلی کر دیجئے، مہابت خاں کے آدمی ہر طرف چھائے ہوئے تھے مگر وہ خوشامدانہ گفتگو کر رہا تھا، مہابت خاں نے بادشاہ سے سوار ہونے کو کہا بادشاہ نے کپڑے بدلنے کی غرض سے نورجہاں کے پاس جانا چاہا مگر اس نے روک دیا اور اسی حالت میں اپنا گھوڑا سواری کے لئے پیش کیا مگر غیرتِ شاہی نے اس کے گھوڑے پر سوار ہونے کی اجازت نہ دی، پھر بادشاہ اسپ خاصہ پر سوار ہوا دولت خانہ سے کچھ دور نکلنے پر مہابت خاں حوضہ دار ہاتھی لے کر آیا اور عرض کیا کہ شورش کا اندیشہ ہے بہتر یہ ہے کہ ہاتھی پر بیٹھکر شکارگاہ کی طرف تشریف لے چلئے بادشاہ ہاتھی پر بیٹھ گیا۔ مہابت خاں کا ایک معتمد راجپوت ہاتھی کے آگے اور دو حوضہ کے پیچھے پہلے سے بیٹھے ہوئے تھے اسی دوران میں مقرب خاں بھی مہابت خاں کی اجازت سے بادشاہ کے قریب جا بیٹھا مقرب خاں کی پیشانی پر اس طوفانِ بے تمیزی میں ایک زخم بھی آگیا تھا جس سے خون بہ رہا تھا، خدمت پرست خواص بھی جس کے ہاتھ میں شراب خاصہ کا پیالہ تھا قریب پہونچ گیا اور راجپوتوں نے برچھے کی نوک سے بہت روکا مگر وہ بھی حوضہ کا کنارہ پکڑ کے بیٹھ گیا۔ نورجہاں کو معلوم ہوا تو وہ بہت گھبرائی اور بہ تبدیل لباس جواہر خاں خواجہ سرا کے ساتھ پل سے گزر کر دریا کے اس پار اپنے بھائی آصف خاں کے پاس چلی گئی، آصف خاں نے یہ ماجرا سنا تو اس کے حواس پراگندہ ہو گئے۔

مہابت خاں ہاتھی کو اپنے خیمہ کی طرف لے گیا اور بڑے احترام سے بادشاہ کو اپنے خیمہ میں اُتارا اب مہابت خاں کو نورجہاں کا خیال آیا فوراً ہی معلوم ہوا کہ وہ آصف خاں کے پاس چلی گئی مہابت خاں کو یہ سنکر اپنی غفلت پر بہت افسوس ہوا پھر مہابت خاں بادشاہ کو شہریار کے خیمہ میں لے گیا۔

اگرچہ مہابت خاں بہت ہی آزمودہ کار فوجی افسر تھا لیکن واقعہ یہ ہے کہ کرنے کو تو اس نے یہ کام کر لیا تھا مگر اس کے حواس بجا اور عقل ٹھکانے نہ تھی کچھ بن نہ پڑتا تھا اس کے آدمی خیمے کو گھیرے کھڑے رہتے تھے اور وہ خود دست بستہ بادشاہ کے سامنے حاضر رہتا تھا لیکن بادشاہ پر کسی قسم کا خوف یا رعب نہ تھا وہ بڑے ضبط و استقلال کا اظہار کر رہا تھا مہابت خاں مقررہ وقت پر بادشاہ کو تخت پر بٹھاتا اور شراب بھی پلاتا تھا غرض نہایت فرمانبرداری کا اظہار کرتا تھا آصف خاں نے تمام امراء کے مشورہ سے طے کیا کہ صبح کو لڑ بھڑ کر بادشاہ کو مہابت خاں کی قید سے چھڑا لینا چاہئے، جہانگیر نے مہابت خاں کے کہنے سے نورجہاں اور آصف خاں کو اس ارادے سے باز رہنے کی تاکید کی، اور مقرب خاں کے ذریعہ سے کہلا بھیجا کہ میرے مقابلہ میں تم لوگوں کا جنگ کرنا زیبا نہیں، میں یہاں بہت آرام سے ہوں۔

مہابت خاں نے آصف خاں کو لکھ دیا کہ تم بڑے عقلمند بنتے تھے محض تمہاری وجہ سے بادشاہ کا یہ حال ہوا بہتر یہ ہے کہ وزارت مجھ پر چھوڑ دو میں بادشاہ کی خدمت کروں گا تم پنجاب اپنی جاگیر پر چلے جاؤ، آصف خاں نے

اس خیال سے کہ یہ سارے نامہ و پیام مہابت خاں کی رائے سے ہو رہے ہیں بادشاہ کے حکم کی تعمیل نہیں کی اور لڑنے مرنے پر تیار ہو کر پل پر آیا مگر راجپوتوں نے فوراً آگ لگا دی بہادروں نے دریا میں گھوڑے ڈال دئے بہت سے ڈوب گئے کچھ خستہ حال کنارے پر پہونچے۔ خدائی خاں نے سات آدمیوں کے ساتھ مہابت خاں کی فوج سے جنگ کی مگر پھر دریا کو تیر کر چلا گیا۔

آخر آصف خاں نے سب امیروں کو ہمراہ لے کر نور جہاں کو ہاتھی پر سوار کیا اور ایک پایاب گھاٹ سے دریا کو عبور کیا لیکن جس گھاٹ سے فوج اُتر رہی تھی وہاں دو تین غار تھے اس لئے فوج میں برہمی پیدا ہو گئی۔ آصف خاں بھی نور جہاں کی عماری سے جدا ہو گیا، آصف خاں خواجہ ابوالحسن اور نور جہاں ابھی دریا سے نکلے نہ تھے کہ مہابت خاں کی فوج نے ان پر حملہ کر دیا اس حملہ سے فوج بے ترتیب ہو گئی کچھ لوگ دریا سے اُتر آئے کچھ کچھ دریا ہی میں رہے کچھ لوٹ گئے۔ نور جہاں کا ہاتھی تیر کر نکل آیا اور وہ بادشاہ کے پاس چلی گئی آصف خاں کا بیٹا ابو طالب اور چند دوسرے نامور سردار بھی آ گئے خدائی خاں لڑتا بھڑتا راجپوتوں کو سامنے سے ہٹا کر خیمہ شاہی تک پہونچ گیا خدائی خاں پر اسوقت سخت یورش تھی ہر طرف سے حملے ہو رہے تھے، اس کے تیر خیمہ میں بادشاہ کے قریب جاکر گر رہے تھے مخلص خاں سامنے آ گیا۔ مہابت خاں نے کہا اس کم بخت کی جرأت ملاحظہ فرمایئے کہ کہ اپنے آقائے ولی نعمت پر تیر چلا رہا ہے بادشاہ نے بہت پیام بھیجے کہ اس کوشش سے باز آؤ مگر اس نے ایک نہ سُنی، مہابت خاں کی فوج برابر اس کے مقابلہ میں جمی ہوئی تھی مگر اسکی امداد کو کوئی نہ آتا تھا بلکہ اُسے لڑائی سے روکا جا رہا تھا مجبور ہو کر وہ پھر دریا کو عبور کر کے واپس ہو گیا۔

آصف خاں کی گرفتاری

آصف خاں نے دیکھا کہ کوئی کام نہیں بنتا اور یہ سب کچھ میرا ہی کیا دھرا ہے مہابت خاں انتقام لئے بغیر نہ چھوڑے گا اس لئے وہ اٹک چلا گیا جہاں اس کی جاگیر تھی بہت سے امراء مہابت خاں سے معافی کا وعدہ لے کر اس کے پاس چلے گئے، آصف خاں بھاگ کر اپنے ڈھائی سو ہمراہیوں کے ساتھ اٹک کے قلعہ میں پناہ گزیں ہوا، مہابت خاں نے راجپوتوں کی فوج اس کے تعاقب میں بھیجی پھر نور جہاں کو بادشاہ کے پاس چھوڑ کر اس نے اپنی آدھی فوج کو بادشاہ کی حفاظت پر مامور کیا اور نصف فوج ساتھ لے کر وہ آصف خاں کے پیچھے گیا۔ آصف خاں کے ساتھی مہابت خاں سے مل گئے اور مہابت خاں، آصف خاں اور اس کے بیٹے ابو طالب کو قید کر کے بڑی بے آبروئی سے بادشاہ کے پاس لایا۔

بادشاہ مہابت خاں کے خوش کرنے کو اکثر نور جہاں اور آصف خاں کی برائی کیا کرتا تھا اور کہا کرتا تھا کہ نور جہاں نے بہت فساد مچا رکھا ہے اور میری محبت ظاہری سے فائدہ اُٹھا کر شاہجہاں کو میرا مخالف بنا دیا۔

اب میں ان دونوں بھائی بہنوں کا منھ دیکھنا نہیں چاہتا یہ ساری گفتگو نور جہاں کے مشورے سے ہوا کرتی تھی۔

آصف خاں کی رہائی

نور جہاں کی حسن تدبیر سے جب بادشاہ مہابت خاں کی قید سے رہا ہوا اور مہابت خاں بھاگ گیا تو بادشاہ نے افضل خاں کو اس کے پاس بھیجکر پیام دیا کہ آصف خاں اور اس کے لڑکے ابوطالب اور دانیال کے بیٹوں کو ہمارے پاس بھیجدو تو تمھارا قصور معاف کر دیا جائے گا۔ مہابت خاں نے دانیال کے بیٹوں کو افضل خاں کے حوالہ کر دیا آصف خاں کی نسبت یہ عذر کیا کہ نور جہاں سے مجھے اطمینان نہیں ہے جب تک میں لاہور سے نہ گزر جاؤں آصف خاں کو نہیں چھوڑ سکتا۔ بادشاہ نے پھر افضل خاں کو بھیجا اور اپنے اور نور جہاں کی طرف سے قسموں کے ساتھ عہد و پیمان کیا کہ میرے یا بیگم کے ہاتھ سے تمھیں کوئی نقصان نہ پہونچے گا مہابت خاں پہلے ٹالتا رہا پھر تین چار منزل کے بعد آصف خاں کو بلا کر عہد لیا اور خلعت، گھوڑا وغیرہ دیکر بادشاہ کے پاس بھیجدیا، مگر ابوطالب کو اپنے پاس رکھا جب اطمینان ہو گیا کہ فوج اس کے تعاقب میں مقرر نہیں ہوئی تو ابوطالب کو بھی عزت کے ساتھ رخصت کر دیا۔[1]

وزارت

آصف خاں کی رہائی کے بعد ۱۰۳۶ھ میں کابل سے واپس ہوتے وقت لاہور پہونچکر اسکو پنجاب کی صوبہ داری اور عہدۂ وزارت پر مامور کیا گیا اسکے بعد ہفت ہزاری عہدہ (ہفت ہزار سوار) کیا گیا۔[2]

جہانگیر کا انتقال اور آصف خاں کی سرگرمیاں

۲۸ صفر ۱۰۳۷ھ کو جہانگیر نے کشمیر سے لاہور آتے ہوئے انتقال کیا اسی حادثہ سے قبل شہریار جس کو نور جہاں مسندِ خلافت پر بٹھانا چاہتی تھی، داء الثعلب میں مبتلا ہو گیا اور مونچھوں، ابرو، اور پلکوں کے بال بالکل بکھر گئے، صاحب مآثر الامراء کا بیان ہے کہ آتشک کی وجہ سے یہ عارضہ پیدا ہوا تھا بہرحال وہ کچھ تو شرم کی وجہ سے اور کچھ علاج کرانے کی غرض سے لاہور چلا آیا تھا۔ جہانگیر کا پوتا یعنی خسرو کا بیٹا داور بخش قید میں تھا۔

نور جہاں نے اپنے بھائی آصف خاں کو جہانگیر کی تجہیز و تکفین اور معاملات ملکی میں مشورہ کرنے کی غرض سے اپنے پاس طلب کیا لیکن آصف خاں نہ گیا اور داور بخش کو قید سے نکال کر بادشاہ بنا دیا اسی کے ساتھ اسنے ایک ہندو کو جس کا نام بنارسی تھا اور نہایت تیز رو تھا اپنی انگوٹھی دیکر شاہجہاں کے پاس بھیجا اور بہت جلد آنے کا زبانی پیام دیا۔[3]

---

[1] مآثر الامراء جلد اول صفحہ ۱۵۳ و تزک جہانگیری جلد دوم ــــــ [2] مآثر الامراء صفحہ ۱۵۳ و تزک جہانگیری جلد ۲ صفحہ ۲۲۳۔
[3] مآثر الامراء ۱۵۴ و تزک جہانگیری جلد ۲۔

نورجہاں کی نظربندی

نورجہاں شہریار کی سلطنت کے لئے تدبیریں کر رہی تھی اور چاہتی تھی کہ آصف خاں اور اعظم خاں میر بخشی کو اپنے یہاں بلا کر قید کردے آصف خاں کی دوسری بہن صادق خاں کے عقد میں تھی وہ بھی نورجہاں کا شریک کار تھا، نورجہاں نے چند بار آصف خاں کو بلایا مگر اس نے عذر کر دیا آصف خاں آگے آگے لاہور کی طرف آرہا تھا نورجہاں پیچھے پیچھے جہانگیر کی نعش کے ساتھ آرہی تھی دوسرے دن بھنبر میں قیام ہوا اور جہانگیر کی تجہیز و تکفین کر کے نعش کو آگے روانہ کر دیا گیا تاکہ لاہور میں باغ نورجہاں میں اس کو دفن کر دیا جائے ہر شخص سمجھتا تھا کہ آصف خاں یہ جو کچھ کر رہا ہے سب شاہجہاں کے لئے ہے داور بخش کو زبردستی قربانی کا بکرا بنایا گیا ہے اس لئے تمام امراء اس کی فرمانبرداری کر رہے تھے لیکن نورجہاں اپنی ریشہ دوانیوں میں مصروف تھی اس لئے آصف خاں نے نورجہاں اور اپنی دوسری بہن اہلیہ صادق خاں کے گھر پر نگرانی کے لئے پہرے بٹھا دئے اور آدمیوں کی آمدورفت بند کر دی بلکہ نورجہاں کو شاہی محل سے لاکر اپنے گھر میں رکھ لیا، چنانچہ مآثرالامراء میں ہے

"بالجملہ گویند بیگم را از محل بادشاہی بر آوردہ در منزل خود جا داد"[1]

شہریار سے مقابلہ

شہریار نے لاہور میں جہانگیر کے مرنے کی خبر سنی تو شاہی خزانوں اور کارخانوں پر متصرف ہو کر بادشاہی کا دعوےٰ کیا اور لشکر جمع کرنے کے لئے اس نے خزانوں کا منہ کھول دیا چنانچہ ایک لاکھ روپئے صرف کر کے ایک ہفتہ میں کافی لشکر جمع کر لیا اور مرزا بایسنقر خاں ولد دانیال کو جو جہانگیر کے مرنے پر بھاگ کر شہریار کے پاس آگیا تھا۔ اس کا سپہ سالار بنایا، بایسنقر خاں لشکر لیکر راوی کے پار آیا اور شہریار دو تین ہزار سواروں کے ساتھ شہر لاہور کے باہر لڑائی کے نتیجہ کا منتظر رہا۔

اس طرف سے آصف خاں بڑی شان و شوکت سے داور بخش کو ہاتھی پر بٹھا کر چلا ایک ہاتھی پر وہ خود سوار ہو کر قلب لشکر میں قائم ہوا لاہور سے تین کوس کے فاصلہ پر مقابلہ ہوا پہلے ہی حملہ میں بایسنقر خاں کو شکست ہوئی اور اس کی فوج منتشر ہو گئی۔ شہریار شکست کی خبر پاکر قلعہ میں چلا گیا۔

شہریار کی گرفتاری

اگلے دن آصف خاں نے قلعہ کے قریب ہی خیمے نصب کئے شہریار کے اکثر ساتھی آصف خاں سے آملے اور رات کے وقت کچھ لوگ ان کی امداد سے قلعہ میں داخل ہو گئے اور داور بخش کو تخت پر بٹھا دیا شہریار جہانگیر کی حرم سرا کے ایک کونہ میں چھپا ہوا تھا فیروز خاں خواجہ سرا نے اس کو پکڑ کر الہ وردی خاں کے سپرد کیا اس نے اس کی کمر کا پٹکہ کھول کر دونوں ہاتھ

---

[1] مآثرالامراء صفحہ ۱۵۵

باندھے اور داور بخش کے سامنے حاضر کر دیا وہاں اُسے پہلے قید کیا گیا پھر دو دن کے بعد آنکھوں میں سلائی پھیر کر اندھا کر دیا گیا۔[۱] پھر چند دن کے بعد طہمورث اور ہوشنگ پسران دانیال کو بھی گرفتار کر کے قید کر دیا گیا۔

آصف خاں نے فتح کی مسرت افزا نوید شاہجہاں کی خدمت میں بھیجی شاہجہاں کو ساہوکاروں کے خطوط سے یہ حالات معلوم ہو گئے تھے اس نے خدمت پرست خاں، رضا بہادر کو احمد آباد سے آصف خاں کے پاس لاہور بھیجا، اور اپنے ہاتھ سے یہ خط لکھا کہ مصلحت وقت کا تقاضہ ہے کہ داور بخش اور دوسرے شاہزادوں کو قتل کر دیا جائے چنانچہ آصف خاں نے ۲۲ جمادی الاول ۱۰۳۷ھ کو اتوار کے دن داور بخش کو قید کر کے شاہجہاں کے نام کا خطبہ پڑھا اور ۲۶ جمادی الاول کو گرشاسپ اور اس کے بھائی، نیز شہریار، طہمورث اور ہوشنگ پسران سلطان دانیال کو قتل کر دیا۔[۲]

عہد شاہجہانی

شاہجہاں آگرہ میں اورنگ نشین حکومت ہوا تو آصف خاں لاہور میں تھا، شاہجہاں نے اپنے ہاتھ سے اس کو فرمان لکھا جس میں بہت سے القاب و خطابات کے بعد اپنی تخت نشینی کا وقت تحریر کیا یہ بھی لکھا کہ آپ کے کہنے سے ہم نے اپنا لقب "شہاب الدین" مقرر کیا ہے، ساتھ ہی شوق ملاقات کا اظہار بھی کیا، اپنا وہ خلعت بھی آصف خاں کے لئے بھیجا جو جلوس کے دن پہنا تھا، اور آٹھ ہزاری منصب بندر لاہوری۔

آصف خاں دربار شاہجہانی میں

۲ رجب ۱۰۳۷ھ میں آصف خاں دارا شکوہ، محمد شجاع اور اورنگ زیب کو ساتھ لے کر لاہور سے آگرہ آیا اور بادشاہ کے حکم سے سکندرہ میں مقیم ہوا، ممتاز محل بیٹوں سے ملنے گئی آصف خاں نے اس کا استقبال کیا، آصف خاں کو مہر اوزک جو ممتاز محل کے پاس رہتی تھی عنایت ہوئی اور وزارت کا منصب، یمین الدولہ کا خطاب ملا، گفتگو کے وقت بادشاہ لفظ عمو سے مخاطب کرتا تھا، آٹھ ہزاری منصب آٹھ ہزار سوار دو اسپہ سہ اسپہ کا منصب ملا، جو آج تک کسی امیر کو نہ ملا تھا اس کے بعد جب آصف خاں نے اپنی فوج کا معائنہ کرایا تو نو ہزاری کر دیا گیا اور نہایت آباد جاگیر جس سے پچاس لاکھ روپیہ وصول ہوتا تھا مرحمت کی گئی۔[۳]

آصف خاں کی سپہ سالاری

۱۰۳۹ھ میں نظام الملک اور خان جہاں کے استیصال کی غرض سے فوج تعینات ہوئی جس کے ایک حصہ کی سرداری شائستہ خاں ولد آصف خاں کے سپرد تھی، اس فوج کا سپہ سالار اعظم خاں تھا۔ سپہ سالاری کا عہدہ نہایت اہم تھا فوج میں بڑے بڑے امیر اور سردار ہوتے تھے ان پر اثر قایم رکھنا آسان نہ تھا اور بغیر اثر و اقتدار کے فوجی مہمات کبھی کامیاب نہیں ہو سکتیں

---

[۱] مآثر الامراء صفحہ ۱۵۵ و توزک جہانگیری جلد دوم صفحہ ۳۴۶ و اقبال نامہ صفحہ ۲۹۹۔ [۲] مآثر الامراء صفحہ ۱۵۶ و توزک جہانگیری جلد دوم صفحہ ۳۴۹ و اقبال نامہ صفحہ ۳۰۴۔ [۳] مآثر الامراء، ص ۱۵۶

معرکہ جنگ و جدال میں فوج اور امراء پر اقتدار قایم رکھنا ہی سب سے بڑی کامیابی ہے اعظم خاں سپہ سالار تو ہوگیا مگر وہ سپاہ کو قابو میں نہ رکھ سکا امراء اس کی مساوات کا دم بھرنے لگے جس سے تنظیم میں فرق پڑ گیا، پھر اعظم خاں سے کسی کو یہ امید بھی نہ تھی کہ وہ انعام یا منصب عطا کر سکتا ہے بادشاہ نے یہ کیفیت دیکھ کر برہان پور میں یمین الدولہ آصف خاں کو سپہ سالاری کے عہدہ پر مامور کیا۔

عادل شاہ کی گوشمالی ۱۰۴۱ھ میں آصف خاں برہان پور سے محمد عادل شاہ بیجاپوری کی گوشمالی کے لئے بڑے تزک و احتشام سے زبردست فوج لے کر روانہ ہوا حوالی بیجاپور میں اس نے خیمے لگائے اور مار دھاڑ شروع کی لیکن محمد امین، مصطفٰے خاں اور خیریت خاں چالیس لاکھ روپے کی پیشکش لیکر قلعہ سے نکلے اور صلح کرلی، لیکن خواص خاں جو اسوقت سلطنت بیجاپور کا کرتا دھرتا تھا وہ جانتا تھا کہ ملک ویران ہے اور لشکر شاہی میں غلہ، گھاس، لکڑی اور دوسرے سامان رسد کی قلت ہے ایسی حالت میں آصف خاں زیادہ نہیں ٹھہر سکتا اسلئے وہ بدستور مدافعت میں معروف رہا۔ یہ واقعہ ہے کہ لشکر میں نہ صرف غلہ ہی کا قحط تھا بلکہ تمام ضروری چیزیں بھی نایاب تھیں حتیٰ کہ ایک جوڑ جوتے کی قیمت چالیس روپیہ تھی اور ایک گھوڑے کی نعلبندی میں دس روپئے صرف ہوتے تھے پھر یہ ملک بھی بالکل ویران تھا مجبوراً یمین الدولہ بیجاپور سے محاصرہ اُٹھا کر رائے باغ اور مرچ کی طرف قتل و غارتگری کرتا ہوا راہی ہوا۔ جو بہت آباد ملک تھا پھر برسات کے قریب کی وجہ سے واپس آگیا۔

آصف خاں سے شاہجہاں کی کشیدگی اس مہم کا ایک ناگوار واقعہ یہ ہے کہ ایک دن خلوت میں اعظم خاں نے آصف خاں سے کہا کہ بادشاہ کو اب میری اور آپ کی ضرورت نہیں ہے آصف خاں نے کہا میرے اور تمہارے بغیر سلطنت کا انتظام بھی نہیں ہوسکتا۔ بادشاہ کو بھی کسی طرح اس گفتگو کا علم ہوگیا اور اس کو سخت ناگواری ہوئی فرمایا کہ آصف خاں کے مجھ پر بہت زیادہ احسانات ہیں تاہم بہتر یہی ہے کہ آئندہ امور سلطنت میں اُسے کوئی تکلیف نہ دی جائے۔

خان خانانی کا خطاب اگرچہ اس واقعہ کے بعد دونوں میں خلوص نہ تھا لیکن بظاہر آصف خان کی عزت و توقیر میں کوئی کمی نہ کی گئی تھی بلکہ مہابت خاں کے مرجانے پر ۸ جلوس میں خان خانانی اور سپہ سالاری کا لفظ اس کے خطابات میں بڑھا دیا گیا۔

انتقال[1] ۱۷ شعبان ۱۰۵۱ھ کو آصف خاں نے مرض استسقا یعنی جلندر میں انتقال کیا۔

"زہے افسوس آصف خاں" تاریخ وفات ہے۔

بادشاہ علالت کے دوران میں چند بار اسکے گھر گیا، بادشاہ کو اس کے مرنے کا سخت صدمہ ہوا، آصف خاں کے بڑے بیٹے شائستہ خاں کو جو ان دنوں صوبہ بہار کا ناظم تھا ماتمی خلعت اور فرمان تسلی بھیجا، آصف خاں کے دوسرے

[1] ماثر الامرا جلد اول صفحہ ۱۵۸

بیٹوں اور بیٹیوں نیز بیگم صاحبہ (اپنی بیٹی) بادشاہ بیگم کی دلجوئی کی سب کو بغیر سلے ہوئے نوکروں کا خلعت دیا آصف خاں کے متعلقین میں جو شخص منصب کے لایق تھا اُسے منصب دیا گیا اور جو تنخواہ کے قابل تھا اُس کی تنخواہ مقرر ہوئی۔[1]

شاہجہاں جب آصف خاں کی عیادت کو گیا تو اس نے علاوہ لاہور والی حویلی کے جسکی تعمیر پر بیس لاکھ روپئے صرف ہوئے تھے اور علاوہ ان مکانات کے جو دہلی آگرہ اور کشمیر میں واقع ہے دو کروڑ پچاس لاکھ روپئے کے جواہرات، چاندی، سونا اور اجناس بادشاہ کے سامنے پیش کر کے التجا کی کہ ان سب کو خزانۂ عامرہ میں داخل کرا لیا جائے[2]۔ کیونکہ مال و دولت جمع کرنے کا مقصد سوا اسکے اور کوئی نہیں ہے کہ اولاد کے آرام و راحت میں کام آئے لیکن میرے اولاد اور اعزہ آپ کے فیضِ التفات سے خوش و خرم ہیں، ایسی صورت میں یہ مال و متاع خزانہ ہی میں داخل ہونا چاہیے۔

بعض کتابوں میں ان چیزوں کی یہ تفصیل لکھی ہے:۔ جواہر:۔ ۳۰ لاکھ روپئے کے ———

اشرفی:۔ ۳ لاکھ یعنی بیالیس لاکھ روپئے کی ——— نقد:۔ ایک کروڑ پچیس لاکھ روپئے ———

سونے چاندی کے ظروف:۔ تیس لاکھ روپئے کے ——— دوسری اجناس:۔ تیس لاکھ روپئے کی ———

بادشاہ نے اس میں سے بیس لاکھ روپئے اسکے تینوں بیٹوں اور پانچ بیٹیوں کو تقسیم کر دئے، لاہور کا محل دارا شکوہ کو عنایت کیا گیا جو آصف خاں کا نواسہ تھا۔ باقی اشیاء ضبط کر لی گئیں[3]۔

مقبرہ

آصف خاں کو شاہجہاں کے حکم سے جہانگیر کے روضہ کے غربی جانب دریائے راوی کے کنارے دفن کیا گیا قبر پر عالیشان گنبد تعمیر ہوا اور باغیچہ بھی نصب کیا گیا۔[3]

منشی کالے خاں صاحب نے "تاریخ عمارات شاہان مغلیہ" کے صفحہ ۱۱۹ پر مقبرۂ اعتماد الدولہ کے حالات میں لکھا ہے:۔

"ایک گوشہ میں ابوالحسن یمین الدولہ آصف خاں کی قبر ہے جن کا منصب شاہجہاں بادشاہ کا عطا کیا ہوا نو ہزاری تھا وزیر اعظم بھی تھے اور شاہجہاں بادشاہ کے خسر بھی تھے ۱۰۶۲ھ (۱۶۵۲ء) میں مرض استسقا سے انتقال کیا"

معلوم نہیں منشی صاحب موصوف کی اس تاریخی کاوش و جستجو کا ماخذ کیا ہے اور اس میں کہاں تک اصلیت ہے سن وفات تو منشی صاحب نے غلط لکھا ہے، آصف خاں ۱۰۵۱ھ میں فوت ہوا ہے، ۱۰۶۲ھ میں وہ زندہ و سلامت تھا البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ بعد کو کسی نے اُسے لاہور سے اُٹھا کر آگرہ میں باپ کی آغوش میں لا رکھا ہو مگر اُسی کے ساتھ یہ خصوصیت کیوں برتی گئی نورجہاں بھی تو اعتماد الدولہ کی بیٹی تھی وہ لاہور ہی میں محو خواب ہے — ممکن ہے جہانگیر کی رعایت سے نورجہاں کو وہاں رہنے دیا گیا ہو، بہر حال میرے مطالعہ میں جسقدر تاریخی کتابیں ترتیب مضمون کے وقت رہیں ان میں سے کسی سے یہ ثابت نہیں کہ ابوالحسن لاہور سے آگرہ آ گئے تھے — واللہ اعلم بالصواب

کوثر چاندپوری

---

[1] مآثر الامراء صفحہ ۱۵۸ — [2] مآثر الامراء صفحہ ۱۵۸ و سیر المتاخرین جلد اول صفحہ ۲۷۰ — [3] مآثر الامراء صفحہ ۱۵۸ و سیر المتاخرین جلد اول صفحہ ۲۷۰ —

سیفو

ایک انگریز مصنف لکھتا ہے :-

"اگر دُنیا کے تمام شعرا سے سوال کیا جائے کہ وہ کون سا بیش بہا خراج ہے جو زمانے نے انسانی فطنت (جینیس) کی ظفرمندی کے ذریعے سے حاصل کیا، تو وہ بلا تامل اور متفقہ طور پر جواب دیں گے کہ سیفو کے گمشدہ اشعار !"

شیکسپیر کو مستثنیٰ کر دینے کے بعد مردوں میں ہومر برترین شاعر ہے، مگر سیفو بغیر استثنا عورتوں میں برترین شاعرہ ہے عجیب بات ہے کہ ہومر اور سیفو نہ صرف کمالِ فن کے اعتبار سے شعرائے عالم کے سرخیل ہیں بلکہ قدامت کے لحاظ سے بھی ہیں اور اس پہلو سے اُن کے کمالِ فن کا کما حقہ اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔

سیفو کی مقبولیت کو دنیا کے کسی ملک اور کسی زمانے کا کوئی شاعر نہیں پہونچا، کیونکہ دنیا میں کسی شاعر کی تصویر اُسکے ملک کے سکوں پر ٹھپا نہیں ہوئی۔ یہ اعزاز اور خصوصیت صرف سیفو کا مقدر تھا۔

دوسرا ثبوت سیفو کی عظمت اور مقبولیت کا یہ ہے کہ تین سو سال سے سیفو اور اُس کے کلام کے متعلق جستجو جاری ہے اور برابر مجتہدین فن دادِ تحقیق و تلاش دے رہے ہیں۔ سب سے زیادہ مکمل کتاب ۱۹۰۸ء میں مسٹر وہارٹن (Wharton) نے لکھی جسے سیفو کے باب میں "لفظ آخر" کا درجہ دیا گیا۔ مگر بیس سال پورے نہ ہونے پائے تھے کہ مسٹر ہینز (Heimms) نے ایک جامع تر تالیف پیش کر دی۔

سیفو کی قدر و منزلت کا اندازہ کرنے کے لئے متعدد یورپی شعرا نے سیفو کے ایک ایک پارے کو لیکر پوری نظمیں لکھی ہیں جو دنیا کی تاریخ ادب میں نئی اور نرالی ادبی کاوش ہے۔ کسی شاعر کے خیال کو اُس کے ایک لفظ یا ٹکڑے سے اُس شاعر کی طرح تخئیل کرنا، اُسی کے ماحول میں احساس کرنا، اور اُس کی تخئیل و احساس کو اپنا لینا درحقیقت اہرام مصری کو آنِ واحد میں کھڑا کر دینے کے برابر مشکل کام ہے! گویا سیفو کے خوابوں کی تعبیر نہیں بیان کی گئی بلکہ اُسکے خواب خود دیکھے گئے! قطع نظر اس سے کہ ان شاعروں کو کس حد تک کامیابی ہوئی یہ مجرد واقعہ کہ سیفو کے ٹکڑے پر سیفو ہی کی زبان و انداز میں نظمیں کہی جائیں اور اُس کا رنگ اور سیرت پیدا کی جائے ایک کارِ عظیم و عجیب ہے!

چھٹی صدی قبل مسیح کے نصف اول کا تاریخی واقعہ ہے کہ ایک جشن دعوت میں یونان کا مشہور مقنن سولن بھی شریک تھا۔ سولن کے بھتیجے نے اُس صحبت میں سیفو کے بعض شعر پڑھے۔ سولن ان اشعار سے اس قدر متاثر ہوا

کہ اُس نے وہ اشعار اُسی وقت یاد کئے اور پھر ایک سوال کے جواب میں کہنے لگا کہ زندگی کا کوئی اعتبار نہیں اور میں ان اشعار کو یاد کئے بغیر مرنا نہیں چاہتا۔

دوسرا تاریخی واقعہ اس کے دو سال بعد کا ہے۔ ایکراٹیس (Apicratin) کے ڈرامہ کا ایک کردار فخر کرتا ہے کہ اُسے سیفو کا گیت یاد ہے! اس واقعے سے یہ اندازہ ہوجاتا ہے کہ اُسوقت کی سوسائٹی میں سیفو کے اشعار کا کیا درجہ تھا سسرو کے زمانے میں بھی سیفو کے گیت گائے جانا ثابت ہے اور پھر تیسری صدی عیسوی تک کی شہادت ملتی ہے کہ سیفو کے نغمے ذوق وانہماک کے ساتھ گائے جاتے اور انسانوں کو وجد میں لاتے تھے۔

اس کے بعد یقینی شہادت تو نہیں مگر ساتویں صدی عیسوی میں بھی سیفو کے نغمات کی مقبولیت کے اشارے ملتے ہیں کہ وہ بالکل محو نہیں ہوگئے تھے۔ کیونکہ اُس صدی کے نحویوں نے سیفو کے حوالے دئے ہیں۔

ایک اور خاص بات سیفو کی عظمت کے ضمن میں یہ ہے کہ ساتویں صدی کے بعد سے سیفو کا نام اور کلام محو ہوکر پندرھویں صدی کے آخر تک کہیں اُس کے متعلق اشارہ نہیں ملتا۔ لیکن سولویں صدی میں اُس کی مقبولیت اور عظمت پھر اپنا مستحق مرتبہ پالیتی ہے!۔

ہومر کی طرح کسی شاعر کا کلام ہمیشہ مقبول و معزز رہ سکتا ہے، غالب کی طرح مردود ہوکر مقبول بھی ہوسکتا ہے اور نظیر کی طرح متصل مقبول بھی رہ سکتا ہے اور مردود بھی، لیکن یہ خصوصیت تنہا سیفو کو حاصل ہے کہ ایک ہزار سال سے زیادہ مدت تک انتہا درجے پر مقبول رہنے کے بعد انسانی حافظے سے یکسر محو ہوجائے اور آٹھ صدیوں تک بالکل گمنام رہ کر پھر وہی عظمت و قبولیت حاصل کرلے۔

سیفو کی اخلاقی حالت اور اُس کے کردار کے متعلق دو باتوں نے سخت اُلجھن اور مغالطہ پیدا کردیا۔ ایک تو اس کا اپنی شاگردوں سے غیر معمولی اظہار محبت کرنا جو اُس کے موجود اشعار کا بھی غالب موضوع ہے اور خاص کر اُس کی وہ نظم جو سیفو نے اپنی شاگرد اتھیس کو مخاطب کرکے لکھی ہے اور دوسری بات وہ خط ہے جس کو غیر مستند طور پر اووڈ کی تصنیف کہا جاتا ہے، سیفو سے منسوب کیا جاتا ہے کہ اُس نے اپنے محبوب فاؤن (Faon) کو لکھا تھا۔

فاؤن کے افسانے کا مسالا اصل میں بعض نحویوں کی تاویلوں کا نتیجہ ہے۔ سیفو کچھ دن مقام ارسیس میں بھی رہی تھی، اور وہاں اُس کی ہم نام ایک ڈیرہ دار (Courtezan) بھی رہتی تھی۔ چنانچہ جب سیفو رسوا کی جانے لگی تو ان نحویوں میں سے کسی نے اِن داستانوں کو اُس ڈیرہ دار سیفو سے منسوب کردیا۔ یہ خیال شاید اس لئے پیدا ہوا کہ جس باکمال شاعرہ کے نام اور حوالے سے لوگ اپنے فن صرف و نحو کو معزز بناتے ہیں اُسے رسوائی سے بری ہونا چاہئے۔

مگر بعد کے یونانی طربیہ نگاروں نے جو تاریخ ادب میں اٹیک کامیڈین (Attic Comedian) کہے گئے ان افسانوں کو لیکر متعدد ڈرامے لکھ ڈالے۔ اور پھر ناموں کی تمیز مٹ کر اُن داستانوں کو اُس ذات سے منسوب سمجھا گیا جو نہایت

مشہور تھی۔

قدیم زمانے کے جن لوگوں نے سیفو کے نام کو ذلت و رسوائی سے پاک رکھنے کی کوشش کی اُن میں سب سے پہلے فلسفی میکسی مس کا نام آتا ہے۔ وہ خود بھی اعلیٰ کردار اور شریفانہ اخلاق کا انسان تھا اور اُس کے خیال میں سیفو کا اپنی شاگرد لڑکیوں سے غیر معمولی محبت کرنا کوئی انہونی بات نہ تھی اور اُس کی یہ محبت اُس محبت سے مماثل تھی جو حکیم سقراط کو اپنے شاگردوں سے تھی یعنی میکسی مس، سقراط اور سیفو کی محبت کو معصوم سمجھتا تھا۔ اُس نے یہ نتیجہ نکالا تھا کہ ان دونوں کی رسوائی کی ذمہ دار اُن کی ہمدردانہ فطرتیں تھیں، اور کثرتِ احباب کے ساتھ اُن کی حسن پرست طبیعتوں کو غلط طور پر سمجھنے کا نتیجہ! وہ خود سیفو کے کلام سے اُس کے اخلاق و کردار کی بلندی ثابت کرتا اور بتاتا ہے کہ سیفو کا ایک بھائی جو اسکندریہ میں تھا، ایک ڈیرہ دار رنڈی (جس کا تاریخی لقب روڈوپس "Rohdopis" تھا) کی محبت میں خراب و خوار ہوا تو سیفو نے ایک نظم میں اُسے سخت تنبیہ کی۔

اُس کے ہمعصر اور مستند شاعر الکائیس نے سیفو کو ان لفظوں میں مخاطب کیا ہے:۔

"بنفشے کے پھول بُننے والی، مسکراہٹ سے مٹھاس برسانے والی، پاکیزہ سیفو! میں تجھ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں مگر حجاب کرتا ہوں!"

سیفو نے اس نظم کا جواب نظم سے دیا:۔

"تیری خواہش اگر کوئی عمدہ بات کہنے کی ہوتی تو تیری آنکھوں کو شرم نہ چھو سکتی اور تو جو کچھ کہنا چاہتا تھا برملا کہہ سکتا!"

سیفو کی محبت کے اِن افسانوں پر سب سے پہلے ایک جرمن نقاد ویلیکر (Welcker) نے درایت کی نظر ڈالی اور اپنے استدلال سے سیفو کو تمام انسانی اور نسوانی خوبیوں کا مجسمہ قرار دیا۔ مسٹر میور (Mure) نے اس سے اختلاف کیا اور بحث کی گرماگرمی اتنی بڑھی کہ دونوں حد سے تجاوز کر گئے۔

اُس وقت کے ادنیٰ طربیہ نگار شعرا، سیفو کو ایک آوارہ، عشرت پرست اور لیسباس کے اوباش حلقے میں اپنی شاعری اور پست اخلاقی کے سبب مقبول ہونے کے رنگ میں پیش کر کے ان بحثوں کے لئے موضوع پیدا کر گئے اور ان بحثوں کا نتیجہ یہ ضرور نکلا کہ سیفو مسلم طور پر اگر اپنے زمانے کے معیار اخلاق سے بالاتر نہ تھی تو گری ہوئی بھی نہ تھی۔ اس گفتگو کے آخر میں انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے مقالہ نگار کا یہ قول نقل کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ "اگر مثلاً اُس خاکے کو سامنے رکھا جائے جو ارسٹوفینز نے سقراط کا بنا کر پیش کیا تھا تو ہم حق بجانب ہوں گے کہ سیفو کے متعلق اس ذیل میں جو کچھ کہا گیا ہے اُس تمام کو یکسر بفوات سمجھیں"

مذکورۂ بالا شہادتوں سے سیفو کے کردار کو اُس گندگی سے پاک کیا گیا ہے جو یونانی طربیہ نگاروں نے اُسکے

سر تھوپی تھی اور جس کی تفصیلات اور دلائل اوپر بیان کئے جا چکے ہیں اور اس واقعے سے بھی انکار کیا گیا ہے کہ اس قصے کی اگر کوئی اصلیت ہوتی تو اُسوقت کے یونانی ادب میں اُس کا ذکر آتا۔ یہ دلیل بھی دی گئی ہے کہ چونکہ بعض قدیم بیانات میں ایڈونس کو فاؤن کے نام سے یاد کیا گیا ہے اس لئے یہ فسانہ وینس و اڈونس کے قصے کی یاد تازہ کرنے کے لئے وجود میں آیا۔

لیکن اس تمام تحقیق و تلاش میں جو انسانی فکر و جستجو کا تحیر خیز کارنامہ ہے، ایک بات یکسر نظر انداز کر دی گئی ہے اور وہ سیفو کا انسان اور عورت ہونا ہے۔ یہ کہا گیا ہے کہ سیفو اُس قوم کے افراد میں تھی جو حسن کے مظاہر کی دیوانی تھی، لیکن یہ کسی نے تسلیم نہیں کیا کہ سیفو کو کسی سے محبت ہوئی۔ وہ محبت جو دو گوشت پوست کے انسانوں میں ہو سکتی ہے۔ یہ بھی نہیں بتایا جا سکا کہ سیفو کو اپنے شوہر سے محبت تھی۔ فاؤن کے افسانوں کو قیاسات سے غلط ثابت کیا گیا ہے کوئی تاریخی ثبوت فراہم نہیں ہو سکا۔ لیکن اگر دوسرے پہلو سے بھی قیاسات کی شہادت مانی جائے تو خود ایک انگریز نقاد کو تسلیم ہے کہ یہ افسانہ، سیفو کی شاعرانہ شخصیت پر چست لباس کی طرح زیب دیتا ہے۔

ایک ایسی شاعرہ جس کا ثانی پچیس صدی کا ارتقا بھی پیدا نہ کر سکے، محبت کئے بغیر اتنی زبردست مغنیہ محبت بن جائے! قیاس قبول نہیں کرتا۔ شاعر اگر حقیقی ہے تو اس کے لئے محبت ناگزیر ہے! پھر سیفو کی تو فطرت شعر کے سانچے میں ڈھلی تھی! اور اُس کے ساتھ نفس انسانی کی رمز شناسی، جذبات کی سچی قدر دانی، راحت و آرام کی زندگی، یہ سب لوازم مہیا ہوں اور محبت کو دخل نہ ملے! عقل نہیں مانتی ایسی سیفو کا کسی کی محبت میں دیوانہ ہو جانا، اُس کا محبت سے محروم رہنا بے شک حیرت انگیز ہو سکتا ہے! اس کے برخلاف محبت کرنا اور ناراس ہونا جو سچی محبت کا انعام ہے اور پھر اُس محبت پر قربان ہو جانا، سیفو کی ہستی کو ایک شعر نغز بنا دیتا ہے ---- محبت کا ایک شاہکار پیش کر دیتا ہے۔

سیفو کی ذات سے اس واقعے کی نسبت نے اُس کی شخصیت میں ایک طلسمی کشش پیدا کر دی ہے۔ جن محققین نے اس فسانے کو بے اصل ثابت کرنے کے لئے کاوشیں کیں، کوئی شک نہیں کہ تحقیق کی دنیا میں قابل صد تحسین کام کیا ہے، لیکن شعر و شباب کی دنیا میں تو اسے شکست طلسم سے تعبیر کیا جائے گا اور اس سے انکار نہ کیا جا سکے گا کہ اس سراسر تخیلی قصے نے بیش بہا ادب پارے پیدا کرا دئے اور اعلیٰ قسم کی نظم و نثر وجود میں آگئی۔

حقیقت کچھ بھی ہو لیکن سیفو کا یہ "نامۂ محبت" اس قابل ہے کہ باقی رہے۔

سیفو کا محبت نامہ

سچ بتانا، جب تم نے یہ خط پڑھا تو کیا میری صورت بھی تمہارے ذہن میں آ گئی تھی؟ اور کیا آخر میں نام پڑھنے سے پہلے تم جان گئے تھے کہ خط کس کا ہے؟

تم کہو گے کہ میرا محبوب مشغلہ تو گیت بُننا ہے، میں نے یہ نوحہ کیوں لکھا؟ ہاں، اگر میری محبت مغموم ہے۔

یہ نوحہ ایک مغموم نغمہ ہی تو ہے! حالانکہ میرے بربط سے آنسوؤں کا گیت نہیں نکلتا! مگر میں اس طرح پھُنک رہی ہوں جیسے مکئی کا بھرا پُرا اور تیار کھیت تیز پورو امیں لو دیتا دکھائی دے!

فاؤن، ایٹنا کے کشت زاروں میں پھر رہا ہے اور میرے دل میں ایٹنا کی آگ روشن ہے!

میرے بربط کے تار ملے ہوئے ہیں لیکن مجھے کسی گیت کا الہام نہیں ہو رہا ہے، وہ دماغ جو گیتوں میں بات کرتا ہو خیالات سے خالی ہے!

لیسباس کی دوشیزہ لڑکیاں، ماپڑھا کی کنواریاں، اور میتھمنا کا کنارا اب مجھے نہیں بھاتے۔ انکٹوریا اور سائڈرو کی میری نظر میں کوئی وقعت نہیں رہ گئی ہے اور نہ اُنھیں میں کوئی دلکشی، اور میری وہ محبت جس میں سیکڑوں شریک تھے اور جو میری رسوائی بھی بن گئی اب صرف تمھارا حصہ ہے —— تنہا تمھارا! تم کتنے خود غرض ہو!

تم خوبصورت ہو ایسے کہ جوانی تم سے چہلیں کر رہی ہے، اور اے حسن پُر لذت! تمھاری خوبصورتی اور جوانی میری نظروں کا جال بن گئی ہے! تم اگر گز اور بیلا اُٹھالو تو فیبس[۱] (Phoebus) بن جاؤ گے، اور جو ماتھے پر ایک سینگ لگالو تو باخس[۲] (Bacchus) نظر آؤ گے! فیبس نے دوشیزہ کریٹ کی آرزو کی اور باخس نے ڈیفنی کی۔ لیکن گیت گانا نہ تو کریٹ والی جانتی تھی اور نہ ڈیفنی! ایسے شیریں نغمے یہ مدھر گیت تو میوزوں نے بس سیفو کو سکھائے ہیں جن سے دُنیا گونج رہی ہے! الکائیس بہتر سُر لگالیتا ہے لیکن اُس کی شہرت برتر نہیں، اگرچہ میرا اور اُس کا وطن ایک ہے، ساز ایک ہے!

بے مہر فطرت نے مجھے زیبائی نہیں بخشی۔ لیکن اُس کے بدلے میں روشن و رسا ذہن دیدیا ہے! میرا جسم و قد مختصر ہے، لیکن میرا نام زمینوں اور سمندروں سے بڑا ہے۔ یہی میری قدر و قیمت کا پیمانہ ہے! میرا روپ رنگ سانولا ہے، پر کالی رنگت والی اینڈرومیڈا[۳] (Andromeda) پرسیوس[۴] (Perseus) کی نگاہوں میں گوری تھی! رنگ دار کبوتروں میں سفید کبوتریاں اکثر دیکھی جاتی ہیں اور سیاہ کچھوے کی مادہ سبزہ رنگ ہوتی ہے! لیکن تمھیں اگر اپنا ہی سا جوڑا چاہیئے تو یاد رکھو کبھی نہ پاؤ گے — ایسی کوئی نہ ملے گی! ہاں، اگر تم مجھے پڑھو گے تو میرا حسن و جمال بڑھ جائے گا! اور تم کہتے بھی تو تھے کہ تو بس باتیں کرتی رہ!

مجھے یاد ہے کہ جب میں گاتی —— کہ محبت کرنے والے ہی گانا جانتے ہیں —— گاتی ہوتی، تو تم میرا منہ چوم لیتے تم میرے گانے کی تعریف کرتے، میری ہر چیز اور ہر بات سے خوش ہوتے — خاص کر جب محبت تسکین پاتی! میرا چنچل پن تمھیں بہت بھاتا، میری چلبلاہٹ تمھاری نظر میں بہت پیاری ہوتی! اوہ! جب ہماری محبت اپنا حق

[۱] اپالو سورج کا دیوتا۔ [۲] شراب کا دیوتا۔ [۳] ایک حسین دوشیزہ جو ستارہ بنا دی گئی۔ [۴] ایک یونانی ہیرو جس نے اینڈرومیڈا کو رہائی دلائی

پالیتی تو خواب ناک کاہلی میں خستہ و خموش پڑے رہنا! کس قدر مزہ دار گھڑیاں ہوتی تھیں!

مگر یہ نئی فتوحات — سسلی کی لڑکیاں ہو اور تم! اب لیسباس کہاں؟ مگر میں بھی سسلی ہی کی ہوں! اے میگریا کی ماؤ اور لڑکیو! اس فراری کو پلٹا دو! اس کی چکنی چپڑی باتوں میں نہ آنا۔ میں بھی انھیں لفظوں کو سن چکی ہوں!

آئرکیس (Eryx) والی دیوی! میں تو تیری زبان ہوں — میری مدد فرما! میرے باپ کی موت پر جب اُس کی مٹی میرے آنسوؤں سے بھیگی تو میں نے چھے ہی بہاریں تو دیکھی تھیں! میرے بھائی نے ایک بیسوا کے پیچھے اپنی دولت اور عزت کھودی اور اب اُسے بری طرح پھر حاصل بھی کرنا چاہتا ہے جس طرح کھوئی تھی، اُس نے اپنی بہن سے کھری کھری سنیں۔ یہ تو میرے ضمیر اور صاف گوئی کا تقاضا تھا۔ اور یہ مصیبتیں نہ ہوتیں تب بھی میری بچی کی فکریں کیا کم تھیں

لیکن اب سب سے بڑھ کر میرے غموں کا باعث تم ہو! میری ناؤ ہلکی اور مخالف ہوائیں تیز ہیں! اب میرے گیسو پریشان رہتے ہیں اور اُنگلیاں نگینوں سے خالی! میرا لباس گھٹیا ہے اور میرے سر پر نہ تو سنہری دمک دکھاتی دیتی ہے اور نہ اُس میں عربستان کی شبنم مہکتی ہے۔ میں اچھے لباس اور جواہر سے سجوں تو کس کے خوش کرنے کو؟ میرے جذبات کا دیوتا تو سمندر پار جا براجا ہے!

میرا دل اب اتنا گداز ہو گیا ہے کہ ایک کانٹا بھی مجھے ہلاک کر دینے کو کافی ہے۔ میرے جینے کی اب کوئی وجہ اگر ہو سکتی ہے تو بس یہ کہ زندگی بھر محبت کئے جاؤں!

میری پیدائش کے وقت بہنوں نے خیال رکھا تھا کہ میرے کرتے میں موٹا ڈورا نہ ہو۔ میری صناعت نے مجھے ایسے سانچے میں ڈھال دیا کہ تھلیا[1] (Thalia) کی تعلیم میرے قلب کو متاثر کرتی ہے! پھر اگر ایک چکنے گالوں والے نوجوان کی محبت کا روز ظفر مندی مجھے گمراہ کر دے تو اس میں حیرت کی کیا بات ہے!

سحر کی دیوی! میں ڈرتی تھی کہ تو اُسے مجھ سے چھین لے گی، اور وہی ہوا!

اے آسمان کے چاند! اُس کا واسطہ جو سب کا واسطہ ہے، فاؤن کو کچی نیند میں نہ اُٹھا دینا!

وینس اُسے اپنے رتھ میں بٹھا کر الوپ کر لے گئی ہے، مگر میں ڈرتی ہوں کہ کہیں مریخ اُس کی خوبروئی کو دیکھ پائے! میٹھا برس! نہ بالکل جوان نہ بالکل لڑکا! ہاں، تیرا سن و سال تو بس ایک جوہر ہے — صرف ایک مسرت! آ او مجسم رعنائی! میری گود میں آجا! تو محبت نہ کر، میری تو اتنی ہی التجا ہے کہ مجھے محبت کرنے دے!

میں اگرچہ تمھیں خط لکھ رہی ہوں مگر آنسو ہیں کہ اُمڈے آ رہے ہیں۔ کاغذ کے یہ دھبے دیکھ لو!

لیکن اگر تمھیں جانا ہی تھا تو پیار اخلاص کے ساتھ رخصت ہوتے! یہ کہتے ہوئے جاتے کہ "لیسباس والی خیر باد!"

---

[1] نو میوزوں میں سے ایک جو طربیہ کی دیوی سمجھی جاتی ہے۔

میرے آنسوؤں کی اور میرے بوسوں کی تم نے قدر نہ جانی! کاش میں اُسوقت اندازہ کر سکتی کہ مجھے کیا دکھ پہونچنے والا ہے! تمھاری یاد میرے پاس تو ملامت و ندامت بن گئی ہے، مگر تمھارے پاس ایسی کوئی چیز نہیں جو تمھیں میری یاد دلائے، حالانکہ میں تمھیں چاہتی ہوں!

میں نے تم سے کچھ نہیں چاہا — کچھ نہیں، بجز اس کے کہ میری محبت کو نہ بھلانا! میرے پیارے! محبت کی قسم — اور محبت خدا کرے تمھارے پاس رہے — نوؤں میوزوں کی قسم، جب کسی نے کہا کہ میری تمام خوشیاں اُڑ گئیں تو میری آنکھ سے نہ تو آنسو گرا اور نہ منھ سے ایک حرف نکلا۔ میری آنکھوں میں آنسو تھا ہی نہیں، میرے گلے میں آواز تھی ہی نہیں! میرا سینہ برف کی چٹان تھا! لیکن جب غم کو زبان ملی تو میں نے چھاتی پیٹ لی، بال نوچ ڈالے، اور جان گھلا دینے والے صدمے سے چیخا کی! بالکل ایسے جیسے اپنے بچے کی چتا کے سامنے ایک ماں کا حال ہو!

میرا بھائی کراکس میرے غم کو دیکھ کر ہنستا ہے اور میرے صدمے کے سبب کو زیادہ شرمناک بنانے کے لئے کہتا ہے "یہ اتنا رنج کیوں کرتی ہے، اس کی بیٹی تو زندہ ہے!"

محبت اور ندامت کبھی متفق اور یکجا نہیں ہو سکتے۔ میرا مجروح سینہ لوگوں کی نگاہوں کے لئے کھلا ہوا ہے!

میرے خیالات فاؤن کے قبضے میں ہیں اور میرے خوابوں کو دن کی طرح روشن وہی بناتا ہے! فاؤن، تم گو مجھسے دور ہو مگر خوابوں میں میرے پاس رہتے ہو! مگر نیند سے جتنی خوشی مل سکتی ہے وہ بہت مختصر، نہایت قلیل ہوتی ہے! میں اکثر دیکھتی ہوں کہ میرا سر تمھارے بازو پر رکھا ہے، یا میرا سینہ تمھارا تکیہ ہے۔ بعض دفعہ یہ اختلاط اتنا حقیقی ہوتا ہے کہ میرے ہونٹ — میرے سب حواس جاگ پڑتے ہیں! میں زبان در دھن تمھارے بوسہ کی لذت محسوس کرتی ہوں۔ بوسہ لینے اور بوسہ دینے، دونوں قسم کی لذت! اور پھر محبت کی رسم پوری ہوتی ہے۔ کتنی میٹھی اور پرلذت! فاؤن! تمھارے بغیر محبت کا مزا کیا!

لیکن جب دن اپنی صورت اور سب کچھ دکھانے آجاتا ہے تو میں بڑبڑاتی ہوں کہ میرے خواب اتنی جلدی ختم ہو گئے، اور میں جنگل میں نکل جاتی ہوں۔ گویا میری مایوسی و محرومی کا علاج اس سے ہو جائے گا! کیونکہ اُس جنگل نے وہ سب کچھ دیکھا ہے جس کا دیکھنا سب کو خوش کر دیتا ہے! میں پاگلوں کی طرح سر کھلے وہاں پہونچتی ہوں اور کھوے کے اندر سیاہ اور کھردری چٹان لٹکتی دیکھتی ہوں جواب سے پہلے مصفا مرمر معلوم ہوا کی تھی! میں اُس کنج میں جاتی ہوں جہاں ہم اکثر سوئے تھے اور جس کے جھونپڑے ڈالیاں ہمارے اوپر جھکے رہتے تھے، مگر وہ کنج اب اُجڑا معلوم ہوا، کیونکہ جنگل کی رونق اور میرا آقا تو موجود ہی نہ تھا۔

وہ سبزہ زار جس پر ہم پڑے رہتے تھے، جس کے اوپر تمھارے قدموں کے نشان تھے، میں نے اُس جگہ کو

ہاتھ سے چھوا! آہ، وہ سبزہ جو کبھی اتنا پیارا تھا آج میرے آنسوؤں سے سینچا جا رہا تھا۔

جھکی ہوئی ڈالیاں آہیں بھر رہی تھیں اور چڑیوں کے چہچہے غائب تھے! بس ایک غمزدہ بلبل چیخ رہی تھی، اسلئے کہ اُس کا۔ شوہر نہیں۔ محبوب مارا گیا ہے! بلبل ہائے گل پکارتی ہے اور سیفو ہائے دل!

پھر رات آکر اُس کنج کو سلادیتی ہے۔ میں اُس بلوریں چشمے پر جاتی ہوں جو دیوتا کا استھان ہے اُس پر کنول کی ڈالیں جھکی ہوئی تھیں۔ میں چشمے کے کنارے گھاس پر گر جاتی ہوں تو ایک نغمہ آکر کہتی ہے:۔

"تو اگر محبت کی آنچ نہیں سہار سکتی تو امبریسیا (Ambracia) کے ساحل پر جا جہاں سے ڈُکمیان نے چھلانگ ماری اور پائرھا کے دل میں اُس کی محبت پیدا ہوگئی۔ ڈُکمیان کو کوئی صدمہ نہ پہونچا اور اُس کا دکھ درد مٹ گیا۔ تو بھی لوکیڈیا کی چوٹی پر چڑھ جا اور بے خوف جست لگا۔ تیرے لئے بھی وہی ہوگا!"

یہ کہا اور وہ آواز اور آواز والی غائب ہوگئی۔ میں اُٹھی، آنکھوں سے بڑے بڑے آنسو جھڑنے لگے، میں نے کہا:۔

"اچھا نغمہ، میں محبت کی دیوانی جاتی ہوں چوٹی پر، مجھے ہراس بھی نہیں ہے، جو مقدر! ہواؤ آؤ، میرے ہلکے پھلکے جسم کو اُٹھانے میں تمھیں تکلیف نہ ہوگی! محبت کے فرشتے! آ اور مجھے اپنے پروں پر اُٹھا لے کہ لوکیڈیا کا کنارا میری موت سے بدنام نہ ہو!

میں اپنے بربط کو جو میرے اور فیبس کے لئے مشترک فخر کا باعث تھا، فیبس پر چڑھاتی ہوں۔ میرے بربط پہ یہ شعر لکھوا دینا:۔

'یہ بربط سیفو کا نذرانہ ہے! وہ جتنا سیفو کے لئے موزوں تھا اُتنا ہی موزوں تیرے لئے ہے!"

آہ، مگر او بھاگ جانے والے تو مجھے ایکٹیم کے کنارے جانے پر کیوں مجبور کرتا ہے؟ تو ہی کیوں نہیں آجاتا کہ لوکیڈیا کی موجوں سے بہتر علاج تو تو ہے! تو فیبس دیوتا کی طرح گبرو اور جوانمرد ہے! اُف، تو بحری چٹانوں سے زیادہ سنگدل ہے۔ تو میری موت سے ایک شاندار خطاب حاصل کرنا چاہتا ہے!

ہمارے دونوں کے سینے متصل ہونے کی جگہ، میں لوکیڈیا کی چوٹی پر سے کود رہی ہوں! فاؤن، یہ وہی تو سینہ ہے جسے تم نے 'فطنت کی آگ سے معمور' کیا تھا!

اے کاش میں گا سکتی! لیکن غم کی آگ نے میرے دل کو جلا ڈالا، اور میری فطنت و صناعت کو تباہ کر دیا ہے اب میرے گیتوں میں وہ ہنروری نہیں رہی، اب میرا بربط چپ ہے۔ اُس کے تار خموش ہیں۔

لیسباس کی بیاہتا اور کنواریو! ایولیا کے گیتوں میں تمھارے نام بڑے پیارے لگتے ہیں، لیکن لیسباس کی محبت میرے لئے تو رسوائی لائی! اب تم میرے گیت سننے اکٹھی نہ ہونا! وہ سب کچھ جسے تم سماوی سمجھتی تھیں۔

فاؤن کے ساتھ اُڑ گیا! میں — میرے فاؤن — کہنے والی ہی تھی! بدنصیب سیفو! جاؤ، اور اُسے بلا لاؤ تو پھر میں تمھیں گیت سناؤں گی! میری فطنت کو چمکانے اور ماند کرنے والا تو فاؤن ہے!

اُف، مگر میری التجائیں کس کام کی! اُس کا دل کب پسیجتا ہے! میری التجائیں تو تیز ہواؤں کے ساتھ بہ جاتی ہیں! او گھونگے! تو ہی میری التجاؤں کو لے جاتا اور اُسے واپس بلا لاتا!

ہاں، چڑھاوے کے پھل پھول تو لد چکے ہیں، تو روانہ کیوں نہیں ہوتا، اور میرے دل کو کیوں عذاب دئے جا رہا ہے؟ اُٹھ، وینس دیوی محبت کرنے والوں کے لئے سمندروں کو ساکن کر دیتی اور بادِ مراد چلا دیتی ہے! روانہ ہو جا، کیوپڈ تیری کشتی کا کھویا ہے، وہ اپنے نازک ہاتھوں سے بادبان چڑھائے گا!

لیکن اگر تجھے سیفو سے گریز ہی ہے، تو اُس سے بے وجہ بھاگتا ہے، تو نفرت سے لکھی ہوئی ایک سطر بھیج دے تاکہ میں لوکیڈیا کی چوٹی پر چڑھ کر قسمت آزماؤں!"

جیسا کہ اوپر کہیں بتایا گیا ہے یہ "محبت نامہ" اووڈ کا کہا جاتا ہے مگر مستند نہیں ہے۔ بہرصورت ایک ادب پارہ ہے۔ اُسے سیفو نے لکھا یا نہیں، وہ ایک پارۂ ادب ہے۔ اور اُس کو وجود میں لانے والی اگر سیفو نہیں تب بھی وہ اُسکے وجود میں آجانے کا سبب تو ہے!

سیفو کی صناعت شعری

اپنے زمانہ میں سیفو کو جذبات انسانی کے گیت گانے والی واحد مغنیہ تسلیم کیا گیا ہے۔ لیکن سیفو کی شاعری کو ایسا مافوق بنا دینے والے اسباب کیا ہیں؟ اس کے لئے سب سے پہلے اُس کے ہمعصر شعرا اور نقادوں کا جائزہ لینا ضروری ہے۔ چھے سو سال قبل مسیح جب سیفو نے دنیا سے اپنی عظمت و عزت کا خراج وصول کیا، اُسوقت یونانی ثقافت (کلچر) کے مرکزوں میں نغماتی شاعری عجیب اور مخصوص طریق پر مقبول تھی۔ خاص کر Aeolia جزیرے کے لوگوں میں یہ صنفِ شعر عروجِ کمال کے آخری نقطے پر پہونچ گئی اور یونان کے ذہین مطالعے کا موضوع اور ذکی دماغوں کا محبوب ترین مشغلہ تھی۔

اِن نغمات کی مملکت، ان گیتوں کی راجدھانی مٹی لین تھا، جہاں مقدس قربان گاہوں پر، مرکے معطر کنجوں میں چشموں کی منور روانیوں پر، لاجوردی سمندر کے کناروں پر، اور رنگ و بو کے باغوں میں، حسن اور عشق کی جوان آنچ کو الفاظ میں بند کیا جاتا تھا۔ اور زمزمہ و شعر کی اِس دنیا، فصاحت و ترنم کے اِس عالم پر گیتوں کی رانی سیفو کی حکمرانی سب نے مان لی تھی۔ اُس کے حضور اِن گانے والوں کا ایک مختصر دربار لگتا تھا، اُس کے ہمعصر نغمہ سرا، حتیٰ کہ الکائیس بھی سیفو ہی کا گیت گاتے تھے!

سیفو کا کمالِ شعر اِس حقیقت میں چھپا ہے کہ سیفو کے عہد سے لیکر فنِ انتقاد کی خردہ گیری جتنی زیادہ شدید

ہوتی گئی۔ دوسری ناقابل انکار حقیقت سیفو کی صناعت کے باب میں یہ ہے کہ اُس کا سرمایۂ شعر ایک ہزار سال تک ہر وقت کی بول چال کا جزر ہا، روزمرہ کے حوالوں میں آتا رہا، استناد کے طور پر مستعمل رہا۔ خیالات بدلتے رہے، نقطۂ نظر میں فرق آتا رہا، لیکن سیفو کے اشعار میں فرسودگی پیدا نہ ہوئی، اُن کی ندرت قایم رہی، وہ اُسی طرح تازہ و شگفتہ رہے! فن شعر میں جتنی نزاکتیں پیدا کی گئیں وہ گویا سیفو کے کلام سے ہی لے کر پیش کی گئیں، کیونکہ وہ ہر زمانے کے نقد پر پورا اُترتا رہا۔ شاعر اپنا تفوق سیفو کے اتباع سے ثابت اور نقاد اپنا فن اُس کی سند سے قایم کرتے رہے۔

اسے موجودہ و آیندہ زمانوں کی خوش بختی سمجھنا چاہئے کہ سیفو کے کلام کے چند نمونے فنا کی دستبرد سے بچ رہے ورنہ اگر یہ بھی ضایع ہو جاتے تو اس عہد کا نقاد، یونان قدیم کے نقادوں کے اُن تبصروں کو سمجھ بھی نہ سکتا جو سیفو کے اشعار پر لکھے گئے۔ واٹس ڈنٹن (Watts Denton) عہد جدید کے ایک انگریز نقاد نے شعر پر ایک مقالہ لکھا ہے، اُس کی وہ چند سطریں جو سیفو سے متعلق ہیں اِس جگہ نقل کر دینا نامناسب نہ ہوگا:-

> "سیفو سے پہلے ایسے نغمے نہیں گائے گئے تھے، اور اُسکے بعد بھی انسانی روح نے جذبات کی آگ میں تپ کر ایسی آہ و کراہ کبھی نہیں کی۔ فنی اعتبار سے بھی صفائی، سلاست اور اُس شاہانہ ایجاز کلام میں جو کسی صناع کو ملہم غیب بھی شاذ ہی سکھاتا ہے، دنیا نے سیفو کا ثانی پیدا نہیں کیا۔ بلکہ کوئی ایسا بھی نظر نہیں آتا جو سیفو کے مقابلہ میں دوسرا درجہ پانے کا بھی مستحق ٹھہرے!"

اس زمانے کے ایک دوسرے نقاد، جے، اے، سائمنڈ نے (J. A. Symonds) لیسباس والوں کی اس خصوصیت کا قصیدہ پڑھا ہے کہ وہ جسمانی حسن اور مناظر قدرت کے پرستار تھے اور پھر سیفو کے کلام کی خصوصیتوں کو اُجاگر کیا ہے۔ اُس نے سیفو کی بعض تشبیہات بھی پیش کی ہیں، مثلاً:-

چاند کو "آہستہ الجمال وینس کی پجارن[1]" کہا ہے۔

دوسری جگہ چاند کو "آسمانوں کی دلفریب حکمراں" کہا ہے۔

ایک اور مقام پر چاند کو "گلابی اُنگلیوں والی" اور "قربانگاہ پر رقص پرستش کو منور بنانے والی" کہا ہے۔

نور سحر کو "سنہری چپلوں والی" کہا ہے۔

نخلستان کو "سیب کی شاخوں میں بہنے والے چشمے کے راگ نائم و غنودہ" بتایا ہے۔

لونگ میں "شہد کی مہک" سونگھی ہے۔

"پھولتی جوانیوں سے ہار گندھوائے" ہیں۔

---

[1] یونانی زبان میں چاند کے لئے جو لفظ مستعمل ہے وہ گرامر (صرف و نحو) کے لحاظ سے مونث ہے۔ (ادارہ)

رات کو "بہت سے کانوں والی" کہا ہے

زمین کو "بے گنتی پھول مالاؤں سے سجی ہوئی" کہا ہے۔

قمری کے مجسمے کے پروں کو "موت کی خنکی سے نڈھال" دکھایا ہے۔

مجیرے کی آواز کو "گرمی موسم کو مسحور کرنے کا منتر" کہا ہے۔

جو بہار میں ماری پھرتی چڑیا کے حسن کو سراہا ہے۔

بلبل کو "سروش بہار" کہا ہے۔

سیب کی رنگت کو "میٹھا انفعال کہکر اُسے گلِ داؤدی سے متقابل کیا ہے

اپنی شاعری کے تار و پود کو "نیمفون (Nymphs) کے باغ کی آرائش" کہا ہے۔

ایک نوعروس اور اُس کی دوشیزگی کا مکالمہ لکھا ہے۔

یونان قدیم کے اکثر نقادوں نے سیفو پر تبصرے لکھے لیکن بجز تعریف و توصیف اور کچھ نہ لکھ سکے۔ ان قدیم تبصرہ نگاروں کی توصیف اس لئے زیادہ وزن دار ہے کہ وہ اپنے ادب کی روایات اور اپنی زبان کی نزاکتوں سے زیادہ واقف تھے۔

سیفو کی شاعری کے چند نمونے پیش کئے جاتے ہیں، جن کی فنی خوبی اور طرزِ بیان کا حسن پہچاننا تو ہمارے لئے ممکن نہیں، تاہم خیالات و جذبات سے پورے طور پر ہم شرابور ہو سکتے ہیں!

وینس[1] دیوی کی شان میں:-

مرصع تخت پر بیٹھنے والی لازوال سائپریس! خداوند جیوپیٹر کی بیٹی! تو سب کچھ کر سکتی ہے۔ میری روح کو بھی غموں سے نجات دے! کہتے ہیں پچھلے زمانے میں تو اپنے باپ کے سماوی محل سے نکل آتی تھی! یہ اگر سچ ہے تو سماوی ملکہ! میری التجاؤں پر بھی رحم فرما! اور اپنے سنہری رتھ کو ایک بار پھر کہکشاں کی سڑک پر دوڑا دے! تیری محبوب قمریوں کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ سے تاریک دنیا کی ہوائیں پھر ایک دفعہ پاکیزہ بن جائیں!

مقدس دیوی! میں ایک آواز سن رہی ہوں! کیا یہ تیرے غیر فانی لبوں کی صدا ہے؟ کیا تیرا جلوہ و جمال کی کرنیں پھیلا دینے والا چہرہ مجھ سے میرے غم کا حال پوچھ رہا ہے؟

دیوی! میری محبت کی دیوانی روح تجھ سے اور کچھ طلب نہیں کرتی، بس یہ سننا چاہتی ہوں کہ جو دوشیزہ سیفو

---

[1] ڈایانیسیاس نے اسی نظم پر تبصرہ کیا ہے۔

کے رنج والم کا باعث ہے وہ سیفو کے پہلو سے آلگے گی! اگر تجھے تحفے لینے سے نفرت ہے تو تحفے دینے پر ناز کریگی
وہ اگر شرمیلی اور بوسے سے گریز کرتی ہے تو خود بوسے دینے لگے گی!

ملکہ، ایک دفعہ اور آجا، اور اپنی اس پجارن کو غم کے پنجے سے چھڑا دے! اور میری کشت آرزو کو سرسبز بنادے! آ، اور مجھ پر ہمیشہ مہربانی فرما — میری دوست بن جا!

محبوب لڑکی کے نام[1]:۔

وہ جسے تو اپنا مہمان بنالے، جو تیرے روبرو ہو، قریب بیٹھکر تیری میٹھی میٹھی باتیں سننے میں محو ہو سکے، تیری ہنسی کے نشے سے مست ہو سکے، دیوتاؤں کا ہم سر ہے!

مگر یہی منظر میرے پہلو میں میرے دل کو لرزا دیتا ہے! میں تیری صورت پر نظر ڈالتی ہوں تو گونگی ہو جاتی ہوں، منھ سے بات نہیں نکلتی! اُس گھڑی ایک شعلہ بھڑک کر میری ہستی پر چھا جاتا ہے۔ میری آنکھیں دیکھ نہیں سکتیں، میرے کان سن نہیں سکتے، میرے اعضا میں بار بار ایک تھرتھری دوڑ جاتی ہے، میرے ماتھے پر پسینے کی شبنم افشاں ہو جاتی ہے، میرا رنگ اُڑ جاتا اور میں سفید پڑ جاتی ہوں، میں دیوانی ہو جاتی ہوں، نزع کی طرح میرا دم گھٹنے لگتا ہے!

ایک مجسمہ شباب و رعنائی جوان کو دیکھ کر کہتی ہے :۔

"حسین دوست! سامنے آ، میری طرف دیکھ، اور اپنی آنکھوں میں مستور رعنائی کو عریاں کردے!"

ایک پارے میں اپنے اظہار احساس کے ساتھ انسانی فطرت پر طنز بھی کر جاتی ہے:۔

"وہ مجھے زیادہ دکھ پہونچاتے ہیں جن کے ساتھ میں اچھا برتاؤ کرتی ہوں!"

اپنی میوز (سروش غیبی) کو مخاطب کرنے میں لطیف "تعلّی" بھی ہے :۔

"میری بنفشہ کی بننے والی میوز! میں تجھسے اپنا جایز حصہ مانگتی ہوں!"

حسن صورت اور حسن سیرت کی تصریح کرتی ہے :۔

"جو حسین ہے، وہ دیکھنے ہی کا حسین ہے، جو نیک ہے وہ حسین پہلے ہے!"

اپنے شاعرانہ احساس کو اس طرح بیان کرتی ہے :۔

"ساحل پر بکھرے ہوئے بلور کے ٹکڑوں کو چھیڑو مت، یوں ہی پڑا رہنے دو!"

حقیقت کی عقدہ کشائی کرتی ہے :۔

"مجھے وہ شہد نہیں چاہئے جس کے اندر مھال ہے!"

---

[1] اسی نظم پر لاطینی نقاد لانگنس نے بحث کی ہے۔

جذبات کا نغمہ اِس طرح سناتی ہے :-

"چاند اور ثریا اپنی اپنی جگہ قایم ہو چکے ہیں،
آدھی رات آچکی ہے ، وقت جا رہا ہے ،
چلا جا رہا ہے ، اور میں اکیلی پڑی ہوں !"

ایک شاعرانہ احساس سناتی ہے :-

"نیچے ، سیب کی ڈالیوں کو چومتا ، پانی بہہ رہا ہے ،
اوپر کی پتیاں سرسرا کر گہری نیند بہا رہی ہیں !"

ایک دوسرا :- "قربان گاہ کے گرد کنواریاں کھڑی ہو گئیں ،
اُن پر ، چودھویں کی چاندنی چھٹک رہی تھی !"

فطرت محبت اور جذبات کے طوفان کو ایک لفظ میں بند کر لیتی ہے :-

"حسین دوشیزہ جب محبت کرتی ہے ،
تو بہت سے ہار گوندھ ڈالتی ہے !"

شباب اور عشق کی تصویر کھینچتی ہے :-

"آ ، وینس آ ، اور
ان اپنے اور میرے دوستوں کے لئے ، طلائی کوزوں کو
محبت کی شراب اور لذتوں سے بھر دے !"

ایک "شادیانے" میں جذبات کو اس طرح گاتی ہے :-

"نئی دلہن ، جس کے سینے میں گلابی محبت کا گھر ہے ،
اے پافوس کی طرح سندر دلہن !
سہاگ پلنگ طیار ہے ،
جا ، اُس سے مل اور ،
اختلاط کی مٹھاس میں شریک ہو جا ،
روشن زہرہ کی کرنیں ہیرا دیوی کی روپہلی چوکی
کو حیران تمناؤں .... دیکھتے ہوئے ،
تیرے دل میں اُسے (شوہر کو) مسند نشین کر دیں گی !"

شام کے منظر کی کیفیات کو کس نزاکت تخئیل سے پیش کرتی ہے :-

"صبح کی چمک نے جن چیزوں کو دور بھگا دیا تھا،
زہرہ (شام کا ستارہ) تو اُن کو گھر بلا رہی ہے،
تو بھیڑوں اور بچوں کو اس طرح بلا رہی ہے،
جیسے بچوں کو ماں سینے سے لپٹانے کو بلاتی ہے!"

اپنی حسرت کو کتنا حسین بنا دیتی ہے :-

"کیا میں ابھی کنوارپن کی آرزو رکھتی ہوں!"

آرزوؤں کی نارسائی کا حسین ترین استعارہ ہے :-

"اے دوشیزہ! تو اُس شیریں اور سرخ سیب کی مانند ہے
جو سب سے اونچی ڈالی میں،
باغباں کی نگاہ سے پوشیدہ ہے —
نہیں، چھپا ہوا نہیں بلکہ اُسے ترسا رہا ہے!"

نوعروس اور اُس کی دوشیزگی میں مکالمہ کراتی ہے :-

نوعروس :- تو کہاں گئی، کہاں چلی گئی، میری دوشیزگی؟

دوشیزگی :- نوجوان لڑکی، اب میں تیری نہیں ہو سکتی، میرا جانا تو ایک صبح کی خوش آمد ہے!"

کیفیات شباب کی تصویر یوں بناتی ہے :-

"اور اُن کے بھاری پپوٹوں پر،
رات کی تاریک نیند پڑی لوٹ رہی ہے!"

ایک گل اندام کی تعریف کرتی ہے :-

"دودھ سے زیادہ سفید،
ریشم سے زیادہ نرم،
گلاب سے زیادہ نازک،
رباب سے زیادہ مترنم،
نرس سے زیادہ لوچدار،
اور سونے سے بہتر سونا!"

ل - احمد (اکبرآبادی)

کیا قرآن خدا کا کلام ہے؟

جولائی سنہ ۴۶ء کے نگار میں نیاز صاحب نے مندرجۂ بالا عنوان کے تحت جو کچھ لکھا ہے، تقریباً وہ صحیح ہے اور مسلمانوں میں ہر نکتہ سنج و دقیقہ رس کے روبرو قرآن کا یہی آئڈیا ہے۔ لیکن مسلم عوام کے خوف کی وجہ سے کسی میں یہ ہمت نہ ہوئی کہ اس کا اظہار کرکے توہم پرستی کو دور کرنے میں مدد دے۔ اگر نیاز صاحب کی یہ صاف بیانی اپنی ذاتی تشہیر سے پاک ہے اور صرف مسلم قوم کی اصلاح کے لئے ہے تو سب سے پہلے میں اس جرأت کی داد دیتا ہوں۔ اگرچہ اس موقع پر داد دینا بھی مقدس گروہ کے نزدیک کفر میں داخل ہوگا، لیکن یہ حقیقت ہے کہ جب تک قوم میں ایسے جری اور صاف گو نہ ہوں گے، مسلمان کبھی شاہراہِ اسلام پر نہیں آسکتے، بلکہ ہمیشہ کفر و اسلام کی بحث اور رسم پرستی میں پڑے رہیں گے۔

آج سے چند صدی پیشتر یورپ کی توہم پرستی کا بھی یہی عالم تھا جو آج ہندوستان کے مسلمانوں کا ہے لیکن جب وہاں کے چند علم دوست دلیروں نے عیسائی مذہب کے باب میں صاف بیانی سے کام لیا اور خصوصیت کے ساتھ ابن رشد کے فلسفہ کی اشاعت کی تو مذہبی جماعت میں ہل چل مچ گئی۔ جب اس نے دیکھا کہ اس کا اقتدار خطرہ میں ہے تو فلاسفہ کی جماعت اور ان کے ہمنواؤں سے چن چن کر بدلا لینا شروع کر دیا اور چونکہ حکومت کی باگ ڈور نام نہاد مذہبی جماعت کے ہاتھ میں تھی اس لئے اس کے نزدیک جو بد اعتقاد ہوتا اُس کو سزا دیجاتی۔ اس مذہبی جماعت نے اپنے خلاف اعتقاد جماعت کو ایسی سخت و شدید سزائیں دینا شروع کیں کہ انسانوں کا خون کھولنے لگا اور بیرحمی و سنگدلی کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ عیسائی مذہب اور پادریوں سے بد دل ہونے لگے، تاہم مظالم میں کمی نہ ہوئی۔ چنانچہ پیہم شدائد و مصائب اور ظلم و عدوان کے باعث رفتہ رفتہ لوگ مذہبی جماعت سے منحرف و متنفر ہونے لگے، یہاں تک کہ توہم پرستی سے آزاد ہوکر آج تمام یورپ تمام دنیا پر قابض ہے۔ اب میں اصل موضوع کو لیتا ہوں۔

ہمارے مقدس گروہ نے خدا کا آئیڈیا جس طرح پر مسلمانوں کے روبرو پیش کیا اس نے خدا کے تصور میں تجسیمیت پیدا کردی جس سے عوام توہم پرست ہوگئے اور مایل بہ زوال ــــ حالانکہ خدا نہ کوئی جسمانی کیفیت رکھتا ہے اور نہ مثل انسانوں کے جذبات سے لبریز ہے۔ خدا کا بہترین تصور قل ہو اللہ احد نے پیش کیا ہے جس میں کسی اضافہ

کی ضرورت نہیں۔

خدا کی ہستی اور اس کے کلام کو سمجھنے کے لئے اول تو سورۂ اخلاص کافی ہے۔ دوسرے "کل فی فلک یسبحون" کے اعلان سے عملی قوت کو سمجھنا چاہئے۔ کائنات میں کوئی چیز، کوئی ذرہ اور کوئی قطرہ ایسا نہیں جو سرگرم عمل نہ ہو۔ وہ چھوٹے چھوٹے ذرے، جن کو سائنس کی اصطلاح میں (Electron) اور (Proton) کہتے ہیں اور جو انسانی آنکھ سے دکھائی نہیں دیتے، اپنے بڑے ذروں کے گرد ہر وقت و ہر لمحہ گردش کرتے رہتے ہیں انسان کی لاش جو ایک مدت سے مدفون ہے یا نذر آب و آتش کر دی گئی ہے، اس کے ذرے بھی بے عمل نہیں۔ ایک آہنی صندوق اور فولادی ظرف کے ذرات بھی ہر وقت عمل کرتے رہتے ہیں۔ عمل کے متعلق کرشن مہاراج کا قول ہے کہ جس قوت کا نام عمل ہے، وہی خدا ہے۔ لیکن میرے نزدیک وہ پوشیدہ قوت جو ہر چیز سے عمل کرا رہی ہے خدا ہے۔ جس طرح روح نظر نہیں آتی، لیکن ہے۔ اسی طرح خدا نظر نہیں آتا۔ لیکن ہے ضرور۔ پس روح یا جوہر روح برق یا جوہر برق۔ اور حیات یا جوہر حیات جس قوت نے پیدا کی ہے وہی خدا ہے۔ وہی حیّ و قیوم ہے اور مذہب کی زبان میں وہی رب العالمین ہے، جو حسب استعداد سب کو روحانی و جسمانی غذا پہونچاتا رہتا ہے۔

اس کے بعد وحی، الہام اس طرح سمجھ میں آتا ہے کہ ایک میخوار جو سیہ مستی کی حالت میں بات کرتا ہے، کیا تم اسکے کلمے سنکر نہیں کہتے کہ یہ پینے والا نہیں بول رہا ہے بلکہ کوئی اور ہے؟ حالانکہ نشہ کی حالت میں جس قدر الفاظ آواز کے ساتھ نکلتے ہیں وہ تمام شرابی کے حلق و زبان سے ادا ہوتے ہیں، لیکن تم اس پر یقین نہیں کرتے، مگر جب وہ ہوش میں بات کرتا ہے تو کہتے ہو کہ یہ بولنے والے کا کلام ہے جو اسی کے ذہن و دماغ کا نتیجہ ہے بالکل یہی مثال وحی کی ہے کہ بانیٔ اسلام جس وقت جذب و کیف کی حالت میں بولتے تھے تو اگرچہ الفاظ آپ ہی کی زبان و حلق سے نکلے ہوئے ہوتے تھے۔ لیکن محرک وہ قوت ہوتی تھی جو نشۂ توحید سے لبریز ہوتی۔

بانیٔ اسلام نے خدا کی ہستی کا تصور کیا، اور رفتہ رفتہ کشف و مجاہدے کے ذریعہ، انہماک و محویت کے ذریعہ جب حقیقت کو پا لیا تو آپ کا شعور اس قدر کامل ہو گیا کہ کائنات کے تمام راز آپ پر روشن ہو گئے۔ تصور تجرد اور عالم محویت میں آپ اس درجہ سریع الحس و ذکی الفہم ہو جاتے تھے کہ اپنی ذات کا اور اپنے وجود پاک کا احساس تک باقی نہیں رہتا تھا، بجز اس قوت لازوال کے جو اوپر بیان کی گئی ہے۔ ایسی حالت میں جو بات، جو کلام، اور جو اشارہ، یعنی جو الفاظ اور فقرے آپ کی زبان مبارک سے نکلتے تھے وہ اسی قوت و فطرت کے قانون کے مطابق ہوتے تھے جس کی تحقیق و جستجو میں آپ مستغرق ہوتے۔ اسی نوع کے کلام کو مسلمان الہام سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں اور اسی کو وحی کا درجہ دیتے ہیں۔

آپ نے حضرت علیؓ کا یہ تاریخی واقعہ سنا ہوگا کہ جب دشمن کا تیر آپ کے پاؤں میں چھد گیا اور جب ہوش کی

حالت میں اس کو نکالنا چاہا تو آپ کو سخت و شدید تکلیف ہوئی۔ اس پر آپ نے فرمایا کہ جب میں نماز کی نیت باندھ لوں تب اس تیر کو نکال لیا جائے، چنانچہ ایسا ہی کیا گیا، اور آپ کو مطلق تکلیف نہ ہوئی۔ اگر اس تاریخی واقعہ کو غلط سمجھا جائے تو اس کا تو میرے پاس کوئی علاج نہیں، لیکن ایسا ہو سکتا ہے کہ تصور و انہماک کی قوت کوئی معمولی قوت نہیں ہوتی اور نہ ہر شخص اس کا اہل ہو سکتا ہے۔

لیکن رسول میں یہ قوت بدرجۂ اتم موجود تھی، اور جس وقت آپ گردن ڈال کر غرقِ تصور ہوتے تھے اور آپ کا ضمیر اس قوتِ لازوال و بے نیاز کی طرف رجوع ہوتا تھا، جس کو عرفِ عام میں خدا کہتے ہیں، تو آپ کی آنکھیں ہر چیز کو زندگی سے لبریز، اور عمل سے معمور پاتی تھیں اس لئے آپ مسلمانوں کو بلکہ عام انسانوں کو عمل و انسانیت کا سبق دیا کرتے اس دلکش آواز پر لوگ کھنچے، لبیک کہتے اور آپ کے حلقۂ درس میں شامل ہو جاتے۔ یہی وہ خاموش تکلم تھا جو رسول پر نازل ہوتا تھا، اور جس کو ہم خدا کا کلام کہتے ہیں اور کہہ سکتے ہیں۔

رہا جبرئیل فرشتہ کا رسول پر پیغامِ الٰہی کا لانا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا کی وہ قوت جس کے ذریعہ وحی آتی تھی، اس قوت کو ہم جبرئیل کے نام سے پکارتے ہیں اور اسی قوت کا نام قرآن کی زبان میں جبرئیل ہے۔ ورنہ فرشتوں کے وجود کا یہ تخیل جو مسلمانوں کے ذہن نشین کرایا گیا ہے، ایک استعارے سے زیادہ کچھ نہیں۔

امام - اکبر آبادی

نوٹ:- اگر الہام علاوہ رسول کے دوسری چیزوں پر بھی ہوتا تھا، جیسا کہ نیاز صاحب نے قرآنی آیات سے ثابت کیا ہے تو اس سے اسلام کو کوئی نقصان نہیں پہونچ سکتا اور نہ اس سے مسلمانوں کے عقیدے میں کمزوری آنا چاہئے۔ کیونکہ دوسری چیزوں کے الہام نے انسانوں کو کوئی فایدہ نہیں پہونچایا، لیکن رسول کے الہام نے اتنا فیض پہونچایا کہ آدمی کو انسانیت و عمل کی دعوت دیکر ممتاز کر دیا۔

امام

نوٹ کر لیجئے

کہ پرانے پرچے پر ڈاک خانہ بجائے رعایتی محصول ایک پیسہ فی پرچہ کے پانچ گنا وصول کرتا ہے۔ اس لئے اگر دفتر میں پرچے کی عدم وصولی کی اطلاع آخر ماہ تک نہ آئی تو ہم پرچہ بیرنگ بھیجنے پر مجبور ہوں گے اور آپ کو ۲۰ر دیکر پرچہ وصول کرنا پڑے گا یا اگر اطلاع کے ساتھ پانچ پیسے کے ٹکٹ ہمیں موصول ہوں گے تو تعمیل ہو سکے گی۔ ورنہ نہیں۔ اور اس کے لئے دفتر مجبور ہے۔

منیجر نگار

نیازکی آزادخیالی

زندگی عبارت ہے حرکت سے اور شعروادب زندگی ہی کا ایک شعبہ ہے، اس کا بھی کسی ایک نقطہ پر قایم رہ سکنا محال ہے، شعروادب اگر ترقی نہیں کرتا تو یقیناً پست ہوتا چلا جاتا ہے۔ چنانچہ اُصول ارتقا کے مطابق اُردو زبان میں بھی ایسے ارباب کمال پیدا ہوتے رہے ہیں جنھوں نے اُردو ادبیات کو صناعت کے درجے تک پہونچایا مگر انھیں ارباب کمال میں وہ جوہر قابل بھی رونما ہونا لازمی تھے جو دوسروں کی طرح اپنے ماحول کا آلۂ کار نہ تھے بلکہ ان لوگوں میں تھے جو عمومیت اور تقلید سے بغاوت کرکے اپنی راہ الگ بناتے ہیں اور اس طرح مستقبل کے لئے دلیلِ راہ بنجاتے ہیں چونکہ ایسے لوگ اپنے عہد کی سطح سے بلند ہوتے ہیں اس لئے ان کے معاصر اور معاشر ان کو سمجھ نہیں سکتے اور وہ مردود کردئے جاتے ہیں لیکن جلد یا بدیر وہ وقت بھی آجاتا ہے جب ان کے فضل وکمال کی قدر کی جاتی ہے اور انکی پرستش ہونے لگتی ہے، یہی زمانہ آزادی کا حقیقی عہد ہوتا ہے اور ایسے ہی نفوس کے لئے ڈاکٹر جونسن لکھتا ہے:-

"ہر وہ شخص جسے لکھنا پڑھنا آتا ہے وہ قلم اُٹھا سکتا ہے اور اُٹھاتا ہے لیکن ایسے لوگوں کی کثرت زبان کو اسی صورت و حالت میں استعمال کرتی ہے جس صورت وحالت میں کہ زبان ان کے سامنے آتی ہے اس کے برعکس ایک فطین شخص زبان کو اپنے مقصد وارادہ کے سانچے میں ڈھال لیتا ہے۔ اس کے دماغ میں غیر معمولی متنوع جذبات پیدا ہوتے رہتے ہیں، اس کے احساس وخیال میں ایک ہمہ گیر وسعت ہوتی ہے، اس کے تصورات عمیق ہوتے ہیں، زندگی وآداب زندگی کے متعلق اسکی رائے تقلیدی نہیں ہوتی وتاریخ کے باب میں اس کا فیصلہ خود اسی کے ذہن کا نتیجہ ہوتا ہے اور وہ ان سب کو مناسب الفاظ وزبان میں ایک مخصوص انداز بیان کے ساتھ پیش کرتا ہے اس کا یہ اظہار خیال چونکہ اس کے ذہنی بطون کا عکس ہوتا ہے اس لئے وہ کثیر الاشکال ہوتا ہے اور اس کے لئے جو زبان وہ اختیار کرتا ہے اس میں ندرت، لطافت وحلاوت کا بیک وقت نہایت دلچسپ امتزاج پایا جاتا ہے"

کیا جونسن کی یہ تعریف غالب دہلوی اور نظیر اکبرآبادی پر صادق نہیں آتی؟ عہد متاخرین تک اُردو ادبیات کی تاریخ میں یہی دو ہستیاں تھیں جنھوں نے تمام مسلک کو ترک کرکے اپنے لئے نئی راہ پیدا کی اور دونوں ہمیشہ مطعون رہے انکے زمانہ میں ان کی قدر ہونا ناممکن تھا اگر ہوتی بھی تھی تو بالکل غلط بنیاد پر لیکن ان کی عزت کا عہد بھی آگیا چنانچہ آج

ارباب کمال نے ان دونوں ہستیوں پر خصوصاً غالب پر اس قدر لکھا کہ کوئی پہلو لکھنے کے لئے نہیں چھوڑا۔ یہی حالت آج جناب نیاز فتحپوری کی ہے، جناب نیاز جس بنا پر آج ننگ اسلاف تصور کئے جاتے ہیں وہ موصوف کی آزاد خیالی ہے اور یہی جوہر ان کے لئے باعث بدنامی ہے، جناب نیاز اگرچہ سماجی قوانین کے شکنجے میں کسے ہوئے ہیں لیکن اپنے رجحان آزادی کے مقابلہ میں کبھی سماج سے مرعوب نہیں ہوتے اور علانیہ اپنے خیالات کا اظہار کر دیتے ہیں۔ جناب نیاز کا طرز نگارش نہ تفاخرانہ ہے نہ ذریعۂ معاش جس کا ثبوت ان کی داخلی و خارجی زندگی ہے یعنی ان کے جذبات وحسیات اور فعل وعمل میں شدید مطابقت پائی جاتی ہے۔

نیاز کا الحاد و ارتداد

جناب نیاز کے الحاد کے متعلق اظہار خیال سے پہلے ملحدی کی حقیقت کو سن لیجئے۔ جہاں تک نفس اختلاف واعتراض کا تعلق ہے حکمائے اسلام میں بہت سی ایسی ہستیاں گزری ہیں جنھوں نے جمہور علماء سے کھلم کھلا اختلاف کیا ہے۔ ابن راوندی، صالح ابن قدوس، یعقوب ابن یوسف، فارابی، ابن سینا، ابن رشد سے لیکر، امام رازی، غزالی، طوسی، ابن تیمیہ، ابن قیم، شاہ ولی اللہ اور بحر العلوم تک سب نے خوف وہراس کو بالائے طاق رکھکر بہت سے مسائل میں جمہور علماء سے اختلاف کیا ہے۔ علامہ ابن قیم اور علامہ ابن تیمیہ نے فنائے نار کے مسئلہ میں جو عقاید کا بہت زبردست مسئلہ ہے علانیہ اپنی ذاتی رائے کو جمہور کے مقابلہ میں ترجیح دی ہے، جس کے موید جناب مولانا سید سلیمان ندوی بھی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ جب علماء کرام کہتے ہیں تو اعتراض نہیں ہوتا اور جب نیاز وہی بات کہتے ہیں جو قدما کہہ گئے ہیں تو ہدف ملامت بنائے جاتے ہیں۔ میں جس نتیجہ پر پہونچا ہوں وہ یہ ہے کہ "الحاد" کا لفظ بہت ہی محدود معنی میں نیاز صاحب کے مضامین پر مستعمل ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ وہ تقلید ترک کر کے خود سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں اور جو سمجھتے ہیں اسے پوری بیباکی کے ساتھ ظاہر کر دیتے ہیں۔ پھر ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ جب علامہ نیاز بھی وہی لکھتے ہیں جو ہمارے بعض دوسرے علماء کرام فرماتے ہیں تو ان کے قول کو کیوں بنظر استحقار دیکھا جاتا ہے۔

مثلاً ہندوستان کی آزادی و ترقی کے لئے "نیشلزم" پیدا کرنا ضروری ہے اور یہ اسوقت تک ممکن نہیں جب تک سیاسی جدوجہد مذہب کا آلۂ کار رہے چنانچہ بعینہ یہی چیز ہمارے فاضل اجل علامہ عبداللہ سندھی فرماتے ہیں لیکن ہمارے علماء کرام کچھ نہیں کہتے، حالانکہ انکے نزدیک سیاست سے مذہب کی علٰحدگی بیدینی و ملحدی ہے۔

نیاز صاحب بھی یہی کہتے ہیں کہ مذہب کا تعلق چند متعین رسوم وقیود سے نہ ہونا چاہئے بلکہ اس کا ایک فلسفہ ہونا چاہئے تاکہ غیر مذہب کے عقلاء کے سامنے پیش کیا جا سکے اور اس طرح ہندوستان کے تمام مذاہب کسی ایک مرکز پر پہونچ کر اشتراک عمل پیدا کر سکیں، لیکن عبدالماجد دریا بادی کے قسم کے مذہبی لوگ اسے کفر والحاد بتاتے ہیں۔ حال ہی میں قرآن کے کلام ربانی ہونے کے متعلق جو مقالہ جناب نیاز کا جولائی کے نگار میں شائع ہوا ہے اور

جس کی بنا پر عبدالماجد صاحب نے ان کو ابوجہل کا لقب عطا کیا ہے، دیکھنے کی چیز ہے، لیکن اگر اس میں واقعی کوئی غلطی ہے، تو انسانوں کی زبان میں بغیر کسی برہمی کے اس پر اظہار خیال کرنا چاہئے۔

"آتش نمرود" کے واقعہ کو بھی جناب نیاز تاریخی واقعہ نہیں بتاتے بلکہ "اساطیر الاولین" میں شمار کرتے ہیں اگر عبدالماجد صاحب یا اُن کی طرح دوسرے مجانین مذہب کے نزدیک جناب نیاز کے دلایل غلط ہیں تو ان کا جواب دینا چاہئے، نہ یہ کہ گالیوں پر اتر آئیں، دنیا کا کوئی مذہب دوسروں کو بُرا بھلا کہکر کبھی ترقی نہیں کر سکتا۔

ہمارے علمار مذہب یا جمہور کی طرف سے ایسی غیر مہذب و ناشایستہ ذہنیت کا اظہار بجائے اس کے کہ لوگوں کو مذہب کی طرف سے مطمئن کرے، اور غیر مطمئن بنا دینے والا ہے، کیونکہ اس سے لوگ یہ سمجھیں گے کہ علماء مذہب کے پاس کوئی معقول جواب نہیں ہے اور ان کا تنہا حربہ "کافر و ملحد" کہدینا ہے۔

جناب نیاز جب تک خدا کی وحدانیت اور رسالتِ رسول کے قایل ہیں (خواہ وہ رسالت کا مفہوم کچھ قرار دیں) دنیا میں کسی کو حق حاصل نہیں کہ انھیں ملحد یا مرتد کہہ سکے۔

جس طرح عبدالماجد وغیرہ کو اپنی جگہ تفکر و تدبر کا حق حاصل ہے، نیاز کو بھی حاصل ہے اور انھیں کوئی مجبور نہیں کر سکتا کہ وہ دوسرے علمار کی تقلید کریں۔ اگر علمار اپنی جگہ اسلام کی خدمت اس بات میں سمجھتے ہیں کہ مذہب کو "اعجوبۂ روزگار" بنا کر پیش کریں تو جناب "نیاز" بھی اپنے نقطۂ نظر سے اسلام کی خدمت اس کو قرار دیتے ہیں کہ وہ "قابل فہم و عمل" چیز قرار پائے۔ کس قدر افسوس کی بات ہے کہ آج ہمارے علمار کرام الحاد و بیدینی کی اشاعت پر تو ماتم کرتے ہیں، لیکن یہ نہیں دیکھتے کہ اس کی مجرم حقیقتاً خود انھیں کی ذات ہے، جو اس "دورِ علم و عقل" میں بھی مذہب کو "مزخرفات" کا مجموعہ بنائے ہوئے ہے۔ دُنیا کا کوئی ادارہ اسوقت تک زندہ نہیں رہ سکتا جب تک وہ زمانہ کا ساتھ نہ دے اور یقیناً مذہب بھی زندہ نہیں رہ سکتا اگر اس نے زمانہ کا ساتھ نہیں دیا۔

محمد عبدالشکور آکم ندوی

تاریخ اسلامی ہند مع توقیت

کتابی شکل میں

نگار سایز کے ۲۴۳ صفحات پر - قیمت معہ محصول ۱۲؍

منیجر نگار لکھنؤ

باب الاستفسار

لوحِ محفوظ
اور
عذاب و ثواب

(جناب صفی مظہر صاحب۔ محلہ جوڑن شہید۔ غازی پور)

نگار ماہ جون سنہ ۴۳ء و جولائی سنہ ۴۳ء میری نگاہ سے گزرے۔ حسب ذیل سوالات بغرض رفع شک پیش کرتا ہوں امید ہے ان کا جواب نگار ماہ اگست میں شایع فرمائیں گے ممنون ہوں گا۔

۱۔ آپ کو تسلیم ہے کہ انبیاء جھوٹے یا مکار نہیں تھے اور ان کا ہر قول و فعل اشارۂ خداوندی کے ماتحت ہوتا تھا (نگار جولائی سنہ ۴۳ء صفحہ ۵۹ سطر آخری) تو آیت "بل ہو قرآن مجید فی لوح محفوظ" کی کوئی حقیقت ہے یا نہیں ؟

۲۔ اگر کوئی حقیقت ہے مگر وہ نہیں جو مسلمان ظاہر کرتے ہیں تو آپ خود ہی اظہار حقیقت فرمائیے۔

۳۔ اگر آیت بالا میں کوئی حقیقت نہیں اور قرآن مجید کا لوحِ محفوظ سے کوئی علاقہ نہیں بلکہ یوں کہئے کہ لوحِ محفوظ کوئی چیز ہی نہیں تو پھر کوئی ایسی صورت بتائیے جس سے جناب رسالتمآبؐ کا سچا ہونا۔ ان کا ہر قول و فعل اشارۂ خداوندی کے ماتحت ہونا باور کیا جا سکے۔

۴۔ اگر آیت مذکورہ مسلمانوں کی اختراع ہے تو آپ کے پاس کیا دلیل ہے اور کیا آپ کوئی ایسا معیار بتا سکتے ہیں جس پر پرکھنے کے بعد ہم کہ سکیں کہ فلاں آیت قرآن کی ہے اور فلاں نہیں۔

۵۔ آپ قرآن مجید کو لوحِ محفوظ میں درج ہونا ایک مستعار عقیدہ جانتے ہیں اور اس کی دلیل میں یہود و نصاریٰ کے اعتقادات متعلق توریت و انجیل پیش کرتے ہیں تو کیا یہ کلیہ ہو سکتا ہے کہ اگر دو روایتیں ایک دوسری سی ملتی ہیں اور ان میں سے ایک غلط ہو تو دوسری بھی غلط ہوگی۔ اگر ایسا ہی ہے تو مثال مندرجۂ ذیل میں آپ کیا کہیں گے۔

"دو شخص کسی کے یہاں ملازم ہیں۔ مالک انصاف پسند ہے۔ ایک ملازم چھٹی کی غرض سے بیجا عذر پیش کرتا ہے۔ مالک سے

پاس آکر درد کی شکایت کرکے زمین پر پچھاڑیں کھانے لگتا ہے۔ مالک تسکین درد کے لئے حکیم حاذق کو طلب کرتا ہے حکیم اپنی حذاقت کی بنا پر اس مریض کو واقعی مریض نہیں قرار دیتا چنانچہ مالک اس مریض کو لعنت ملامت کرکے ٹھکرا دیتا ہے کچھ دن کے بعد دوسرا ملازم بالکل اسی بیماری کا شکار ہوکر مالک کے پاس آتا ہے اور رخصت کی استدعا پیش کرتا ہے کیا مالک واقعہ سابقہ کی بنا پر اس شخص کے عذرات کو بھی لائق التفات تصور نہ کرے، اور تصدیق حال نہ کرے؟

۲۔ اگر آپ آخرت کے عذاب وثواب کو بے حقیقت تصور فرماتے ہیں تو آیت " وما کان لنفس ان تموت الا باذن اللہ کتابا موجلا۔ ومن یرد ثواب الدنیا نوتہ منہا ومن یرد ثواب الآخرہ نوتہ منہا وسنجزی الشاکرین" کے معنی اس عنوان سے بیان فرمائیں کہ رسول کی صادق الکلامی بھی بحال رہے اور عقیدۂ ثواب وعذاب بھی مسترد ہوجائے؟

(**نگار**) آپ کے استفسار کا مدعا تمام حشو وزوائد کو نکال کر یہ قرار پاتا ہے کہ میں " لوح محفوظ " کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کروں اور آخرت کے عذاب وثواب پر (آپ کی پیش کردہ آیت کو پیش نظر رکھکر) بحث کروں۔

میں نے جون اور جولائی کے نگار میں قرآن مجید کے کلام خداوندی ہونے کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ عام طور پر جس معنی میں قرآن مجید کو خدا کا کلام سمجھا جاتا ہے وہ میرے نزدیک درست نہیں ہے یعنی یہ عقیدہ کہ اس کا ایک ایک لفظ، ایک ایک حرف اور ایک ایک نقطہ خدا نے رسول اللہ پر اس طرح نازل کیا ہے جس طرح کوئی مادی چیز کسی کو دیجاتی ہے، میرے لئے قابل قبول نہیں اور اس سلسلہ میں میں نے وحی سے بحث کی تھی تاکہ وہ لوگ جو قرآن کو محض اس دلیل پر " منطوق ربانی " کہتے ہیں کہ اسے " وحی یوحیٰ " کہا گیا ہے، اچھی طرح سمجھ لیں کہ قرآن مجید کو وحی کا نتیجہ سمجھنا اس کو مستلزم نہیں کہ اسے ' خدا کا کلام ' سمجھا جائے۔

وحی والہام کا لفظ کلام مجید میں ہر جگہ فطری ذہانت وافتاد یا طبعی صلاحیت کے معنے میں مستعمل ہوا ہے اور اس لئے قرآن کا " وحی یوحیٰ " ہونا صرف یہ معنی رکھتا ہے کہ وہ رسول اللہ کے اس غیر معمولی فطری استعلاء یا دماغی تفوق کا نتیجہ ہے جو خدا نے ان میں ودیعت کردیا تھا اور جس کی بناء پر استعارتاً کہا جاسکتا ہے کہ رسول اللہ کا قول گویا عین خدا کا ارشاد ہے ــــ کلام مجید کو " کلام ربانی " کہنے کی سب سے بڑی روایتی دلیل یہی تھی اور اسی کو میں نے پیش کردیا تھا۔ دوسری دلیلوں سے میں نے اس لئے بحث نہیں کی کہ وہ اس سے زیادہ کمزور ہیں۔ تاہم چونکہ ذکر آگیا ہے اس لئے ان کمزور دلیلوں میں سب سے قوی دلیل کی حقیقت بھی معلوم کرلیجئے۔ دلیل یہ ہے کہ قرآن کا جواب کسی انسان سے ممکن نہیں، اس لئے وہ خدا کا کلام ہے۔ اس سلسلہ میں جو آیات پیش کی جاتی ہیں وہ یہ ہیں:۔

سورۂ بقر:۔ "**ان کنتم فی ریب مما نزلنا علےٰ عبدنا فاتوا بسورۃ من مثلہ**"

(جو کچھ ہم نے اپنے بندہ پر نازل کیا ہے اگر اس میں تمھیں شک ہے تو اس کے مثل ایک سورۃ ہی پیش کردو)

سورۂ یونس :۔ ام یقولون افتراہ۔ فاتوا بسورۃ من مثلہ وادعوا من استطعتم من دون اللہ ان کنتم صادقین۔

(کیا وہ یہ کہتے ہیں کہ قرآن رسول نے بنایا ہے؟ اگر وہ سچے ہیں تو ایسی ہی ایک سورت بنا لائیں اور خدا کے علاوہ جس کی مدد چاہیں وہ بھی حاصل کرلیں)

سورۂ ہود میں بھی تقریباً یہی الفاظ ہیں لیکن یہاں بجائے ایک سورۃ کے دس سورتیں لانے کا مطالبہ کیا گیا ہے

ام یقولون افتراہ ؟ قل فاتوا بعشر سورہ مثلہ

سورۂ بنی اسرائیل میں پورے قرآن کا مثل پیش کرنے کا مطالبہ ہے اور دعویٰ کیا گیا ہے کہ اگر تمام دنیا کے انس و جن شریک ہوں تو بھی ایسا ہونا ممکن نہیں :۔

قل لئن اجتمعت الانس والجن علی ان یاتوا بمثلہ ہذا القرآن لا یاتون بمثلہ

آپ نے دیکھا کہ ایک جگہ پورے قرآن کے جواب کا مطالبہ کیا گیا ہے، دوسری جگہ دس سورتوں کا اور تیسری جگہ صرف ایک سورت کا۔ اگر آپ ظاہر معنی لیں گے تو ان آیات میں معنوی تعارض پیدا ہو جائے گا اور بحث یہ آن پڑے گی کہ کیا پورے قرآن سے کم، یا دس سورتوں یا ایک سورۃ سے کم کا جواب ممکن ہے۔

ان آیات کو پڑھکر ایک یا دس یا پورے کی بحث کرنا حماقت ہے۔ مفہوم وہی ایک ہے کہ بہ حیثیت مجموعی قرآن جس چیز کا نام ہے اس کا جواب پیش نہیں کیا جا سکتا، البتہ انداز بیان جداگانہ ہے۔ لیکن اس دعوے سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ قرآن کا جواب اس لئے نہیں ہو سکتا کہ وہ خدا کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ ہیں۔ کیونکہ قرآن میں شاید ہی کوئی لفظ ایسا ہو جو رسول اللہ سے پہلے عربی زبان میں نہ پایا جاتا ہو۔ قرآن کے تمام الفاظ اور قرآن کا انداز تحریر پہلے بھی پایا جاتا تھا، لیکن قرآن کوئی نہ تھا۔

اس سے معلوم ہوا کہ قرآن کو "خدا کا کلام" یا "معجزہ" کہنا اس بناء پر نہ تھا کہ اس کے الفاظ میں کوئی خاص بات ہے، بلکہ اس حیثیت سے یہ دعویٰ کیا گیا تھا کہ جو راہِ عمل قرآن نے دکھائی ہے یا جو درس اخلاق و ترقی اس نے پیش کیا ہے، اس میں اصولاً کسی اضافہ کی گنجایش نہیں۔

یہ درست ہے کہ قرآن میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ رسول اللہ نے قرآن نہیں بنایا (ام یقولون افتراہ ؟) لیکن اس کے معنے صرف یہ ہیں کہ رسول نے جو کچھ قرآن میں کہا ہے وہ ہوائی باتیں نہیں ہیں (ما ینطق عن الھویٰ) بلکہ وہ نتیجہ ہے وحی یا اس تائید غیبی کا جو مخصوص ذہنی بلندی کی صورت میں رسول اللہ کی فطرت میں خدا کی طرف سے ودیعت کی گئی تھی۔

اب الفاظ "لوحِ محفوظ" کو لیجئے۔ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ قرآن پہلے سے کسی تختی میں منقوش تھا

حالانکہ اسے عقل انسانی باور نہیں کر سکتی کہ خدا نے کسی مادی تختی پر کسی کاتب یا نقاش کی طرح قرآن کو پہلے لکھ لیا ہو اور پھر اسے رسول پر نازل کیا ہو، اس عقیدہ کے تحت خدا اور اس کے انتظام کو یکسر "مادیات" سے متعلق کرنا پڑیگا اور شاید ہی کوئی مسلمان ایسا ہو جو خدا یا اس کے احکام کا تصور مادی چیزوں کی طرح جائز سمجھتا ہو۔

آپ نے غور نہیں کیا کہ لفظ لوح، بغیر الف لام کے استعمال کیا گیا ہے۔ اگر واقعی کوئی مخصوص تختی مراد ہوتی تو بجائے لوح کے اللوح (الف لام کے ساتھ) استعمال کیا جاتا۔ اس لئے میری رائے میں قرآن مجید کا لوح محفوظ میں منقوش ہونا بالکل وہی معنی رکھتا ہے جیسے ہم یہ کہیں کہ فلاں بات "پتھر کی لکیر" ہے اور اس سے وہ مفہوم پیدا نہیں ہوتا جو آپ کے ذہن میں ہے۔

اگر آپ "لوحِ محفوظ" کے معنی وہی لیتے ہیں جو عام تختی کے ہیں، تو کوئی وجہ نہیں کہ آپ "ید اللہ فوق ایدیہم" میں ید کے معنے ہاتھ کے نہ لیں لیکن اگر یہاں ید کے معنی قدرت کے لیتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ لوح میں محفوظ ہونے کے معنے "ایک مضبوط و اٹل قانون" نہ سمجھے جائیں۔ علاوہ اس کے اگر آپ نے لوح کے معنی وہی قرار دئے جو عام طور پر سمجھے جاتے ہیں، تو پھر اس عقیدہ کی صحت میں کیا کلام ہو سکتا ہے کہ طوبیٰ ایک درخت ہے جس میں اتنی ہی پتیاں ہیں جتنے انسان اور ہر پتی پر ایک انسان کی پیدایش و وفات کی تاریخ اور قسمت کی کیفیت درج ہے جب انسان مرتا ہے تو یہ پتہ ٹوٹ کر گر جاتا ہے۔ آپ کا یہ فرمانا کہ ہو سکتا ہے کہ یہود و نصاریٰ کی روایتیں لوحِ منقوشش کے متعلق غلط ہوں اور کلام مجید کے متعلق صحیح، کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اگر یہ صحیح ہے کہ قرآن لوحِ محفوظ میں منقوش ہے تو پھر یہود و نصاریٰ کا بیان ان کی کتابوں کے متعلق کیوں غلط سمجھا جائے۔ جس طرح قرآن منقوش ہو سکتا ہے، اور کتابیں بھی ہو سکتی ہیں۔

آخرت کے متعلق جو آیت آپ نے پیش کی ہو بیشک اس میں ثواب دنیا اور ثواب آخرۃ دو چیزیں علحدہ علحدہ بیان کی گئی ہیں لیکن بحث تو عذاب و ثواب کی اس مادی صورت سے ہے جو عام طور پر بیان کی جاتی ہے۔ دُنیا و مادرا، دنیا یقیناً دو علحدہ علحدہ چیزیں ہیں، لیکن دُنیا کے علاوہ کسی اور عالم کا پایا جانا اس کو مستلزم نہیں کہ حشر و نشر میزان و صراط، دوزخ و جنت وغیرہ کے بیان کو بیان تمثیلی نہ سمجھا جائے۔ چنانچہ بعض اکابر اسلام نے دوزخ و جنت کے عذاب و ثواب کو بالکل روحانی چیز قرار دیا ہے اور جسمانی حشر و نشر سے انکار کر دیا ہے۔

تصحیح

گزشتہ ماہ کے نگار میں غلطی سے "بعض حیرتناک سیاسی انکشافات" اڈیٹر کے نام سے شایع ہو گیا حالانکہ یہ مضمون جناب محمد عتیق صاحب صدیقی کا ہے، ناظرین تصحیح کر لیں۔ - منیجر نگار

مطبوعات موصولہ

ادب اور زندگی پروفیسر مجنوںؔ گورکھپوری کے سات انتقادی مقالات کا مجموعہ ہے جسے ایوان اشاعت گورکھپور نے شایع کیا ہے۔ اس میں سے بعض مقالات ایسے ہیں جن کے کچھ حصے دہلی ریڈیو اسٹیشن سے اور کچھ لکھنؤ سے نشر ہو چکے ہیں۔

پروفیسر مجنوںؔ کی صحافتی زندگی کے آغاز کو کافی زمانہ ہو چکا ہے لیکن اس دوران میں جو خدمت انھوں نے اردو علم و ادب کی انجام دی ہے، وہ کافی سے زیادہ ہے۔ کمیت کے لحاظ سے بھی اور کیفیت کے اعتبار سے بھی۔ وہ ایک بے چین قسم کا دماغ رکھنے والے انسان ہیں اور اسی لئے ان کے افکار ذہنی میں ایک مخصوص ندرت و جسارت پائی جاتی ہے۔

ابتدا میں جب انھوں نے فسانے شروع کئے تھے اسوقت بھی یہ حقیقت اہل نظر سے پوشیدہ نہ تھی کہ انکا فطری رجحان ان کو کسی نہ کسی وقت "انتقادیات" کی طرف مایل کر دے گا، چنانچہ جب انھوں نے رسالہ "ایوان" جاری کیا تو ان کے لئے یہ راہ متعین ہو گئی اور اس کے بعد سے جو کچھ انھوں نے لکھا وہ اُردو کے انتقادی لٹریچر میں بالکل نئی چیز تھا۔

مجنوںؔ اپنے مطالعہ کے لحاظ سے فلسفی بھی ہیں اور ادیب بھی اس لئے ان دونوں کے امتزاج نے ان کے رنگِ انتقاد میں گہرائی کے ساتھ ساتھ، شگفتگی و دلکشی بھی پیدا کر دی ہے۔ خصوصیت کے ساتھ جب وہ کسی ایسے موضوع پر قلم اُٹھاتے ہیں جس میں انھیں ایک ([illegible]) اسکول کے آرٹسٹ کی طرح اظہارِ خیال کا موقع مل جاتا ہے تو اُن کے اشارات بہت پر لطف اور گرانمایہ ہوتے ہیں۔ اس مجموعہ میں جتنے مقالات شایع کئے گئے ہیں، ان سب میں یہی کیفیت پائی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ نظیرؔ اور حالیؔ پر جو کچھ لکھا ہے وہ بھی اس خصوصیت سے خالی نہیں (گو نہ اب حالیؔ موجود ہیں نہ نظیر اکبر آبادی)

"ادب کا تعلق زندگی سے" کیا ہے۔ گو تاثرات کے لحاظ سے انسانی تفکر کے لئے یہ کوئی نئی بات نہ ہو، لیکن بحث و گفتگو کے لئے اسے ایک مستقل موضوع بنا دینا، بالکل تازہ چیز ہے۔ اس مجموعہ کے اکثر مقالات اسی خیال کو سامنے رکھکر یکجا کئے گئے ہیں اور غالباً یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اُردو میں شاید ہی اتنا مفید مواد اس موضوع پر کہیں اور مل سکے۔

حقیقت یہ ہے کہ علوم مغربی کے مطالعہ سے مجنوںؔ نے خود جتنا صحیح فایدہ اُٹھایا ہے وہ کم کسی کو نصیب ہوتا ہے

اور دوسروں کو جتنا فایدہ پہونچایا ہے اس کی دوسری مثال تو مجھے نظر ہی نہیں آتی -

تاریخ ادب اُردو پہلا حصہ یہ کوئی جامع تاریخ نہیں ہے بلکہ طلبہ کے لئے یا اُن حضرات کے لئے جو حوالکی بڑی بڑی کتابوں سے فایدہ نہیں اُٹھا سکتے، یہ سلسلہ شروع کیا گیا ہے -

ابتدا میں زبان اُردو کی مختصر تاریخ درج ہے اور اس کے بعد آغازِ ادب سے لیکر اسوقت تک کے مشاہیر کا تذکرہ پایا جاتا ہے -

گزشتہ دس سال کے اندر ادارۂ ادبیات اُردو کی یہ ساٹھویں تالیف ہے جس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ یہ ادارہ اس وقت تک کتنی ادبی خدمت انجام دے چکا ہے - اس مرتبہ حیدرآباد پہونچکر میں نے خود اس ادارہ کو دیکھا اور اس کے اہتمام و انصرام کو دیکھ کر بہت متاثر ہوا - ڈاکٹر محی الدین قادری زور اس ادارہ کے روح و رواں ہیں اور حیدرآباد کی جدید نسل میں، جو ولولہ زبان کی خدمت کا پایا جاتا ہے اس میں بڑا حصہ ڈاکٹر زور کی سعی و کوشش کا ہے - اس کتاب کی قیمت عہ ہے -

محمد حسین آزاد یہ کتاب بھی ادارۂ ادبیات اُردو حیدرآباد نے شایع کی ہے اس میں مولانا آزاد مرحوم کے تمام حالات زندگی کو یکجا کر کے ان کی تصانیف پر تبصرہ کیا گیا ہے اور شاعری پر بھی -

یہ تالیف جہاں بانو بیگم (نقوی) ام - اے کی ہے اور اس لحاظ سے کہ ایک خاتون کی فکر و کاوش کا نتیجہ ہے بہت زیادہ قابل قدر ہے - ادارہ کا شعبہ نسواں اس سے قبل اور بھی کئی کتابیں خواتین حیدرآباد کی شایع کر چکا ہے -

قیمت دو روپیہ ہے اور ملنے کا پتہ ادارۂ ادبیات اُردو حیدرآباد دکن -

آبدوز اور سرنگ - پانی کی کہانی ادارۂ ادبیات اُردو حیدرآباد نے ایک سلسلہ چھوٹے چھوٹے رسالوں کی اشاعت کا شروع کیا ہے تاکہ سائنس کے ضروری مسایل عام فہم اُردو میں لوگوں کے سامنے پیش کئے جائیں - چنانچہ یہ دونوں رسالے اسی سلسلہ کے ہیں - ایک میں آبدوز اور سرنگوں کی حقیقت سے بحث کی گئی ہے اور دوسرے میں پانی کے متعلق تمام ضروری اطلاعات یکجا کر دی گئی ہیں - جابجا نقوش و تصاویر کے ذریعہ سے ان مسایل کو اور زیادہ عام فہم بنانے کی کوشش کی گئی ہے - اس میں شک نہیں کہ یہ سلسلہ بہت مفید ہے اور اُردو میں اپنی نوعیت کے لحاظ سے بالکل پہلی کوشش ہے -

قواعد عربی حصۂ اول مولوی محمد ہبۃ اللہ صاحب نے جو گورنمنٹ سٹی کالج حیدرآباد میں عربی کے لکچرر ہیں عربی زبان کے قواعد پر یہ پہلا حصہ ابتدائی تعلیم کے لئے شایع کیا ہے جو بہت سہل و مفید معلوم ہوتا ہے - عربی زبان سے مسلمانوں کی بیگانگی بہت افسوسناک بات ہے، حالانکہ اگر وہ چاہیں تو تھوڑا سا وقت نکال کر اسی قسم کی کتابوں کی مدد سے بہت کم مدت میں خاص مہارت اس زبان میں بھی پیدا کر سکتے ہیں -

امید ہے مولوی صاحب موصوف اس سلسلہ کو جلد مکمل کر دیں گے۔

جلوۂ زار اظہر جناب سید دلدار حسین رضوی اظہر الٰہ آبادی کی چند غزلوں کا مجموعہ ہے۔ جناب اظہر حیدرآباد کے محکمۂ تعلیم میں ملازم ہیں اور وہاں کے اہل علم میں خاص عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں، تاریخ گوئی میں آپ کو غیر معمولی ملکہ حاصل ہے اور شعر و شاعری سے خاص لگاؤ ہے اس کی قیمت ۸ھر ہے اور ملنے کا پتہ ۱۶۷، بازار نور الامراء حیدرآباد دکن۔

تذکرۃ الہند - یادگار رضائی حکیم رضا علی خاں مرحوم کی تالیف ہے جس میں دکن اور ہندوستان کی جڑی بوٹیوں کے افعال و خواص نہایت محنت سے یکجا کر دئے گئے ہیں۔ یہ کتاب دو جلدوں میں شایع کی گئی ہے اور طباعت و کتابت کے لحاظ سے بھی نہایت پسندیدہ ہے۔ انجمن اطبائے یونانی حیدرآباد نے اس کتاب کو شایع کرکے واقعی فن طب کی بڑی خدمت انجام دی ہے۔ کاش یہ اردو میں ہوتی اور عوام بھی اس سے فایدہ اٹھا سکتے۔

ان دونوں حصوں کا حجم ۱۰۰۰ صفحات سے زیادہ ہے اور قیمت دس روپیہ۔

پریم کہانیاں ڈاکٹر عباس علی خاں لمعہ کے بعض ادبی ٹکڑوں کا مجموعہ ہے، جو ٹیگور کے رنگ میں لکھے گئے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے مقالات بعض ادبی رسایل میں شایع ہوتے رہتے ہیں اسلئے وہ بزم ادب میں کوئی نووارد شخص نہیں ہیں۔ ان کے خیالات پاکیزہ ہیں اور زبان شستہ۔ مکتبۂ ابراہیمیہ حیدرآباد سے یہ کتاب مل سکتی ہے۔

مقدمۂ زندگانی محمد زندگانی محمد، محمد حسین ہیکل مصری کی مشہور تالیف ہے جس پر خود انھوں نے ایک معرکۃ الآرا مقدمہ بھی لکھا ہے۔ یہ کتاب اسی مقدمہ کا ترجمہ ہے جس میں قرآن مجید اور رسالت پر جدید اصول انتقاد کو سامنے رکھکر بحث کی گئی ہے اور ان دونوں کی اہمیت کو روایت و درایت دونوں سے ثابت کیا گیا ہے۔ ملنے کا پتہ:- دفتر امت مسلمہ امرتسر ہے اور قیمت ۱۰ر۔

رہنمائے تاریخ اردو فن تاریخ گوئی کی کتاب ہے جسے حاجی محمد عبد القادر وکیل بنارس نے مرتب کیا ہے اس میں تقریباً ۵۰ شعراء کی تاریخ وفات کے قطعات درج ہیں اور اس سلسلہ میں تاریخگوئی کے تمام مروجہ طریقوں کو بھی بتا دیا گیا ہے۔ قیمت ۱۲ر ہے۔

صبح نشاط مجموعہ ہے جناب نظیر لودھیانوی کی نظموں کا۔ جناب نظیر بہت کہنہ مشق شاعر ہیں اور ان کی نظمیں اکثر رسایل میں شایع ہوتی رہتی ہیں۔ آپ ڈاکٹر اقبال مرحوم کے شعر و فلسفہ سے بہت متاثر ہیں اور آپ نے جو کچھ کہا ہے نظریۂ اقبال ہی کو سامنے رکھ کر کہا ہے۔

آپ کی نظموں میں استواری ہے اور ادائے بیان میں زور و خودداری - اس مجموعہ میں، ادبی، فطری، مذہبی و معاشرتی سبھی قسم کی نظمیں نظر آتی ہیں اور ان سب میں جناب نظیر کے سچے تاثرات جھلک رہے ہیں -

طباعت و کتابت وغیرہ بہت خوب ہے اور قیمت تین روپیہ - ملنے کا پتہ :- نیو اسٹریٹ لودھیانہ -

سحرِ حلال جناب درویش میرٹھی کی نظموں اور غزلوں کا مجموعہ ہے - جناب درویش نوجوان شاعر ہیں اور جو کچھ کہتے ہیں، تاثر کے ساتھ کہتے ہیں - اس مجموعہ کی اشاعت سے قبل اپنے اور میرے ایک مشترک دوست کے ذریعہ سے انھوں نے اس مجموعہ پر میری رائے حاصل کی تھی جو ابتدا میں دیدی گئی ہے - یہ کتاب مجلد شایع کی گئی ہے اور جناب درویش محلہ کوٹلہ میرٹھ سے ایک روپیہ میں ملسکتی ہے -

اُردو کا پہلا شاعر اور پہلا مدوّن پروفیسر اویس احمد ادیب نے ولی دکھنی کو اس عنوان سے پیش کیا ہے اور اس کے تمام اصناف نظم سے بحث کی ہے - ولی سے پہلے کے شعراء کو وہ برج بھاشا کے گننے والوں میں جگہ دیتے ہیں اس لئے اُردو کے پہلے شاعر ہونے کی خصوصیت انکے نزدیک صرف ولی کو حاصل ہے - کتاب مطالعہ کے قابل ہے اور افادہ سے خالی نہیں -

قیمت ۱۲ ؍ ہے اور ملنے کا پتہ "مصنف حلیم مسلم کالج کانپور -

خوابِ بیداری آخوند ملا فتح علی شیرازی کی مشہور کتاب "خواب شگفت" کا ترجمہ ہے جسے سید یوسف حسین صاحب زیدی نے پیش کیا ہے - اس کتاب میں تمثیلی انداز سے تمام امم سابقہ و حاضرہ کے اجتماعی حالات پر روشنی ڈالی گئی ہے اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ مذاہب میں اوہام پرستی کو کتنا دخل ہو گیا ہے - خدا کے روبرو تمام انبیاء یکے بعد دیگرے بلائے جاتے ہیں اور اُن کے سامنے ان کی اُمتوں کی بدعتوں کا بیان کر کے محاسبہ کیا جاتا ہے، اخیر میں حضرت خاتم النبین کو بھی بلایا جاتا ہے اور تمام نزاعات مذہبی کو پیش کر کے پوچھا جاتا ہے کہ یہ کیا ہے - کتاب نہایت دلچسپ و مفید ہے اور وہ لوگ جو مذاہب کے باب میں زیادہ آزاد رائے رکھتے ہیں ان کے لئے اس کا مطالعہ ضروری ہے -

ترجمہ بہت صاف و سلیس کیا گیا ہے - ملنے کا پتہ سید یوسف حسین زیدی - کوچہ میر انیس، لکھنؤ - قیمت ۸ ؍

طلسمِ عمل ترجمہ ہے ڈیل کارنگی کی مشہور کتاب کا جس کے ۸ لاکھ ۳۸ ہزار نسخے ستمبر ۳۹ء تک فروخت ہو چکے تھے - کارنگی نفسیات کا مشہور عالم ہے اور اس نے اپنے تجربات کی بناء پر اس کتاب میں بتایا ہے کہ ایک انسان کیونکہ کامیاب زندگی بسر کر سکتا ہے -- کتاب بہت دلچسپ ہے اور ترجمہ بھی نہایت شگفتہ و سلیس کیا گیا ہے ملک کو سید مجتبیٰ حسن صاحب بی - اے کا ممنون ہونا چاہئے کہ انھوں نے اس کتاب کا ترجمہ کر کے نفسیات کے عملی اصول اُردو میں روشناس کرائے -- کتاب مجلد شایع ہوئی ہے اور ۱۲ ؍ میں دفتر نگار سے مل سکتی ہے -

خوددار خاتون ترجمہ ہے آسکر وائلڈ کے ایک ڈرامہ کا جس میں وکٹورین عہد کی معاشرت کو پیش کیا گیا ہے۔ آسکر وائلڈ کی تصانیف کا ترجمہ آسان نہیں، لیکن جناب محمد مرزا صاحب دہلوی نے بہت کامیابی سے یہ خدمت انجام دی ہے۔

قیمت ۸؍ ہے اور ملنے کا پتہ دائرۂ ادبیہ۔ دریا گنج۔ دہلی۔

نشا ڈرامہ ہے جناب کشن پرشاد کول کا لکھا ہوا۔ اس میں انھوں نے بتایا ہے کہ ہماری معاشرت عورتوں کے باب میں کتنی بیرحم واقع ہوئی ہے اور ہم خدا کی اس مخلوق کے ساتھ کتنی بدسلوکی کرتے ہیں۔

اس کے مصنف بہت کہنہ مشق انشا پرداز ہیں اور جو کچھ لکھتے ہیں اس میں خاص قسم کی متانت و سنجیدگی پائی جاتی ہے، چنانچہ یہ کتاب بھی ان خصوصیات سے خالی نہیں۔ پلاٹ اور کردار سب میں دلچسپی پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور یہ کوشش ہر جگہ کامیاب نظر آتی ہے۔ قیمت ایک روپیہ اور ملنے کا پتہ لیڈر پریس الہ آباد۔

پیام کیف مرزا احسان احمد صاحب وکیل اعظم گڈھ کی غزلوں کا مجموعہ ہے۔ مرزا صاحب گو پیشہ ور شاعر نہیں ہیں، لیکن اپنے فکر و احساس کے لحاظ سے پکے شاعر ہیں۔ جس کا حال لوگوں کو اسوقت معلوم ہو گیا تھا جب کلام اصغر پر ان کا تبصرہ شایع ہوا تھا۔ یہ اصغر مرحوم کی شاعری سے بہت متاثر ہیں لیکن ان کا کلام اُن خامیوں سے پاک ہے جو اصغر کے کلام میں پائی جاتی ہیں۔ فلسفہ و تصوف غزل کا دشمن ہے، لیکن اگر سلیقہ و تاثر کے ساتھ ان کا استعمال کیا جائے تو غزل میں، ایک خاص رنگ پیدا ہو جاتا ہے جو آجکل مقبول ہے۔

احسان صاحب کی شاعری میں فلسفہ و تصوف دونوں ہیں، لیکن دونوں کا صرف احتیاط سے کیا گیا ہے۔
یہ کتاب جناب مصنف سے اعظم گڈھ کے پتہ پر ۸؍ میں ملسکتی ہے۔

گلستانِ شرف دیوان ہے سید ابو الفتح محمد شرف الدین متخلص بہ شرف رئیس ڈھاکہ کا جس میں غزلیں، قصاید، سلام اور سہرا وغیرہ سبھی کچھ ہے، لیکن ایک رئیس کا کلام جیسا ہوا کرتا ہے ویسا ہی ہے، کوئی خاص بات کسی چیز میں نظر نہیں آتی۔ البتہ لکھائی چھپائی وغیرہ میں خاص اہتمام سے کام لیا گیا ہے۔ قیمت ایک روپیہ۔

مضامین محمد علی حصۂ دوم جنھیں محمد سرور صاحب استاذ جامعۂ ملیہ دہلی نے مرتب کیا ہے۔ یہ مجموعۂ مضامین گویا ہندوستان کی گزشتہ ۲۰ سال کی سیاسیات کی تفسیر ہے جس میں تاویلی یا روایتی کسی پہلو کو نہیں چھوڑا ہے۔ ان مقالات کی معنویت کے متعلق صرف اس قدر کہہ دینا کافی ہے کہ "مولانا محمد علی" کے دماغ کا نتیجہ ہیں اور حسنِ ظاہری کی ضمانت کے لئے مکتبۂ جامعہ کی نسبت کافی ہے۔

کتاب مجلد شایع ہوئی ہے اور ضخامت تقریباً ۵۰۰ صفحات۔

اسلام کیسے شروع ہوا یہ کتاب بھی مکتبۂ جامعہ نے شایع کی ہے۔ یہ کتاب بچوں کے لئے لکھی گئی ہے جس میں جناب رسالتمآب کی سیرت کو نہایت سادہ زبان میں پیش کیا گیا ہے۔

کتاب مجلد ہے اور قیمت ۸؍

جوہر عبدالحق نمبر جامعۂ ملیہ کے طلبہ نے رسالۂ جوہر کا یہ نمبر مولوی عبدالحق کی ستر ویں سالگرہ کے موقع پر شایع کیا ہے۔ مولوی صاحب موصوف نے اردو ادب کی جتنی گرانقدر خدمات انجام دی ہیں، ان کا اجمالی علم تو ہر شخص کو حاصل ہے لیکن ضرورت تھی کہ ان کو تفصیل کے ساتھ قلمبند کیا جاتا۔ اس لئے اہل ملک کو "ارباب جوہر" کا ممنون ہونا چاہئے کہ انھوں نے اس فرض کو نہایت خوبی سے انجام دیا۔ علاوہ ان مقالات کے جن کا تعلق مولوی عبدالحق صاحب سے ہے، دوسرے ادبی مقالات بھی اس میں اچھے اچھے لکھنے والوں کے نظر آتے ہیں۔

یہ نمبر مجلد شایع کیا گیا ہے اور قیمت ۸؍ ہے۔

Our countrymen abroad انگریزی تصنیف ہے جناب دھرم یاش دیو کی جس میں انھوں نے نہایت تفصیل کے ساتھ بتایا ہے کہ دوسرے ملکوں میں ہندوستانیوں کی کیا حالت ہے اور وہ کس حال میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ کتاب نہایت محنت و قابلیت سے لکھی گئی ہے۔ قیمت درج نہیں ہے۔

ملنے کا پتہ:۔ سکریٹری آل انڈیا کانگرس کمیٹی سوراج بھون الہ آباد ہے۔

نازی ازم جناب عبدالرحیم شبلی (بی کام) کی تالیف ہے جس میں نازی تحریک کی تاریخ ابتدا سے اسوقت تک درج کی گئی ہے۔ اس کے مولف دنیائے صحافت میں اس سے پہلے بھی اپنے معاشی مقالات کی وجہ سے کافی شہرت حاصل کر چکے ہیں۔

اس زمانہ میں جبکہ اس نوع کے لٹریچر کی ضرورت ہے، مولف نے یہ کتاب لکھ کر اردو ادب کی نہایت برمحل خدمت انجام دی ہے۔ وہ لوگ جو ہٹلر اور اس کی نازی تحریک کا مطالعہ ہر پہلو سے کرنا چاہتے ہیں ان کے لئے اس کا مطالعہ فایدہ سے خالی نہیں۔ قیمت ۲؍ ملنے کا پتہ۔ دارالادب پنجاب بارود خانہ لاہور۔

"نگار" جولائی ۱۹۴۰ء

کی عدم وصولی کی اطلاع اگر آپ اب کر رہے ہیں تو اطلاع کے ساتھ پانچ پیسے کے ٹکٹ بھی بھیجئے ورنہ پرچہ دفتر سے ارسال نہ ہوگا۔ منیجر نگار۔

دُنیا میں صرف ایک مُلحد ہے اور ایک مُسلمان!

مُلحد: نیاز فتحپوری اور مُسلمان: عبدالماجد دریابادی ——— یہ نظریہ یا استقصاء میرا نہیں ہے، بلکہ اسی شخص کی باتوں سے سمجھا ہے جسے میں نے دنیا کا صرف ایک مسلمان کہا ہے۔

یقیناً حیرت کی بات ہے کہ خدا کی اتنی بڑی آبادی میں کفر و اسلام کی نیابت اس قدر محدود و مختصر ہو، لیکن عبدالماجد کی رائے یہی ہے اور کسی شخص کی ذاتی رائے کو یوں بغیر سوچے سمجھے غلط کہہ دینا کم از کم مجھ ایسے مُلحد کے نزدیک نہایت نامعقول بات ہے، گو عبدالماجد ایسا مسلمان اسی ضد و رقابت کو اسلام سمجھتا ہو۔

دُنیا میں بڑے بڑے فلسفی گزرے ہیں اور بڑے بڑے پیچیدہ فلسفے انھوں نے پیش کئے ہیں، لیکن اس زمانہ کے ایک ہندی فیلسوف، ایک ماہر علم کلام نے جس کے مسقط الراس ہونے کا فخر دریاباد کو حاصل ہے، کفر و اسلام کی دیرینہ نزاع کا نہایت ہی سادہ و مختصر فلسفہ پیش کیا ہے، جس کے سمجھنے کے لئے کسی چیز کی ضرورت نہیں سوائے اسکے کہ عقل کچھ کم ہو۔

یہ فیلسوف کہتا ہے کہ اسلام نام ہے صرف اُس چیز کا (میں نے چیز کا لفظ اس لئے استعمال کیا کہ اس کا بتایا ہوا اسلام واقعی عجیب "چیز" ہے) جو کسی کی سمجھ میں نہ آئے اور ہر وہ چیز جو سمجھ میں آجائے کیسے غیر اسلامی ہے اس مسئلہ کو اور زیادہ مختصر کر کے گویا یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ جو عبدالماجد کہے وہ اسلام ہے اور جو نیاز فتحپوری کہے وہ کفر و الحاد ہے —— کیا دُنیا میں اس سے زیادہ صاف و صریح، اس سے زیادہ آسان تشریح اسلام و کفر کی کوئی اور ہوسکتی ہے؟ غالباً نہیں۔ لیکن اس سلسلہ میں یہ بات ضرور غور طلب رہجاتی ہے کہ وہ کیا کہتے ہیں اور میں کیا کہتا ہوں۔

سب سے پہلا فرق میرے اور اُن کے درمیان یہ ہے کہ میں ہر گفتگو میں انسانیت کو پیش نظر رکھتا ہوں اور وہ وحشت و درندگی کو —— وہ اگر میری زبان سے کوئی بات ایسی سن لیتے ہیں جو ان کے زعم یا عقیدہ کے خلاف ہے تو غصہ سے ان کا چہرہ سرخ ہو جاتا ہے، اور وہ مجھے مرتد و ملحد کے نام سے یاد کرنے لگتے ہیں اور میں جب اُن سے لایعنی باتیں سنتا ہوں تو مجھے ان پر رحم آتا ہے اور میں صرف انھیں احمق سمجھنے پر کفایت کرتا ہوں۔ گو اس کا فیصلہ دشوار ہو کہ دُنیا میں ملحد ہو کر جینا بہتر ہے یا احمق رہکر!

خیر، یہ تو میرے اُن کے اختلاف کے نہایت سطحی (ظاہری حدود ہیں، جن پر نہ آپ کو زیادہ توجہ کرنے کی ضرورت ہے اور نہ مجھے زیادہ اصرار کی - اب آیئے ذرا معنویت کی طرف آئیں - میں اسوقت مُسلم و مُلحد کی اصطلاحات پر فقہی حیثیت سے کوئی گفتگو کرنا مناسب نہیں سمجھتا، بلکہ میرے اور اُن کے درمیان جو دیرینہ تعلق "اہرمن ویزداں" کا سا چلا آرہا ہے اس کو سامنے رکھ کر اس مسئلہ کو پیش کرنا چاہتا ہوں -

سب سے پہلی چیز جو کفر و اسلام کے درمیان مابہ النزاع یا (زیادہ صحیح الفاظ میں) مابہ الاشتراک ہے، وہ خدا کا تصور ہے - اسلام کا دعویٰ ہے اور بالکل صحیح دعویٰ ہے کہ اس نے وحدانیت کا جو نظریہ پیش کیا ہے وہ مادیت کے لگاؤ سے یکسر پاک ہے، یعنی اس تصور میں کوئی بعید ترین شائبہ بھی مادیت کا نہیں پایا جاتا - یوں اگر عبدالماجد سے پوچھا جائے تو وہ بھی غالباً اس کا اعتراف کریں گے، لیکن اگر انھیں معلوم ہو جائے کہ میں بھی یہی کہتا ہوں تو انھیں وحدانیت کے اس عقیدہ میں بھی کفر و الحاد کی جھلک نظر آنے لگے گی - آپ اس کو مبالغہ نہ سمجھئے بلکہ جو کچھ عرض کرتا ہوں اس کے لئے دلایل بھی رکھتا ہوں -

میں کہتا ہوں کہ خدا "نطق و کلام" کی اُس صفت سے مبرا ہے جو تمام انسانوں میں پائی جاتی ہے اور قرآن مجید کو اس معنی میں "خدا کا کلام" کہنا، خدا کی توہین ہے اور تصورِ وحدانیت کے یکسر منافی - وہ یہ سنکر آگ ہو جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ نہیں قرآن کا ایک ایک لفظ، ایک ایک نقطہ "وحیٌ یُوحیٰ" ہے - میں کہتا ہوں بیشک قرآن مجید وحی ہے، الہام ہے لیکن اس معنے میں نہیں جو عام طور پر سمجھے جاتے ہیں بلکہ اس مفہوم میں جو قرآن سے متبادر ہے اور جب میں ثابت کرتا ہوں کہ "وحی الہام" سے مراد صرف فطری ذہانت یا طبعی صلاحیت ہے تو اس کے جواب میں مجھے گالیاں دینے لگتے ہیں -

کیسی تماشہ کی بات ہے کہ "یداللہ فوق ایدیہم" میں تو وہ ید (ہاتھ) کی تاویل کر کے اس کا مفہوم "قدرت وقوت" بتائیں (کیونکہ خدا مادیت سے مبرا ہے اور ہاتھ پاؤں کچھ نہیں رکھتا) لیکن قرآن مجید کے باب میں وہ خدا کا حلق و زبان بھی کچھ مان لیتے ہیں - یہاں تک کہ وحی کا مفہوم ان کے نزدیک "خدا کا کلام" قرار پاتا ہے اور "لوحِ محفوظ" کا مفہوم ایک جواہر کار تختی (واقعی تختی) جس پر یہ کلام ازل سے منقوش چلا آتا ہے اور خدا کا یہ ارشاد کہ "ماکان لبشر ان یکلمہ اللہ" (انسان کا یہ منصب نہیں کہ خدا اس سے کلام کرے) ان کو نظر نہیں آتا -

میں کہتا ہوں کہ قرآن مجید میں جو قصص بیان کئے گئے ہیں ان کا مقصود لوگوں میں اعتبار و بصیرت کی کیفیت پیدا کرنا ہے چنانچہ خدا فرماتا ہے :-

فاقصص القصص لعلہم یتفکرون ——— لقد کان فی قصصہم عبرۃ

لیکن عبدالماجد کہتے ہیں کہ نہیں کلام مجید تاریخ کی کتاب بھی ہے اور نہ تاریخی نقد و جرح کا ہدف بھی اسے بنایا جاسکتا ہے

میں کہتا ہوں کہ رسول کی عظمت اسی میں ہے کہ قرآن کو اشارۂ خداوندی کے ماتحت رسول کے ذہن و دماغ کا نتیجہ سمجھا جائے، ورنہ ان کی حیثیت ایک ایسے مصلح کی سی قرار پائے گی جو خود نہ کوئی اختیار رکھتا ہے اور نہ اتنی اہلیت کہ وہ تدبیر و مصلحت سے کام لیکر لوگوں کی رہنمائی کر سکے، لیکن عبدالماجد کا فیصلہ یہ ہے کہ رسول کی حیثیت صرف ایک پیامبر رساں کی سی ہے اور قرآن مجید کی رہبری و ہدایت میں خود انکی ذاتی یا طبعی صلاحیت کو کوئی دخل حاصل نہیں۔

میں کہتا ہوں کہ قرآن مجید کو معجزہ کہنا اسی وقت اہمیت رکھ سکتا ہے جب ہم اسے رسول اللہ سے یعنی ایک انسان سے منسوب کریں، ورنہ خدا کے کلام یا خدا کی کسی بات کا معجزہ کہنا کوئی معنی نہیں رکھتا، کیونکہ آفتاب کو سبھی آفتاب کہتے ہیں۔ اس میں نئی بات کیا ہے۔

عبدالماجد کہتے ہیں کہ "فاتوا بسورۃ من مثلہ" دلیل ہے اس بات کی کہ اس کا ایک ایک لفظ "منطوق خداوندی" ہے اور اس کا جواب نہیں ہو سکتا۔ میں کہتا ہوں کہ قرآن مجید کا کوئی لفظ ایسا نہیں جو پہلے سے عربی زبان میں نہ پایا جاتا ہو، اس لئے بجائے قرآن مجید کے عربی زبان ہی کو معجزہ کہنا زیادہ موزوں ہے۔ لیکن اگر معجزہ کا تعلق ہے آیات کے مفہوم سے ان تعلیمات سے جو ان آیات میں ظاہر کی گئی ہیں، تو میرا بھی مقصود یہی ہے اور اس صورت میں الفاظ قرآنی کے معجزہ یا کلام ربانی ہونے کی بحث قطعاً اٹھ جاتی ہے۔

میں کہتا ہوں کہ "نطق یا کلام" کا مفہوم اس وقت تک متعین ہی نہیں ہو سکتا جب تک ہم زبان، حلق، الفاظ وغیرہ کا تصور اس کے ساتھ شامل نہ کریں اور خدا یقیناً ان چیزوں سے پاک ہے ۔۔۔ مگر عبدالماجد کہتے ہیں کہ قرآن مجید کے الفاظ وہی ہیں جو خدا نے جبرئیل کے ذریعہ سے رسول اللہ کے سمع مبارک میں اس طرح القا کئے جس طرح ایک استاد اپنے شاگرد کو ہجے کر کر کے پڑھاتا ہے، خواہ ایسا سمجھنے کے لئے خدا کو حلق و زبان کا محتاج ہی کیوں نہ ماننا پڑے۔

یہ تو صرف کلام مجید کے متعلق میرے ان کے خیالات کا اختلاف تھا، اب اس سے ہٹ کر اور باتوں کو لیجئے:-

میں کہتا ہوں خدا بے نیاز مطلق ہے، وہ کسی کی پرواہ نہیں کرتا، وہ تاثر سے مستغنی ہے۔ عبدالماجد کہتے ہیں کہ وہ ہماری عبادتوں سے خوش ہوتا ہے اور نافرمانیوں سے برہم۔ گویا وہ دنیا کا کوئی انسانی بادشاہ ہے جسکی تعریف کیجئے تو انعام دیتا ہے اور نہ کیجئے تو دربار سے باہر نکال دیتا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ ہمارے اچھے اخلاق سے خدا کا خوش ہونا اور ہماری بداعمالیوں سے اس کا ناخوش ہونا صرف اس لئے ظاہر کیا جاتا ہے کہ انسان عرصہ سے دنیاوی بادشاہت کے نظام سے متاثر ہے اور اسی کی مثال کو سامنے رکھ کر اسے بہتر درس دیا جا سکتا ہے، ورنہ اس خوشنودی یا ناخوشنودی کا تعلق صرف ہمارے اعمال یا کردار کے ان نتائج سے ہے جو اسی دنیا کے اندر فلاح یا بربادی کی صورت میں ہمارے سامنے آجاتے ہیں۔

میں کہتا ہوں کہ دوزخ و جنت کا مفہوم یکسر روحانی مفہوم ہے اور حور و قصور، کوثر و سلسبیل، جہنم و فردوس صرف تمثیلی الفاظ ہیں جن سے معنوی راحت و تکلیف کو ظاہر کیا جاتا ہے، لیکن عبدالماجد کہتے ہیں کہ نہیں، حور سے مراد اسی قسم کی دنیاوی عورت ہے جس سے جنسی لطف اُٹھایا جاتا ہے اور عورت و حور میں زیادہ سے زیادہ اگر کوئی فرق ہو سکتا ہے تو صرف یہ کہ عورت کو سیر ہو جانے کے بعد تیس روپیہ کا مہر ادا کر کے طلاق بھی دیجا سکتی ہے اور حور سے علٰحدگی اختیار کرنے کی کوئی صورت نہیں۔

وہ کہتے ہیں کہ عذاب قبر، نکیرین کی گرز بازی، حشر و نشر، میزان و پل صراط وغیرہ کا وجود مادی حیثیت سے ماننا ضروری ہے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ تمام باتیں تمثیلی ہیں اور خدا نے انسان کو اتنا احمق پیدا نہیں کیا کہ وہ عالم مجاز میں آکر اپنی حقیقتوں کو واشگاف کرنا ضروری سمجھے۔ خدا لاکھوں گرے، روز بنتا بگڑتا رہتا ہے اور اس کا عالم خلق اتنا وسیع ہے کہ زمین ایسا حقیر کرہ اور اس کے حقیر باشندے، تو کیا اگر لاکھوں نظام شمسی روز تباہ ہوتے رہیں تو بھی اس کی کارگاہ کی رونق کو کوئی صدمہ نہیں پہونچ سکتا۔ اس لئے ہمارا حشر و نشر وغیرہ کا قایل ہونا اپنے آپ کو ناواجب اہمیت دیدینا ہے جس کو خدا کی عظمت کا صحیح تصور برداشت نہیں کر سکتا۔

میں کہتا ہوں کہ عبادت کا اصل مقصود اخلاق میں بلندی پیدا کرنا ہے، گویا عبادت ذریعہ و وسیلہ ہے نہ کہ اصل مقصود۔ عبدالماجد کہتے ہیں کہ صوم و صلوٰۃ خود اپنی جگہ اصل مقصود ہے اور نجات کے لئے کافی۔

یہ ہیں وہ چند اُصولی باتیں جن کے اختلاف پر عبدالماجد کے اسلام اور میرے الحاد کی بنیاد قایم ہے۔ میں تو انھیں غیر مسلم نہیں کہتا کیونکہ میرے نزدیک بعض عقاید کا اختلاف ایک شخص کو ملت اسلامی سے خارج نہیں کر سکتا لیکن میں ان کے نزدیک مرتد ہوں، ملحد ہوں اور اگر میرے عقاید واقعی ارتداد و الحاد ہیں (جس کا فیصلہ میں عبدالماجد سے نہیں بلکہ دُنیا کے دوسرے اہل علم و عقل سے چاہتا ہوں) تو میں نہایت خوشی سے اس کا اعتراف کرنے پر طیار ہوں۔

ہمارے دوست عبدالماجد ایک نہایت ہی خشک و عبوس قسم کے قنوطی انسان ہیں جن کے نزدیک زندگی نام ہے دنیا و اہل دنیا سے بیزار رہنے کا اور اپنے آپ کو سب کے لئے اجیرن بنا دینے کا، ان کے نزدیک دنیا کی سب سے بڑی گمراہی اس کی علمی و ذہنی ترقیاں ہیں اس لئے دور حاضر ان کے لئے سخت کرب و اضطراب کا باعث ہے۔

یورپ میں کسی علمی ایجاد کی خبر انھوں نے سنی اور دریاباد میں ان کو تکلیف شروع ہو گئی، امریکہ میں کسی نئی دوربین کی ایجاد کا حال معلوم ہوا اور ان کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا اور اگر اتفاق سے کوئی جہاز طوفان کے صدمہ سے غرق ہو گیا تو فوراً انھوں نے اس کو خدائی انتقام سے تعبیر کیا۔

انھیں یہ جستجو ہر وقت رہتی ہے کہ اہلِ مغرب میں طلاق کا اوسط کیا ہے، شراب پینے والوں کی تعداد کتنی

ہے، موٹروں کے ٹکرانے سے کتنے آدمی روز ہلاک ہوتے ہیں اور ان تمام باتوں کو وہ دورِ حاضر کی لعنت قرار دیکر اس سے پناہ مانگتے ہیں، لیکن وہ اس کو بالکل نظر انداز کر جاتے ہیں کہ علوم جدیدہ کتنی زبردست علمی خدمات انجام دے رہے ہیں اور فطرت کے کتنے قوائے کامنہ کو وہ بروئے کار لا چکے ہیں اسی کے ساتھ کبھی اس پر توجہ نہیں فرماتے کہ جس جماعت کو وہ "اپنی" اور "خالص اسلامی" چیز کہتے ہیں خود اس کے اعمال و اخلاق کا کیا حال ہے، اور جب تک خود اپنا دامن خشک نہ ہو دوسروں کی تر دامنی پر اعتراض کرنے کا انھیں کیا حق حاصل ہے۔

جس وقت میں نے جون میں "آتشِ نمرود" پر بحث کرتے ہوئے یہ ظاہر کیا کہ "قرآن مجید" اس معنے میں کلام ربانی نہیں ہے جو عام طور پر سمجھے جاتے ہیں، تو انھوں نے مجھے ابوجہل و ابولہب بھی کہا، میرے خلاف اخبارات میں مضامین بھی شایع کرائے، میرے اور نگار کے مقاطعہ کے لئے جلسے بھی برپا کئے، لیکن جو دلایل میں نے جون اور جولائی کے نگار میں پیش کئے ہیں ان کی تردید کی جرأت وہ نہ کر سکے۔ ان کے نزدیک گویا اسلام کی خدمت نام ہے صرف اس بات کا کہ جو شخص ان کے مزعومہ عقاید کے خلاف کوئی بات کہے اسے مرتد و ملحد کہدیا جائے کسی کو "مرتد و ملحد، کافر و زندیق" بنا دینا، قدامت پرست جماعت کا کوئی نیا حربہ نہیں ہے، اور ہر چند کہ اس حربہ سے انھوں نے "آزاد خیالی" کو کافی نقصان پہونچایا، لیکن پھر بھی وقتاً فوقتاً "عقل انسانی" کی طرف سے اظہار حق ہوتا ہی رہا اور برابر ہوتا رہے گا۔

ان لوگوں کا اعتراض ہے کہ مجھے یا کسی کو کیا حق حاصل ہے کہ اُن کے عقاید کے خلاف رائے کا اظہار کر کے انھیں تکلیف پہونچائی جائے۔ لیکن بالکل یہی اعتراض ان پر بھی وارد ہوتا ہے کہ وہ کسی کو آزادانہ اظہار رائے سے باز رکھ کر کیوں اُس جماعت کو تکلیف پہونچائیں، جو اسلام کی خدمت اسی میں سمجھتی ہے کہ اُسے لایعنی عقاید سے پاک کیا جائے۔

جس طرح عبدالماجد کو ایک مسلم ہونے کی حیثیت سے اسلام پر اظہار خیال یا اس کی تبلیغ کا حق حاصل ہے، اسی طرح میں بھی مسلمان ہونے کی حیثیت سے مجاز ہوں کہ اسلام کا وہ مفہوم پیش کروں جو میرے نزدیک صحیح و درست ہے۔ اگر عبدالماجد یہ سمجھتے ہیں کہ میں قرآن کو کلام ربانی نہ مان کر اسلام کی توہین اور رسول کی تکذیب کرتا ہوں، تو میں بھی اپنی جگہ یہ یقین رکھتا ہوں کہ وہ قرآن کو خدا کا کلام کہکر اسلام کی تخریب اور رسول کی تخفیف کرتے ہیں، فرق اگر کوئی ہے تو صرف یہ کہ جو کچھ میں کہتا ہوں اس کے لئے دلایل بھی پیش کرتا ہوں اور وہ صرف مجھے ملحد و مرتد کہدینا ہی کافی دلیل سمجھتے ہیں۔ کسی مسئلہ پر اختلاف رائے کے معنے یہ نہیں ہیں کہ بازاری آدمیوں کی طرح سب و شتم پر اُتر آیا جائے۔ خود جناب رسالتمآب کا طرز عمل ہمیشہ یہی رہا کہ وہ مخالف کو ہمیشہ سمجھانے کی کوشش کرتے تھے اور

غصہ کبھی نہ فرماتے تھے، لیکن عبدالماجد صاحب کو جو اپنے آپ کو سب سے بڑا محافظ روایات نبوی کا سمجھتے ہیں، سوائے گالیاں دینے اور مغالطہ وغیرہ کی پست و ذلیل کوششیں کرنے کے اور کوئی جواب اپنے پاس نہیں رکھتے۔

پھر ہو سکتا ہے کہ وہ اس نوع کی غیر انسانی حرکات سے اپنے جذبۂ انتقام کو ایک حد تک پورا کر سکیں، لیکن دنیا میں تماشائیوں کے ساتھ اہل نظر کی بھی کمی نہیں ہے اور وہ یقیناً اس کو بد نفسی پر محمول کریں گے یا اہل مذہب کی بیکسی و بے مایگی پر، اور شاید یہ دونوں باتیں عبدالماجد کو خوش نہیں آسکتیں۔

مجھ پر ایک نہایت ہی ذلیل قسم کا یہ الزام بھی قایم کیا جاتا ہے کہ میں نے اس نوع کے مضامین نہ لکھنے کا عہد کیا تھا لیکن اس عہد سے پھر گیا۔ لیکن یہ معاہدہ تو اسی وقت ٹوٹ گیا تھا جب عبدالماجد اینڈ کو نے خود بھی اپنے عہد کو توڑ کر حکومت سے میرے خلاف مقدمات چلانے کی اجازت طلب کی تھی۔ آج اڈیٹر معارف کی طرف سے بھی مجھ پر یہی الزام قایم کیا جاتا ہے، حالانکہ سید سلیمان ندوی خود اس جماعت کے سرگروہ تھے جو میرے خلاف قانونی کارروائی عمل میں لائے جانے کے لئے تگ و دو میں مصروف تھی!

اگر میری معذرت شایع ہونے کے بعد وہ خاموش رہتے اور کوئی معاندانہ کارروائی نہ کرتے تو بیشک مجھ پر "انحراف عہد" کا الزام قایم ہو سکتا تھا، لیکن اس صورت میں وہ کس منھ سے مجھ پر الزام قایم کر سکتے ہیں۔ خود پاس عہد نہ کرنا اور دوسروں سے ایفا چاہنا عجیب تماشہ کی بات ہے!

میں نے عبدالماجد صاحب کو خط کے ذریعہ سے بھی اطلاع دیدی ہے اور اب نگار کی وساطت سے بھی میں انھیں اور تمام اُن کے ہم عقاید لوگوں کو مطلع کرنا چاہتا ہوں کہ میں اسلام کے متعلق جو کچھ اظہار خیال کرتا ہوں اس کو اپنے نزدیک حق سمجھتا ہوں، لیکن اگر اُن کے نزدیک وہ غلط ہے تو نگار کے صفحات کھلے ہوئے ہیں۔ میں اُن کے تردیدی جوابات کو من و عن شایع کر دینے کا وعدہ کرتا ہوں، اور اسی کے ساتھ یہ بھی کہ اگر ان کے جوابات سے مجھے تسکین ہو گئی، تو میں ایک لمحہ کے لئے بھی اپنی غلطی تسلیم کرنے میں پس و پیش نہ کروں گا — ورنہ یوں مجھے ان کے مرتد و ملحد کہنے کی پرواہ نہیں ہے، میرا اور میرے عقاید کا معاملہ خدا کے ساتھ ہے اور وہی بہتر جانتا ہے کہ میری نیت کیا ہے۔

وکفیٰ باللہ شہیدا

جذبات بھاشا

کا جدید اڈیشن - کاغذ و کتابت نہایت نفیس - قیمت بارہ آنہ - رعایتی قیمت ۸/

منیجر نگار لکھنؤ

دو منظر

پنگھٹ کی صبح:

ٹھنڈی ہوا، خموش فضا، بھاپ کا دھواں جاڑے کی رُت، بہار کے دن، صبح کا سماں
لہروں پہ تیرتی ہے حبابوں کی کہکشاں موجوں سے کھیلتی ہیں درختوں کی ڈالیاں
آئی ہوا تو اوس کے موتی ڈھلک گئے
سرسبز پتّیوں کے پیالے چھلک گئے

آئی کرن نگاہ سے پر تولتی ہوئی، کُہرے کی ہر لطیف گرہ کھولتی ہوئی،
شبنم کے تابناک گُہر رولتی ہوئی، پانی میں روشنی کی شکر گھولتی ہوئی
موجوں کی بیقرار جبینیں جھک گئیں،
وہ جوشِ کیف ہے کہ ہوائیں بہک گئیں

اشنان کرنے آئی ہے لڑکی کسان کی کاندھے پہ ایک ململی دھوتی پڑی ہوئی
ندّی کے پاس جاکے جو انگڑائی اُس نے لی ملّاح کے بھی ہاتھ سے پتوار چُھٹ گئی
موجوں نے بڑھ کے اُس کو گلے سے لگا لیا،
شاعر نے بھی نگاہ کو اپنی جھکا لیا،

پنگھٹ کی شام:

پیڑوں کی چھاؤں، ریت کے ذرے، شفق کی ضو ساحل کو چومتی ہوئیں موجیں بہ طرزِ نو
خورشید کے چراغ کی بجھتی ہوئی سی لو بربط سا چھیڑتی ہوئی ندّی کی تیز رو
موجوں کے جزر و مد میں عجب اہتمام ہے،
فردوس کی سحر ہے کہ پنگھٹ کی شام ہے

پھیلی ہوئیں جھکے ہوئے پیڑوں کی ڈالیاں دریا کی سطح بن گئی سایہ کا آسماں،
جاتا نہیں ہے ایک بھی نظارہ رائگاں گاؤں سے آرہی ہیں کسانوں کی لڑکیاں
مٹی کی گاگروں کو سروں پر لئے ہوئے
مستی کی تیز تیز شرابیں پئے ہوئے،

چڑھتا ہوا شباب، مکمل جوانیاں، موضوعِ حسن و عشق، مجسم کہانیاں
تہذیبِ عہدِ رفتہ کی زندہ نشانیاں کھیتوں کی شاہزادیاں، گاؤں کی رانیاں
آتے ہی اُن کے منظرِ ساحل بدل گیا،
ماحول حسن و کیف کے سانچے میں ڈھل گیا

ماہر القادری

رات کی دیوی

نکلی وہ شب کی دیوی جھروکے سے شام کے
شانہ پہ کاکلوں کو پریشاں کئے ہوئے
پلکیں جھکی جھکی ہوئی نیندوں کے بوجھ سے
دامن میں جگنوؤں کے جلائے ہوئے دیے
ہونٹوں پہ خامشی سی درختوں کی چھاؤں کی
وہ لوریاں سی چال میں آہستہ پاؤں کی
سونی جبیں پہ سوئی ہوئی بستیوں کا حال
دھندلاہٹوں کے ابر میں کھوئے ہوئے سے گال
آنکھیں خمار و خواب کے جادو لئے ہوئے
ہر ہر نگاہ تیز سی صہبا پئے ہوئے
انگشت خوابناک میں ذوقِ گناہ کے
مبہم سے کچھ حسین اشارے چھپے ہوئے
سانسوں کے دھیمے ساز میں خاموشیوں کی لَے
سنسان جنگلوں کے مسافر کے دل کا بھے
بوسوں کے عطر بیز ترنم کی گرمیاں،
فرقت زدہ حسینہ کی بیتاب ہچکیاں
دھڑکن میں دل کی راز کی باتوں کی خامشی
جسموں کا اتصال وہ سانسوں کی راگنی،
نیندوں کے ابرتار میں کھویا ہوا جمال،
اوڑھے ہوئے حسین ستاروں کا ایک شال
آہستہ پا رواں ہیں افق پر خیال کے
ماضی کے خوابہائے پریشاں کے قافلے
سایوں کے کارواں جلو میں لئے ہوئے
دھندلے، سکوں فروش، مسلسل، خموش سے
نکلی وہ شب کی دیوی جھروکے سے شام کے

طفیل احمد خاں سلطانپوری

نازی سپاہی

ہم نشیں! آ دیکھ میرے ساتھ میں دیکھوں جہاں
دیکھ یونیفارم میں وہ ایک فوجی نوجواں
دیکھ کتنے صاف و روشن ہیں ٹیونک کے بٹن
شارٹ پر ڈالی ہے اس نے کس قدر بانکی شکن
دیکھ اس کے بوٹ پر پالش ہے کتنی دل فروز
پٹیوں پر کتنی خوبی سے اُلٹ رکھے ہیں ہوز
دیکھ کتنی کس کے یہ تھامے ہوئے ہے رائفل
اس کے بازو ہو نہیں سکتے کسی صورت سے شل
بے حس و حرکت کھڑا ہے ایڑیوں کو جوڑ کر
ہر نظر اس کی گزر جائے گی پتھر توڑ کر
کس نئے انداز سے سینے کو ہے تانے ہوئے
سر کو ہے سیدھا کئے، ٹھوڑی کو ہے بھینچے ہوئے
آہنی قوت سے اس نے داب رکھی ہے زمیں
آندھیوں میں یہ جگہ سے اپنی ہل سکتا نہیں
مارچ کرتے وقت دائیں ہاتھ سے تھامے سلنگ
عزم سے بڑھتا ہے خالی ہاتھ کو دے کر سوِنگ
دبدبے سے اس کے گھبراتے ہیں سب پیر و جواں
راہ دیدیتے ہیں ہٹ کر راستے سے کارواں
گرمیاں سینے میں دل میں ہے شجاعت کا سرور
حوصلوں سے سرخ چہرہ، عزم سے آنکھوں میں نور
یہ محافظ بن کر اُٹھا تھا کبھی تہذیب کا
یہ معالج بن کر آیا تھا کبھی تخریب کا
کیا خبر تھی، ہے فرشتہ پیشہ در جلاد بھی
ضامنِ امن و اماں بن جائیگا صیاد بھی

ریڑھ کی ہڈی پہ کٹ سکتی تھی اس کی زندگی
ذہن اسے دے کر خدا نے ذہن کی توہین کی
عقل کی اس کو ضرورت ہی نہیں تھی عمر بھر،
ناچنا ٹھہرا اسے جب دوسروں کے حکم پر
یہ جتانے کے لئے ہے اپنے افسر کا غلام،
یہ سلامی رائفل پر اس کو دیتا ہے مدام

اس کو کوئی مس نہیں ہے زندگی کے سوز سے
میت پروانہ سے یا شمعِ شب افروز سے
ایک آنسو آنکھ سے اس کی کبھی اُمڈا نہیں،
ایک شعلہ اس کے سینے میں کبھی بھڑکا نہیں
اس کو تاروں کی چمک میں کیف کچھ ملتا نہیں
آتشیں نغمات سے بھی اس کا دل ہلتا نہیں

پھول کے رومان رنگ و بو سے بے بہرہ ہے یہ
حسن کیا سمجھے گا جب پیدائشی اندھا ہے یہ

سامنے بلور کی مینا ہو یا پھولوں کا جام
مار کر ٹھوکر اسے سب کچھ کچل دینے سے کام

واحد اپنی نوعیت کا ہے یہ حیواں سر بسر
پھینک دیتا ہے یہ انسانوں کی گردن توڑ کر

گن مشینوں سے کئے ہیں اس نے مجبوروں پہ وار
اس نے بینٹ سے کیا معصوم سینوں کو فگار

گیس کی صورت میں اسنے غم ہی غم پھیلائے ہیں
اس نے فاقہ کش نہتوں پر بھی بم برسائے ہیں

بھر گیا انسان سے دل تو تنوع کے لئے
ہڈیوں کے پیسنے کو اس نے توڑے مقبرے

ناز کرتا ہے یہ بچوّں کے گھروندے توڑ کر
لطف لیتا ہے یہ ماؤں کو تڑپتا چھوڑ کر

بھاگتا ہے جب لٹیرا بن کے یہ میدان سے
نوچ لیجاتا ہے گہنے بچیوں کے کان سے

کاش یہ گنتا مری بہنوں کی ٹوٹی چوڑیاں
دیکھتا اے کاش ان کی ساڑیوں کی دھجیاں

کر دئے کتنے کتب خانے جلا کر اس نے خاک
کتنی تصویروں کو اسنے کر دیا وحشت میں چاک

کتنے شاعر ظلم سے اس کے ہوئے ہیں سوگوار
پاؤں سے کچلے ہیں اس نے اپنے کتنے شاہکار

جانور کی طرح اس نے روند ڈالیں کھیتیاں
اس نے باغوں پر گرائیں بے ضرورت بجلیاں

ہم نشیں! کب تک میں اس کمبخت کا شکوہ کروں؟
لا مجھے پستول دے، میں اسکے گولی مار دوں!

فضل الدین اثر ایم-اے

غزل: خلیل اللہ قریشی

کسی کا آستاں ہے اور میں ہوں
نشاطِ جاوداں ہے اور میں ہوں

زمیں کی گردشوں پر ہے تسلط
شرابِ ارغواں ہے اور میں ہوں

خوشا ساعاتِ رنگینِ محبت
وہ کافر شعر خواں ہے اور میں ہوں

یقینِ عظمتِ کعبہ کے باوصف
بتوں کا آستاں ہے اور میں ہوں

وہ دزدیدہ نظر اور پرسشِ حال
محبت کامراں ہے اور میں ہوں

طلسمِ بے خودی ہے کارفرما
خیالِ دلستاں ہے اور میں ہوں

قدم کی چاپ اور ان کے قدم کی
ستم پرور گماں ہے اور میں ہوں

[illegible] ترغیب جنسی [illegible]

نیاز فتحپوری کی دیگر تصانیف

نگار بک ایجنسی لکھنؤ

ترغیباتِ جنسی (یا) شہوانیات

اس کتاب میں فحاشی کی تمام فطری و غیر فطری قسموں کے حالات انکی تاریخ و نفسیاتی اہمیت پر نہایت شرح و بسط کیساتھ محققانہ تبصرہ کیا گیا ہے جسمیں بتایا گیا ہو کہ فحاشی دنیا میں کب و کس کس طرح رائج ہوئی نیز یہ کہ مذاہب عالم نے اسکے رواج میں کتنی مدد کی۔ اس کتاب میں آپ کو حیرت انگیز واقعات نظر آئیں گے

قیمت تین روپیہ (سے) علاوہ محصول

خریداران نگار سے ایک روپیہ کم۔

مجموعۂ استفسار و جواب سہ جلد

ان تینوں جلدوں میں ۱۹۲۲ء سے لیکر ۱۹۲۶ء تک کے استفسار و جواب شایع کئے گئے ہیں۔ اس مجموعہ کی اہمیت کا اظہار بیکار ہے کیونکہ نگار کو جو خصوصیت اس باب میں حاصل ہے وہ کسی سے مخفی نہیں ان تینوں جلدوں میں سیکڑوں ادبی، تاریخی و تنقیدی مسایل شامل ہیں اور اسکی حیثیت ایک مختصر سی سائیکلوپیڈیا کی ہے۔

قیمت فیجلد تین روپیہ (سے) علاوہ محصول

خریداران نگار سے فی جلد ایک روپیہ کم

جذبات بھاشا

جناب نیاز نے ایک دلچسپ تمہید کے ساتھ بہترین ہندی شاعری کے نمونے پیش کرکے ان کی ایسی تشریح کی ہے کہ دل بیتاب ہوجاتا ہے۔ اردو میں یہی سب سے پہلی کتاب اس موضوع پر لکھی گئی ہے اور ہندی کلام کے بے مثل نمونے نظر آتے ہیں۔

قیمت علاوہ محصول بارہ آنہ (۱۲/)

خریداران نگار سے تین آنہ (۳/) کم

فلاسفۂ قدیم

اس مجموعہ میں حضرت نیاز کے تین علمی مضامین شامل ہیں:-

۱- چند گھنٹے فلاسفۂ قدیم کی روحوں کے ساتھ

۲- مادئین کا مذہب

۳- حرکت کے کرشمے۔

نہایت مفید و دلچسپ کتاب ہے۔

قیمت ایک روپیہ (عہ) علاوہ محصول

خریداران نگار سے چار آنہ (۴/) کم

شاعر کا انجام

جناب نیاز کے عنفوانِ شباب کا لکھا ہوا افسانہ، حسن و عشق کی تمام نشہ بخش کیفیات اس کے ایک ایک جملہ میں موجود ہیں، یہ فسانہ اپنے پلاٹ اور انشاء کے لحاظ سے اس قدر بلند چیز ہے کہ دوسری جگہ اس کی نظیر نہیں مل سکتی۔

قیمت دس آنے (۱۰/)

علاوہ محصول

خریداران نگار سے دو آنہ (۲/) کم

فراستُ الید

مولفۂ نیاز فتحپوری جس کے مطالعہ سے ایک شخص بآسانی ہاتھ کی شناخت اور اس کی لکیروں کو دیکھ کر اپنے یا دوسرے شخص کے مستقبل سیرت عروج و زوال موت و حیات، صحت و بیماری شہرت و نیکنامی وغیرہ پر صحیح پیشین گوئی کرسکتا ہے۔

قیمت ایک روپیہ (عہ)

علاوہ محصول

خریداران نگار سے چار آنہ (۴/) کم

مذاکراتِ نیاز

سینے حضرت نیاز کی ڈائری جو ادبیات و تنقید عالیہ کا عجیب و غریب ذخیرہ ہے ایک بار اسکو شروع کردینا آخیر تک پڑھ لینا ہے۔ اس کتاب کی بہت کم جلدیں باقی رہ گئی ہیں۔

قیمت بارہ آنہ (۱۲/)

علاوہ محصول

خریداران نگار سے تین آنہ (۳/) کم

گہوارۂ تمدن

یہ وہ معرکۃ الآرا کتاب ہے جس میں تاریخ و اساطیر سے ثابت کیا گیا ہے تمدن کی ترقی میں عورت نے کتنا زبردست حصہ لیا اور دنیائے تہذیب و شایستگی اسکی کس قدر ممنون ہے اردو میں اس موضوع پر اس سے قبل کوئی کتاب نہیں لکھی گئی۔ مصنف کو اس کتاب پر ریاست بھوپال سے ایک ہزار روپیہ انعام ملا تھا۔

قیمت دو روپیہ (عہ)

علاوہ محصول

رجسٹرڈ نمبر اے ۴۶۶

جنگ اور ہندوستان

قصداً نہ سہی مجبوراً اس زمانہ گرانی میں طب یونانی کی طرف توجہ کیجئے، شاید آپ کی توجہ اس کی ترقی کا باعث ہو، بہترین اور با اصول تیار شدہ مرکبات،

طبّی دواخانہ یونانی

سے حاصل کیجئے جو سوا سو سال سے طب یونانی اور پبلک کی خدمت انجام دیکر غیر فانی شہرت حاصل کر چکا ہے **فہرست دواخانہ** مفت طلب فرمادیں

طبّی دواخانہ یونانی

چوک بازار — اندور —— ۶۶ محمد علی روڈ بمبئی ۳

تار کا پتہ: "شاہی" اندور —— ٹیلیفون نمبر ۲۶۹۸۳

رجسٹرڈ نمبر ۱۱۰۴۷۱

نگار

قواعد رسالہ "نگار"

۱- رسالہ ہر مہینے کی پندرہ تاریخ سے پہلے شایع ہوتا ہے۔
۲- رسالہ نہ پہونچنے کی صورت میں بیس تاریخ تک دفتر کو اطلاع ہونی چاہیئے ورنہ رسالہ مفت نہ روانہ کیا جائیگا
۳- خط کتابت کیوقت اپنا نمبر خریداری ضرور لکھیئے جنپر نمبر خریداری نہیں ہوتا ایسے خطوط ضایع کردیئے جاتے ہیں
۴- جواب طلب امور کے لئے جوابی کارڈ یا ٹکٹ آنا ضروری ہے۔
۵- مضامین صاف اور خوشخط آنے چاہیں۔
۶- سالانہ قیمت پانچ روپیہ، ششماہی تین روپیہ- بیرون ہندسات روپیہ سالانہ پیشگی مقرر ہے۔

نرخنامہ اجرت اشتہارات

تعداد صفحہ	ایک صفحہ	نصف صفحہ	پاؤ صفحہ
بارہ مرتبہ	۱۰۰ روپیہ	۶۰ روپیہ	۴۰ روپیہ
چھ مرتبہ	۶۰ روپیہ	۳۵ روپیہ	۲۵ روپیہ

(۱) اجرت ہر حال میں پیشگی آنا ضروری ہے (۲) جو صاحبان تین ماہ سے زائد اشتہار دیں گے ان کو بیس فیصدی کمیشن دیا جائیگا میعاد اشتہار کے اندر دو مہینے قبل اطلاع دینے پر مضمون بدل سکتا ہے۔

تعداد صفحہ	ایک صفحہ	نصف صفحہ	پاؤ صفحہ
تین مرتبہ	۳۵ روپیہ	۲۴ روپیہ	۱۴ روپیہ
ایک مرتبہ	۱۲ روپیہ	۹ روپیہ	۶ روپیہ

نگار بک ایجنسی لکھنؤ

چوتھائی قیمت پیشگی آنی لازم ہے

مولانا نذیر احمد
نبات النعش ۹/
مراۃ العروس ۱۰/
توبۃ النصوح ۱۲/
موعظۂ حسنہ عہ/
رویائے صادقہ عہ/
ایامیٰ عہ/
فسانۂ مبتلا عہ/
ابن الوقت عہ/
مصائب غدر ۱۲/

مولانا شبلی
سیرۃ النبی جلد اول للعہ
" دوم للعہ
" سوم للعہ
الفاروق عا/
سیرۃ النعمان عہ/
الغزالی عہ/
المامون عہ/
سوانح مولانا روم عا/
سفرنامہ مصر و شام عا/
علم الکلام عا/
الکلام عا/
رسائل شبلی عہ/
مقالات شبلی عہ/
شعر العجم جلد اول سے/
" دوم عا/
" سوم عا/
" چہارم سے/
" پنجم عا/
موازنہ انیس و دبیر سے/
مضامین عالمگیر ۸/
آغاز اسلام ۸/
کلیات فارسی عا/
کلام شبلی اردو ۸/

امیر مینائی
صنم خانۂ عشق عا/
مراۃ الغیب عہ/
محامد خاتم النبیین ۸/
ضیائے سخن عہ/
مکاتیب امیر مینائی عا/

رتن ناتھ سرشار
سیر کہسار للعہ
خدائی فوجدار عا/
جام سرشار عا/
الف لیلہ لیطر ناول ص/
کامنی عہ/
سوانح عمر و عیار عہ/

منشی سجاد حسین مرحوم
احمق الذی ۸/
حاجی بغلول ۸/

پیاری دنیا ۸/
کایا پلٹ ۸/
میٹھی چھری ۶/
طرحدار لونڈی عہ/
طلسمی فانوس ۱۲/

جوالا پرشاد برق
مرنالنی ۱۲/
مار آستین ۱۲/
بنگالی دلہن ۱۲/
معشوقۂ فرنگ ۱۲/

بسم اللہ

نگار

فہرست مضامین اکتوبر ۱۹۲۹ء

ملاحظات ۔۔۔ ۲

ہندی اور بابلی علم الاصنام کی مشابہت ۔ محمد نعیم الرحمن ایم اے ۹

بازگشت (افسانہ) ۔۔ مجنون گورکھپوری ۱۶

تصوف اسلام پر ایک مورخانہ نظر ۔ عبدالمالک آروی ۲۷

لکھنؤ کے عہد شباب کی ایک شاعرہ ۔۔۔ ۳۵

حکومت برطانیہ کی وسعت کاراز ۔ عبدالقیوم رسا ۳۹

ازدواج مکرر ۔۔۔ ۴۸

مرقع چغتائی (یعنی) دیوان غالب کا مصور اڈیشن ۔۔ ۵۳

مومن و کلام مومن ۔۔ کیفی چریاکوٹی ۶۱

مرد اور عورت ۔۔ بدر اصلاحی ۷۲

سیاح کی ڈائری ۔۔۔ ۷۶

اظہار تمنا ۔۔ عزیز احمد ۸۱

باب الاستفسار ۔۔۔ ۸۲

الہام شعر ۔۔ سید علی اختر اختر ۸۵

مشاہدات ۔۔ جوش ملیح آبادی ۸۶

شالامار باغ ۔۔ محمود علی خان محمود ۸۸

یاد محبوب ۔۔ ثاقب جالندھری ۸۹

غزلیات ۹۰

معلومات ۔۔ قیسی ۹۳

مطبوعات موصولہ ۔۔ ۹۶

بسم اللہ

نگار

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

جلد (۱۶)	اکتوبر سنہ ۱۹۲۹ء	شمارہ (۴)

ملاحظات

گذشتہ ماہ کے رسالہ کو کسی نے "سنان و نشتر" سے تعبیر کیا اور کسی نے "تیغ و تفنگ" سے اور جسقدر "جراحت پذیری" کی اہل کا تعلق ہے، اس کے اور نام بھی "مراتب تاثر" کے لحاظ سے رکھے جا سکتے ہیں لیکن مجھے اگر مسرت ہی تو صرف اس خیال سے کہ اگر ایک طرف یہ "تپش مذبوحی" جراحت ناکام کا پتہ دے رہی ہی تو دوسری طرف بحمداللہ "بر بنیاد کشتگان آواز" کا منظر بھی دل بڑھانے کے لئے موجود ہے۔ اور اگر تماشائیوں کے "آفرین و مرحبا" کو بھی اسی میں شامل کر لیا جائے تو پھر "دیت و خونبہا" کا سوال اُس "عشوہ و تبسم" سے آگے نہیں بڑھتا جسے ظہوری فخر کے ساتھ سرمایۂ تحمید و تقدیس کی صورت پیش کرتا ہے

میری حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہتی، جب بعض حضرات میری تحریروں سے عصبیت مذہب کو ثابت کرنا چاہتے ہیں، حالانکہ میری تنقیدیں خواہ وہ مذہب معاشرت سے متعلق ہوں، یا علم و ادب سے اس خلوص نیت کا نتیجہ ہوتی ہیں جس کی اگر کوئی دنیاوی تعبیر ہو سکتی ہے تو صرف یہ کہ

شکایتے ست نگنجد بدل زبیاری

میں اس سے قبل بھی بارہا عرض کر چکا ہوں اور آج پھر اس کا اعادہ کرتا ہوں کہ تشیع و تسنن تو خیر نہایت ہی معمولی بات ہے میں نے تو اصطلاحی کفر و اسلام کا پردۂ امتیاز بھی نوچ کے پھینکدیا ہے اور میں اُس دعوے کے ساتھ نہ جس کے لئے تصدیق کی ضرورت ہوتی ہے نہ تردید کا اندیشہ "بصور سرافیل" اس امر کا اعلان کرتا ہوں کہ اگر جنّت نام ہے صرف سکون روح و طمانینت قلب کا اور اگر یہ جنّت ایک زاہد شب زندہ دار صرف تقشف ہی سے حاصل کر سکتا ہے تو میں وہ ہوں کہ

فردوس را بدام نگہ می کنم شکار

میں اس چیز سے واقف ہوں، جس کی جستجو دیر و حرم میں کیجا رہی ہے، میں اس مقصود کو جانتا ہوں کہ جس کو مساجد و کنائس میں ڈھونڈھا جا رہا ہے، اور میں اس حقیقت سے بھی بیخبر نہیں ہوں کہ یہ محراب و منبر پر پیشانیاں رگڑ رگڑ نوشتۂ تقدیر کو مٹا دینے کی کوشش کرنے والے آجتک یہی نہیں سمجھ سکے کہ وہ کیا چیز ہے جو سجدہائے نیاز کا مسجود ہو سکتی ہے اور وہ کونسا پردہ ہے جس کے اٹھنے کے بعد یہ تمام اعتبارات سطحی یہ جملہ مبرزات قشری محو ہو کر

چشم وا کردن زمین تا آسمان آغوش داشت

بنجاتے ہیں۔ پھر اس سے قبل خدا معلوم کتنی زریں صبحیں، کتنی رنگین شامیں، کتنی خنک راتیں میں نے صرف اس غور و تامل میں صرف کر دیں کہ کہ منصور کا انا الحق کہکر دار و رسن کی منزل سے گزر جانا واقعی شاہد مقصود کے چہرہ سے حجاب کا اٹھا دینا تھا اور کیا میں بھی اگر ایسا دعویٰ کر دیا ۹ ہو گا لیکن میں ہمیشہ اسی نتیجہ پر پہونچا کہ اول تو وہ منزل جسے

"مرا کردہ اند آشکارا بمن"

کہتے ہیں خود کوئی ایسی بلند منزل نہیں جس کو ہر شخص بادنیٰ تامل نہ پا سکتا ہو چہ جائیکہ اس میں بھی ناصبوری سے کام لیا جائے۔ اس لئے میں بے نیازانہ انداز سے آگے بڑھا اور میں نے اپنی فطری ودیعتوں میں سے ایک نہایت ہی ابتدائی منزل کی ودیعت کو بے نقاب کرنا چاہا لیکن حیرت ہے کہ دنیا اس کے بھی سمجھنے کے لئے تیار نہیں اور جسوقت میں یہ دعویٰ کرتا ہوں کہ

"یک مے ز آبگینہ و ساغر بر آوردم"

تو وہ مجھ سے منہ پھیر لیتی ہے، مجھے کافر کہتی ہے دہریہ اور ملحد کے لقب سے یاد کرتی ہے اور اپنے جہل سے میرے علم کو مغلوب کرنا چاہتی ہے، حالانکہ یہاں یہ عالم ہے کہ "گرانیٔ محمل" کا احساس جسقدر قوی ہوتا جاتا ہے، اسی اعتبار سے

ہر پردہ را بولولہ سنجم ہزار بار

اس لئے میں اپنے تمام احباب سے خواہ کسی مذہب و مسلک کے متبع ہوں بتا دینا چاہتا ہوں کہ میرے شاہد مقصود کے سامنے یہ تمام نسبتیں، یہ جملہ اضافات وہی حقیقت رکھتی ہیں جو "بارۂ کتاں" چاند کے سامنے، اور بحمد اللہ میں اس سے بہت بلند ہوں کہ اس "نا استواری نسیج" کا تماشہ دیکھنے کے لئے ایک لمحہ کے بھی اپنی نگاہ پستی کی طرف مائل کروں۔ ——— دنیا اگر اپنی صحرا نوردیوں میں خضر کو راہبر بنانا چاہتی ہے تو بنائے اور جبتک جی چاہے سکندر کی ناکامی کا انتقام اس سے لیتی رہے لیکن مجھے اُس جستجو میں دعوت شرکت نہ دے کہ بہ۔

سیلاب را بہ بادیہ رہبر گرفتہ ام

اگر ایک طرف یہ عزم استوار ہے کہ تنقید خواہ وہ معاشرت و اخلاق سے متعلق ہو یا مذہب و سیاسیات سے، ہمیشہ بلند نقطۂ نظر سے ہونا چاہیئے، تو دوسری طرف میں اپنی فطرت کی اس کمزوری سے بھی واقف ہوں کہ وہ کسی کا دل دکھانا گوارا نہیں کرتی اور اس لئے جب مجھے اس کا علم ہوجاتا ہے کہ میری تحریر یا نگار کے کسی مضمون سے کسی کو صدمہ پہونچ گیا ہے، تو میں بہت ملول ہوجاتا ہوں۔ بنابراں اگر گذشتہ ماہ کے نگار سے کسی خاص شخص یا کسی مخصوص جماعت کو کوئی تکلیف پہونچی ہے تو میں اسکی معذرت میں صرف یہ یقین دلانا چاہتا ہوں کہ میرا مقصود کبھی تنگ نظری کا اظہار نہیں ہوتا اور اگر کوئی صورت ایسی پیدا ہوجاتی ہے تو صرف اس لئے کہ

مستم چناں کہ گل نشناسم ز نوک خار

اس سلسلہ میں مجھ کو برا کہنے والے دو قسم کے لوگ ہیں، ایک وہ جو انتقام لینے کے لئے صرف اپنے اہرمن سے چارہ سازی چاہتے ہیں اور گالیوں کی آزار رسانی کے سوا ان کے پاس کوئی آلۂ حرب نہیں ہوتا۔ اور دوسرے وہ جو میری تحریر میں بے حجابی، عریانی، فحاشی وغیرہ کے نقائص نکالکر اپنے پندار میں مجھے ذلیل و خفیف کرنا چاہتے ہیں۔ سو اول الذکر جماعت سے مجھے صرف یہ کہنا ہے کہ جس طرح انکا اہرمن ان کے ساتھ ہے اسی طرح میرا یزداں میرے ساتھ ہے۔ اور اس لئے مجھے ڈرنے کی ضرورت نہیں، اور موخر الذکر جماعت کے حضور میں اپنے ذوق ادب و انشا کی ۔فِ سے سوائے اس کے اور کچھ نہیں عرض کرسکتا کہ

نظارۂ خوبان و مے و نغمہ حرام است

دیدیم و شنیدیم و سمعنا و اطعنا

میرے پاس وہ مطبوعہ اعلان آیا ہے جسے کلکتہ میں قایم ہونے والی "لیگ اگینسٹ ملاازم" نے اپنے مقصد کی تبلیغ کے لئے شایع کیا ہے۔ اس لیگ کے روح رواں اور صدر مولوی عبد الرزاق ملیح آبادی ہیں اور سید محمد عثمان فاضل نایب صدر۔ اس لیگ کے قیام کا مدعا اُس ذہنیت کی مخالفت ہے جو تنگ نظری، تنگ دلی، تقلید و جمود، تعصب و عدم رواداری کو مذہب کے رنگ میں پیش کرتی ہے۔ اس ذہنیت کا اصطلاحی نام اس انجمن نے ملاازم اور اس ذہنیت والوں کا ملّا رکھا ہے۔ اس اعلان کے آخری صفحہ میں یہ بھی ظاہر کیا گیا ہے کہ یہ انجمن الحاد و دہریت کی حامی نہیں ہے اور نہ ہر عالم دین کی مخالف ہے بلکہ وہ صرف ان نام نہاد مذہبی پیشواؤں کے خلاف ہے جن میں یہ ذہنیت پائی جاتی ہے۔

جس حد تک الفاظ اعلان کا تعلق ہے اس انجمن کے مقاصد نہایت ہی پاکیزہ اور قابل قبول معلوم ہوتے ہیں، لیکن عملی حیثیت سے مجھے اس کے اندر چند در چند کمزوریاں محسوس ہوتی ہیں۔ جس وقت پبلک کے سامنے یہ دعوےٰ پیش کیا جائے گا کہ ملّاؤں کی جماعت تنگ نظر ہے متعصب ہے، تقلید کی پابند ہے تو لامحالہ یہ سوال پیدا ہوگا کہ ان کی تنگ نظری تعصب اور تقلید مذہب کے اندر ہے یا اس سے باہر ظاہر ہے کہ اس سے باہر نہیں ہوسکتی اور ہو تو بھی کون مانتا ہے۔ اس لئے وہ مذہب ہی سے متعلق ہوگی اور جس وقت آپ مذہبی مناظرہ

کریں گے تو ایک غیر متناہی سلسلہ "قال، اقول" کا پیدا ہو جائے گا اور آخر کار وہ مقصد حاصل نہ ہو گا جس کے لئے یہ لیگ قایم کی گئی ہے

اگر یہ لیگ مذہب کے ساتھ ملاؤں کی مخالفت کرنا چاہتی ہے تو کوئی توقع کامیابی کی نہیں ہو سکتی اور نہ مذہب کی موجودہ مراسم کی حمایت کرتے ہوئے ملاؤں کے خلاف کوئی کامیاب پروپیگنڈا ہو سکتا ہے۔ لیکن اگر آپ یہ دعوی کریں کہ جو اسلام اس جماعت نے پیش کیا ہے، وہ شروع سے غلط ہے اور ان میں سے ایک بھی بلا استثنار مذہب اسلام کے صحیح مفہوم کو نہیں سمجھا تو بیشک یہ لیگ کچھ اہمیت اختیار کر سکتی ہے اور اصلاح کی بھی اس سے توقع ہو سکتی ہے۔ یہ بالکل خلاف اصول ہے کہ اس جماعت میں سے بعض کو علیحدہ کر دیا جائے اور بعض کو لے لیا جائے، بلکہ ایک سرے سے ان سب کو حرف غلط کی طرح مٹا دینا چاہئے اور لوگوں کو اسلام کی حقیقت ذہن نشین کر کے بتانا چاہئے کہ اسلام نام ہے صرف ترک مذہب کا، نسخ ادیان کا، تفریق قومی کے مٹجانے کا اور جامعہ انسانیت کو ایک مرکز پر جمع کرنے کا، جس کا نام اخلاق اور صرف اخلاق ہے۔ اسلام مسجد و مندر کی تفریق سے بے نیاز ہے، زنار و تسبیح کے امتیاز سے بالاتر ہے نہ ناقوس و اذان کی تمیز اس کا نصب العین ہے نہ پیکرماں اور طواف کا فرق اس کا مطمح نظر۔ وہ تمام عالم کو، ساری کائنات کو، جملہ نوع البشری کو ایک رشتہ سے وابستہ کر کے صرف ایک نقطہ پر لانا چاہتا ہے اور وہ اس مساوات کا مبلغ ہے جس سے زیادہ وسیع مساوات دنیا میں کسی ہادی و رہنما کسی نبی و رسول نے اس سے قبل پیش نہیں کی۔

وہ نہ کسی کے نام کو دیکھتا ہے، نہ وضع و صورت کو، نہ وہ نسب کو وجہ امتیاز قرار دیتا ہے نہ حسب کو، نہ دولت اس کے نزدیک کوئی اہمیت رکھتی ہے نہ جاہ و ثروت۔ وہ دیکھتا ہے صرف رواداری کو، جذبۂ ایثار و فدویت کو، اور محض اس اضطراب کو جو بنی نوع انسانی کے ہر فرد میں دوسرے فرد کی اعانت کے لئے پیدا ہونا چاہئے۔

پھر آج اسلام کا صحیح مفہوم بتانے کے لئے سب سے پہلے ضرورت ہے اس عنصر کو محو کر دینے کی جو اسلام کو اصطلاحی لفظ قرار دیکر اس کو اخوت عامہ کے مقصد سے علیحدہ کر رہا ہے اور موجودہ ضروریات تمدن و زمانہ کے لحاظ سے تمام ان اصول معاشرت و حیات پر نظر ثانی کرنے کی جو آج اسلام کے چہرہ کو نہایت بدنما صورت میں پیش کر رہے ہیں۔ اگر زمانہ کے ساتھ لوگوں کے امیال و عواطف اور عقول و افکار میں تغیر ہونا ضروری ہے تو پھر یقیناً وہی مذہب حقیقی معنی میں خدائی مذہب کہلائے گا جو عہد و زمانہ کے لحاظ سے تمام عقول و اذہان کی رہبری کر سکے اور اپنے اندر اس تغیر کو روا رکھے جس کے بغیر "اخوت عامہ" کا مقصد عظیم حاصل نہیں ہو سکتا۔

پھر آج اگر منزل تک پہونچنے کا کوئی صحیح راستہ ہو سکتا ہے تو وہ نہ وہ ہے جسے تمام علماء دین زمانہ سے صدیوں پیچھے ہٹ کر متعین کر رہے ہیں اور نہ اس کی وہ تدبیر ہے جو کلکتہ کی اس لیگ نے بتائی ہے۔

اس لئے جس ایثار و قربانی، جس رسوخ و استواری کی ضرورت ہے وہ ہم میں سے سرمد و منصور کی طلبگار ہے سقراط و حسین کی متجسس ہے، اور ان مردان خدا کی منتظر ہے جو ممبر پر نہیں بلکہ دار پر اس راز کا اعلان کرنے کی جرأت اپنے اندر رکھتے ہوں

پھر اگر آج بعض نفوس مقدسہ اس قربانی کے لئے آمادہ ہو جائیں خدمت اسلام کے لئے اپنے تمام مصالح ذاتی کو پس پشت ڈالنے کے لئے طیار ہو جائیں، تو بغیر کسی لیگ کے قائم کئے ہوئے حقیقی مقصد حاصل ہو سکتا ہے اور دنیا از خود ان مولویوں، ان ملاؤں، ان عالمان دین، ان پیران طریقت، ان تصوف پیشگان جم مرتبت کے بتوں کو ٹھکرا دینے کے لئے آمادہ ہو سکتی ہے

مین اس لیگ کے ارباب کار کو بتانا چاہتا ہون کہ مین جس منزل مین ہون وہ ان کے لیگ کے مقاصد سے بہت بلند ہے اور میرے نزدیک اس نوع کی جماعتون یا انجمنون کا قیام ایک طفلانہ نمائش تو ضرور ہے لیکن سنجیدہ و موثر تدابیر سے اس کو کوئی علاقہ نہین ہو سکتا

اگر اس لیگ کو کچھ کرنا ہے تو مین مشورہ دونگا کہ

بیفشان دامن و آزادہ برخیز

ورنہ اسے فنا ہو جانا چاہئے کیونکہ جو "بابِ نبرد" نہ ہو اس کو "عشق نبرد پیشہ" کی دعوت پر لبیک کہنے کا کوئی حق حاصل نہین ہے

داس کا حکومت کے طرزِ عمل کے خلاف احتجاجاً فاقہ کی تڑپا تڑپا کر ہلاک کرنے والی صعوبتون کو برداشت کرکے اس دنیا سے گزر جانا، گو بظاہر نہایت معمولی بات معلوم ہوتی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اگر آپ تاریخ کے اوراق الٹ کر دیکھین گے تو معلوم ہوگا کہ زمانہ ایسے "مردانِ خدا" چند سے زیادہ نہین پیدا کر سکا

اس وقت یقیناً یہ سوال ہے صرف ایک شخص، ایک معمولی انسان کے جان دیدینے کا، لیکن عاقبت بین نگاہین دیکھ سکتی ہین کہ یہ موت، احیاء ہے ایک قوم کا، نجات ہے ایک ملک کی

داس نہین مرا، بلکہ زندگی کا راز ہمکو بتا گیا، اس کے جنازہ پر پھول نہین برسائے گئے، بلکہ آزادی کی دیوی کے تخت و تاج کو آراستہ کیا گیا اور اگر فطرت نے اپنے اصول نہین بدلے ہین تو ہم کہہ سکتے ہین کہ داس نے انتظار کی مدت کو بقدر نصف صدی کم کر دیا ہے اور وہ وقت دور نہین جب ارتھی پر سوگ کے پھول چڑھانے والے ہات، "ملکۂ حریت" کے جلوس مین مسرت کی گلباریان کرتے ہوے نظر آئین گے

موت نام ہے دنیا سے محو ہو جانے کا - پھر کون ہے جو داس کو مردہ کہہ سکتا ہے - الا ان اولیاء اللہ لا یموتون - یقیناً داس اللہ کے اولیا مین سے ایک ولی تھا اور اگر مسلمان مجھے اس اظہار خیال پر اسلام سے خارج کرنا چاہین تو کر دین، مجھے پروا نہین

منت کش چشم کہ حقیقت نگر آمد

اور اگر وہ ولایت خداوندی کو صرف اپنے ہی لئے مخصوص جانتے ہین تو کم از کم مجھے یقین نہ دلائین کہ میرے اوپر تو اس کے خیال سے بھی موت کا سا جمود طاری ہونے لگتا ہے اور نہ اپنی قربانیون کا ذکر کرین کہ

دارد تفاوت آب شدن تا گریستن

یہ بڑی حد تک صحیح ہے کہ ہندوستان کا سیاسی تگ و دو مین اس وقت تک کوئی کامیابی حاصل نہ کر سکنا ہندو مسلم تفریق کی وجہ سے ہے اور یہ بھی غلط نہین کہ اس تفریق کے قیام مین ہندؤن کی تنگ نظری اور عصبیت بہت معاون ہو رہی ہے لیکن کیا مسلمان اس باب مین بالکل معصوم ہین کیا وہ ہندوستان کی مسئلۂ آزادی کو واقعی بہت اہم سمجھتے ہین اور کیا وہ اپنی پوری توجہ اس طرف

صرف کر رہے ہین؟ ممکن ہے بعض نفوس اس دعویٰ کر سکین، لیکن عام طور پر مسلمانون کی ذہنیت اسدرجہ انتشار و پراگندگی رکھتی ہے کہ اس وقت تک یہی نہین معلوم ہو سکا کہ انکا مقصود کیا ہے۔ کبھی وہ مسئلۂ تبلیغ کی کامیابی کو اپنے مرض کا علاج سمجھکر اس طرف متوجہ ہو جاتے ہین، کبھی "خدمت کعبہ" کو وہ اساس تہذیب و اخلاق جانکر اپنے آپ کو "خدام کعبہ" کہنے اور کہلوانے پر اصرار کرتے ہین کبھی "زوال خلافت" پر مجلس عزا مرتب کر کے اس کا نام "خلافت کمیٹی" رکھتے ہین اور اب خیر سے فلسطین کے معاملہ نے ایک اور نئی چیز "فلسطین کمیٹی" کی بنیاد کا مواد فراہم کر دیا ہے۔ گویا ہندوستان کے مسلمان ساری دنیا کے ذمہ دار ہین اور جب تک یہ ہندوستان مین بیٹھکر کوئی رزولیوشن پاس نہ کر دینگے اس وقت تک عالم اسلامی کی کوئی مشکل حل ہو ہی نہین سکتی۔ لیکن اس "خاک بسر" قوم سے کوئی پوچھے کہ۔ اس وقت تک ان تمام مذہبی، سیاسی اور اخلاقی انجمنون نے کیا کارہائے نمایان انجام دئے اور ان تحریکات مین حصہ لینے کے بعد دوسرون کو کیا فایدہ پہونچا یا اور خود کیا فایدہ حاصل کیا خلافت ختم ہونے کے بعد خلافت کمیٹی قایم ہوئی اور دولت بے اندازہ ہندوستان کے غریب مسلمانون سے جمع کی گئی، لیکن کیا حکومت حجاز نے ارض مقدسہ سے یہود و نصاریٰ کے اثرات محو کرنے مین کوئی مدد ان کی، کیا وہ اس سلسلہ مین اپنی کسی حقیر سے حقیر آرزو کو بھی پورا دیکھنے مین کامیاب ہو سکے۔ اسی طرح خدام کعبہ کی حیثیت سے وہ مسئول ہو سکتے ہین کہ اس باب مین ان کے خدمات کیا ہین۔ کیا حاجیون کی جماعت کو بمبئی مین ٹکٹ خرید کر کے لا دینا، مسافرخانون مین اکران کو ٹھیرا دینا اور جہاز پر سوار کرا دینا اتنا بڑا کام ہے کہ اس سے زیادہ کوئی اور ذریعۂ نجات ہو ہی نہین ہو سکتا۔ جمعیۃ العلماء اور ان کی تبلیغ کا ذکر فضول ہے کیونکہ اب اس جماعت اور اس کے اس مقصد کی لغویت روز روشن کی طرح عیان ہے

اب اس ذہنیت کے ماتحت فلسطین کے مسئلہ مین ہنگامۂ گدایانہ برپا کیا جا رہا ہے، اور کیا عجب ہے کہ اس کے لئے بھی کوئی فہرست فراہمی چندہ کی کھولدیجائے۔ لیکن اس کا نتیجہ بھی جو کچھ ہونے والا ہے، کسی سے مخفی نہین۔ یہان کے مسلمان یہ نہین سمجھتے کہ جب تک وہ خود اپنی ملکی و مقامی حیثیت کو مستحکم و بلند نہ کرینگے اُن کے "طنین پشہ" کو کون سنیگا اور اُن کے شور و شغب سے دنیا کے یہ اصول کیونکر بدل سکتے ہین کہ پہاڑ سے سر ٹکرانا خود اپنے سر کو مجروح کرنا ہے۔ اگر مسلمان چاہتے ہین کہ واقعی ان کی آواز کو کوئی اہمیت دیجائے تو انکا فرض یہ ہونا چاہئے کہ پہلے اندرونی ملکی سیاسیات مین اپنے اندر ایک جماعت صالح کی سی اہمیت پیدا کرین اور جب خود اپنے گھر کو محفوظ کرلین تو دوسرون کے گھرون کی آگ بجھانے کی کوشش کرین۔ کیا ہندوستان کے مسلمانون کے باب مین، ترکی، ایران، افغانستان، مصر، فلسطین، حجاز کسی جگہ سے کوئی آواز بلند کیجاتی ہے، کیا کبھی [illegible] اگیا ہے کہ وہان کی کسی انجمن نے کوئی تجویز اپنی حکومت کے ذریعہ سے حکومت برطانیہ کے پاس بھیجی ہو، پھر جب اس وقت حالت یہ ہے کہ ہر قوم و جماعت اپنے ہی تحفظ کی منزل سے نہین گزری، تو ہندوستان کے مسلمانون کی یہ "انجمن آرائیان" اور "رزولیوشن فرمائیان" کیا اہمیت رکھ سکتی ہین

مین دیکھتا ہون کہ مسلمانون کی ایک جماعت اور غالباً بڑی جماعت سارد ابل کی منظوری سے چین بہ جبین نظر آتی ہے یہانتک کہ اسمبلی کے بعض مسلمان ممبر احتجاجاً ہال سے اٹھکر باہر چلے گئے۔ ہم نے مانا کہ صغرسنی کی شادیان ہندؤن مین زیادہ ہوتی ہین اور

یہ قانون انھون نے اپنے ہی معاشرت کی اصلاح کے لئے نافذ کرایا ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ جب اصولاً مسلمان بھی اس کے مفاد کے منکر نہین ہین تو وہ کیون مخالفت کرتے ہین۔ رہا شریعت اسلامی کا سوال، سو مین پوچھتا ہون کہ کیا ہندوستان مین زنا کے جرم مین کسی کو سنگسار کیا جاتا ہے، کیا سرقہ کے ارتکاب پر کسی کے ہات قطع کئے جاتے ہین، کیا تہمت پر یہان حد قذف جاری ہوتی ہے، کیا شراب خواری پر درّے لگائے جاتے ہین، پھر جب مسلمان ان تمام تعزیرات کو جو شریعت اسلامی کے خلاف ہین گوارا کئے ہوئے ہین تو کوئی وجہ نہین کہ وہ سارڈا بل پر چراغ پا ہون علی الخصوص اُس وقت جبکہ مسلمانون مین بھی ہندؤن کے ساتھ میل جول رکھنے کی وجہ سے صغر سنی کی شادی کا رواج کچھ کم نہین ہے

صغر سنی کی شادی کو روکنے والا قانون باوجود اس کے کہ مسلمانون کی ایک جماعت نے مخالفت کی، منظور ہوگیا اور ۱۹۳۰ء سے اس کا نفاذ بھی ہوجائے گا، جہانتک عورتون کی صحت کا تعلق ہے یہ قانون بہت مفید ہے اور معاشری حالت کی درستی مین بھی اس سے کام لیا جاسکتا ہے، لیکن اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ایک قانون اس سے بہت زیادہ اہم تھا جس کی طرف کسی نے توجہ نہین کی اور جس کا نفاذ بقاءِ عقل و حواس اور تحفظ انسانیت و اخلاق کے لئے ازبس ضروری ہے

اس وقت تمام اکناف ہند مین ایک کثیر جماعت ان لوگون کی دیکھی جاتی ہے جو اپنے آپ کو عالم دین کہتے ہین، صوفی راہ طریقت بتاتے ہین، مجالس وعظ مین سخت تباہ کن اور دشمن عقل و انصاف روایات بیان کرتے ہین صرف اس لئے کہ روپیہ کمائین، جاہلان اور احمقون کو اپنے کاذب کشف و مراقبہ سے دھوکا دیکر اپنا گرویدہ بناتے ہین تاکہ زندگی کے تمام نعایم و لذائذ اپنے لئے مخصوص کرلین درانحالیکہ انھون نے کوئی محنت نہین کی، کسی جفاکشی اور عرقریزی سے کام نہین لیا

اگر قانون تعزیرات ہند دغا مین ان کو گرفتار نہین کرسکتا، اگر ضابطہ فوجداری آوارہ گردی کے سلسلہ مین ان کو نیک چلنی کا پابند کا نہین بنا سکتا، اگر امتناع گداگری کا قانون اُن پر نافذ نہین ہوسکتا، تو کوئی وجہ نہین کہ ان کی تباہکاریون سے بچانے کے لئے، ایک علیحدہ قانون نہ مرتب کیا جائے اور ان معزز گداگرون، ان پڑھے لکھے بھکاریون کو جو "یسئلون الناس الحافا" کی ایک مخفی مگر نہایت ہی سخت لعنت مین مبتلا ہین وعظ پیشگی اور پیری مریدی سے نہ باز رکھا جائے۔ نہ ان کے پاس کوئی جائداد ہے نہ ریاست نہ یہ کہین ملازمت کرتے ہین، نہ تجارت لیکن دولت ہے کہ ان کے قدمون پر نثار کیجارہی ہے، اور عیش و نشاط کی دیوی ہے کہ ہر وقت ان کے پہلو سے وابستہ نظر آتی ہے۔ مین نہین سمجھ سکتا کہ غریب اہل ہند کی وہ کمائی جو پسینہ مین ڈوب کر حاصل ہوتی ہے، کیون بلا کسی محنت و استحقاقِ مُزد کے ان مولویون، پیرون، سیدون پنڈتون، جوتشیون اور برہمنون کو دیدیجائے جو ایک متعدی مرض کے جراثیم کی طرح صرف وبا اور ہلاکت پھیلانے کے لئے رونما ہوئے ہین

کیا اسمبلی کے کسی ہندو یا مسلمان ممبر میں یہ جرأت ہی کہ وہ اس مسئلہ کو پیش کرکے تکمیل کی حد تک پہونچائے؟

نیاز

ہندی اور بابلی علم الاصنام کی مشابہت

(بہ سلسلہ ماسبق)

۷ - بھیم

گلگمیش اور ایع بانی قدیم بابل کے دو بڑے بڑے ہیرو تھے۔ اہل بابل کی متھیا مین ان دونون (اور خصوصاً گلگمیش) کا وُہی رتبہ تھا جو یونان مین ہرقل کا اور ہمارے ملک مین بھیم کا تھا۔ بابل کے یہ دونون ہیرو ایک دوسرے کے بہت گہرے دوست تھے۔ ایک ہفتخوان کو طے کرنے کے دوران مین ایع بانی کو موت کے دیوتا نے گرفتار کر کے زمین کے نیچے کے طبقہ مین مُردون کی سرزمین کو روانہ کر دیا (یعنی ایع بانی مر گیا) اور گلگمیش بھی بیماری مین مبتلا ہو گیا، تو مؤخر الذکر نے تہیہ کیا کہ وہ کسی نہ کسی طرح اپنے جد بزرگ پیر نپشتیم سے (جو زمین کے نیچے کی دنیا مین سمندر مین رہتا تھا) مل کر مدد لیگا اور اپنی اس پریشانی کو دور کریگا۔ چنانچہ وہ اس ارادہ سے نکلا، اور بڑے بڑے سر بفلک پہاڑون اور اُن کی دشوار گزار گھاٹیون سے گزرتا، قدم قدم پر خونخوار شیرون سے لڑتا اور اُنھین قتل کرتا ہوا ماشی پہاڑ کی ایک تنگ و تاریک سرنگ پر پہنچا جس کے دروازہ پر ایک بڑے سے بچھو کی شکل کے دیو اور اُس کی دیونی سے سابقہ ہوا۔ گلگمیش اُنھین دیکھتے ہی غش کھا کے گر پڑا۔ مگر چونکہ وہ جانتے تھے کہ گلگمیش دیوتا کا بچہ ہے اور دیوتاؤن کا سا جسم رکھتا ہے، اس لئے اُنھون نے اُسے کچھ ایذا نہین دی۔ ہوش مین آیا تو دیونے اس کے سفر کا مقصد دریافت کیا، اور معلوم کرنے پر اُسے بڑے پیار سے اور تمام دشواریون سے آگاہ کر کے اُن پر قابو پانے اور زندہ سلامت منزل مقصود تک پہنچ جانے کا طریقہ بتایا۔ چنانچہ گلگمیش ان ہدایتون پر عمل کرتا اور طرح طرح کی دشواریون، خصوصاً ”موت کے سمندر“ کی آفتون سے بچتا ہوا آخر پیر نپشتیم کے پاس پہنچ گیا۔ وہ پیر کو جوان اور مضبوط چاق چوبند دیکھ کر بہت حیران ہوا۔ اس سے نہ رہا گیا اور پیر سے سوال کیا کہ ”آپ باوجود اتنے سن رسیدہ ہونے کے اب تک کیونکر ایسے مضبوط اور جوان ہین؟“ اس سوال کے جواب مین پیر نے اُسے طوفان کا قصہ سنایا (جو ادھر بیان ہو چکا ہے)۔ اس کے بعد گلگمیش نے اپنی ساری رام کہانی سنائی کہ کس طرح ایع بانی جیسے ہمدم و ہمراز کا ساتھ چھوٹا اور وہ خود کیسی کیسی بیماریون مین مبتلا رہا اور کیا کیا آفتین جھیل کر وہان تک پہنچا۔ چونکہ بہت تھک چکا تھا، سو گیا۔ پیر کی بیوی کو اُس پر بڑا ترس آیا، اور اُس نے اپنے شوہر سے کہا کہ ”اس لڑکے کو اپنے ہاتھ سے چھو دیجئے تاکہ اس کی سب بیماریان دور ہو جائین اور اسے جادو کا کھانا کھلائیے تاکہ وہ پھر صحت اور سلامتی کے ساتھ اپنے گھر واپس پہنچ جائے۔“ چنانچہ ابھی گلگمیش سو ہی رہا تھا کہ پیر نے اُسے چھوا، اور پیر کی بیوی نے جادو سے تیار کی ہوئی غذا بھی اُسی حالت مین کھلا دی۔ گلگمیش جاگا تو اپنے اندر ایک نئی طاقت نئی روح محسوس کرتا تھا لیکن بوڑھے پیر کو اس پر بھی صبر نہ ہوا اور اُس نے گلگمیش کو ”آب حیات“ کے چشمے پر غسل کرنے کو بھیج دیا۔ اس غسل سے اُس کے جسم کی تمام بیماریان دور ہو گئین اور وہ پہلے سے بھی زیادہ تندرست اور توانا ہو گیا۔

مہابھارت (بان پرب) مین بھیم کے متعلق بھی اسی قسم کی روایت درج ہے۔ بھیم نے بھی گلگمیش کی طرح کُبیر کے چشمے کی تلاش مین

جہان اُسے معلوم ہوا تھا کہ ایسے ایسے سُندر کنول پھول ہوتے ہین کہ دھرتی والون نے کبھی سُپنے مین بھی نہ دیکھے ہون اور اُن کو دیکھنے اور چھُونے سے ساری تھکن دُور ہو کر نیا زور اور بل پیدا ہو جاتا ہے۔ دیو لوک تک پہنچنے کے لئے اُتر پورب کی طرف سفر کیا جس طرح گلگمیش کو پیر نپشتیم نے طوفان کا قصہ سنایا تھا اُسی طرح بھیم کو ہنومان جی مل گئے تھے اور اُنھون نے اُسے دنیا کی عمر کا حال بتایا تھا اور طوفان کی کہانی سنائی تھی جس نے اُس وقت سے پہلے کی سب نسلون کا ستیاناس کر دیا تھا۔ بھیم بھی کُبیر تال پر پہنچ کر دیوون سے لڑا تھا، اور گلگمیش کی طرح اُسے بھی کُبیر مین نہانے اور اُس کے امرت کے پینے سے ایک نیا بل نیا زور مل گیا تھا اور اُس کے جسم کے سارے گھاؤ اچھے ہو گئے تھے

بابلی متھیا مین گلگمیش کے سرنگ کو پار کرنے کی جو کہانی ہے (جس کا اوپر مختصر سا ذکر ہوا ہے) وہ ہندی متھیا کی اس کہانی سے بہت مشابہ ہے جس مین لنکا کا راجا راون سیتا جی کو اُٹھا کر لے گیا تھا اور ہنومان جی سیتا جی کی تلاش مین ایک بڑے لمبے سے غار کو پار کر کے ایک جوگن کے محل پر پہنچے تھے۔ ہنومان جی نے سری رام چندر جی سے کہا تھا کہ "مہاراج" مین نے راجا جنک کی بیٹی کو دیکھا ہے۔ جب ہم دکھن کے پہاڑون غارون اور جنگلون مین گھومتے گھومتے تھک گئے تو ہمین ایک بڑا سا غار دکھائی دیا۔ ہم اُس غار مین گھس گئے۔ اندر پہنچ کے معلوم ہوا کہ غار بہت گہرا ہے۔ چارون طرف گھُپ اندھیرا تھا۔ ہر طرف بڑے بڑے درخت تھے، اور زمین پر بھانت بھانت کے بھیانک کیڑے مکوڑے رینگتے پھرتے تھے۔ بڑی بڑی آفتون کا سامنا کر کے ہم نے اُس غار کو پار کیا، دور تک نکل جانے کے بعد ہمین سورج کی روشنی دکھائی دی اور ایک بڑی سی گڑھی نظر پڑی۔ یہ مایا دیوی کی گڑھی تھی۔ اُس مین پربھاوتی نام ایک جوگن اپنی تپسیا مین مشغول تھی۔ اُس نے ہمین طرح طرح کھانے پینے کی چیزین دین۔ جب ہم کھا پی چکے اور تازہ دم ہو گئے تو جوگن کے بتائے ہوئے راستے پر چل کھڑے ہوئے۔ جب ہم اُس غار سے نکلے تو ہمین ایک سمندر نظر آیا جس کے کنارے پر تین پہاڑ تھے۔ ہم نے اُن مین سے ایک پہاڑ پر کھڑے ہو کر دیکھا تو سامنے ایک بہت بڑا سا سمندر دکھائی دیا۔ تب تو ہم لوگ اپنی زندگی سے مایوس ہو گئے اور ہمین کسی طرح کی امید نہین رہ گئی کہ اب ہم اپنے گھر واپس پہنچ سکینگے۔..... وغیرہ وغیرہ۔ اُسی جگہ ہنومان جی اور اُن کے ساتھیون کو ایک بڑا سا عقاب ملا، جس نے انھین بتایا کہ ہو نہ ہو سیتا جی کو راون ہی لے گیا ہوگا۔ مگر ان مین اس سمندر کو پار کرنے کی ہمت نہ تھی۔ آخر ہنومان جی نے ایک تدبیر سوچی، اور کسی طرح ہوا کے دیوتا وائی کی مدد سے سمندر کے اوپر سے اُڑتے اور راستے مین سب بھوت پریت اور دیو وی کو مارتے ہوئے لنکا پہنچے اور سیتا جی کا پتہ لگا لیا

اب اس کے مقابلے مین گلگمیش اس سرنگ کے بچھونما چوکیدار اور اُس کی بیوی کی ہدایت پر آگے بڑھا تو اُسے معلوم ہوا کہ وہ پہاڑی سرنگ بارہ میل لمبی تھی اور ہر طرف سوا گھُپ اندھیرے کے اور کچھ نہ تھا۔ مگر گلگمیش نے کمر ہمت چست کی اور اُس سرنگ کو کسی نہ کسی طرح پار کرنے کی ٹھان لی۔ وہ آگے بڑھا اور اُس اندھیرے غار مین گھس گیا۔ پورے چوبیس گھنٹے تک طرح طرح کی مصیبتین جھیلنے کے بعد اُسے کچھ روشنی دکھائی دی جسے دیکھتے ہی وہ بے تحاشا بھاگا اور اس سرنگ مین سے نکل گیا۔ اور پھر دن کی روشنی مین پہنچ گیا۔ وہان پہنچ کر اُسے ایک خوشنما اور دلکشا باغ نظر آیا جس کے بیچون بیچ ایک بہت ہی خوبصورت اور بابرکت درخت لگا ہوا تھا۔ اُس کی شاخین طرح طرح کے بیش بہا پتھرون کے گچھون سے لدی ہوئی تھین اور پتے جواہرات کے تھے۔ گلگمیش یہ نظارہ دیکھ کر ششدر رہ گیا۔ کچھ دیر اسی طرح حیرت سے اُسے دیکھتا رہا، آگے بڑھا تو اُسی قسم کے اور بہت سے درخت اُسے نظر آئے۔ مگر وہ ان سب کو پیچھے چھوڑتا ہوا آگے بڑھا، اور چلتے

چلتے ایک سمندر کے کنارے پر پہنچا یہ " موت کا سمندر " تھا جس ملک میں وہ سمندر تھا جب اُس کی رانی نے اُسے آتے ہوئے دیکھا تو وہ جلدی سے اپنے محل میں گھس گئی اور دروازہ بند کر لیا۔ گلگمیش نے بڑی خوشامدوں اور دھمکیوں سے دروازہ کھلوایا اور رانی سے آگے کا راستہ دریافت کیا۔ رانی نے کہا کہ " اس بھیانک سمندر کو آج تک کوئی پار نہیں کر سکا۔ تم میں اتنی طاقت کہاں سے آئی کہ تم موت کی موجوں کا مقابلہ کر سکو!" لیکن بہادر سیاح اس پر بھی مایوس نہیں ہوا، اور آخر کار رانی کو بتانا ہی پڑا کہ ارد اربع نامی ملاح کی مدد سے اُس سمندر کو پار کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ اس نے ارد کو بلایا اور اُسے اپنے ہمراہ کشتی میں بٹھا کے لے چلا۔ یہاں پھر اُسے سخت سے سخت آفتیں جھیلنی پڑیں۔ لیکن وہ اپنے ارادے میں کامیاب ہوا اور پیر نپشتیم سے ملاقات ہو گئی! پیر نے اُسے طوفان کا قصہ سنایا (جو اوپر بیان ہو چکا ہے)...... وغیرہ وغیرہ

۸- گرڑ

گرڑ ہندی متھیا میں نہ صرف پرندوں کا بادشاہ اور وشنو جی کی سواری ہے، بلکہ اُسے ایک دیوتا کا رتبہ بھی حاصل ہے۔ گرڑ کی ماں کو سانپ (جو گرڑ کے سخت دشمن تھے) اُٹھا کے لے گئے تھے اور اُس بیچاری کو اپنی باندی بنا کر طرح طرح کی ایذائیں دیتے تھے۔ گرڑ نے ہزار جتن کئے، مگر اپنی ماں کو ان ظالموں کے پنجے سے نہ چھڑا سکا۔ آخر اُس نے یہ تدبیر نکالی کہ دیوتاؤں کا امرت (آب حیات جس سے دیوتاؤں کو دوامی زندگی حاصل تھی) چُرا کے گیا اور سانپوں کی نذر کیا۔ تب کہیں جا کے اُس کی ماں کو خلاصی نصیب ہوئی۔ جب اندر دیوتا کو معلوم ہوا کہ امرت چوری گیا، تو اُس نے گرج گرج کر گرڑ پر بجلیاں برسانی شروع کیں۔ مگر ایک بھی کارگر نہ ہوئی۔ صرف اتنا ہوا کہ گرڑ کا ایک پر زخمی ہو کر گر گیا، اور بس۔ آخر لاکھ دشواریوں کے بعد اندر کو وہ " چاند کا پیالہ " ہاتھ لگا جس میں امرت رکھا رہتا تھا، اور وہ اسی کو لے کر دیولوک کو واپس چلا گیا امرت نہ ملا نہ سہی، غنیمت ہوا کہ پیالہ ہی ہاتھ آ گیا!

قریب قریب یہی حال بابل کی متھیا میں زُو پرندے کا ہے، جو آجکل گھوڑا (سپت مکھ اشو) اور بیل (برشب تور) کے نام سے موسوم ہے۔ وہ لوگ اُسے " بدکار " اور " بدی کا سر اُٹھانے والا " کہتے تھے۔ ایک مرتبہ اُس کے جی میں آئی کہ کسی طرح دیوتاؤں پر حکومت کرنا اور اُن پر زور چلانا چاہئے۔ اس غرض سے اُس نے خداؤں کے خدا (مہادیو؟) بَیل کے گھر میں سے " لوحِ تقدیر " کو (جس کے ذریعہ وہ سب دنیاداروں کی قسمتوں اور تقدیروں کو اپنے دست قدرت میں رکھتا تھا) چُرا کے بھاگا، اور سیدھا عرب پہنچ کر ایک پہاڑ کی چوٹی پر دم لیا۔ آنُو دیوتا نے گرجنے والے دیوتا رمّن (ہندی اندر) سے درخواست کی کہ وہ زُو پر حملہ کر کے اُسے تباہ کر دے۔ لیکن رمّن ڈر کے جھجک گیا اور حملہ نہ کر سکا۔ اسی طرح اور سب دیوتا بھی کانوں پر ہاتھ دھر کے الگ ہو گئے اور کسی کی اتنی ہمت نہ ہوئی کہ زُو پر حملہ کر کے " لوحِ تقدیر " اُس سے چھین لیتا۔ آخر جب کسی سے کچھ نہ ہو سکا تو چاند کا دیوتا عرب جا کر زُو سے لوح کو چھین لانے کے ارادہ سے روانہ ہوا...... (افسوس کہ قدیم روایات سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ اس کے بعد چاند دیوتا اور زو کا کیا حشر ہوا)

بابل کی متھیا میں دو بڑے بیر (بلکہ انھیں مہابیر اور راج بیر کہنا زیادہ مناسب ہوگا) گلگمیش اور اینگی تھے ان دونوں کے

بارے مین کہا جاتا ہے کہ بادشاہ تھے، اور دونون نیچے والی دُنیا (پاتال؟) کے سفر کو گئے تھے۔ ایتن وہان سے "پیدائش کا پودا" لانے کے لئے گیا تھا اور گلگمیش "زندگی کا پودا" لانے کی نیت سے۔ ایتن نے ایک بڑے سے دیو نما عقاب سے مدد لی، جو ہمارے ہندی گرڑ کی طرح سانپون کا دشمن تھا۔ اور جس طرح ہندوستان مین وشنوجی مہاراج گرڑ کی پیٹھ پر سوار ہوتے تھے اُسی طرح ایتن بھی اس بابلی عقاب پر سوار ہو گیا تھا۔ ایک اور موقع پر جب ایتن نے سب سے اوپر کے آسمان (عرش!) کا سفر کرنا چاہا تھا، تب بھی اُس نے اسی عقاب سے مدد مانگی تھی۔ اس استمداد پر عقاب نے کہا کہ "ہان دوست، مین بڑی خوشی سے تمھین سب سے اوپر کے آسمان تک لے چلونگا۔ اپنے سینے کو میرے سینے پر اور اپنے بازوؤن کو میرے پرون پر رکھ دو اور اپنے جسم کو میرے جسم سے ملا کر بالکل ایک کردو، اور چلے چلو!" چنانچہ ایتن نے ایسا ہی کیا، اور عقاب نے اپنے شہپرون پر اس طرح چسپان کئے ہوئے اوپر کو اڑا، دو گھنٹے تک اُڑتے رہنے کے بعد عقاب نے ایتن سے کہا کہ "ذرا نیچے دیکھو" ایتن نے دیکھا کہ سمندر زمین کو چارون طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔ عقاب اور بلند ہوا، اور دو گھنٹے کے بعد اُس نے ایتن سے پھر کہا کہ نیچے دیکھو، اب کے اُس مہابیر نے دیکھا کہ سمندر زمین کو بالکل ایک پیٹی کی طرح گھیرے ہوئے ہے۔ عقاب اور اونچا اڑا، اور پھر دو گھنٹے کے بعد ایتن نے دیکھا کہ سارا سمندر ایک چھوٹے سے تالاب کے برابر رہ گیا ہے۔ اتنی دیر (چھ گھنٹے) مین وہ دونون انُو، بَعَل اور ایع کے آسمان پر پہنچ گئے، جہان ایتن کو آرام اور سایہ کی جگہ مل گئی۔ کچھ سستانے کے بعد عقاب پھر ایتن کو لے کر اڑا، اور سیدھا آسمان کی ملکہ (اور سب سے بڑی دیوی) اِشتر کے آسمان کی طرف چلا۔ اس اثنا مین اُس نے پھر دو دو گھنٹے کے بعد ایتن سے نیچے دیکھنے کو کہا اور ایتن برابر دیکھتا رہا کہ زمین کس طرح جلدی جلدی سکڑ رہی ہے! اس کے بعد کچھ حادثہ پیش آیا، اور عقاب بجائے اونچا ہونے کے نیچے کو گرنے لگا[1]۔ اور گرتے گرتے دھڑام سے زمین پر آ رہا۔ عقاب کے تو پرخچے اڑ گئے، لیکن ایتن (غالباً) زندہ سلامت بچ گیا

ہمارے گرڑ کے ساتھ ایسا حادثہ تو نہین ہوا، لیکن دو واقعات اُس سے منسوب کئے جاتے ہین۔ (۱) ایک دفعہ وشنوجی مہاراج اُس پر سوار چلے جا رہے تھے۔ راستے مین ایک جگہ انھون نے اپنے داہنے بازو سے (جو تمام کائنات سے زیادہ وزنی تھا!) اُسے دبایا تو اس بوجھ سے اُس کے کچھ پر جھڑ گئے۔ (۲) رامائن شریف مین گرڑ کے دو بیٹون کا ذکر آتا ہے۔ اُن مین سے ایک کو تو راون نے زخمی کر کے مار ڈالا تھا، اور دوسرا سری رام چندر جی مہاراج کو زخمی بلکہ نیم مردہ حالت مین پڑا ہوا ملا تھا۔ اُس نے آنجناب سے بیان کیا تھا کہ "ایک دفعہ ہم دونون بھائی ایک دوسرے سے آگے بڑھ جانے کی شرط بد کے سورج کی طرف اڑے۔ سورج کے قریب پہنچ کر میرے تو پر جل گئے[2]۔ مگر میرے بھائی کے پر بچ گئے۔ مین یہان اس پہاڑ پر گر پڑا، اور اب تک ان برے حالون مین یہان پڑا ہون!"

اس ضمن مین اسی نوع کی دو اور دلچسپ روایتین بیان کرنا بیجا نہ ہوگا جو عرب کے (مُسلم!) باشندون مین عام طور پر رائج تھین (اور غالباً اب بھی ہین)۔ ایک تو بابل کے بادشاہ نمرود کے متعلق ہے کہ جب حضرت ابراہیم نے اُسے ایک خدا کی عبادت کرنے کی دعوت دی تو اُس نے ایک بہت بلند مینار بنوایا تاکہ اُس پر چڑھ کر "ابراہیم کے خدا" کو دیکھ سکے۔ لیکن جب خدا کی قدرت سے یہ مینار بننے کے بعد گر گیا، تو وہ ایک صندوق مین بیٹھ کر اڑا جسے چار بڑے بڑے دیو صفت پرندے اڑا کر لے گئے۔ دور کی بلندی تک پہنچنے کے بعد

---

[1] اگر یک سرموی برتر پرم ..... [2] فروغ تجلی بسوزد پرم!

وہ اس زور سے ایک پہاڑ پر گرا کہ پہاڑ بھی ہل گیا! ——— دوسری روایت سکندر ذو القرنین کی ہے کہ اُس نے "ملک ظلمات" مین عقاب سے بھی زیادہ بڑے بڑے پرندے پال رکھے تھے۔ ایک مرتبہ اُس نے اپنے چار سپاہیون کو حکم دیا کہ ان پرندون پر بیٹھ کر اڑین اور آسمان کی خبر لائین۔ چنانچہ وہ اڑے اور اوپر سے "زندہ لوگون کے ملک" کی خبرین لائے۔ اسی طرح سکندر کے متعلق حبشی روایتون مین ایک روایت یہ بھی ہے کہ اُسے زمین کی لمبائی چوڑائی کا پورا حال معلوم تھا، اور اس علم کے حاصل کرنے کی تدبیر اُس نے یہ نکالی تھی کہ اُس نے اپنے آپ کو بہت ہی چھوٹا سا بنا لیا اور ایک عقاب کی پیٹھ پر سوار ہو کر اڑا اور آسمانون کی سب سے اونچی بلندیون تک پہنچ کر وہان کے سب حالات کی تحقیق کر کے واپس آگیا!

جیسا کہ اوپر ذکر ہوا، گرڑ وشنوجی کی برق پا سواری تھی۔ وشنوجی کی اس سواری کے عالم کی جو مورتیان ہین اُن مین وشنوجی کے ہاتھ مین ایک چکر نظر آتا ہے جو ایک آتشین چکر ہے اور ہر وقت بڑی تیزی سے گھومتا رہتا ہے۔ مہابھارت (آدی پرب) مین لکھا ہے کہ وشنوجی مہاراج نے گرڑ کو اپنی رتھ پر جھنڈے کی چوب پر بٹھا لیا اور فرمایا "اب تم اسی طرح میرے اوپر بیٹھے رہا کرو گے" یہی حال بابل کے دیوتا شمش (سورج دیوتا)، مہادیوی اشتر اور چند اور دیوتاؤن کا بھی ہے۔ اُن کے ہاتھون مین بھی چکر ہوتے ہین، جو حیات جاوید کا نشان ہوتے ہین، خاص کر شمس دیوتا کی مورتی اس طرح بنائی جاتی تھی کہ وہ ستون دار محل مین اپنے تخت پر بیٹھا ہے اور اُس کے سامنے سورج کا چکر ہے۔ اس چکر (یا پہیے) کے ارے لہردار ہوتے تھے اور ہر لہر یا تین تین خطون سے بنایا جاتا تھا

اسی طرح ایران کے قدیم کتبون مین وہان کے بادشاہون کے سرون کے اوپر ہرمزد خدا ایک پر دار پہیے یا چکر کے اندر منڈلاتا ہوا نظر آتا ہے!

۹- کرن

ہماری مہابھارت کا زبردست بیر اور سورما کرن رانی پرتھا کا بیٹا تھا۔ اتفاق سے سورج دیوتا کی نظر رانی جی پر جا پڑی تھی اور وہ ہزار جان سے اُن پر عاشق ہو گیا تھا۔ جب اس عشق کا نتیجہ کرن کی صورت مین نمودار ہوا تو رانی نے ایک ٹوکری کی ناؤ بنائی اور اس معصوم کو اُس ٹوکری مین رکھ کر ندی کے سپرد کر دیا۔ وہ اُسے بہا کر گنگا مائی کے پاس لے گئی اور اُن کے حوالہ کر دیا۔ گنگاجی نے اُسے انگ راج تک پہونچا دیا، جہان ایک عورت نے اُسے اُٹھا لیا اور اپنے شوہر کے پاس لے گئی۔ کرن اپنے ان نئے ماں باپ کی شفقت کے سایہ مین پل کر پروان چڑھا، اور ایک زبردست جنگجو سپاہی اور سپاہ سالار ہو کر آخر کار انگ راج کا راجا ہو گیا

قدیم اسیریا مین بھی ایک لڑکی دیوداسی بنا کر سورج دیوتا شمش کے نام پر مندر مین بٹھا دی گئی تھی۔ اُسے بھی سورج دیوتا نے سرغون نام ایک بیٹا عطا کیا تھا۔ اس شرم کی ماری ماں نے بھی اپنے لال کو ایک چھوٹی سی ناؤ مین رکھ کر دریا کے سپرد کر دیا تھا۔ خدا جانے کتنی دور نکل جانے پر کسی غریب کسان نے اُسے اُٹھا لیا اور بیٹا بنا کر پالا۔ جیسے کرن کو گنگا مائی نے برکت دی تھی، اسی طرح اشتر دیوی نے سرغون کی مدد کی، اور وہ جوان ہو کر نہ صرف ایک بے باک اور دلاور سپاہی ہو گیا بلکہ بہت جلد اپنے قوت بازو سے اسیریا کا بادشاہ بن گیا۔ اُس زمانہ کی تاریخ (جیسی کچھ بھی ہم تک پہنچی ہے) گواہ ہے کہ وہ اسیریا کے نہایت زبردست اور جلیل القدر حکمرانون

مین سے تھا[۱]

۱۰۔ لکشمی

اہل بابل کے ہان اشتر دیوی زرخیزی اور پیداوار کے دیوتا کی مان تھی۔ ہمارے ملک مین لکشمی جی نے پہلے وشنوجی مہاراج سے، پھر سرسوتی دیوی کے نام سے برہما جی سے، بیاہ کیا تھا اور (پران کے ایک بیان کے مطابق) دنیا کی مان تھین (ہین!) اور ہمیشہ ہمیشہ زندہ سلامت رہینگی

۱۱۔ شکنتلا

قدیم ہندوستان کی حسن و عشق کی روایتون مین شکنتلا کو جو رتبہ حاصل ہے اُس سے ہندوستان کا ہر شخص واقف ہے، وہ مینکا نام ایک اپسرا کے بطن سے ایک بڑے رشی وشوامتر کی بیٹی تھی اور مالنی ندی کے کنارے کسی مقام پر پیدا ہوئی تھی، مینکا اُسے ندی کے کنارے چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ ایسے ہو کے مقام مین جہان ہر وقت شیرون اور بھیڑیون کا خطرہ رہتا تھا، خدا نے اُس کی حفاظت کے لئے بہت سے گدھ بھیج دیئے تھے جو ہر وقت اُس کے گرد حلقہ باندھے بیٹھے رہتے تھے اور اُس کی نگہبانی کرتے تھے۔ کئی دن کے بعد ایک خداترس بزرگ کا وہان گذر ہوا۔ وہ اُسے اُٹھا کے اپنے گھر لے گیا اور بڑے جاؤ چوچلے سے اُس کی پرورش کی..... وغیرہ وغیرہ

بابل کی ملکہ سیمی رامس کا واقعہ بھی اسی نوعیت کا ہے۔ اُس کی مان بھی اس زمین کی رہنے والی نہ تھی، بلکہ آسمان ہی سے نازل ہوئی تھی۔ وہ بھی اپنی اس بچی کو پیدائش کے بعد ایک درخت کے نیچے ڈال کے چلی گئی تھی۔ خدا نے اُس کی نگہداشت کا سامان یون پیدا کیا کہ بہت سی فاختائین ہر وقت اُس کے گرد جمع اور قسم قسم کے نازک پھلون اور پھولون سے اُس کی غذا اور تفریح کا سامان کئے رہتی تھین۔ کئی دن تک اسی طرح فاختاؤن کی حفاظت مین گزر گئے۔ ایک دن اتفاق سے شاہی چرواہا اُدھر جا نکلا اُس نے اُسے وہان پڑا ہوا پا کر اٹھا لیا اور اپنے گھر لے جاکر بیٹی بنا کر پالا

جس طرح شکُنت (پرندہ) کی وجہ سے ہندی لڑکی کا نام شکنتلا رکھا گیا تھا ویسے ہی (غالباً اس سے پہلے) سُمَت (فاختہ) کے سبب سے بابلی لڑکی کا نام بھی سُم رَمَت ہو گیا تھا۔ پھر سم رمت سے بگڑ کر یہ نام سیمی رامس ہو گیا

دونون اپنے اپنے ملکون مین حسن کی دیویان خیال کی جاتی ہین۔ شکنتلا راجا دشینت سے بیاہی گئی اور رانی کھلائی۔ سیمی رامس نینوا کے حاکم اور سپہ سالار اُون کے بیاہ مین آئی۔ وہان کا بادشاہ نینس اُس پر عاشق ہو گیا اور اُسے اون سے طلب کیا۔ پہلے تو اُون سے انکار کرتا رہا، لیکن جب دیکھا کہ اُسے نینس کے حوالے کر دینے کے سوا اور کوئی چارہ نہین ہے تو خود پھانسی لے کر مر گیا اور سیمی رامس نینس کی بیوی بن کر ملکہ ہو گئی۔

۱۲۔ سیتلا

جس طرح ہندوستان مین سیتلا (ماتا، مائی، مہارانی، دیوی) چیچک کی دیوی ہے، اور اس مرض کو دفع کرنے کے لئے اس کی

---

[۱] آپ کو یاد ہوگا کہ یہودیون کے ہان بھی ایک مہابیر اسی طرح ٹوکری کی ناؤ مین رکھ کے چھوڑ دیا تھا، اور گو وہ راجا نہین ہوا مگر راجپوت ضرور ہو گیا تھا، اور اپنی قوم کا سردار اور سپہ سالار بھی تھا۔ ممکن ہے اللہ کے اُس بندے کی کہانی بھی کبھی بیان کر سکون ۱۲

پوجا کی جاتی ہے، بالکل اسی طرح قدیم بابل مین بھی مختلف امراض سے محفوظ رہنے کے لئے لوگ ان امراض کے دیوتاؤن اور دیویون کی پوجا کرتے تھے۔ چنانچہ اُن کے ہان کی ایک روایت ہے کہ ایک مرتبہ وبا کے ایک دیوتے (جس کا نام اُوراتھا) تمام جاندارون کو مار ڈالنے کا قصد کیا، اور قریب تھا کہ وہ اپنا ارادہ پورا کر ڈالتا۔ مگر پھر کچھ سوچ کر اس پر رضامند ہوگیا کہ وہ ان لوگون کو ایذا نہ پہنچائیگا جو اُس کی بہادری اور جبروت کی تعریف مین گیت اور بھجن گائینگے اور اُس کے نام کا جاپ کرینگے۔ چنانچہ بابلیون کے ہان کچھ خاص خاص منتر تھے جن کا جاپ کرلینے سے وہ لوگ اُورا کے شر سے محفوظ رہتے تھے۔

جیساکہ شروع مین عرض کیا جاچکا ہے اور ان صفحات سے بھی ظاہر ہے، یہ چند مثالین ایسی ہین جن مین قدیم بابل اور قدیم ہندوستان کی دماغی اور اخلاقی کیفیت کی مشابہت نظر آتی ہے۔ اسی نوع کے اور بےشمار قصے اور روایتین ہین جن مین سے ہر ایک مین نہ صرف دو ملک یا دو قومین بلکہ کئی ملک اور کئی قومین برابر برابر شریک نظر آتی ہین۔ مین نے ان مندرجہ بالا صورتون مین کہین دوچار جگہ ایرانیون اور یہودیون کا اشارہ کے طور پر ذکر کیا ہے، ورنہ ان روایات مین نہ صرف ایشیاکی۔ ہندی، ایرانی، اسیری، بابلی، یہودی، مصری، زنگی — قومون کا بلکہ یورپ کی۔ یونانی، انگریزی، جرمن، آئرلینڈی وغیرہ۔ اقوام کا بھی حصہ ہے۔ ان واقعات کا ایک یا قریب قریب ایک ہونا بنی نوع انسان کے ایک ہونے پر ضرور دلالت کرتا ہے۔ اس مین شک نہین کہ ان تمام خرافات کو پڑھ کر اور سن کر ہم کو ہنسی آتی ہے، مگر یہ نہ بھولنا چاہئے کہ جن دنون کی یہ سب باتین ہین ان دنون انسان بالکل بچہ تھا۔ ہان البتہ افسوس اس امر کا ہونا چاہئے کہ انسان بوڑھا ہو کر بھی عقل نہ پکڑے اور باوجود عقل کا دعویٰ کرنے کے ان ہی بچپن اور بےشعوری کی باتون پر یقین رکھے۔ یہ بھی انسان کی رنگین طبیعت کی نیرنگیان ہین!

محمد نعیم الرحمٰن (ام۔اے)

ایک شاعر کا انجام

مصنفہ نیاز فتحپوری

ایڈیٹر نگار کا سب سے پہلا افسانہ حسن و عشق، جسمین تخئیل کی بلندی، زور تحریر، اسلوب بیان اور ندرت انشاء کے ایسے ایسے پاکیزہ نمونے موجود ہین جو ساحری کی حد تک پہونچتے ہین۔ جوش محبت کے جذبات جس مستانہ پن سے اس تصنیف مین ظاہر کئے گئے ہین اسکا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ یہ فسانہ جناب نیاز کے عنفوان شباب کا لکھا ہوا ہے

قیمت مع محصول ڈاک ۱۲ار

"مینیجر نگار۔ لکھنؤ"

بازگشت

(بہ سلسلۂ ماسبق)

(۱۴)

بیساکھ کے دن تھے۔ دیہاتون مین بیکاری اور تعطل کا زمانہ تھا۔ ادریس کی آنکھین صحتیاب ہوگئی تھین اگرچہ اُنمین اگلی سی بینائی پھر نہ آسکی۔ گذشتہ تین چار مہینے ادریس نے بالکل بیکار گذارے تھے۔ مدرسہ برائے نام قائم رہگیا تھا۔ دکان بھٹہ اور غلہ کے کاروبار مین بھی ممتاز کی تنہا جانفشانیون کے باوجود بڑا خسارہ ہوگیا تھا ادریس کے دلمین رفتہ رفتہ یہ خیال پیدا ہوگیا تھا کہ وہ اپنے گناہون کی سزا بھگت رہا ہے۔ وہ فطرتاً واہمہ پرست تھا۔ اور مقدر کا قائل تھا۔ اسکی واہمہ پرستی روز بروز بڑھ رہی تھی۔ اب وہ مریم کو ایک "خوبصورت بلا" سمجھنے لگا تھا جس کے ہاتھون اسکو غارت ہونا ہے۔ اسکو یقین ہوگیا تھا کہ اسکی "سرنوشت" مین سوا "روزِ سیاہ کے" کچھ ہے نہین

ادریس بے انتہا چڑچڑا ہوگیا تھا۔ اب شاید ہی کوئی دن ایسا گذرتا ہو کہ مریم کا خدا اسید ھارہتا ہو اور ادریس اس سے نہ لڑتا ہو جھگڑے کی بنا عموماً سکینہ کا ذکر ہوتا تھا۔ ادریس روز بروز مان سے معافی مانگنے کے لئے زیادہ بیتاب ہورہا تھا۔ اب سے پہلے مریم ادریس کی ہمدردی کیا کرتی تھی اور اسکا غم غلط کرنیکی ہر ممکن کوشش کرتی تھی مگر اب جب کبھی ادریس مان کا نام لیتا تو مریم کے سارے بدن مین آگ لگ جاتی اور ادریس کو طعنے دینے لگتی "آخر یہ ساری محبت آپ ہی کی طرف سے ہے یا آپکی مان کو بھی آپکی کچھ پروا ہے؟" اس درمیان مین وہ کئی بار ادریس کو جتا چکی تھی "مین نے پہلے ہی کہدیا تھا کہ آپ میرے ساتھ خوش وخرم نہ رہ سکین گے۔ آپ نے میرا کہنا نہین مانا۔ آپ نے وقتی جوش مین اندھے ہورہے تھے۔ آخر وہی ہوا جس کا مجھکو اندیشہ تھا۔ آپ نے خوانخواہ میری زندگی کو بھی مصیبت کا پہاڑ بنا کر رکھ دیا۔" مریم کی المناکیان فی الحقیقت حد بیان سے باہر ہو چلی تھین۔ اجمالاً یہ کہا جا سکتا ہے کہ اسکے جذبات وہی تھے جو شاعر نے اس شعر مین بیان کرنیکی کوشش کی ہے

آہ وہ کون تھا خدا مارا   جس نے اس سے مجھے لگا مارا

ادریس اسدن مریم سے خوب لڑا اور پھر دو دن تک اس سے بولا نہین۔ ایکدن ادریس صبح کی گاڑی سے بستی گیا۔ غرض یہ تھی کہ بستی کے اسکول مین ملازمت کے لئے کوشش کرے۔ ادریس کی بیچین طبیعت کو اس تھوڑے عرصہ مین بڑا تلخ تجربہ ہوا تھا جس زندگی کو اُسنے سراپا سکون و راحت سمجھکر اختیار کیا تھا اُسنے اسکو اور بھی بیچین اور پراگندہ کر رکھا تھا۔ وہ اب کاہلی اور مجہولیت مین اپنے دن گذارنا نہین چاہتا تھا۔ ادریس نے مریم کو نہین بتایا تھا کہ وہ بستی کیون جا رہا ہے۔ چلتے چلتے خوانخواہ دونون مین تکرار ہوگئی۔ مریم کی زبان سے بے شعوری مین نکل گیا "آج اگر آپ کسی شہر مین برسرکار ہوتے تو شاید اتنا پریشان نہ رہا کرتے۔" ادریس خود بھی دلمین یہی چور لئے ہوئے تھا۔ وہ اس طعنہ کو برداشت نہ کر سکا اور مریم پر آنکھین نکال کر بولا "مین گھسیارا ہو کر رہونگا مجھے اسی مین چین ملیگا۔ تمکو اگر میرا ساتھ نہین دینا تو اسمین مداخلت کرنے کا بھی کوئی حق نہین ہے" یہ کہکر وہ بستی چلا گیا اور کہہ گیا کہ "دوسرے دن صبح کو واپس آؤنگا"

مریم دن بھر غمناک رہی۔ اسکی آنکھون مین آنسو اُمڈے چلے آرہے تھے اور وہ کئی دفعہ جی کھول کر رو چکی تھی۔ شام کے وقت ہوا کے ٹھنڈے جھونکون کے ساتھ اسکے دلمین خود بخود ایک انبساطی کیفیت پیدا ہوئی اور اسنے اپنے دل کو یہ کہتے ہوئے محسوس کیا "کچھ نہین یکساغم اور کہان کی افسردگی دنیا کے آلام کو اگر بھولنا ہے تو ہوا کے جھونکون سے دریا کی لہرون سے جنگل کے جانورون اور درختون سے چاند سورج اور ستارون سے اپنا جی بہلاؤ" بظاہر مریم ایکبار پھر وہی مریم ہوگئی تھی جسکو ادریس نے کبھی "غنچۂ سحر" کہا تھا۔ اُسنے اپنے بال درست کئے۔ کپڑے بدلے اور جنگل اور ندی کی بہار دیکھنے نکل گئی

مریم نے لاکھ چاہا کہ اپنی ناکامیون اور تلخیون کو قدرت کے دلفریب مناظر مین بھول جائے لیکن اسکو بہت جلد معلوم ہوگیا کہ یہ مناظر اب اسکے لئے دلفریب نہین رہے۔ اسکے دل کی آواز درصل دھوکہ کی آواز تھی۔ جو لمحے ایک بار گذر گئے وہ پھر نہین آتے۔ جو زندگی ایک بار بسر ہوگئی اسکا اعادہ ناممکن ہے۔ یونان کے "رونے والے فلسفی" کا قول ہے کہ "ایک ہی ندی مین کوئی دو بار نہین نہا سکتا" جس دریا مین آپ نے ابھی غسل کیا ہے وہ دوسرے لمحے مین بالکل ایک دوسرا دریا ہو جاتا ہے۔ اگرچہ یہ بات فوراً محسوس نہین ہوتی۔ زندگی کے بہاؤ مین کسی ایک حالت کو اپنی جگہ قرار نہین ہے۔ حدوث لازمۂ زندگی ہے۔ جس چیز کو آپ ایک دفعہ کھو چکے اُسکی بازیافت محال ہے۔ جو بات ایک بار ہو چکی اُسکی "بازگشت" قانون قدرت کے منافی ہے۔ ہان یہ اور بات ہے کہ آپ "رنج نومیدی" کی تاب نہ لا سکین اور عمر بھر "کف افسوس" مل مل کر "تجدید تمنا" کا عہد کرتے رہین

مریم آج تڑپ رہی تھی کہ صرف چند لمحون کے لئے اسکے دلمین وہی ذوق وہی صلاحیت پیدا ہو جائے جسکی بدولت شادی سے پہلے اسکے اوقات اسقدر طربناک تھے۔ مگر اب نہ وہ مریم تھی نہ وہ مریم کا دل۔ اسکو زمین و آسمان بدلے ہوئے نظر آرہے تھے۔ جنگل کے ایک ایک پتہ۔ دریا کی ایک ایک لہر۔ ڈوبتے ہوئے سورج کی ایک ایک کرن مین وہ ایک پژمردہ کردینے والی تاثیر محسوس کررہی تھی۔ شام کی تاریکی کے ساتھ ساتھ یہ تاثیر بھی بڑھ رہی تھی۔ اب مریم محسوس کر رہی تھی کہ ستارون کی چمک مین اک طنز ہے اور چاند اسکی بدبختی پر مسکرا رہا ہے اسی عالم مین اسکی نظر اس ٹیلہ پر پڑی جہان پہلے پہل اُسنے ادریس کا "ہدیۂ نیاز" حاصل کیا تھا۔ مریم کے منہ سے ایک دلدوز کراہ نکل گئی اور وہ ٹیلہ کی طرف چلی۔ وہان تک پہنچنے بھی نہ پائی تھی کہ رؤف نے اسکو پکارا۔ مریم ٹھٹک گئی۔

ہرچند کہ مریم جسوقت اپنے مکان سے نکلی تھی اسکو ایک بار رؤف کا خیال ضرور آیا تھا لیکن یہ کہنا صریحاً ظلم ہوگا کہ وہ رؤف سے ملنے کی اُمید مین یہان آئی تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ اسوقت یہ دیکھکر کہ رؤف اسکے قریب ہے مریم کا دم اور بھی گھٹنے لگا تھا

رؤف مریم کے پاس آیا اور کہنے لگا "مین تمکو ایک جھلک دیکھنے کی حسرت مین روز یہان آتا ہون۔ مجھے اب بھی تم سے وہی گہری محبت ہے۔ نہین اب میری محبت اور بھی گہری ہوگئی ہے کیونکہ اب تمھاری صورت پر ایک یاس اور بیکسی برسنے لگی ہے جسنے تمھارے حسن کو چار چاند لگا دئے ہین۔" مریم نے اسکا کوئی جواب نہ دیا اور ایک دھیمی سی آہ کرکے رہگئی۔ دن ہوتا تو رؤف دیکھ لیتا کہ مریم کی جادو بھری آنکھون مین آنسو ڈبڈبا آئے تھے۔ رؤف نے پھر کہا "مریم مین نے سنا ہے کہ ادریس کا برتاؤ تمھارے ساتھ کچھ خوشگوار نہین ہے اور تمھارا چہرہ بھی گواہ ہے کہ تم مضمحل اور آزردہ رہتی ہو۔ اگر یہ سچ ہے تو قسمت نے تم پر بڑا ظلم کیا۔"

مریم سے اب ضبط نہ ہو سکا۔ رؤف نے اسکے دل کے نازک ترین حصہ کو چھیڑ دیا تھا۔ وہ زار زار رونے لگی۔ رؤف سے نہ رہا گیا۔ اُسنے بڑی جرأت کی اور مریم کو اپنے حلقۂ آغوش مین لے کر اسکے بالون مین ہاتھ پھیرنے لگا۔ مریم نے اپنے کو رؤف کی گود سے الگ نہین کیا۔ اسکو رؤف کے نرم و گداز بدن سے راحت مل رہی تھی۔ اسکے آنسو کسی طرح نہ تھمتے تھے۔ رؤف نے تسلی دینے کی لاکھ کوشش کی مگر سب بیکار۔ مریم کی حالت واقعی عبرتناک تھی جس مریم کو یہ غرہ تھا کہ رؤف نے اسکے جسم کو ہاتھ نہین لگایا ہے آج وہی مریم رؤف کی گود مین اس بےبسی اور بیپردگی کے ساتھ بڑی سسکیان لے رہی تھی۔ گویا غالب نے یہ شعر اسی کے لئے کہا تھا:۔

آنکو بہ خلوت با خدا ہرگز نکردے التجا — نالان بہ پیش ہر کسے از جور افلاکش نگر

مریم کوئی پینتالیس منٹ تک اس حالت مین رہی ہوگی کہ جنگل کے پتے کھڑکھڑائے۔ رؤف نے مڑ کر دیکھا تو ایک شخص دھوتی پہنے ہوئے اُلٹے پاؤن جنگل مین گھسا جا رہا تھا۔ مریم اسکو نہ پہچان سکی مگر رؤف نے چاند کی روشنی مین پہچان لیا۔ اُسنے مریم کو الگ کر کے کہا۔
"ممتاز میان ہین۔ دنیا مین اگر واقعی کسی سے جلتا ہون تو وہ ممتاز ہین"

یہ سنکر مریم کے حواس بجا ہو گئے اور وہ جلدی سے وہان سے یہ کہتی ہوئی بھاگی "دیکھئے اب کیا نئی آفت آتی ہے۔ اگر ممتاز میان نے مجھکو اس حالت مین دیکھ لیا ہے تو مین بلا کسی بدنیتی کے بدنام ہو جاؤنگی اور میری شامت بڑھ جائیگی" رؤف نے شرمندہ ہو کر کہا "مریم اتنا نہ ڈرو۔ جب تک سانس مین سانس ہے مین تمکو ہر آزار سے بچانیکی کوشش کرونگا"

مریم راستہ بھر یہ سوچتی رہی کہ اب کیا کرے۔ یہ ممکن نہین کہ ممتاز نے اسکو رؤف کی آغوش مین نہ دیکھا ہو۔ ورنہ اس تیزی کے ساتھ وہ جنگل پھر کیون گھس جاتا۔ پھر ممتاز کو ادریس کے ساتھ جو تعلق خاطر ہے اسکی بنا پر ممتاز ادریس کو حقیقت حال سے خبردار کر دینا اپنا فرض سمجھیگا۔ یہ سوچ کر مریم کا دل بیٹھنے لگا۔ مگر پھر وہ ممتاز کی طبیعت پر غور کرنے لگی۔ وہ جانتی تھی کہ ممتاز بڑا نیکدل اور معاف کر دینے والا آدمی ہے۔ اُسنے آج تک کسی کو اپنی ذات سے کوئی تکلیف نہین پہنچائی پھر کیا وجہ ہے کہ آج بھی وہ اپنی فطری خطاپوشی سے کام نہ لے اور "فتنہ انگیز" راستبازی پر "مصلحت آمیز" سکوت کو ترجیح نہ دے اسکے لئے تو جھوٹ بولنے کی بھی ضرورت نہ ہوگی۔ مریم کو اس خیال سے بڑی ڈھارس ہوئی۔ اُسنے یہ بھی طے کر لیا کہ موقع پاکر ممتاز سے اپنی لغزش پر معافی مانگ لیگی۔ اسی اُدھیڑبن مین مریم اپنی جائے پناہ مین داخل ہو گئی۔ اسکی حیرت کی کوئی انتہا نہ تھی جب اُسنے دیکھا ادریس خلاف توقع گھر پر موجود ہے۔ ادریس نے مریم پر ایک نظر ڈالی اور پھر منہ پھیر لیا اسکا چہرہ غیر معمولی پریشانیون کا اظہار کر رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک ہی دن کے اندر اُسنے اپنی عمر کے کئی برس گذار کر دئے ہین۔ مریم نے دبی زبان سے پوچھا "آج ہی کیون واپس چلے آئے؟" ادریس نے اسی طرح منہ پھیرے ہوئے جواب دیا "جس کام کے لئے گیا تھا وہ ہو چکا" اور پھر چپ ہو رہا۔ اسکا سکوت کہہ رہا تھا کہ اب اس سے آگے وہ کسی سوال کا متحمل نہ ہوگا۔ مریم نے سمجھا کہ صبح کا غبار ابھی باقی ہے۔ اس لئے وہ چپ ہو رہی

(۱۵)

بستی مین مدرسی کی جگہ خالی ضرور تھی لیکن وہان شامت اعمال سے ادریس کا نام پہلے پہنچ چکا تھا۔ کارکنان مدرسہ ادریس کی

زندگی کے واقعات سے اچھی طرح آگاہ تھے اُنکی رائے مین ادریس بدکردار تھا۔ بچون کی تعلیم و تربیت کو ایسے آدمی کے سپرد کرنا در اصل آیندہ حیثیت اجتماعی مین خرابیان پیدا کرنا ہے اس دوراندیشی کی بنا پر مدرسہ کی مجلس انتظامیہ مین جب ادریس کی درخواست پیش ہوئی تو ارکین نے علی الاعلان اسکو نامنظور تو نہین کیا مگر ادریس سے یہ بہانہ کر دیا کہ اسکی درخواست سے پہلے ایک شخص کا تقرر ہو چکا ہے۔ دن بھر مین یہ ساری کارروائی ختم ہوگئی ادریس کو صحیح حالات مدرسہ کے منشی سے معلوم ہوئے جو اسکو پہلے سے جانتے تھے۔ ادریس کو دھکا لگا۔ جو ادریس ہیڈ ماسٹری کر چکا تھا آج وہ ایک معمولی مدرسی کیلئے چند ایسے ارکین کا محتاج تھا جو یہ بھی نہین جانتے کہ تعلیم درحقیقت کسکو کہتے ہین۔ اسکی غرض و غایت کیا ہے اور اسکا نظام کیا ہونا چاہئے۔ ادریس کے اضمحلال کی انتہا نہ تھی جس دوست کے وہان وہ بستی مین جا کر ٹھیرا تھا اُسنے بڑا اصرار کیا کہ وہ رات بھر قیام کرے مگر ادریس نے بڑی خوشامدون سے اپنے دوست کو راضی کر لیا اور شام ہی گاڑی سے چل کھڑا ہوا

خلیل آباد مین ممتاز مل گیا۔ ادریس نے اسکو ساتھ لے لیا راستہ بھر زندگی کے اہم مسائل پر جرح و تعدیل کرتے ہوئے دونون پریتیا کے اندر پہنچ گئے۔ ادریس نے کہا "چلو دریا کی سمت چلین۔ شاید دل کی جلن کو کچھ تسکین ہو" جنگل سے باہر قدم بھی نہ پڑے تھے کہ ممتاز کو جو آگے آگے تھا ادریس نے پکڑ کر پھر جنگل کے اندر کھینچ لیا۔ ممتاز جواس باختہ ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ اور اسکی نگاہ اس منظر پر پڑ گئی جسکی وجہ سے ادریس نے اسکو اپنے ساتھ درختون کے آڑ مین کر لیا تھا۔ ممتاز کو کسی طرح اپنی آنکھون پر اعتبار نہ آتا تھا۔ اسکو یہ اندیشہ ضرور تھا کہ ادریس مریم کے ہاتھون تباہ ہونیوالا ہے مگر یہ وہم بھی نہ تھا کہ وہ تباہی یون ہوگی۔ مریم رؤف کی آغوش مین تھی ممتاز کو ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ ادریس کے سہارے کے لئے دنیا مین اب کوئی چیز نہین رہی۔ اُسنے ادریس کی طرف دیکھا۔ ادریس نے مسکرا کر کہا "کیا دیکھتے ہو؟ این ہم اندر عاشقی بالائے غمہائے دگر۔ ٹھیرو آج بہت ممکن ہے قسمت کا فیصلہ ہو جائے"

مگر قسمت کا فیصلہ یون آسانی سے نہین ہوا کرتا۔ رؤف نے ممتاز کو دیکھ لیا تھا اور مریم اس سے الگ ہو کر گھر کا راستہ لے چکی تھی ادریس نے کہا "ممتاز یہ کھٹک میرے دل سے کبھی نہین گئی تھی۔ دیکھنے مین مطمئن ضرور تھا مگر دل مین یہ چور موجود تھا۔ تمنے مجھے اس آسمانی بلا سے بچانا چاہا تھا۔ اور میری مان نے بھی مجھے بچانیکی بڑی کوشش کی لیکن جو خود نہ بچنا چاہے اسکو کون بچائے۔ مان سے معافی مانگنے کی آرزو میرے دل مین ہے اب مین کس مُنہ سے معافی مانگون۔ مگر خیر۔ مجھے اب اپنی تباہی کا غم بھی نہین مین مٹ جانے کے قابل ہون اور مٹ جانے پر تلا ہوا ہون مین تو اب اس منزل پر پہنچ گیا ہون جہان زمانہ لاکھ دُکھ پہنچائے مگر اسکو "کم آزار" ہی سمجھا جاتا ہے"

ادریس کے تیور سے ظاہر ہوتا تھا کہ اُسنے اپنی کو حوادث روزگار کے حوالہ کر دیا ہے اور اب اپنی زندگی کو بنانے کی سمت سے تدبیر اختیار کرنیکی زحمت گوارا نہ کرے گا

ادریس تیزی کے ساتھ مکان کی طرف چلا اور مریم سے پہلے پہنچ گیا۔ اُسنے مریم سے ایک حرف نہین کہا اور ارادہ کر لیا کہ کبھی اس سے کچھ نہ پوچھیگا۔ وہ جانتا تھا کہ مریم اپنی بریت کیلئے کچھ نہ کچھ ضرور کہیگی اور ادریس اسکو بری کرنیکے لئے تیار نہ تھا۔ وہ اپنی حرمان نصیبی پر اندر ہی اندر اپنا دل خون کر رہا تھا لیکن اسکی تاب نہ لا سکتا تھا کہ مریم اسکے سامنے اپنے حرکات و سکنات کی جا یا بیجا توجیہ کرے۔ وہ مریم کو ایک "چھٹی روگ" سمجھنے لگا تھا جس سے جہانتک ہو سکے بناہ پانیکی کوشش کرنا چاہئے۔ اب ادریس نے مریم کے ساتھ سیر و تفریح کیلئے

جانا بھی ترک کردیا۔ واقعات سے بے خبر مریم نے سمجھا کہ اسکی شامت مین بلاوجہ یہ اور اضافہ ہوا۔ اُسنے بھی اپنے دل کو پتھر کی طرح بے حس بنالیا۔ یہ کہنا تو غلط ہوگا کہ اسکو کوئی سوگ نہ تھا مگر وہ اپنی زندگی سے بیزار اتنا ہو چکی تھی کہ اسکو ادریس کی خوشی ناخوشی کی کوئی پروانہ تھی۔ وہ اب صرف اسوقت تفریح کیلئے نکلتی تھی جبکہ ادریس گھر پر نہ ہوتا۔ اور جب وہ تفریح کیلئے نکلتی تو لئیق سے ضرور ملاقات ہوجاتی اور مریم کو اسکی آغوشِ پناہ مین رو رو کر دلکی کلفت نکالنے کا بہانہ ملجاتا

ادریس کا دماغ اب صرف اس سوچ مین مبتلا تھا کہ مان کی شفقت پھر کیونکر حاصل کرے۔ مریم کو اُسنے ایک حرفِ غلط سمجھ لیا تھا اور بڑی جد وجہد کے بعد اسکی طرف سے اپنے کو خالی الذہن کرلیا تھا

(۱۶)

اساڑھ کا مہینہ تھا عید کا دن تھا ہر طرف چہل پہل تھی۔ دیہاتون مین یہ موسم یون بھی حرکت و نشاط کا موسم ہوتا ہے۔ اسپر طرہ عید کا ہر شخص کی باچھین کھلی ہوئی تھین۔ محروم سے محروم اور نادار سے نادار اپنے کو آج بامراد تصور کر رہا تھا۔ محتاج و غنی آج ایک صف مین تھے۔ تاج والے "کلاہِ نمد" والون سے ہم بزم تھے

لیکن زمانہ کی بیدردی دیکھئے، ادریس کو یہ بھی موقع نہ ملا کہ آج وہ جھوٹی ہی خوشی منالیتا۔ اسکو دو روز پہلے سے شدید بخار تھا اور اسکا سارا بدن ٹوٹ رہا تھا۔ مریم اسکی تیمارداری مین پوری تندہی کے ساتھ مصروف تھی۔ ادریس کو یہ ناگوار تھا مگر وہ چپ تھا اور مریم کی طرف متوجہ نہ تھا۔ دن کے دس بج چکے تھے۔ ادریس کھڑکی سے دیکھ رہا تھا کہ عیدگاہ سے لوگ گلے ملتے ہوئے اپنے اپنے گھر واپس آرہے ہین راستے مین اسکی نظر انھین راہیون مین ممتاز پر پڑی جو اسی کے مکان کی طرف آرہا تھا۔ اُسنے مریم سے بے کیف لہجے مین کہا "دروازہ کھولدو، ممتاز آرہا ہے۔"

ممتاز داخل ہوا اور ایک نظر مریم پر ڈالکر ادریس سے پوچھا "کیون؟ خیریت تو ہے؟" ادریس نے ایک تلخ مسکراہٹ سے جواب دیا "اب تو سر پر جو پڑے اسکو خیریت ہی سمجھنا چاہئے۔ آج ساری دنیا جھجھون مین مصروف اور مین اس کال کوٹھری مین بیٹھا ہوا اپنے لئے ایک عیدنامہ موزون کر رہا تھا۔ پورا تو ہو نہین سکا چند اشعار سُن لو

نہین معلوم تمکو کیا ہے عید! مجھکو تو قہر ہے بلا ہے عید!
عید کیا عید کی خوشی کیسی! نہ رہا دل تو خوشدلی کیسی!
تم ہو مصروف ساغر و مینا مجھکو دن رات خون دل پینا
روز و شب آنسوؤن سے کام مجھے دیدۂ خونچکان ہے جام مجھے

ممتاز دیر تک ادریس کی حسرتناک صورت کو دیکھتا رہا اسکے بعد وہان سے اُٹھا اور سکینہ کے پاس پہنچا

سکینہ کی حالت ادریس سے کچھ کم قابل رحم نہ تھی آج صبح سویرے سے وہ ایک کونہ مین پڑی رو رہی تھی۔ اور کسی طرح طبیعت ہلکی نہ ہوتی تھی پچھلی عید اسکو بیطرح یاد آرہی تھی جو اسکی زندگی مین غالباً سب سے زیادہ پرمسرت عید تھی۔ ادریس گھر تھا اور کاروبار مین ترقی کر رہا تھا۔ سکینہ کیلئے یہ بجائے خود ایک عید تھی۔ اور ایک عید اس سال کی بھی تھی کہ سکینہ کو سال بھر کے بعد بھی بیٹے کی صورت دیکھنا میسر ہوا۔

سکینہ اپنے کو ملامت کر رہی تھی کہ نہ وہ اسقدر سخت گیر ہوتی نہ اسکی یہ مصیبت اتنا طول کھینچتی۔ اُسنے غور کرنا شروع کیا تو اسکو معلوم ہوا کہ مریم جہانتک کہ خود سکینہ کو اسکا تجربہ تھا ہرگز ایسی چیز نہ تھی جس سے نفرت کی جائے۔ سکینہ کا رنج و غصہ امتداد زمانہ کے ساتھ زائل ہوچکا تھا۔ اب اسکو مریم مین بہت سی خوبیان نظر آرہی تھین اور اسدن مریم کے ساتھ جو جارحانہ برتاؤ کیا تھا اسپر وہ دل سے پشیمان تھی

اس اثناء مین ممتاز پہنچ گیا اور اُسنے ادریس کی علالت کا حال کماحقہ بیان کرکے کہا "بہتر یہ ہے کہ اب آپ اُنکو معاف کردین۔ وہ ایک بار مجھ سے اس آرزو کا اظہار بھی کرچکے ہین" سکینہ نے یہ کہکر ممتاز کو رخصت کردیا "مین کل سوچ کر بتاؤنگی کہ مجھکو کیا کرنا چاہیے" لیکن چار بجتے بجتے وہ ادریس کو دیکھنے کے لیے بیتاب ہوگئی اُس نے گلشن نامے گاؤن کی ایک عورت کو بلاکر کہا "مین ادریس سے تیواری پور جاکر ملنا چاہتی ہون۔ مین چادر سر سے لپیٹ لون گی۔ تم میرے ساتھ چلو اور جنگل کے اندر سے چلو تاکہ مردون کی نگاہون سے جہانتک ہوسکے بچ کر نکل جائین گلشن راضی ہوگئی اور سکینہ کو ساتھ لیکر تیواری پور روانہ ہوئی

سکینہ نے ادریس کے گھر کے پاس پہنچ کر چادر اُتاردی۔ مریم ادریس کے کسی کام سے باہر آئی ہوئی تھی۔ اسکی آنکھین سکینہ سے لڑین اور تھوڑی دیر کیلیے اسکو سکتہ سا ہوگیا۔ لیکن وہ دیر کرنیوالی عورتون مین سے نہ تھی۔ اُسنے آناً فاناً طے کرلیا کہ اسکو کیا کرنا ہے۔ سکینہ مشکل سے دس قدم کے فاصلہ پر رہی ہوگی کہ مریم گھر مین گھس گئی اور اندر سے دروازہ بند کرلیا۔ دنیا اسکو چاہے کتنا ہی وحشیانہ سلوک کیون نہ سمجھے لیکن اب وہ کسی طرح اسکو گوارا نہ کرسکتی تھی کہ مان بیٹے آپس مین ملکر اپنا اپنا دل ٹھنڈا کرین ایسی حالت مین کہ وہ خود اندر اندر جھلس رہی ہو

گلشن نے چاہا کہ دروازہ کھٹکھٹائے لیکن سکینہ نے روک دیا۔ مریم کے قرینہ سے اسکو معلوم ہوگیا کہ اس مکان مین اسکو کس قسم کے آؤ بھگت کی اُمید کرنا چاہیے۔ اب ادریس سے ملنے کی بجز اسکے اور کوئی سبیل نہ تھی کہ ادریس خود رام نگر آئے۔ سکینہ ادریس کی جان کی خیر مناتی ہوئی اُلٹے پاؤن واپس گئی۔ گلشن نے اسکو بہتیرا سمجھایا لیکن سکینہ کے آنسوؤن کا تار کسی طرح نہ ٹوٹتا تھا

(۱۷)

رات کے کوئی آٹھ بجے ہونگے۔ ادریس کا بخار ہلکا تھا اگرچہ اسکی رگ رگ ابھی تک اسی طرح بیچین تھی۔ اسکو کسی طرح نیند نہین آرہی تھی۔ مریم اسکی پٹی کے پاس بیٹھی تھی لیکن اپنی جگہ پہلو بہ پہلو وہ بھی بدل رہی تھی۔ شام کے واردات ابھی اسکے پیش نظر تھے اور اب اسکی سمجھ مین نہ آتا تھا کہ اُسنے اچھا کیا یا برا کیا جو سکینہ کی پذیرائی نہ کی۔ سب سے بڑا سوہان اسکے لئے یہ تھا کہ اگر ادریس کو تمام باتون کا علم ہوگیا تو آیندہ وہ مریم کی صورت بھی کبھی نہ دیکھیگا۔ مگر ہونیوالی بات ہوچکی تھی اور اسکا تدارک ناممکن تھا۔

سارے گھر پر ایک ماتمی سکوت چھایا ہوا تھا۔ ادریس کو دفعتاً ایسا معلوم ہوا کہ کوئی دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے اور اسکا نام لیکر پکار رہا ہے۔ اُسنے ایک بار اور کان لگا کر سنا اور مریم سے کہا "دروازہ کھولدو۔ ممتاز ہین" مریم کا جی سن سے ہوگیا اور اس کا سارا جسم کانپنے لگا

ممتاز نے آتے ہی ادریس کو اس طرح مخاطب کیا جس طرح ایک نبی اپنی مردود قوم کو جسکی اصلاح امکان سے باہر ہوگئی ہو "ادریس ابتک تمنے جو کیا اسکو مین ایک معمولی لغزش سمجھتا تھا جو ہر انسان سے سرزد ہوسکتی ہے۔ لیکن اب معلوم ہوا کہ تم سفاک ہو

خبیث ہو۔ جہنمی ہو۔۔۔"

ادریس نے مداخلت کرتے ہوئے کہا "کہین میرے بخار کا ہذیان تم پر تو نہین طاری ہوگیا؟ آخر بات کیا ہے؟ ہوا کیا؟"

"ہوا کیا؟ جو ہونا تھا وہ ہوا اور جو تم چاہتے تھے وہ ہوا۔ تمنے ماں پر اس طرح دروازہ بند کر لیا کہ کوئی کتے بلی کیلئے روا نہین رکھ سکتا۔ وہ تم دونوں کو لینے آئی تھین۔ وہ تمھاری خطاؤں کو معاف کرنے آئی تھین اور تمنے اُنکے ساتھ یہ سلوک کیا۔ تم پر لعنت ہے۔ اب سر پر ہاتھ رکھکر تمام عمر روتے رہو تو بھی تمکو ماں کا سایہ نہین نصیب ہو سکتا۔ وہ یہاں سے لوٹی جا رہی تھین جنگل مین سانپ نے ڈس لیا اور وہ چند گھڑیوں کی مہمان ہین"

ادریس کود کر بستر سے زمین پر آرہا۔ اسکو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اسکا خون جسم کے اندر جمتا چلا جا رہا ہے۔ پہلے تو اسکی سمجھ مین کچھ نہ آیا کہ ممتاز کیا بک گیا۔ جب اُسنے ممتاز کے چہرہ کو اچھی طرح دیکھ لیا اور حقیقت کا احساس ہوا تو کہا "یہ مین کیا سُن رہا ہوں اور تم کیا کہہ رہے ہو؟ مین نے؟ مین نے ماں پر اپنا دروازہ بند کر لیا۔ یہ کب کی بات ہے؟ مجھے تو کچھ یاد نہین آتا۔ وہ یہاں کب آئی تھین؟" ادریس کی حالت دیکھتے دیکھتے ایسی ہو گئی کہ دیکھنے والے سے دیکھی نہین جاتی تھی۔ ممتاز کو بھی ترس آگیا۔ مریم سے بھی نہ رہا گیا۔ اُسنے جراٗت کی اور ادریس کے قدموں پر گر کر بولی "یہ سب کچھ میرا کیا دھرا ہے۔ مین یہ نہین کہہ سکتی کہ مجھے معاف کیجئے۔ نہین مجھے جو سزا چاہے دیجئے"

ادریس اپنے ہوش مین نہ تھا۔ اُسنے مریم کو اس زور سے ٹھکرایا کہ اگر ممتاز سنبھال نہ لیتا تو وہ سیدھی دیوار سے جا کر ٹکر کھاتی۔ ادریس نے دوڑ کر پھر مریم کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا "بدبخت مجھے معلوم تھا کہ تو موت اور غارتگری کی دیوی ہے۔ تو مجسم "بپت" تھی۔ مین نے تجھکو اپنے دل مین جگہ دی۔ اسکی سزا پا گیا۔ اب مین تیرا سایہ بھی دیکھنا نہین چاہتا۔ جا اور اب رؤف کا خون چوس جسکی گود اسدن ٹھنڈی ہو رہی تھی" ادریس نے ایک بار مریم کا سر اُٹھا کر حقارت کے ساتھ دیکھا اور ممتاز کے ساتھ رام نگر چلا گیا۔ مریم کی آنکھوں مین دنیا تیرہ و تار تھی۔ وہ سارے گھر مین "ہائے ہائے" کرتی پھر رہی تھی۔ بڈھا رسول شاہ بھی لڑکھڑاتا ہوا اسکے ساتھ ساتھ چل رہا تھا اور اسکو سمجھا رہا تھا مگر معلوم ہوتا تھا کہ مریم کے کانوں مین آواز ہی نہین جاتی۔ وہ اسی طرح اپنے بال نوچتی رہی اور کپڑے پھاڑتی رہی

رؤف شام سے جنگل مین مریم سے ملاقات کی اُمید مین گھوم رہا تھا اسکو ایک آدمی سے سارے واقعات معلوم ہو چکے تھے۔ ادریس کو گئے ہوئے ایک گھنٹہ ہوا ہوگا کہ رؤف مضطر و بیتاب رسول شاہ کے گھر مین داخل ہوا اور بے خوف و خطر مریم کو گود مین لیکر کہنے لگا "مریم! مین جبتک زندہ ہوں تمکو اس حال مین نہین دیکھ سکتا۔ مین دنیا و عقبےٰ دونوں تم پر نچھاور کر دونگا۔ اور تمھاری زندگی کو از سر نو خوش و خرم بنانیکی ہر ممکن تدبیر کرونگا۔ تم صرف اتنا کہدو کہ تم میرے ساتھ رہنا گوارا کرو گی۔ پھر جہاں کہو تم کو لیکر چلا چلوں یقین مانو اگر سات سمندر پار بھی تمکو چین ملے تو مین وہاں بھی چلنے کے لئے تیار ہوں۔ لیکن مریم! میری شہزادی! للّٰہ یوں جان نہ کھو!"

مریم تھوڑی دیر تک پاگلوں کی طرح ٹکٹکی باندھے ہوئے رؤف کو دیکھتی رہی۔ اور پھر اس سے لپٹ کر کہنے لگی "ہاں رؤف میاں مجھے لے چلو۔ یہاں سے دور اگر جہنم مین بھی لے چلو تو اب مین چلونگی۔ ابھی چلو مین چلنے کیلئے تیار ہوں۔ آہ! مین پاپن ایسا جلی نہ کو ملا بھی نہ رکھا!" رؤف نے بیتابانہ مریم کا منہ چوم کر کہا "اس طرح بدحواس نہ ہو مین تمھارا ہوں۔ میری دولت تمھاری ہے۔ تم جو چاہو مجھ سے کرالو۔ آج بھوک کے وقت تم تیار رہنا۔ مین تمھارے ساتھ یہاں سے نکل چلونگا۔ تین بجے صبح کو ٹھہرے ایک گاڑی لکھنؤ کو جاتی ہے۔ ہملوگ فی الحال لکھنؤ کا ٹکٹ

لین گے" مریم نے کہا "اچھا اب جاؤ اور جلد سے جلد اپنا سامان درست کرلو"

(۱۸)

رؤف کو رخصت کرکے مریم نے تمام واقعات پر بیٹھکر تبصرہ کرنا شروع کیا وہ اُسکا اتنا تڑپ چکی تھی کہ اب اسمین زیادہ تڑپنے کی تاب نہ تھی۔ ناچار اُس نے سوچنا شروع کیا۔ اور رفتہ رفتہ اسکے حواس درست ہونے لگے اور اُسکی عقل کام کرنے لگی۔ اب رؤف اسکو ایک بہکانیوالا شیطان معلوم ہو رہا تھا جو اسکو کمزور پاکر اپنی اس ہوس کو آسودہ کرنا چاہتا تھا جسکو ایک مدت سے اپنے دلمین پرورش دے رہا ہے۔ اس خیال کے آتے ہی مریم پھر وہی سرکش مریم تھی یعنی وہ ہرگز رؤف کو اپنے اوپر قابو نہین دے سکتی۔ لیکن آخر پھر کیا کرے۔ مریم کا دماغ تیزی سے اپنا کام کر رہا تھا۔ دفعتاً وہ مسکرائی جیسے کوئی بڑی مہم سر کرلی ہو۔ وہ اُس جگہ گئی جہان ادریس کے لکھنے پڑھنے کا سامان تھا اور بیٹھکر ادریس کو یہ خط لکھا

"پیارے۔ تم کہہ گئے ہو کہ مین تمکو اپنا سایہ بھی نہ دکھاؤن۔ اسکا مین نے معقول انتظام کرلیا ہے جسکے بتانیکی ضرورت نہین۔ بس آئندہ تم میری منحوس صورت نہ دیکھو گے چلتے چلتے بعض ایسے واقعات سے صحیح طور پر تمکو اطلاع دیدینا چاہتی ہون جن سے ابتک تم بےخبر ہو۔ مین نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ تم میرے ساتھ شادی کرکے خوش نہ ہوگے اور وہی ہوا تمنے خوامخواہ مان سے بگاڑ کیا مین منع کرتی رہی۔ بعد کو مین نے بہت چاہا کہ تم اپنا غم بھول جاؤ لیکن تم پر کوئی اثر نہ ہوا۔ تم خود اس کوفت مین اور نہ جانے کس کس کوفت مین گھلتے رہے اور بےوجہ مجھے بھی گھلاتے رہے۔ آخرکار مین نے سوچا کہ کسی طرح تم اپنی مان سے ملجاؤ۔ اسکے لئے ایک دن تم سے چھپکر رام نگر گئی اور تمھاری مان سے ملی۔ مین نے جس عاجزی کے ساتھ تمھاری مان سے خوشامدین کین شاید تم سے بھی نہ کرتی لیکن مجھے معلوم ہوگیا کہ وہ بڑی بیدرد ہین۔ اُنھون نے مجھے کتے بلی سے بدتر سمجھکر نکالدیا۔ مین نے تم سے اسکا ذکر اسلئے نہین کیا کہ خوامخواہ تمھارا ملال بڑھیگا۔ مگر مین بھی انسان ہون اور اپنی عزت آپ کرتی ہون۔ مین نے قسم کھالی کہ اب جہانتک ہوسکیگا تمکو مان سے کبھی نہ ملنے دونگی۔ مجھے یقین ہوگیا تھا کہ جہان تم مان سے ملے کہ میری زندگی اور بھی تلخ ہوجائیگی۔ چنانچہ جب مین نے اُنکو ایک عورت کے ساتھ اپنے گھر کی طرف آتے دیکھا تو سمجھ گئی کہ وہ تمکو لینے آرہی ہین اور تم ہمیشہ کے لئے مجھ سے جدا ہوجاؤگے۔ مین اسکو گوارا نہ کرسکتی تھی اسلئے مین نے دروازہ بند کرلیا۔ میرے فرشتون کو بھی خبر نہ تھی کہ وہ ہم دونون کو لینے آئی ہین۔ اور مین تمھاری مان کی قاتل نہین ٹھیرائی جاسکتی۔ اب ایک بات اور رہگئی ہے جس مین مجھے اپنی صفائی کرنا ہے اور وہ رؤف سے میرے تعلقات ہین۔ تم یقین کرو یا نہ کرو۔ مجھے اب اسکی پروا نہین رہی۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ مجھے رؤف سے کوئی سروکار نہ تھا جیسا کہ پہلے بھی تم سے کہہ چکی ہون۔ اُسدن تمنے یا تمھارے دوست نے مجھے رؤف کی گود مین دیکھا۔ یہ مین اقرار کرتی ہون مجھے اس حالت مین نہ ہونا چاہیے تھا۔ مگر اسوقت مین اپنے ہوش مین نہ تھی۔ مجھے کسی بات کا احساس نہ تھا۔ تم مجھ سے لڑکر بستی چلے گئے تھے۔ مین اپنی قسمت کو کوستی ندی کے کنارے چلی گئی تھی اور اس ٹیلہ تک پہنچی جہان پہلے پہل تمنے اپنی بےبنیاد محبت کا اظہار کیا۔ رؤف نے مجھ سے ہمدردیان شروع کین مجھے کوئی حس نہ تھا کہ مین کہان ہون اور کیا کر رہی ہون۔ لیکن مجھے رؤف کے ساتھ ایک وقتی راحت ضرور ملی۔ گنہگار دراصل مین بس اسقدر ہون۔ ہان اس سے پہلے دو ایک بار یہ خیال ضرور آچکا تھا کہ اگر آج تمھاری جگہ رؤف ہوتا تو شاید میری یہ گت نہ ہوتی۔ سو یہ ایک انسانی کمزوری تھی جسکی بنا پر مجھے کوئی سزا نہین دیجاسکتی۔ بس مجھے اسی قدر کہنا تھا۔ اب اگر میرے خدا نے چاہا تو نہ تم مجھے دیکھو گے اور نہ مجھ سے کچھ سنو گے۔ ہان یہ پہلا اتفاق ہے کہ مین تمکو "تم" کہہ کر پکار رہی ہون۔ اسکی وجہ یہ ہے

کہ آج مین اپنے کو ساری دنیا سے اور خاصکر تم سے بہت بلند چیز سمجھ رہی ہون - اسکی وجہ خود میری سمجھ مین نہین آتی - آخر مین یہ بھی کہدینی ہون کہ اگر مین اب بھی کسی کو چاہنے کا دعوی کرسکتی ہون تو وہ تم ہو اور میری آخری دعائین تمھاری جان کے ساتھ ہین"

"تمھاری مریم"

بارہ بجے کا وقت تھا - رات اندھیری تھی - مریم نے خط ختم کیا اور یوسف پور جاکر نور محمد کو دیا - نور محمد اندیشہ ناک ہوکر اسکی صورت دیکھنے لگا - مریم نے اسکی نگاہون سے تجاہل کرکے کہا "مین اب جاتی ہون - تم آدھے گھنٹے کے بعد اس خط کو جاکر ادریس میان کو دیدینا"

(۱۹)

ادریس کو جسوقت مریم کا خط ملا ہے اسوقت سکینہ کی تجہیز و تکفین کا سامان ہو رہا تھا - گاؤن والے جمع تھے اور "نوحۂ غم" سے "گھر کی رونق" بڑھی ہوئی تھی - مریم کا خط پڑھکر ادریس کچھ دیر کیلیئے دم بخود ہوگیا اور پھر اسپر ردعمل کا دورہ شروع ہوگیا - اسکے دل مین طرح طرح کے خطرات پیدا ہونے لگے - مجبوراً اسنے ممتاز کو ہمراز بناکر کہا "نہ جانے وہ کیا کرنیوالی ہے - میری رائے یہ ہے کہ تم میرے ساتھ فوراً تیواری پور چلو" ممتاز تیار ہوگیا

تھوڑی دیر مین دونون اس راستہ پر تھے جو آمی اور پریتیا کے درمیان مین ہے - آدھا راستہ طے ہوچکا تھا اور وہ ٹیلہ قریب تھا جو ادریس کی محبت کا گہوارہ بھی تھا اور تربت بھی - اس سے گذر کر ادریس نے دیکھا کہ ایک عورت بھاگی ہوئی چلی آرہی ہے اور اسکے پیچھے پیچھے ایک مرد دوڑتا ہوا آرہا ہے - عورت کہہ رہی تھی "نہین میرا پیچھا نہ کرو میری کمزوری سے فائدہ اٹھانیکی کوشش نہ کرو - مین نے تم سے جو وعدہ کیا وہ ہوش و حواس کی حالت مین نہ تھا" ادریس نے مریم کی آواز کو پہچان لیا اور اسکی طرف لپکا - مریم نے اسکو دیکھ لیا حسرت بھرے لہجے مین کہا "آہ! مین چاہتی تھی کہ ایک بار اس ٹیلہ پر اور بیٹھ لون مگر میری قسمت مین اتنا بھی نہین" یہ کہکر وہ ندی مین کود پڑی - اسی کے ساتھ رؤف بھی کودا جواب مریم سے صرف چند قدمون کے فاصلہ پر رہگیا تھا

ادریس دیکھ رہا تھا کہ رؤف اور مریم باہم گتھے ہوئے غوطے کھا رہے ہین لیکن وہ سرتھامے کنارے بیٹھا ہوا تھا - جیسے اسکے اعصاب مفلوج ہوگئے ہون اور آنکھین پتھرا گئی ہون - ممتاز کھڑا غور سے دیکھ رہا تھا - رؤف ایسا تیراک نہ تھا جو ایک ڈوبتے ہوئے کو بچا سکے - چند منٹ مین مریم اور رؤف دونون تہ نشین ہونے لگے - یہ دیکھکر ممتاز بھی ندی مین کودا لیکن موقع تک پہنچنے مین اسکو دیر ہوگئی - رؤف اور مریم کی یادگار مین سطح آب پر صرف چند بلبلے رہگئے تھے

صبح ہوتے ہوتے رام نگر سے تین جنازے نکلے - ماتم داروں کی آمد و رفت جاری تھی لیکن ان مین ادریس کا کہین پتہ نہ تھا - ممتاز کی پریشانی کی کوئی حد نہ تھی - اسکو ایک طرف رابعہ اور اُسکے والدین کو سنبھالنا تھا اور دوسری طرف ادریس کو ڈھونڈ کر نکالنا تھا - دوپہر ہوتے ہوتے وہ ادریس کے کھوج مین نکلا - ادریس آمی کے کنارے اسی ٹیلہ کے پاس بیٹھا ہوا ملا - اس کا دماغ مختل تھا اور وہ کسی کا جواب نہ دیتا تھا - بڑی مشکل سے ممتاز اسکو رام نگر لے آسکا

(۲۰)

ان سانحات کو تریب قریب نو مہینے ہو چکے ہین۔ اس عرصہ مین ادریس کا دماغ اپنی اصلی حالت پر آگیا۔ اسکی اس بیچینی اور پراگندگی کا کہین پتہ نہین ہے جو اسکی فطرت ثانی ہو کر رہگئی تھی۔ وہ اب اسطرح مطمئن تھا گویا جو کچھ ہونا تھا وہ سب ہو چکا ہے اور وہ زمین و آسمان کی آفتون سے بالکل مامون ہے۔ ادریس کو اب جو دیکھتا تھا وہ اسکو ایک نئی ہستی پاتا تھا۔ وہ ابھی تک رام نگر مین تھا۔ ممتاز بھی اسکے ساتھ رہتا تھا۔ ادریس صبح سے شام تک خاموش رہتا تھا اور صرف شام کے وقت اس ٹیلہ کی زیارت کر آتا تھا جو اسکے لئے دنیا کی بہترین اور عزیز ترین عبادت گاہ ہو گئی تھی۔ مختصر یہ کہ وہ اس شعر کی ایک جیتی جاگتی تصویر تھا

چندانکہ دست و پا زدم آشفتہ تر شدم   ساکن شدم میانۂ دریا قرار شد

ادریس کی اندرونی کیفیت کو سمجھنے والے صرف دو تھے۔ ایک تو ممتاز دوسری رابعہ۔ رابعہ کا باپ ایک ماہ پہلے ہیضہ کی وبا مین مر چکا تھا۔ پے بہ پے مصیبتون نے رابعہ کے دلمین ایک خستگی ایک گداز ایک گھلاوٹ پیدا کر دی تھی اور اب وہ اپنے اور ادریس کے درمیان ایک مشترک عنصر محسوس کر رہی تھی۔ وہ ادریس سے ملنے کے لئے بیتاب تھی۔ اُسنے کئی بار ادریس کو بلا بھیجا مگر ادریس اپنی خیالی دنیا مین کچھ ایسا محو تھا کہ اُسنے رابعہ کی طرف توجہ بھی نہ کی۔ ایک دن ۱۲ بجے رات کو جبکہ سارے رام نگر پر ایک سکوتِ خواب مسلط تھا رابعہ خود ادریس کے پاس پہنچی۔ ممتاز سو گیا تھا۔ مگر ادریس اپنے بستر پر بیٹھا تکیہ زانوؤن پر دھرے کچھ سوچ رہا تھا۔ رابعہ کو دیکھکر اسکی پیشانی پر بل پڑ گئے اُسنے کہا "تم کس لئے یہان آئی ہو؟ اب تمکو مجھ سے کیا کام ہے؟"

رابعہ نے اسکے تیور کی پروا نہ کی اور ہاتھ جوڑ کر بولی "ادریس اس مین شک نہین کہ میرا منہ ہرگز اس قابل نہین رہا کہ تم سے ملون یا کچھ کہون لیکن مین انسان ہون اور انسان خطاؤن کا پتلا ہے۔ خطاؤن کو معاف کرنا صفات خداوندی مین سے ہے۔ تم فیاض ہو۔ دریا دل ہو۔ تمھاری اپنی مصیبتون نے تمکو اس قابل بنا دیا ہے کہ دوسرون کی مصیبت کو سمجھو۔ مجھے اس سے انکار نہین کہ تم کو برباد کرنے والی در اصل مین تھی لیکن میرے اچھے ادریس تم مجھکو معاف کر دو اور مجھے اپنی لونڈی بنا کر رکھ لو مجھکو معلوم ہو چکا ہے کہ اگر تمنے اپنے دامن مین پناہ نہ دی تو مجھے دنیا مین کہین پناہ نہ ملیگی۔ ادریس مین تمکو اپنا معبود سمجھکر پوجونگی مجھے معاف کر دو"!

رابعہ کا لہجہ درد بھرا تھا۔ ادریس متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اُسنے رابعہ کو بستر پر بٹھا کر کہا "ہر چند نہ مین خدا ہون اور نہ ہونا چاہتا تاہم تمھاری کلفتون کو محسوس کرتا ہون۔ اگر تم اس سے پہلے معافی مانگتین تو مین ہرگز معاف نہ کرتا لیکن اب مین اس درجہ کو پہنچ چکا ہون جہان کسی کو کسی سے شکایت نہین ہوتی۔ مین زندگی کی اصلیت سمجھ چکا ہون۔ اور تمنے جو کچھ کیا اسکو مین گناہ نہین سمجھتا۔ پھر تمھین کہو مین معاف کس چیز کو کرون۔ رہگیا یہ سوال کہ مین تمکو اپنی پناہ مین لے سکتا ہون یا نہین سو اسکے متعلق مجھے ایک بات کہنا ہے۔ اگر تم غور سے سننے کے لئے اور سوچ سمجھکر اسپر عمل کرنیکے لئے تیار ہو تو کہون"

رابعہ سراپا گوش بنگئی۔ ادریس نے ممتاز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "مین تمکو چاہنے اور تم سے چاہے جانیکا اس بدنصیب کو اپنے سے زیادہ مستحق سمجھتا ہون اور میرا ایمان یہ ہے کہ تم کو اگر چین نصیب ہو سکتا ہے تو میرے دامن مین نہین بلکہ اسی کے دامن مین۔ تم اسکو نہین سمجھو گی۔

مگر مین خوب سمجھتا ہون، تمنے اسکو کبھی نظر بھر کر دیکھا بھی نہین مگر یہ تمکو اسی طرح چاہتا رہا - ذرا سوچو تو وہ تم کو اس حالت مین بھی چاہتا رہا جبکہ مجھکو تم سے شدید ترین نفرت تھی - اسلئے میری صلاح یہ ہے کہ تم ممتاز کو اپنا سرتاج بنالو - راحت پاؤگی - اس سے زیادہ نہ مین کچھ کہہ سکتا ہون اور نہ تمھارے کام آسکتا ہون - اگر کسی کے کام آسکتا تو سب سے پہلے اپنے کام آتا اور مریم کو یون نہ کھو دیتا - اگر محبت واقعی کوئی چیز ہے اور اگر مین نے کسی کی محبت کی تو وہ تمھاری نہین بلکہ مریم کی - اسکا یہ حشر ہوا - تمنے مجھکو مٹایا - مین نے مریم کو - ذرا دیکھنا کس کا انتقام کس سے لیا گیا - نہ جانے اب میرا انجام کیا ہونیوالا ہے" یہ کہکر ادریس نے آنکھون مین آنسو بھر کر یہ شعر پڑھا

طالع بخت مرا ہیچ منجم نہ شناخت　　یارب از مادر گیتی بہ چہ طالع زادم!

رابعہ ساکت وصامت ادریس کا منہ تکتی رہی - ادریس نے کہا "اب جاؤ مین کل تمھاری مان سے آکر اس معاملہ پر گفتگو کرونگا لیکن اگر تمنے میرا مشورہ نہ مانا تو مجھے تم سے پھر نفرت ہوجائیگی" ادریس نے رابعہ کا ماتھا چومکر اسکو رخصت کردیا اور تھوڑی دیر بعد ممتاز کو جگا کر اس سے پورا واقعہ بیان کردیا

ممتاز نے کہا "تمنے بڑی غلطی کی - سکون کی مجھ سے زیادہ تمکو ضرورت ہے - اور بہت ممکن تھا خدا تمکو اسی بہانہ سکون دیتا اور ادریس محبت سے زیادہ سکون بخش چیز دنیا مین کوئی نہین"

ادریس نے مسکرا کر کہا "مین نے اس معاملہ پر کافی غور کرلیا ہے - سکون واطمینان ہر شخص کے حصہ کی چیز نہین - یہ اپنا اپنا کردار ہوتا ہے اور اپنا اپنا لچھن جو انسان کی زندگی کو بناتا بگاڑتا ہے - چنانچہ یہ میرا ہی کردار تھا جسنے مجھے برباد کیا اور میرے ساتھ دو معصوم اور بےگناہ عورتون کو خاک مین ملا دیا - خدا کی بحث میرے سامنے نہ نکالو - جس چیز کو تم خدا کہتے ہو مین اسکو ایک اندھی قوت سمجھتا ہون جو ایک فاتر العقل بچے کی طرح حسین چیزون کے ساتھ پہلے تو کھیلتی ہے اور پھر انکو توڑ پھوڑ کر رکھدیتی ہے - رہگئی محبت سو میرا خیال ہے کہ اس دنیا کے حوادث مین اسکا وجود نہین - اس دنیا کی محبت کے متعلق اثر نے سچ کہا ہے

واقعی کون کس کو چاہے ہے　　ہر کوئی وہم مین بنا ہے ہے

ممتاز تمھارے معتقدات کچھ اور ہین - تمھارا مزاج تمھاری طبیعت کچھ اور ہے اسلئے تم رابعہ کے ساتھ آسودگی ضرور پاسکتے ہو مجھے چھوڑو مین نے اپنی آئندہ زندگی کا نقشہ بنالیا ہے - میرے پاس جو کچھ ہے وہ سب مریم کی راہ مین خیرات کردونگا اور خود تیواری پور کی اسی جھونپڑی مین رسول شاہ کے ساتھ رہکر کھیتی پر بسر اوقات کرونگا"

مجنون گورکھپوری

ہمیشہ یاد رکھئے

(۱) خط وکتابت مین نمبر خریداری درج کرنا (۲) جوابی امور کے لئے ٹکٹ جوابی کارڈ بھیجنا (۳) بیس تک پرچہ نہ پہونچنے کی اطلاع کرنا (۴) منی آرڈر کے کوپن مین نمبر خریداری درج کرنا

(مینجر نگار لکھنؤ)

تصوف اسلام پر ایک مورخانہ نظر

(بہ سلسلۂ ماسبق)

امام غزالی کے صوفیانہ تجارب

امام غزالی فرماتے ہین اس دور عزلت نشینی مین مجھ پر ایسی ایسی چیزین منکشف ہوئین کہ انھین شمار نہین کر سکتے، دوسرونکے فائدہ کیلئے اتنا بتا دینا چاہتا ہون، کہ مجھے علم یقینی ہو گیا ہے، کہ صرف صوفیہ ہی سلوک الہیہ کے رہرو ہین، اور اور یہ کہ انکے آئین وضوابط سب سے عمدہ انکا طریقہ سب سے یقینی، اور انکے صفات سب سے پاک اور ستودہ ہین، اگر عالم کے عقلا اپنے ذہن فضلا اپنی عقل، اور قانون الہیہ کے ماہرین اسرار، اپنے علم و معرفت کیساتھ، مجتمع ہو کر چاہین، کہ مسلک تصوف کے کسی آئین مین تغیر و تبدل یا ترمیم کرین، تو انھین اسکا موقع نہین، صوفیہ نے تمام عملیات خواہ وہ حرکت سے متعلق ہون یا سکون سے، خارجی ہون یا دخلی شمع وحی کی روشنی سے مستفاد ہین، اور روئے زمین پر انوار وحی کے سوا، کوئی دوسری شے ایسی نہین جس سے استفادہ نورانی کیا جائے مختصر یہ کہ انکے پاک مسلک کے متعلق، جو کچھ کہا گیا، وہ یہی ہے، مسلک تصوف کی پہلی تلقین یہ ہے، کہ دماغ کو غیر خدا سے بالکل پاک و صاف کر دیا جائے، اسلئے داخلہ کی کنجی اذان نماز کی طرح (جسکا مقصد یہ ہے کہ اب نماز کے سوا، تمام اعمال ناجائز ہین) یہ ہے کہ دماغ کو سراپا خدا کی یاد مین مستغرق رکھا جائے،

استغراقاً ایک رہرو طریق، کی نظرون سے حجابات (مادیہ) دور ہو جاتے ہین، اور اس کیلئے روحانی علم و عرفان کا دروازہ کھول دیا جاتا ہے، طریقت کا وہ رہرو، عالم بیداری ہی مین ملائکہ اور ارواح انبیا کا مشاہدہ کرتا ہے، انکی آوازین سنتا ہے، اور ان سے کسب عرفان کرتا ہے، اسکے بعد اسکی روحانی حالت ایسی ارفع ہونے لگتی ہے، کہ صور و امثال کے حجابات دور ہو جاتے ہین، اور وہ ایک ایسے نشیمن لاہوتیہ مین جا گزین ہوتا ہے، جسکا صحیح مرقع الفاظ مین نہین پیش کر سکتے، قرب الہیہ کی وہ منزل اسکے سامنے ہوتی ہے، جسے بعضون نے "حلول" سے موسوم کیا، بعضون نے "اتحاد" اور "وصول" سے لیکن یہ تمام تعبیرات ناقص ہین، جو اس عالم شہود کی صحیح ترجمانی نہین کر سکتین،

عالم "شہود" اور کیفیت "حال"

صوفیہ کا خیال ہے کہ رہرو طریقت کو یہ لذت شہود عالم "حال" مین میسر ہوتی ہے "حال" کے متعلق میکڈونلڈ لکھتا ہے، کہ اس سے وہ نفسیاتی حالت مراد ہے، جسکی تکوین نہ تو کسی سعی کا نتیجہ ہے، اور نہ کوئی ظاہری علت اسکے حدوث کا سبب ہے، یہ ایک احساس ہے، جو قوت ادراک کے مخالف ہے، یہ ایک قریبی شعور ہے، جسے مشتقات علمیہ سے تعبیر نہین کر سکتے، صوفیہ نے لفظ "احوال" کو مسرت و غم، علو و حضیض سے بھی تعبیر کیا ہے، جو عابد کے قلب مین نازل ہوتا ہے، یہ اصطلاح اپنی آخری ترقی یافتہ صورت مین وہ اعلی معنی ظاہر کرتی ہے، جسے بیخودی (Ecstacy) کہتے ہین، جس وقت صوفی احساس خودی سے گزر جاتا ہے، اسے عالم مادی کا شعور باقی نہین رہتا، اس وقت اسے صرف خدا ہی کا شعور ہوتا ہے، یہ کیفیات اسکے ارادہ سے حاصل نہین ہو سکتین بلکہ اس وقت روح آتی اور روانہ ہوتی ہے

ملا شاہ اور مراقبہ ذات

میکڈونلڈ لکھتا ہے، کہ صوفیانہ زندگی کی دوسری مثال ہلوگون کو ہندوستان کے اس دور کی طرف متوجہ کرتی کرتی ہے، جب اکبر، جہانگیر، شاہجہان، اور اورنگ زیب سریر آرائے حکومت تھے، اس عہد مین ایک نہایت مشہور صوفی گزرے ہین، جو کچھ دنون بلخ مین رہے، کاشمیر مین آئے، اور پھر لاہور مین اقامت کرلی، فرانس کے مشہور مستشرق، وان کریمر کی بدولت آپکی زندگی، اور آپکے اقوال منصۂ شہود پر آئے فاضل مستشرق نے یہ روایات بہ سند متصل حاصل کئے ہین جنھین آپکے ایک مقرب مرید نے ایک کتاب مین جمع کردیا تھا، یہ جامع روایات (خسرو دہلوی کی طرح) صوفیانہ زندگی گزار رہا تھا، اور دربار مغلیہ مین بھی ایک معزز عہدہ پر فائز تھا، وہ بزرگ حضرت ملا شاہ تھے، جو سنہ ۱۵۸۵ء مین بمقام بدخشان پیدا ہوئے، بلخ اور لاہور مین تعلیم پائی اور سلسلہ قادریہ مین بیعت کرلی، آپ وحدت فی الکثرت کا ذوق صوفیانہ رکھتے تھے، اور لوگونکی ناراضگی اور دل آزاری کے خیال سے اسلام کے ظاہری طریقہ پر بھی عامل تھے، آپکا حلقہ اثر اسقدر مقناطیسی پہلو رکھتا تھا کہ مریدونکا ہجوم لگا رہتا، آپ کے متعلق کفر والحاد کا فتویٰ بھی جاری ہوا، لیکن آپ نے اورنگ زیب جیسے ظاہر بین، اور سخت گیر مسلمان کو مالوف رکھا، اور ایک پاک اور مقدس زندگی گزار کر سنہ ۱۶۶۱ء مین بمقام لاہور انتقال کیا،

آپکے مرید اور مولف زندگی کا نام توکل بیگ تھا، جسے آپنے ابتدائے شباب ہی مین صوفیانہ زندگی سے آشنا کیا، توکل بیگ کمالات صوفیانہ کے اس نقطہ پر پہونچا، جہان اس نے نور باطن کا مشاہدہ کیا، اور جہان اسے ہر شے مین وحدت کی جلوہ گری معلوم ہوتی تھی، اور جہان وہ اپنی انفرادی ہستی کو بھی فانی اور ہستی واحد مین جذب ہوکر، باقی تصور کرنے لگا تھا،

توکل بیگ خود اپنی صوفیانہ ریاضت کے متعلق لکھتا ہے، جسے وان کریمر نے فارسی سے فرنچ مین ترجمہ کیا میکڈونلڈ نے فرنچ ہی کا انگریزی ترجمہ کیا تھا، جسے اردو مین پیش کیا جاتا ہے، توکل بیگ لکھتا ہے:-

مینے تمام رات بغیر آنکھ جھپکائے گزاردی، اور ایک لاکھ مرتبہ قرآن مجید کی ایکسو بارھوین سورۃ (سورۃ اخلاص) تلاوت کرنے مین مشغول ہوگیا، یہ عمل مینے چند دنون مین ختم کیا، مشہور ہے کہ اس سورہ مین اسم اعظم ہے، جو شخص اسے ایک لاکھ مرتبہ پڑھیگا، اسکے اثر سے اسکی تمام مرادین برآوینگی، اسلئے مینے حضرت ملا شاہ کی نظر محبت حاصل کرنے کی غرض سے یہ عمل شروع کردیا، اور مین عقیدہ راسخ رکھتا تھا، کہ اس ذریعہ سے میری مراد برآویگی، مینے جسوقت لاکھون مرتبہ یہ سورت پڑھی، میرے مرشد کے دل مین میری ہمدردی پیدا ہوئی، اور آپنے اسوقت سنگھین محمد اپنے خلیفہ کو بھیجکر مجھے اپنے حضور مین طلب کیا، تمام رات آپنے مجھ پر "توجہ" مبذول کی اور مین خود اپنے قلب کی طرف توجہ کرتا رہا، مگر میرے قلب کی عقدہ کشائی نہ ہوسکی،

اس طرح تین راتین گزر گئین، حضرت ملا شاہ اپنی روحانی توجہ صرف فرماتے رہے، لیکن کوئی اثر مرتب نہوا، چوتھی رات ملا شاہ نے کہا کہ سنگھین محمد اور صالح بیگ جو جذبہ "حال" رکھتے تھے، اپنی توجہ کرینگے، انھون نے اس حکم کی پیروی کی، اور مین تمام رات قبلہ رخ ہوکر بیٹھا رہا، اور اپنی تمام قوتین اپنے قلب کی طرف مبذول رکھین، صبح کے وقت کسی قدر نور اور صفائی میرے قلب مین جلوہ گر ہوئی، لیکن مین رنگ یا صورت کی تمیز نہین کرسکتا تھا،

نماز صبح کے بعد مین ان دو متذکرہ بالا آدمیون کے ساتھ اپنے پیر کے پاس گیا، انھون نے مجھے سلام کیا اور ان دونون آدمیون سے

دریافت کیا کہ میرے لئے انھون نے کیا کیا، تب وہ میری طرف مخاطب ہوئے، اور مجھ سے میرے تجارب کے متعلق سوال کیا، مینے کہا کہ مین قلب کے اندر ایک قسم کی صفائی محسوس کرتا ہون، اسپر شیخ کا چہرہ خوشی سے چمکنے لگا، اور مجھ سے کہا کہ تمھارا قلب مجموعہ محاسن ہونیکے باوجود اس قدر تاریک ہو گیا ہے کہ سمندر ناپیداکنار کے دو کھوے بھی اسمین نہ تو چمک پیدا کر سکے، نہ جلا، اب وقت آگیا ہے کہ مین خود دکھاؤن کہ یہ کیونکر پاک و صاف ہو جاتا ہے،

اسکے بعد انہون نے مجھے اپنے نزدیک بٹھایا، میرے حواس کا یہ حال تھا کہ جیسے مین مست ہون، میرے مرشد نے مجھے حکم دیا کہ مین آپکی صورت قلب مین متعین کرون، آپنے میری آنکھون پر پٹی باندھ دی، اور کہا کہ مین اپنی تمام دماغی قوتین اپنے قلب پر مجتمع رکھون، مینے ایسا ہی کیا، اور ایک آن مین خدا کی عنایت اور شیخ کے فیضان باطنی سے میرا قلب منکشف ہو گیا، مینے دیکھا کہ میرے اندر الٹے ہوئے پیالہ کی طرح کوئی چیز رکھی تھی، وہ سیدھی ہو گئی، اس سے مجھ مین بے انتہا مسرت پیدا ہوئی، مینے مرشد سے کہا کہ اس حجرہ کی طرح جسمین مین آپکے نزدیک بیٹھا ہوا ہون، ایک دوسرا حجرہ خود اپنے اندر دیکھ رہا ہون، اور مجھے ایسا نظر آرہا ہے، جیسے کوئی دوسرا توکل بیگ کسی دوسرے ملاشاہ کے نزدیک بیٹھا ہوا ہے،

تب انھون نے حکم دیا کہ مین آنکھین کھول دون، مینے اپنی ظاہری آنکھون سے انھین اپنے نزدیک بیٹھا ہوا دیکھا اسکے بعد پھر انہون نے میری آنکھون پر پٹی باندھ دی، اور مینے اپنی روحانی آنکھون سے انھین اسی طرح بیٹھا ہوا دیکھا حیرت مین آکر مین پکار اٹھا، یا مرشد، خواہ مین اپنی جسمانی آنکھون سے دیکھون یا روحانی آنکھون سے صرف آپ ہی آپ نظر آتے ہین،

اسکے بعد مینے دیکھا کوئی ترمراتی ہوئی شکل میری طرف چلی آرہی ہے، جب مینے مرشد سے مینے اسکا تذکرہ کیا تو انھون نے مجھسے کہا کہ اس صورت سے نام دریافت کرنا، مینے اپنے دماغ ہی مین یہ سوال کیا، اور اس صورت نے قلب سے جواب دیا، میرا نام عبدالقادر جیلانی ہے ۱؎، مینے اپنے گوش روحانی سے یہ آواز سنی، تب میرے مرشد نے مجھے تلقین کی کہ مین ولی موصوف سے، روحانی استمداد، اور فیض باطنی کی درخواست کرون، جب مینے یہ درخواست کی تو روح نے جواب دیا کہ مین تمھین اپنی امداد تفویض کر چکا ہون، اور یہی وجہ ہے کہ تمھارے قلب کی عقدہ کشائی ہوئی ہے، جذبہ تشکر سے سرشار ہو کر مینے ولی موصوف کی طرف سے ہر جمعہ کی رات کو کامل قرآن ختم کر لینا لازم کر لیا، اور کامل دو سال تک یہ عمل مینے کیا کبھی ناغہ نہ کیا میرے مرشد ملاشاہ نے کہا، عالم روحانی اپنے کمال حسن کے ساتھ تمھین دکھایا گیا اب بیخودی کو کامل طور سے اس عالم غائب کے مشاہدہ عجائب مین مٹاتے رہو

مین سختی کے ساتھ اپنے مرشد کے ہدایات پر عمل پیرا رہتا تھا، اور روز بروز عالم روحانی کا علم مجھے زیادہ ہوتا جاتا تھا، اسکے بعد مینے ایک دن آن حضرت صلعم اور آپکے مخصوص صحابیون کی صورت دیکھی اور ملائکہ اور اولیاء اللہ کی جماعتین میری نظر باطن سے گزرتی تھین اسی صورت سے تین ماہ گزر گئے، اور مین ارتقائے روحانی کے اس نقطہ پر پہونچا، جہان رنگ مٹ جاتا ہے، اسوقت یہ تمام صورتین غائب ہو گئین، اس دور مین

۱؎ Proceedings of the Psychical research society مین اس قسم کے اکثر واقعات پائے جاتے ہین، یورپ اور امریکہ مین روحانیات کی ترقی نے اس قسم کے بیشتر صوفیانہ خیالات کی تصدیق کر دی ہے، آجکل میرے اموں جناب مخدومی سید مظہر الحق صاحب بیرسٹر کو روحانیات کے مطالعہ کا خاص شغف ہے مطبوعات امریکہ و یورپ کی قدیم و جدید تقریباً پانچسو جلدین آپکے کتب خانہ مین اس فن کی کتابین موجود ہین فرماتے تھے کہ ایک ماہر روحانیات خود اپنا مشاہدہ لکھتا ہے، کہ اسنے امام غزالی کی روح سے ملاقات کی، اور انہین زمرد کا ہار پہنے دیکھا، دماغ ہی مین سوال کرنا اور قلب مین جواب پالینا موجودہ (قرأۃ افکار) Telepathy نے ثابت کر دیا ہے،

میرے مرشد نے کبھی وصل الٰہی اور "باطن" صوفیانہ کی توضیح کرنی ترک نہین کی، لیکن انھون نے مجھے حقیقت کاملہ دکھانا پسند نہین کیا، البتہ ایک برس کے بعد علم حقیقت اور یہ کہ اس سے میری اصلی ہستی کو کیا تعلق ہے، مجھ پر منکشف ہوا، اسوقت میرے قلب مین مفصلہ ذیل اشعار کا الہام ہوا، اور یہان سے غیر شعوری طور پر یہ اشعار میری زبان پر جاری ہوگئے

(میکڈونلڈ نے انگریزی اشعار لکھے ہین جو وان کریمر کے فرانسیسی کا ترجمہ ہے، توکل بیگ کے اشعار ملہمانہ فارسی مین تھے، انگریزی کا خلاصہ ترجمہ حسب ذیل ہے،

مجھے یہ خبر نہ تھی کہ یہ برباد ہوجانے والا جسم صرف آب وخاک کا ایک تودہ ہے، مجھے پتہ نہ تھا کہ قلب، روح، اور جسم مین کیسی کیسی قوتین مجتمع ہین، مین بہت متاسف ہون، کہ میری زندگی کا اس قدر حصہ تیرے (خدا؟) بغیر گزر گیا، مین "تم" تھا اور مجھے اسکا علم نہ تھا جب مینے ملاشاہ سے اس شاعرانہ الہام کا تذکرہ کیا، تو وہ خوش ہوئے کہ اب "اتحاد الٰہیہ" کا خیال میرے دلمین ظاہر ہوا، اور اپنے احباب کو مخاطب کرکے انھون نے کہا، "توکل بیگ نے میرے منہ سے اتحاد الٰہی کی باتین سنین اور وہ کبھی اسکے رموز کی تکذیب نہین کرینگے، انکی نظر باطن منکشف ہوگئی انکے سامنے رنگ وروپ کا میدان آیا اور وہ اسکی اس منزل پر بھی پہونچے جہان الوان وصور مٹ جاتے ہین، اس شخص کو جو اتحاد الٰہیہ کے ان وادیون سے گزرجاتا ہے، کامل حقیقت کا علم ہوجاتا ہے، پھر نہ تو وہ اپنے شکوک سے گمراہ ہوتا ہے، نہ منکرین کی اغوا سے،

اسکے بعد میکڈونلڈ نے ملاشاہ کے دو شاہی مریدون دارا شکوہ اور اسکی بہن فاطمہ کے متعلق توکل بیگ کے بیان کا ترجمہ کیا ہے، فاطمہ نے مشاہدات باطنی، صوفیانہ تجارب، اور علوی روحانی تفصیل سے لکھے ہین ارباب ذوق چاہین تو "رلجس ایٹیچیوڈ اینڈ لائف ان اسلام" کا مطالعہ کرین،

مثال نفس کشی، "ذکر" اور اسکے اسرار

ایڈورڈ ولیم لین اپنی اقامت قاہرہ کے زمانہ کی مفصلہ ذیل روایت اپنے ترجمہ الف لیلی کے نوٹ مین لکھتا ہے،

ابوالقاسم گیلانی قاہرہ مین میرے ایک دوست تھے، انھون نے درجۂ ولایت کے حاصل کرنے کیلئے جو نفس کشی اور دوسرے ذرایع اختیار کئے تھے، انکا تذکرہ مجھ سے کر رہے تھے، یہ عمل، جبر نفسیہ، اور کامل توکل علی اللہ سے تعلق تھا، انہون نے تلاش مرشد مین اپنا گھر چھوڑ دیا، اور فارس اور اسکے آس پاس کے ممالک مین (اور اگر ضرورت ہوئی تو دور دراز مقامات مین) سیر وسفر کرنے کے لئے نکلے، بہت دنون تک وہ انسانی آبادی سے علیحدہ علیحدہ رہے، صبح سے شام تک روزہ رکھتے، اور کسی قدر گھانس یا جنگلی پھل سے افطار کرلیتے، یہانتک کہ بتدریج وہ اکل وشرب کے تکلفات سے بھی سبکدوش ہوگئے، پہلے انکے پاؤن مین آبلے پڑگئے، سخت پتھرون سے جگہ بہ جگہ زخمی ہوئے، اور بالکل صلب ہوگئے، مگر غذا کی کمی کے اعتبار سے اصول فطرت کے خلاف انکا جسم اور توانا ہوگیا، اور خواہشات بڑھ گئین، آفتاب کی حدت، اور شانہ پر کالے کالے بال لٹکائے رہتے، اور عریانی جسم سے انکی صورت بھیانک اور دہشتناک معلوم ہوتی تھی، پہلے پہل جب ایک قصبہ مین انکا گزر ہوا، تو لڑکون نے انہین گھیر لیا، اور پتھر برسانے لگے، اسلئے وہ آبادی سے علیحدہ ہوگئے، اور ہمارے قدیم الایام اجداد کی طرح ایک حد تک جسم کو پتون سے چھپایا، اور قبل اسکے کہ پتے سوکھ کر جسم سے علیحدہ ہون وہ شہر چھوڑ دیتے تھے، عموماً انسانی رہگزر سے الگ رہتے، اگر کسی ریگستان مین گزر ہوتا

(جہان نہ جنگلی میوے دستیاب ہوسکتے تھے، نہ پتے) تو آبادی طرف رخ کرتے، اور ایک ٹکڑہ روٹی اور ایک گلاس پانی کسی سخی آدمی سے لیتے، ایک چیز جس سے خصوصیت کے ساتھ وہ خوف کرتے تھے، یہ تھی کہ کہین، کہ کسی فاسق یا شیطان سے (جو انسانی شکل مین ہو) مدد نہ پہونچے ایک مرتبہ ایک تپتے ہوئے ویران مقام مین انکا گزر ہوا، تین دن تک انھین کچھ کھانے کو نہ ملا، نہ گھانس کی ایک پتی ملی نہ پانی کا کوئی چشمہ، تشنگی کا سخت غلبہ تھا، انھون نے دعا کی کہ خدا کسی شخص کو ایک گھڑا پانی لیکر روانہ کرے لیکن ساتھ یہ شرط بھی کی کہ پانی بغدادی گھڑے مین ہو تاکہ مین جان لون کہ یہ تیری طرف سے ہے، شیطان کی طرف سے نہین ہے، اور جب مین اس سے پینے کے لئے مانگون، تو وہ اسے میرے سر پر ڈال دے تاکہ مین اپنے نفس امارہ کو زیادہ آسودہ نہ کرسکون، مینے پیچھے پلٹ کر دیکھا تو ایک آدمی سبز بغدادی گھڑے مین پانی لئے ہوئے آرہا تھا مینے جب اس سے پینے کیلئے مانگا تو اس نے میرے سر پر بہادیا، اور روانہ ہوگیا، اللہ کی قسم ایسا ہوا، اس معجزانہ کرامت کو انھون نے درجات ولایت کا ایک حصہ سمجھا، پانی سے وہ تازہ دم ہوگئے اور منازل ریگستان طے کرنا شروع کئے، لیکن تھوڑی ہی دیر کے بعد پھر تشنگی کا غلبہ ہوا، اور نہین ایسا معلوم ہونے لگا کہ اب وہ بیہوش ہوجاوینگے، کہ سامنے ایک پہاڑی نظر آئی، اور اسکے دامن مین ایک جھرنا جاری تھا، انھون نے نفس کشی کی غرض سے پانی پینے کے قبل پہاڑ کی چوٹی پر چڑھنے کا ارادہ کیا، جہان وہ بڑی وقت سے تمام دن کی محنت کے بعد پہونچے، وہ قلہ کوہ پر کھڑے تھے کہ انہون نے سوارونکی ایک جماعت دیکھی جو دامن کوہ کے نزدیک آکر ٹھہر گئی، انکا سردار جو آگے آگے تھا، انکا نام لیکر بولا، اے ابوالقاسم اے گیلانی نیچے آؤ، اور پانی پیو، لیکن میرے دوست اس خیال سے کہ وہ ابلیس ہے، اور اسکے رفقا اسکی اولاد ہین، انھون نے خواہش رد کی لی یہانتک کہ یہ فریبی اپنی جماعت کے ساتھ روانہ ہوا، اور نظر سے غائب ہوگیا، آفتاب غروب ہوگیا، اور انکی تشنگی مین بھی کچھ کمی ہوگئی تھی، پھر بھی انھون نے پانی کے چند قطرے پئے، دشت پیمائی کرتے کرتے انکا گزر ایک سنگلاخ مین ہوا، جہان انہون نے ایک ضعیف العمر شخص کو بیٹھے ہوئے دیکھا، انکی داڑھی لانبی اور سفید تھی، بزرگ نے انھین مخاطب کرکے دریافت کیا، کہ کس چیز کی تلاش ہے، انہون نے کہا کہ مین ایک روحانی مرشد کی تلاش مین ہون، اور میرا دل کہہ رہا ہے، مجھے جنکی تلاش ہے، وہ آپ ہی ہین، بزرگ نے کہا میرے بچے، تم سامنے ایک بزرگ کا مقبرہ دیکھ رہے ہو، یہ وہ جگہ ہے، جہان دعا کا جواب ملتا ہے، وہان جاؤ اور مقبرہ کے اندر بیٹھو، نہ کھاؤ نہ پیو اور نہ استراحت کرو، بلکہ رات دن آہستہ آہستہ لا الہ الا اللہ کا ورد رکھو دیکھو، ذی روح مخلوق تمھاری جنبش لب دیکھ نہ سکے، کیونکہ اس وظیفہ کے مخصوص صفات مین ایک یہ ہے کہ ورد مین لب کو کوئی جنبش نہ ہو، جاؤ تم پر سلامتی ہو" میرے دوست کہتے تھے حسب ارشاد مین وہان گیا تو دیکھا ایک چھوٹی سی مربع عمارت ہے، جس مین ایک گنبد ہے، اور دروازہ کھلا ہوا ہے، مین اندر جاکر بیٹھ گیا اور طاق اور مخروطی شکل کی عمارت کی طرف جو قبر پر بنی ہوئی تھی اپنا رخ کرلیا،

یہ شام کا وقت تھا، مینے توحید کے یہ خموش مشاغل جس طرح میرے مرشد نے ہدایت کی تھی، شروع کردئے مینے دیکھا کہ ایک دھندلے رنگ کی کوئی صورت میرے پہلو مین بیٹھی ہے، اور مجھے میری ریاضت عابدانہ مین مدد دے رہی ہے مینے اسے مس کرنے کے لئے اپنے ہاتھ پھیلائے، لیکن مجھے معلوم ہوا، کہ یہ کوئی مادی ذات نہین بایں ہمہ وہ صورت وہان موجود تھی، مینے اچھی طرح دیکھا، اس نظارہ سے مجھے ترغیب ہوئی، اور مین اپنے عمل مین بلا وقفہ شبانہ روز مشغول رہا، نہ مین کچھ کھاتا تھا نہ پیتا تھا، پھر بھی میری روحانی طاقت روز افزون تھی، تیسرے دن

مین مقبرہ کی سفید دیوارون، زمین اور ہوا مین، اور جس طرف مین نظر اوٹھا کر دیکھتا تھا لا الہ الا اللہ لکھا ہوا پاتا، اور جب کبھی ایک مکھی مقبرہ مین داخل ہوتی، تھی تو وہ بھی اپنے رقص پرواز سے یہی کلمہ لکھ دیتی تھی، خدا کی قسم ایسا ہوا، اب میرا مقصد کامل طور سے حاصل ہوگیا مینے دیکھا کہ مجھے علم مابعد الطبیعۃ حاصل ہوگیا ہے، احباب اور ارباب تعارف کے خیالات مجھے ستاتے نہ تھے لیکن ہر دوست جو فارس، ہند، عرب، اور ترکستان مین تھا، اور جو کچھ وہ کر رہا تھا میرے پیش نظر معلوم ہوتا تھا مجھے ایک ناقابل بیان مسرت حاصل ہوئی .... یہ حالت چند سال تک باقی رہی، لیکن آخر کار مین دنیاوی اغراض کے فریب مین مبتلا ہوگیا، مین اس ملک مین آیا ایک خطاط کی حیثیت سے میری شہرت ہوتی، اور حکومت نے مجھے ایک منصب بھی عطا کیا، اب دیکھو یہ شال ہے، یہ الماس کی بنی ہوئی چیز میرے سینہ پر ہے مین ضعیف ہوگیا اب خوف ہوتا ہے کہ مجھے نفس کشی کے ان مصائب کی برداشت نہ ہوگی، جن سے بہت حقیقی حاصل ہو، گو مینے ارادہ کر لیا ہے، کہ مین ایک بار کوشش کرونگا"

لین کہتا ہے، اس گفتگو کے تھوڑے ہی دن کے بعد میرے دوست منصب سے برطرف کر دئے گئے، انھین طاعون ہوگیا اور اسی مین انھون نے انتقال کیا، لین نے اسکے بعد تنقید کی ہے، اور وہ کہتا ہے، کہ میرے دوست سچ مچ کچھ عرصہ تک ایک بادیہ پیما عابد کی طرح زندگی گزار رہے تھے، اور چونکہ انھون نے نفس کشی کی تکلیفین جھیلین، جسکے ساتھ جوش عقیدت کا تلازم تھا، تو بہت ممکن ہے، انکی قوت مصورہ مین بدنظمی ہوگئی ہو، اور انھون نے سچ مچ یہ عجیب وغریب مناظر دیکھے ہون، کیونکہ جب وہ بیان کر رہے تھے تو لہجہ۔ ادا مین ایک خاص قسم کی آرزو، اور اخلاص پایا جاتا تھا جسے ایک کاذب عمداً نہین برت سکتا، لین ایک یوروپین تھا، جسکے لئے مادہ نوازی امر ناگزیر ہے، تخیلات کے عجائب ورا مابعد الطبیعۃ واتو کھا پن اسکے نزدیک نہ تو قابل اعتماد ہے نہ لائق تسلیم اس نے ابو القاسم گیلانی کے تجربات کو اختلال مصورہ کا نتیجہ بتایا، ہر چند اسے اپنے دوست کی حق گوئی اور راستبازی کا اعتراف ہے، اہل مذاق واقعہ کی اہمیت سمجھ لین،

طریقت کی منزل افتتاحیہ

میکڈونلڈ نے صوفی لٹریچر کا گہرا مطالعہ کرنے کے بعد اس بحث عنوان کی ایسی جامع تلخیص کی ہے، کہ موجودہ دور کے انگریز مستشرق ڈاکٹر نکلسن نے بھی جنکا مذاق صوفیانہ اور مطالعہ تصوف عقیدت اور پرستش کی حد تک پہونچ گیا ہے، اپنی مایہ ناز کتاب "صوفیائے اسلام" کے باب اول مین میکڈونلڈ کی اس فاضلانہ تحریر کا اقتباس دیدیا ہے، میکڈونلڈ لکھتا ہے،

رہرو طریقت کو چاہئے کہ تعلقات دنیا ترک کر دے، اور اپنا دل ان سے خالی رکھے، اسے نہ کنبہ کا تردد ہو نہ دولت کی فکر، نہ بچون کا خیال ہو نہ گھر کا غم، یہانتک کہ علم ظاہری کی طلب، حکومت کی تمنا، اور حوصلہ مندیون کی شورش بھی مفقود ہوجائے، اسے قلب مین ایسی کیفیت پیدا کر لینی چاہئے، کہ اسکے نزدیک کسی شے کا وجود وعدم دونو یکسان معلوم ہون، اسکے بعد اسے ایک گوشہ مین بیٹھنا چاہئے، اور اپنا مذہبی عمل صرف فرائض تک محدود رکھنا چاہئے، اسوقت اسے نہ تو قرآن مجید کی تلاوت کرنی چاہئے، نہ اسکے معانی ومطالب پر غور وفکر، نہ احادیث کا مطالعہ کرنا چاہئے، نہ اس قسم کی دوسری کتابون کا، اسے جائزہ لیتے رہنا چاہئے کہ اللہ جل شانہ کے سوا کوئی دوسری شے اسکے دماغ مین داخل نہو، اور ایک گوشہ عزلت مین بیٹھکر مسلسل "اللہ اللہ" کا ورد رکھنا چاہئے، خیال اسی پر جمع رہے، عاقبت الامر اسپر ایک ایسی کیفیت طاری ہوگی، جیسے اسکے زبان کی حرکت بند ہوگئی ہے، اور اسے معلوم ہوگا گویا یہ لفظ اسکی زبان سے بہ گیا اسے اسمین استقلال رکھنا چاہئے، یہانتک کہ کامل طور سے زبان کی حرکت مفقود ہوجائے، اسمین بھی اسے مستقل رہنا چاہئے، یہان تک کہ لفظ کی شکل، اسکے حروف

اور ہیئت قلب سے نکل جائین اور صرف ایک خیال رہجائے اسے ایسا معلوم ہونے لگے، جیسے اسکے قلب مین چھپا ہے، اور اس سے علیحدہ نہین ہو سکتا، اس قدر عمل رہرو طریق کے ارادہ اور مرضی پر موقوف ہے، اس کیفیت کا قایم رکھنا، اور اغوائے شیطانیہ کو مسترد کرنا، اسکے زیر تصرف ہوتا ہے لیکن رحم ایزدی کا ایصال اسکے ارادہ یا مرضی سے بالاتر ہے، اب اسے صرف ایک امیدوارانہ انتظار رکھنا چاہیئے، کہ خدا اسکے قلب مین کیا کشف کرتا ہے، جیسا کہ خدا نے اس طور سے انبیا اور اولیا کے ساتھ سلوک کیا ہے، اگر ایک رہرو طریقت مفصلہ بالا عمل پورا کرے تو اسے امیدوار رہنا چاہیئے کہ اسکے قلب مین لمعان حقیقت کی ضیا باریان ہونگی، پہلے پہل یہ نور حقیقت نا استوار ہوتا ہے، برق کی چمک کی طرح یہ پیدا ہو کر غائب ہو جاتا ہے، گو بعض اوقات یہ قیام پذیر بھی ہوتا ہے . . . . اور جب یہ واپس آتا ہے، تو اسکی واپسی کبھی دیرپا ہوتی ہے کبھی اگریز پا، جس طرح سے اولیاء اللہ کے عادات و خصائل مختلف ہین اسی طرح انکا حصول کمالات بھی مختلف ہوتا ہے۔

ڈاکٹر نکلسن نے بھی اس ضمن مین علامہ ہجویری کی کتاب "کشف المحجوب"، سے مفصلہ ذیل بحث اپنی کتاب صوفیائے اسلام مین نقل کی ہے، علامہ ہجویری کہتے ہین،

طریقت صوفیہ مین جب کوئی شخص داخل ہونا چاہتا ہے، تو شیوخ اسے تین سال تک تعلیم روحانی دیا کرتے ہین، اگر وہ انکے ارشادات تربیت پر کاربند ہوتا ہے، تو بہتر، ورنہ وہ سلسلہ طریقت مین نہین داخل کرتے پہلا سال مخلوق کی خدمت مین بسر ہوتا ہے، دوسرا سال عبادت الٰہی مین، اور تیسرا سال خود اپنے جائزہ قلب مین رہرو طریق اسوقت مخلوق کی خدمت کر سکتا ہے، جب وہ خود کو ایک خادم اور تمام خلایق کو مخدوم تصور کرے، اسے بلا استثنا یہ خیال رکھنا چاہیئے، کہ تمام افراد اس سے بہتر ہین، اور اسے اپنا فرض سمجھکر تمام لوگونکی یکسان خدمت کرنی چاہیئے، اور وہ خدا کی عبادت اسی وقت کر سکتا ہے، جب اسکے تمام اغراض خواہ وہ موجودہ زندگی سے متعلق ہون، یا آخرت سے، مٹ جائین اور اسے چاہیئے کہ خدا کی عبادت صرف خدا کیلئے کرے، یہ چونکہ جو شخص کسی شے کیلئے خدا کی عبادت کرتا ہے، وہ خود اپنی عبادت کرتا ہے، نہ کہ خدا کی کوئی شخص اپنے قلب کا جائزہ اسی وقت لے سکتا ہے، جب اسکے خیالات مجتمع ہون، اور تمام تردداث فنا ہو جائین، اسلیئے وہ اس قابل ہو جائے کہ قرب الٰہیہ مین اپنے قلب کو بے توجہی کی یورشون سے محفوظ رکھ سکے، جب مبتدی یہ صفات پیدا کر لیتا ہے، تو اسے حق ہے کہ نقال کی طرح نہین بلکہ ایک سچے صوفی کی طرح مرقع پہنے،

حضرت شبلیؒ اور جنید بغدادیؒ کا مکالمہ "صوفیائے اسلام" مین حضرت شبلی اور جنید بغدادی کا ایک مکالمہ بھی پایا جاتا ہے، حضرت شبلی، حضرت جنیدؒ کے پاس آئے، اور کہا کہ مینے سنا ہے کہ آپکے پاس علم الٰہی کی موتیان ہین، خواہ آپ مجھے عطا کیجئے یا فروخت کیجئے، حضرت جنید نے جواب دیا، کہ مین اسے فروخت نہین کر سکتا، چونکہ تمھارے پاس اسقدر متاع ہی نہین کہ قیمت ادا کر سکو اور اگر مین تمھین یونہین دیدون تو مفت کی چیز سمجھکر تم اسکی قدر نہ کروگے جاؤ میری ہی طرح اس بحر زخار مین سر کے بل شناوری کرو، یہانتک کہ تمھین صبر و استقامت کی مدت گزارنے کے بعد وہ موتی حاصل ہو جائے حضرت شبلی نے کہا تو مجھے کیا کرنا چاہیئے، کہا جاؤ ایک سال تک گندھک فروخت کرو ایک سال کے اختتام پر حضرت جنیدؒ نے کہا اس تجارت نے تمھین مشہور کر دیا ہے جاؤ اب درویشی اختیار کرو، اور صرف گداگری کرتے رہو، ایک سال تک حضرت شبلیؒ بغداد کی گلیون مین مارے مارے پھرتے رہے، راہگیرون سے بھیک مانگتے، لیکن انکی طرف

کوئی بھو نہوتا، اسکے بعد وہ اپنے مرشد حضرت جنید کے پاس آئے، وہ بول اوٹھے، اب دیکھو اہل دنیا کی نظر مین تمھاری کیا وقعت کیا ہے، تم اپنا دماغ انکی طرف متوجہ نہ کرو، اور نہ انکی باتو نکا کچھ خیال رکھو، تم چیمبر لین تھے، اور ایک عامل (گورنر) کی حیثیت سے صوبہ پر حکمرانی کی اس ملک مین جاؤ اور جن جن لوگون کے ساتھ تمنے خطا کی ہے، ان سے معافی چاہو، حضرت شبلیؒ نے چار برس تک دروازہ دروازہ جاکر سب سے معافی مانگی، صرف انھین ایک آدمی کا پتہ نہ معلوم نہ ہوسکا، مراجعت کی، تو حضرت جنید نے کہا، ابھی تک تمھارے دل مین شہرت وعزت کا خیال ہے، جاؤ، ایک سال تک بھیک مانگو، حضرت شبلیؒ تمام دن بھیک مانگتے، اور اسے اپنے مرشد کے پاس لاتے، وہ اسے فقرا اور مساکین مین تقسیم کردیتے، اور شبلی کو دوسری صبح تک بھوکا رکھتے، جب اسطرح ایک سال گزر گیا، تو حضرت جنید بغدادی نے انہین اپنا مرید بنایا اور یہ شرط کی کہ ایک خادم کی طرح انہین مخلوق کی خدمت انجام دینی ہوگی، ایک سال کی خدمت کے بعد حضرت جنیدؒ نے ان سے پوچھا، "اب تم خود کو کیا خیال کرتے ہو؟" شبلی نے جواب دیا "مین اب خدا کی تمام مخلوقات مین اپنے کو سب سے ذلیل سمجھتا ہون، مرشد نے کہا "اب تمھارا ایمان راسخ ہوگیا"

طریقت کے عملیات لازمہ صاحب کتاب اللمع لکھتے ہین کہ طریقت مین سات "مقامات" ہین، توبہ، پرہیز انقطاع، افلاس، صبر، توکل، قناعت یہ تو تصوف کے زاہدانہ اور اخلاقی تعلیم کے متعلق ہین "احوال" اسی طرح کا ایک نفسیاتی سلسلہ ہے، جس مین مراقبہ، قرب (الہی) عشق، خوف، امید، خواہش، رفاقت، اطمینان، تصور، اور یقین داخل ہین "مقامات" اور "احوال" مین یہ فرق ہے، کہ سابق الذکر کا حصول سعی انسانی پر موقوف ہے، اور آخر الذکر روحانی احساسات اور اخلاق ہین جن پر انسان متصرف نہین ہوسکتا انکا ورود قلب پر خدا کی طرف سے ہوتا ہے، جب انکا نزول ہوتا ہے، تو انسان انہین مسترد نہین کرسکتا، اور جب وہ جاتے ہین تو انسان انہین روک نہین سکتا، طریقت صوفیہ اسوقت ختم نہین ہوسکتی، جب تک ایک رہرو طریق ان تمام مقامات کو طے نہ کرلے، اور جب تک ہر مقام مین کامل نہو جائے، خدا بھی اسے اس دور مین لذت "احوال" سے علی قدر مراتب مستفیض کرتا ہے، ان تمام مراحل کے طے کرلینے کے بعد صوفی، حیات شاعری کی اس سطح عالی پر پہونچ جاتا ہے، جسے معرفت و حقیقت سے تعبیر کرتے ہین، جہان طالب ایک عارف کی شکل مین منتقل ہوتا ہے، اور اسے محسوس ہوتا ہے، کہ عرفان، عارف اور معروف (معلوم) ایک ہی شے کی مختلف تعبیرات مجازی ہین، (باقی)

سید عبد المالک آروی

تصویر زیب النسا بیگم

جو دربار عالمگیری کی ایک بے مثل مصورہ کے قلم کا رہے اور بعد تحقیق و تنقید بسیار اس کی صحت کی توثیق ہوچکی ہے یہ تصویر تین خوشنما رنگ سے طیار کی گئی ہے اور سنہ ۲۲ء کے نگار مین شایع ہوچکی ہے قیمت معہ محصول۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ (۸ر)

تصویر رقاصہ

بنگال کے مشہور نقاش و مصور فرمدار کی ایک بہترین تصویر جو حضرت نیاز کے مشہور مضمون رقاصہ کے گجراتی ترجمہ کے ساتھ کلکتہ کے مشہور گجراتی رسالہ نوجیتن مین شایع ہوئی تھی۔

قیمت (۴ر)۔

"مینیجر نگار"

لکھنؤ کے عہد شباب کی ایک شاعرہ

نواب بیگم حجاب

جن حضرات نے تاریخ اودھ کا مطالعہ کیا ہے، وہ اس حقیقت سے بے خبر نہ ہونگے کہ نواب شجاع الدولہ سے لیکر جانعالم واجد علی شاہ تک زمانہ کیسا رنگین و عیش کوش گزرا ہے

یون تو برہان الملک نواب سعادت علی خان ہی کے زمانہ سے صوبۂ اودھ پر سلطنت دہلی کا کوئی خاص اقتدار قایم نہ رہا تھا، لیکن شجاع الدولہ نے تو کھلم کھلا اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا اور وہ تمام آزادیان جو ایک مطلق العنان فرمانروا کی طرف سے ظاہر ہو سکتی ہین اوسکی طرف سے ظاہر ہونے لگین۔ اس مین شک نہین کہ شجاع الدولہ کا زمانہ بدامنی و برہمی کا زمانہ تھا اور کوئی صورت اطمینان و سکون کی ایسی ظاہر نہ ہوئی تھی کہ وہ پوری طرح داد عیش دیسکتا، لیکن اس اضطراب و بے چینی کے عالم مین بھی جب اس کو موقعہ ملا انھین چچکا اور اپنے بعد آنے والون کے لئے اس منزل کی راہ متعین کر گیا جس سے پورا لطف حاصل کرنا قدرت نے واجد علی شاہ کی قسمت مین لکھدیا تھا

بہرحال خدا معلوم سلطنت اودھ کی بنیاد کس ساعت مین ہوئی تھی کہ اس کا ایک فرمانروا بھی جذبۂ عشرت و نشاط سے معرا نظر نہین آتا اور جس وقت اسی سلسلہ مین ہم جانعالم واجد علی شاہ کے عہد پر پہونچتے ہین، تو وہ تمام کہانیان جو راجہ اندر سے منسوب کیجاتی ہین ایک تاریخی حقیقت ہو کر رہجاتی ہین

یہ مسئلہ حقایق مسلمہ سے ہے کہ فرمانروا کے ذوق و مشاغل کا اثر رعایا پر بہت پڑتا ہے، اس لئے اگر واجد علی شاہ کے عہد مین سارا لکھنؤ ایک بلدۂ شعر و موسیقی، اک شہر حسن و محبت نظر آتا تھا تو جائے حیرت نہین کیونکہ خود جانعالم کی زندگی کا کوئی لمحہ اس نشۂ جان بخش سے خالی نہ گزرتا تھا۔ یہی سبب ہے کہ اس عہد کی شاعری بھی اس سے پوری طرح متاثر ہوئی اور اس کا معیار جلوۂ کوہ طور سے اتر کر نظارۂ لب بام تک آگیا۔ اور بجائے کیفیات حقیقت خروش کے جذبات معصیت کوش نظر آتے لگے

واجد علی شاہ نہ صرف اچھے مغنی اور بے مثل رقاص تھے بلکہ قادر الکلام شاعر بھی تھے اور اپنے جذبات و خیالات کو بغیر کسی اخفا کے نظم کرنے مین قدرت کاملہ رکھتے تھے۔ انھون نے اپنے واقعات شباب و سرخوشی کو نہ صرف پوری عریانی کے ساتھ نظم کیا بلکہ انکی اشاعت بھی چاہی جس کو جرأت اخلاق بھی کہہ سکتے ہین اور بے غیرتی و بے حیائی بھی۔ بہرحال اُس وقت واجد علی شاہ نے ایک ایسی عجیب و غریب فضا لکھنؤ مین پیدا کر دی تھی جسے روما کے صنامی دور سے تشبیہ دی جاسکتی ہے اور کوئی گھر ایسا نہ تھا جو اس احساس سے خالی رہا ہو

که دور شاہ شجاع ست مے دلیر بنوش

گھر گھر مجالس لطف و نشاط کا قیام، گوشہ گوشہ مین رندان بادہ کوش کا اژدہام، ہر ہر بام سے حسن دلنواز کی جلوہ فروشی

اور ہر ہر گلی مین عشق کی تپش اندوزی ہر شام کو شب عیش کے اسباب کی فراہمی مین وہ افراط گویا صبح تک زندہ رہنا نہین اور ہر صبح آئندہ شام کے لئے وہ اہتمام کہ شاید کبھی مرنا نہین۔ گدا سے لیکر شاہ تک کی آنکھ مین سرسون پھولی ہوئی تھی اور جدہر دیکھئے قاقم و سنجاب کے پردون کے اوٹ مین ایرانی قالینون پر، حریری چادرون کے اندر حسن و شباب اس طرح مدہوش پڑے تھے، جیسے اس رات کی کبھی صبح ہونا ہی نہین ہے ظاہر ہے کہ جب سارا شہر اس رنگ مین رچا ہو تو ...... خود جان عالم نے حسن و شباب سے انتقام لینے کے لئے کیا کچھ نہ کیا ہوگا۔ اور اس کے ماحول مین جتنی بھی رنگینی رہی ہو کم ہے

جان عالم کے حریم خاص مین جن ناز نینان پری پیکر کا ہر وقت جمگھٹ رہتا تھا اُن مین سے ہر ایک بادشاہ کے ذوق کو پورا کرنے والی تھی اور یہی سبب ہے کہ ان مین مغنیہ اور شاعرہ اکثر تھین

بادشاہ کے محلون کے علاوہ شاہی خاندان کی خواتین اور امرازادیان بھی اس ذوق سے خالی نہ تھین اور انھین مین سے ایک شاہ غازی الدین حیدر کے وزیر نواب معتمد الدولہ بہادر کی پوتی اور داروغہ اعظم علیخان کی بیٹی تھی جس کا نام نواب بیگم عرفیت چھوٹی بیگم اور تخلص حجاب تھا

بعض تذکرہ نویسون نے جن مین سے ایک ہمارے عزیز دوست مولوی عبدالباری آسی بھی ہین لکھا ہے کہ یہ واجد علی شاہ کی بیوی تھی اور مٹیا برج ان کے ساتھ گئی تھی، حالانکہ یہ بالکل خلاف حقیقت ہے۔ نواب بیگم کا نہ واجد علی شاہ کے نکاح مین آنا تاریخ سے ثابت ہے اور نہ حرم مین داخل ہونا ظاہر ہوتا ہے - تذکرہ چمن انداز مین واجد علی شاہ کی ایک بیوی کا ذکر جس کا تخلص عالم تھا۔ حجاب کے تحت مین کر دیا ہے اور اس کے بعد ہی نواب بیگم حجاب کا ذکر ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ جناب آسی نے دونون حجاب کے واقعات و حالات کو ایک کر دیا اور اس طرح یہ غلطی پیدا ہوئی۔

نواب بیگم حجاب کا دیوان جس مین ۵۰ اغزلین معہ تین تضمینون اور دو چار قطعات و رباعیات کے پائی جاتی ہین ۱۲۹۰ھ مین مطبع حسینی اثنا عشری لکھنؤ مین "حسب ارشاد نواب مرزا علی امجد خان قیصر معروف بہ قیصر مرزا نبیرۂ نواب احمد علی خان خزانہ دار نواب آصف الدولہ طبع ہوا اور اس کا تاریخی نام تحریر عاشق رکھا گیا جس سے ۱۲۸۹ھ کے عدد نکلتے ہین - یعنی ۱۲۸۹ھ مین یہ دیوان مرتب ہوا اور ۱۲۹۰ھ مین چھپ کر طیار ہوا۔ چونکہ حجاب کی ولادت ۱۲۵۹ھ مین ہوئی تھی جیسا کہ اس کے تاریخ تولد اور سجع کے حسب ذیل شعر سے ظاہر ہوتا ہے

وقت نزول آیۂ تطہیر کھل گیا زہرا کو رب نے آج کیا اشرف النساء ۱۲۸۹ھ

اس لئے طبع دیوان کے وقت حجاب کی عمر ۳۰ سال کی ہوگی

حجاب کے دیوان مین ایک مخمس، واجد علی شاہ کی بیوی عالم کی غزل پر بھی پایا جاتا ہے اور شروع مین عالم کے بعد اعلی اللہ سلطنتہا کے الفاظ بھی درج ہین جس سے ثابت ہوتا ہے کہ نواب بیگم حجاب واجد علی شاہ کی بیوی نہ تھی ورنہ وہ اپنی سوکن کی غزل پر تضمین نہ لکھتی اور لکھتی بھی تو مساوی درجہ رکھنے کی حیثیت سے اعلی اللہ سلطنتہا کے الفاظ کا اضافہ نہ کرتی

حجاب کا یہ دیوان اب کمیاب ہے اور بالکل اتفاق سے ہات آگیا ہے اس لئے مناسب سمجھتا ہون کہ اسکا مختصر سا انتخاب

یہان دیدیا جائے۔

حجاب کا رنگ شاعری وہی ہے جو اُس زمانہ مین ہر جگہ نظر آتا تھا، لیکن بعض بعض اشعار خوب ہین۔ حجاب خود شاعر تھی اس کے ثبوت مین صرف ایک غزل پیش کرنا کافی ہے جو شروع سے اخیر تک نسائی لب ولہجہ اور نسائی جذبات سے معمور ہے۔ وہ غزل یہ ہے

خفا ابھی سے نہ ہو مدعا سنو تو سہی — قبول کرنا نہ کرنا بھلا سنو تو سہی
رقیبون کی تو شب روز سنتے ہو باتین — ہماری بھی کبھی اے مہ لقا سنو تو سہی
نہین یہ خوب کہ سنتے نہین کسی کی تم — یہ دیکھو تو کہ مین کہتا ہون کیا سنو تو سہی
خطا تو میری بتاؤ جو روٹھے جاتے ہو — بگڑتے کس لئے ہو کیا ہوا سنو تو سہی
جواب دو کہ نہ دو اے بتو نہین پروا — کہون جو کچھ وہ برائے خدا سنو تو سہی
نہ رحم آئے جو تم کو تو میری قسمت ہے — تم اپنے دل سے میری التجا سنو تو سہی
معاف کرنے کو کہتا نہین مین صاحب سے — یہ چاہتا ہون کہ عذر خطا سنو تو سہی

حجاب کو تو زمانہ مین جانتے ہین سب
مگر جو کہتے ہین تمکو ذرا سنو تو سہی

بعض بعض شعر لکھنوی رنگ سے ہٹکر کہے گئے ہین اور خوب ہین مثلاً

آگے سے بھی ہو زیادہ بیقراری اندنون — شکل پہچانی نہین جاتی ہماری اندنون

جو اس نے کہا گو وہی کرتے گئے ہمتو — اسپر بھی نگاہون سے اترتے گئے ہمتو
وہ خُلق سے پیش آئے یہ تھی ان کی عنایت — گردن کو جھکائے ہوئے ڈرتے گئے ہمتو

خود کبھی پوچھین وہ احوال یہ عادت ہی نہین — ہم جو کچھ آپ سے کہتے ہین گلا ہوتا ہے

خط دلدار کے آنے سے کبھو تکر دل مرا ٹھیرے — خدا جانے کہ پھر وقت ملاقات اس سے کیا ٹھیرے
رہے بتخانہ مین برسون نہ کعبہ مین ذرا ٹھیرے — غرض تھی دل کے بہلانے سے جب جا دل لگا ٹھیرے

کہین گے اس کو نہ اچھا برا حجاب کبھی — بیان کرینگے کسی سے نہ اپنے یار کا حال

بعض اشعار اور قابل داد ہین مثلاً

مین نے تو کوئی بات نہین ایسی کہی تھی
غیرون سے بھرا تھا کہ جو وہ بندہ پہ برسا

تم سے بتلائین کیا کہ فرقت مین
صدمے دل پر گزرتے ہین کیا کیا
بُت کو خوفِ خدا حجاب نہین
ہم صنم سے بھی ڈرتے ہین کیا کیا

اے حجاب آج تو سوتا ہے وہ غافل کیسا
بخت جاگے ہین ذرا یار کو دیکھا ہوتا

دامن محبوب تک پہونچا نہ جب دست جنون
بڑھ گیا ناچار اپنے ہی گریبان کی طرف

مہینون ہو گئے صاحب کہانتک آزماؤ گے
گلے لگ جاؤ کیا ہر روز کا جھگڑا لگا ہے

گل پھولے ہین اس شوخ نے مہندی جو ملی ہے
جو پور ہے انگلی مین وہ لالہ کی کلی ہے

اس زمین کا یہ شعر خصوصیت کے ساتھ قابل تحسین ہے:۔

کچھ خوف خدا کیجئے اس طرح نہ چلئے
سو بار تو اس چال پہ تلوار چلی ہے

تذکرون مین اس کا صرف ایک یہ شعر نظر آتا ہے:۔

بنکے تصویر حجاب اس کو سراپا دیکھو
منہ سے بولو نہ کچھ آنکھون سے تماشہ دیکھو

نیاز

شہاب کی سرگزشت

جناب نیاز فتحپوری کا وہ معرکۃ الآرا افسانہ جو سیرۃ نگاری، نفسیاتی تحلیل، بلندی خیال، زور تحریر، ندرت بیان، نزاکت تخیل اور قوت انشاء کے لحاظ سے اردو مین ایک بالکل نئی اور نادر چیز ہے! اول بار اسکا مطالعہ انسان کو کچھ سوچنے پر مجبور کرتا ہے، دوسری بار اسکا مطالعہ حقیقت سے قریب کر دیتا ہے اور تیسری مرتبہ کے مطالعہ کے بعد انسان اُسکے لذت مین بالکل غرق ہو جاتا ہے۔ اگر پسند نہ ہو تو مطالعہ کے بعد واپس کر دیجئے اور اپنی قیمت لے لیجئے۔ مع محصول ڈاک (عمہ) مین ملیگا۔ "مینیجر نگار" لکھنؤ

حکومت برطانیہ کی وسعت کار راز

اور

قبضۂ ہندوستان کی دلچسپ داستان

(بہ سلسلہ ماسبق)

ہم ہندوستان پر کس طرح حکومت کرتے ہین

مین نے اس تعلق کی نوعیت پر جو ہندوستان کو انگلینڈ کے ساتھ حاصل ہے غور کیا ہے اور یہ ظاہر کر چکا ہون کہ کیونکر بغیر معجزہ کے ایسا تعلق پیدا ہونا ممکن تھا۔ اب ہم ایک قدم اور آگے بڑھتے ہین اور اس مسئلہ پر غور کرتے ہین کہ آیا یہ تعلق اسی طرح قائم رہیگا یا یہ کہ ہندوستان مین انگریزون کی حکومت کو ہم ایک سیاسی شعبدہ سمجھین جو اپنے زمانۂ قیام تک تو ہمارے لئے موجب حیرت ضرور ہے لیکن اسکا قیام پائدار نہین۔ سب سے بڑی دشواری ہندوستانی معاملات کے مطالعہ مین ایک طالب علم کو یہ پیش آتی ہے کہ وہ اس قدر عجیب اتنے بعید اور ایسے وسیع واقعات کے چکا چوند کر دینے والے اثر سے متاثر ہو کر یہ سمجھنے لگتا ہے کہ ہندوستان مین معمولی اسباب کی بنا پر واقعات کا رونما ہونا ممکن ہی نہین ہے، بلکہ اس خطہ مین جو کچھ ہے سراسر معجزہ ہے۔ تاریخ نویسی کا ادیبانہ انداز تحریر اس فریب کو اور مزید تقویت پہونچاتا ہے کیونکہ سلطنت ہند کے حیرت انگیز اور عجیب خط وخال کی نمائش کا شوق مورخین کو بہت زیادہ ہوتا ہے جس سے نتائج تک پہونچنا اور زیادہ دشوار ہو جاتا ہے۔

چنانچہ اسی مغالطہ کی بنا پر ہم خیال کرنے لگے ہین کہ ہندوستان پر ہمارا تسلط عام قواعد سے مستثنیٰ بالکل ایک سیاسی معجزہ ہے جس کا فخر انگریزی قوم کی دلیرانہ خصوصیات اور اسکی فطری قابلیت حکمرانی کو حاصل ہوتا ہے۔ جب تک ہمارا خیال یہ رہیگا ہم اسکے قیام کی مدت کے متعلق کوئی رائے قائم کرنے سے قاصر رہین گے۔ جو چیز ابتدا مین معجزہ تھی یقیناً آخر تک معجزہ رہیگی۔ اگر عام اصول اس معاملہ مین معطل تھے تو کون کہہ سکتا ہے یہ تعطل کب تک باقی رہیگا۔ مین نے سلطنت کے آغاز پر متانت کیساتھ غور کرنیکی کوشش کی ہے۔ مین نے فتح ہندوستان کے مسئلہ پر بہت غور کیا ہے، اور اس مین شک نہین کہ فتح اس معنی مین ضرور حیرت انگیز تھی کہ ہمارا تجربہ ایسی کوئی بڑی نظیر پیش نہین کرتا۔ کیونکہ ایشیائی سوسائٹی کا انقلاب قدرتاً یورپ سے مختلف ہوتا ہے۔ لیکن اس معنی مین ہرگز حیرت انگیز نہین ہے کہ اسکے اسباب ناقابل فہم ہین یا انکا پتہ لگانا مشکل ہے۔ اب مین دریافت کرونگا کہ ہندوستان مین ہماری سلطنت آیا اس معنی مین حیرت انگیز ہے یا نہین

اگر ہم یہ تصور کرلین کہ ہندوستان محض ایک مفتوح ملک ہے اور انگریز اسکے فاتح ہین تو بظاہر یہ خیال صحیح معلوم ہوگا۔ مگر کون نہین جانتا کہ ایک مفتوح قوم کے جذبۂ بے اطمینانی کو دبانا کس قدر دشوار ہوتا ہے۔ اگرچہ فاتح قوم کی فوج بلحاظ تعداد وعمدگی مفتوح قوم سے بہتر ہی کیون نہ ہو لیکن نتیجہ کے لحاظ سے بارہا اس کو ناکامی ہوئی ہے اہل اسپین بڑے بہادر سپاہی تھے اور حکومت اسپین اُس وقت کی ساری

عیسائی سلطنتوں سے زبردست تھی تاہم ([illegible]) مین ناکامی رہی - اس کی وجہ یہی ہے کہ جب قومیت کا جذبہ یا غیر مذہب ہونے کا احساس کسی قوم کے تمام افراد مین ساری ہو جاتا ہے اور صرف لڑنے والے افراد تک محدود نہین رہتا تو شجاعت اور عسکریت دونون سے کہین زیادہ کارآمد ثابت ہوتا ہے، آیئے اب ہم ہندوستان کی حالت کا اٹلی سے مقابلہ کرین جس جگہ یورپ کے نقشہ مین اٹلی واقع ہے، اُسی جگہ ایشیا کے نقشہ مین ہندوستان پایا جاتا ہے یہ بھی ہندوستان ہی کی طرح براعظم کے جنوب مین ایک جزیرہ نما ہے جس کے اوپر سر بفلک پہاڑون کا سلسلہ ہے اور نیچے مغرب سے مشرق کی جانب ایک بحر ذخار موجین لیتا ہے - حالات کے لحاظ سے یہ اور بھی ہندوستان سے مشابہ ہے کیونکہ یہ بھی صدیون تک غیر ملکی حملہ آورون کا شکار بنا رہا - ابھی زیادہ زمانہ نہین گزرا کہ اٹلی اسٹریا کے زیر حکومت تھا - اس کے باشندے اور فوجین اسٹریا سے بہت ہی کم جنگجو اور تربیت یافتہ تھین - حالانکہ آسٹریا بالکل ملحق ہے - اگرچہ اٹلی کا پلہ لڑائی مین ہمیشہ ہلکا رہتا تھا پھر بھی آج وہ آزاد ہے - اٹلی لڑائیون مین عموماً شکست ہی کھایا کرتا تھا لیکن قومیت کا جذبہ ملک کے اندر اتنا زبردست تھا اور اسکی وجہ سے غیرون کی اتنی قوی ہمدردی اُسکے ساتھ تھی کہ آخر الامر وہ کامیاب رہا اور اجنبیون نے اسکو اپنے حال پر چھوڑ دیا - ہر نقطہ نظر سے ہندوستان کا محل وقوع اُسکے لئے اٹلی سے زیادہ مفید ہے - اسکی آبادی انگلینڈ سے تقریباً ۸ گنا زیادہ ہے، وہ کرۂ زمین کے دوسرے سرے پر واقع ہے - علاوہ ازین انگلینڈ کوئی فوجی سلطنت ہونیکی مدعی نہین ہے، باوجود اس کے ہندوستان اُسکی غلامی کا جوا اپنے کندھے پر رکھے ہوئے ہے - ہم وہان پر بغاوت کی کوئی خبر نہین سنتے - سلطنت ہند کے انتظام مین ہمکو دقتین پیش آتی ہین لیکن خاصکر مالی یا اقتصادی وقت جو اسٹریا کو اٹلی مین پیش آئی ہمارے سامنے نہین ہے یعنی ہمکو ایک مفتوح قوم کے جذبہ مخالف کو دبانا نہین ہے - واقعی کیا یہ ایک معجزہ نہین ہے! کیا اس معاملہ مین عام اصول بالکل بے اثر نہین معلوم ہوتے - یا اس سے ہم یہ سمجھین کہ یا تو ہندوستانیون کی اطاعت شعاری کی انتہا نہین ہے یا پھر انگریزون کی قابلیت حکمرانی کی -

اصل سوال یہ ہے کہ ہندوستانی مین قومیت ہے یا نہین اور یہ کہ اس قومیت کو انگلینڈ نے مفتوح کر لیا ہے یا نہین - سوال کے جزو اول کا جواب اثبات مین دینا سخت غلطی ہے، ہم یورپ کے باشندے دیکھتے ہین کہ یورپ کا نقشہ مختلف ملکون مین تقسیم ہے - ہر ملک کی ایک خاص قومیت اور ایک خاص زبان ہے - چونکہ ہم ان باتون کے خوگر ہین اسوجہ سے ایسی زبردست غلط فہمی مین مبتلا ہین - ہمارا خیال ہے کہ ہر ملک خواہ وہ یورپ کے اندر ہو یا باہر اگر اسکا کوئی نام ہے تو ضرور اپنی قومیت رکھتا ہوگا - لیکن اسی کے ساتھ ہم قومیت کا صحیح مفہوم سمجھنے اور اُسکی تعریف بیان کرنیکی زحمت نہین گوارا کرتے جس طرح ہم یہ کہکر اپنی تشفی کر لیتے ہین کہ اہل انگلینڈ فرانسیسیون کی محکومی سے اور اہل فرانس جرمنون کی محکومی سے کبھی خوش نہین ہو سکتے اُسی طرح ہمارا یہ خیال ہے کہ ہندوستانی انگریزون کی محکومی کو سخت ذلت محسوس کرتے ہونگے لیکن یہ داستان نہین ہے بلکہ بدیہی امر ہے کہ ہر آبادی کی ایک قومیت نہین ہوتی، انگریز اور فرانسیسی محض ایک آبادی سے عبارت نہین ہین بلکہ خاص طریقہ اور خاص قوتون سے متحد ہین - اس لئے دیکھنا چاہئے کہ وہی قوت ہندوستانی آبادی مین بھی کارفرما ہے یا نہین پہلی قوت متحد النسل ہونا ہے جب نسلی اتحاد وسیع پیمانہ پر ہوتا ہے تو لسانی اتحاد پیدا ہوتا ہے - انگریزون سے مراد وہ قوم ہے جو انگریزی زبان بولتی ہے اور فرانسیسیون سے وہ جو فرانسیسی زبان بولتی ہے - کیا ہندوستان کے باشندے بھی ایک زبان بولتے ہین! اسکا جواب نفی مین ہے -

جس طرح یورپ کے تمام باشندے ایک زبان نہیں بولتے اسی طرح ہندوستان کے باشندے بھی ایک زبان نہیں بولتے۔ علمائے علم السنہ نے سنسکرت اور دیگر زبانوں کے ساتھ اُسکے قریبی تعلق کے بارہ مین بہت زور تحریر دکھلایا ہے لیکن مین یہ کہے بغیر نہین رہ سکتا کہ لسانی اتحاد کیلئے جو شرط سب سے مقدم ہے وہ زبانون کا قابل فہم ہونا ہے نہ کہ انکا باہمی پوشیدہ تعلق۔ چنانچہ اہل اٹلی اسٹریا والون کو اجنبی ہی سمجھتے تھے کیونکہ وہ جرمن زبان نہین سمجھ سکتے تھے انکو اس سے کوئی بحث نہین تھی کہ جرمن اور اطالوی زبانین انڈو یورپین زبانین ہین جس طرح یورپ کی مختلف زبانون مین قریبی تعلق ہے اُسی طرح ہندوستان کی متعدد زبانون مین بھی ہے۔ ہندی زبانون کو یورپ کی (Romance) زبانون سے تشبیہ دیجا سکتی ہے کیونکہ یہ زبانین ایک ہی اصل سے نکلی ہین۔ لیکن بنگالی مرہٹی اور گجراتی زبانون کا قریبی تعلق اُنکے بولنے والون کو ایک قوم نہین بنا سکتا۔ "ہندوستانی" زبان مسلمانو کی فتح کی وجہ سے پیدا ہوئی۔ مسلمان حملہ آورون کی فارسی زبان ہندوستانیون کی ہندی زبان سے گڈ مڈ ہوکر ایک نئی زبان ہندوستانی پیدا ہوگئی۔ لیکن جنوب مین ہم ایسا لسانی اختلاف پاتے ہین جسکی مثال یورپ مین بھی نہین ملتی۔ کیونکہ وہان کی بڑی بڑی زبانین تامل تیلگو کناری انڈو۔ یورپین (Indo - European) زبانین نہین ہین۔ اور اُنکے بولنے والون کی تعداد یورپ کی اُن اقوام سے بہت زیادہ ہے جو انڈو یورپین زبانین نہین بولتی ہین

صرف یہی اس بات کی کافی وجہ ہے کہ ہندوستان کو فرانس یا انگلینڈ کی طرح نہین شمار کرنا چاہیے کیونکہ یہ دو قومیتون کے نام ہین۔ ہندوستان کی مثال یورپ سے دیجا سکتی ہے جسکے اندر بہت سی قومین آباد ہین اگرچہ کسی طبعی تقسیم سے ان قومیتون کا ایک مشترک نام پڑ گیا ہے۔ یورپ کی طرح یہ بھی ایک جغرافی اصطلاح ہے لیکن کبھی اس مفہوم مین اسکا استعمال نہین ہوا ہے۔ یورپ کا لفظ اس معنی مین ہیروڈوٹس (Herodotus) کے زمانہ سے مستعمل ہوتا آرہا ہے لیکن ہندوستان سے جو مفہوم ہم اس وقت سمجھتے ہین بہت قدیم نہین ہے چونکہ سارا ملک کوہ ہمالیہ اور کوہ سلیمان کے سلسلون سے بقیہ ایشیا سے علیحدہ ہے اسلئے قدرتی طور پر یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس کا ایک نام ہو۔ لیکن ہمیشہ سے یہی خیال نہین رہا ہے۔ چنانچہ یونانیون کا اس ملک کے متعلق بہت مبہم خیال تھا، وہ عرصہ تک یہی سمجھتے تھے کہ انڈیا سے صرف انڈس (Indus) کا صوبہ مراد ہے کیونکہ وہ اسی سے مشتق ہے۔ جب وہ کہتے ہین کہ سکندر نے ہندوستان پر حملہ کیا تو اس سے انکی مراد صوبہ پنجاب سے ہوتی ہے۔ کچھ زمانہ کے بعد اُنکو گنگا کے دوآبہ کے حالات معلوم ہوے لیکن دکن کے متعلق انکو کچھ علم نہ تھا۔ خود ہندوستانیون کو سارے ملک کے لئے ایک نام استعمال کرنا اتنا قدرتی نہین معلوم ہوتا جتنا ہمکو کیونکہ اسکے شمالی اور جنوبی حصون مین بہت نمایان فرق ہے۔ آرین قوم جو سنسکرت بولتی تھی اور جسنے برہمنیت کی بنیاد ڈالی خاص کر پنجاب مین وہ گنگا کی وادی مین آباد ہوی ابتداءً زیادہ جنوب کی سمت نہین پھیلی۔ اسلئے لفظ ہندوستان صحیح طور سے اُسی شمالی خطہ کا نام ہے۔ جنوب مین یعنی جزیرہ نمائے ہند مین دوسری قومین آباد ہین جنکی زبان غیر آرین ہے (اگرچہ اب برہمنیت وہان بھی پھیل گئی ہے) سلطنت مغلیہ اپنے عروج کے زمانہ مین بھی اس خطہ مین زیادہ دور تک نہین پھیل سکی تھی

اس سے معلوم ہوا کہ ہندوستان کوئی سیاسی نام نہین بلکہ یورپ یا افریقہ کی طرح ایک جغرافی اصطلاح ہے اُسے کسی خاص قوم اور زبان کا ملک نہین سمجھا جاتا بلکہ بہت سی قومون اور زبانون کا۔ یہ ہے اساسی فرق ہندوستان اور دوسرے ممالک مین

قومیت ایک سے زیادہ عناصر سے مرکب ہوتی ہے جس کا ایک عنصر ہم خون ہونے کا احساس ہے اور دوسرا عنصر اشتراک مفاد کا احساس اور ایک سیاسی جمعیت قائم کرنیکی صلاحیت ہے۔ یہ عنصر اگرچہ ہندوستان مین کلیۃً مفقود نہین تھا لیکن کمزور ضرور تھا۔ ملک کے طول وعرض کو دیکھکر اس عنصر کا موجود ہونا ناممکن معلوم ہوتا ہے لیکن وہ حد فاصل جو ہندوستان کو باقی دنیا سے علٰحدہ کرتی ہے اتنی مضبوط ہے کہ باوجود داخلی تقسیم کے اُسکے ایک کُل، ہونے کا مفہوم بہت قدیم سے چلا آرہا ہے۔ محمود غزنی سے پہلے کی جو تاریخ ہے اسمین اکثر لکھا ہے کہ فلان بادشاہ سارے ہندوستان کا مالک تھا، فلان بادشاہ کے قبضہ مین کل ہندوستان تھا، اس کے اسلامی حکومت کے دور اول مین اور سلطنت مغلیہ کے عہد میں سارے ہندوستان کا قبضہ تسلیم کیا جاتا تھا، حالانکہ سلطنت مغلیہ کی وسعت کے متعلق بھی یہ خیال مبالغہ سے تہین چہ جائیکہ اس کے پیشتر، غور کرو کہ سلطنت مغلیہ کی مدت کتنی مختصر تھی، اسکی ابتدا ۱۵۲۴ء سے قبل نہین کہی جاسکتی، یہ وہ سنہ ہے جب بابر نے لاہور پر قبضہ کیا۔ بالفاظ دیگر سلطنت مغلیہ کی ابتدا ہنری ہشتم کے عہد حکومت سے ہوی۔ واسکوڈی گاما نے جب ہندوستان مین قدم رکھا سلطنت مغلیہ کا وجود بھی نہین تھا۔ اور اُسکے اندر نمایان اور سریع انحطاط ۱۷۰۷؁ یعنی ملکہ آینی کے عہد سے شروع ہو گیا تھا۔ ان دونون تاریخون مین دو صدی سے بھی کم کا زمانہ ہوتا ہے پھر یہ بھی قابل غور ہے کہ ہندوستان مین بابر کے داخل ہوتے ہی سلطنت مغلیہ نہین شروع ہو گئی۔ بلکہ اسوقت جب مغلون کے حدود سلطنت مین ترقی ہوئی ۱۵۵۹؁ء مین جب اکبر تخت نشین ہوا یعنی ملکہ الزبتھ کی تخت نشینی کے دوسرے سال سلطنت مغلیہ کے اندر صرف پنجاب، دہلی اور آگرہ کے صوبے تھے۔ اکبر ۱۵۷۶؁ سے قبل بنگال نہین فتح کر سکا سندہ اور گجرات کے صوبے ۱۵۹۱؁ اور ۱۵۹۲؁ کے درمیان فتح ہوے، اسوقت البتہ اکبر کی سلطنت وسیع پیمانہ پر تھی اگر ہم بجاے ۱۵۲۴؁ کے ۱۵۹۴؁ کو سلطنت مغلیہ کے آغاز کی تاریخ قرار دین تو اسکی مدت ایک صدی سے کچھ ہی زیادہ ہوتی ہے

اب پھر یہ امر قابل غور ہے کہ اس عروج کے زمانہ مین بھی سلطنت مغلیہ کے اندر ہندوستان کے تمام علاقے نہین شامل تھے، اگر ہم اسکے برعکس خیال کرتے ہین تو ہندوستان اور انڈیا (ملاحظہ ۱) کے دو الگ الگ مفہوم خلط ملط ہو جاتے ہین ۱۵۹۵؁ء مین اکبر کی سلطنت دریاے نربدا تک پہونچی تھی یعنی اس نے ابھی دکن مین قدم نہین رکھا تھا۔ اسلئے وہ ہندوستان کا شہنشاہ تھا انڈیا کا نہین اکبر نے اپنی حکومت کے آخری سالون مین دکن پر حملہ کیا، اس زمانہ سے نصف جنوبی ہند مین مغلون کی چالبازیان شروع ہوئین۔ لیکن اورنگ زیب کی مہم دکن سے قبل (۱۶۸۳؁) یہ کہنا کہ دکن فتح ہو چکا تھا کسی طرح درست نہین ہے۔ اس وقت سے البتہ ہم کہہ سکتے ہین کہ دکن سلطنت مغلیہ مین داخل تھا یعنی کل ہندوستان صحیح معنون مین ایک حکومت کے ماتحت تھا ہرچند دکن کی فتح محض براے نام تھی کیونکہ مرہٹے برابر زور پکڑتے جارہے تھے۔ فتح دکن کے بعد سلطنت کی حیات صرف چند ساعت کی تھی مغلون نے اس توسیع کے بدلے اپنی ساری سلطنت کی تباہی مول لی صرف ۲۴ سال کے اندر اسکا زوال نمایان ہونے لگا اور جیسا کہ میرا خیال ہے یہ تباہی اسی اولوالعزمانہ مہم کا نتیجہ تھی سلطنت مغلیہ کو ہمیشہ ایک استوار بنیاد اور قومی مرکز کی ضرورت تھی، اُسکے قوٰی کے اضمحلال کی وجہ اسکی توسیع کی احمقانہ کوشش تھی

مختصر یہ کہ انڈیا سواے انگریزون کے کسی کے زمانہ مین ایک حکومت کے ماتحت نہین تھا۔ اور انگریزون نے بھی یہ کام لارڈ ڈلہوزی کی گورنر جنرلی سے قبل تک جسکو ۸۰ سال ہوے، مکمل نہین کیا تھا۔ اسلئے کہ لارڈ موصوف ہی کے عہد مین پنجاب، اودھ اور ناگپور کے صوبے برٹش گورنمنٹ سے ملحق ہوے

قومیت کا دوسرا امتیاز عنصر اتحاد مذہب ہے۔ یہ عنصر یقیناً ہندوستان مین کلیۃً مفقود نہین ہے برہمنیت (ہندو مذہب) سارے ہندوستان مین پھیلی ہوی ہے لیکن یہان صرف یہی ایک مذہب نہین ہے۔ ہندوستان مین ۵ کروڑ سے کم مسلمان نہین ہین، یہ تعداد حکومت ترکی کے مسلمانون سے بھی زیادہ ہے۔ کچھ سکھ مذہب کے لوگ ہین یہ مذہب ہندویت اور اسلام کی آمیزش سے پیدا ہوا ہے! تھوڑے سے عیسائی بھی آباد ہین۔ سیلون اور نیپال مین بودھ مت کے لوگ ہین لیکن برہمنیت غالب آبادی کا مذہب ہے۔ اسکی بنیاد نہایت مضبوط ہے کیونکہ متعدد بار اسکو خطرناک حملون کا مقابلہ کرنا پڑا ہے۔ دنیا کے تبلیغی مذاہب مین بودھ مذہب کا بڑا درجہ ہے۔ یہ ہندوستان ہی مین پیدا ہوا لیکن دور دور تک پھیلا۔ ہمارے پاس اسکا ثبوت موجود ہے کہ چوتھی صدی قبل مسیح مین یہ مذہب ہندوستان مین بڑے عروج پر تھا اور یہ عروج ساتوین صدی عیسوی تک باقی رہا لیکن برہمنیت نے اسکو مغلوب کر لیا اور آج یہ مذہب ایشیا کے باقی حصون مین بہ نسبت اس ملک کے کہین زیادہ سرسبز ہے جسنے اسکو پیدا کیا تھا۔ اسکے بعد برہمنیت کو ایک دوسرے طاقتور اور جابر مذہب سے مقابلہ کرنا پڑا جسکے آگے زردتشت نے سپر ڈالدی اور جسکے مقابل مشرق مین عیسائیت کو چند قدم پیچھے ہٹنا پڑا۔ یہ مذہب اسلام تھا۔ اس موقع پر بھی برہمنیت اپنی جگہ قائم رہی اسلامی حکومت سارے ہندوستان مین پھیل گئی لیکن یہان کے باشندون کو مسلمان نہ بنا سکی

اب میرے خیال مین مذہب ہی سب سے قوی اور اہم عنصر قومیت کی تشکیل مین ہے۔ اور یہ عنصر ہندوستان مین موجود ہے جب کہا جاتا ہے کہ ہندوستان بمقابلہ فرانس یا انگلینڈ یورپ سے زیادہ مشابہ ہے تو ہمکو فراموش نہین کرنا چاہئے کہ یورپ بلحاظ عیسائی مذہب ہونے کے اپنے اندر ہمیشہ سے ایک قسم کا اتحاد رکھتا آیا ہے۔ جو خطرہ کے وقت فوراً اور واضح طور پر رونما ہوگیا۔ چنانچہ قرون وسطی مین جب یورپ کو ایک خونخوار اور لامذہب دشمن کا خطرہ لاحق رہتا تھا اس اتحاد کا اظہار ہو جایا کرتا تھا۔ اس سے یہ ثابت ہو سکتا ہے کہ برہمنیت مین ایسے جراثیم ہین جن سے جلد یا بدیر قومیت پیدا ہو سکتی ہے شاید ایسا ہو لیکن اس صورت مین تو اس قومیت کو بہت پہلے پیدا ہو جانا چاہئے تھا۔ کیونکہ اسلامی حملون کے اندر جو پیہم صدیون تک جاری رہے، ان جراثیم کی نشو ونما کے لئے کافی مواد تھا۔ اسلام کے مقابلہ مین برہمنیت کیون اپنی جگہ قائم رہی کیون متحد نہین ہوی؟ اسلئے کہ اُسنے کبھی اِسکی اہمیت نہین دکھلائی اور نہ کبھی ایسا کیا۔ برہمنیت کو ہندوستان مین فروغ ہو چکا ہے۔ سیواجی سترھوین صدی کے وسط مین پیدا ہوا۔ وہ ایک سردار تھا، اُسنے بمبئی کے عقب مین دو ایک پہاڑی قلعون پر قبضہ کرکے مرہٹہ سلطنت قائم کر لی۔ یہ ایک خالص ہندو تحریک تھی اور جون جون اسکی قوت بڑھتی گئی اسمین برہمنون کا اثر و نفوذ ترقی کرتا گیا۔ سلطنت مغلیہ کے زوال سے اس جمعیت کو بڑی قوت پہونچتی گئی یہان تک کہ اٹھارھوین صدی کے وسط مین اسنے قریب قریب سارے ہندوستان کو ڈھک لیا اس سے اندازہ ہو سکتا تھا کہ اس جمعیت کے اندر وہ تخم موجود ہے جس سے ہندوستانی قومیت کا پودا اُگے گا اور برہمنیت ہندؤن کیلئے وہ کام کریگی جو دوسرے مذاہب نے اپنے پیرؤن کیلئے کی ہے۔ لیکن یہ کچھ نہوا اور اسنے حب الوطنی کا جذبہ تک نہ پیدا کیا اس کا سبب یہ ہے کہ بوجہ جامعیت کے کمزور ہونیکے برہمنیت دراصل مذہب نہین ہے بلکہ کئی مذاہب کے درمیان ایک ضعیف سی مفاہمت ہے اور یہی وجہ ہے کہ اُسکے اندر اجتماعی اصول کمزور ہے۔ بہرکیف مرہٹون کی تحریک مین کوئی ایسی خصوصیت نہین تھی جسکی وجہ سے ہم اسے ایک ملی اور قومی تحریک کہہ سکین۔ یہ شروع سے آخر تک غارت گری اور لوٹ مار تھی

الغرض ہندوستان میں قومیت نہیں ہے اگرچہ اسکے اندر ایسے جراثیم موجود ہیں جنسے ہندوستانی قومیت پیدا ہو سکتی ہے۔ یہی ہے وہ حقیقی سبب جسکے باعث ہندوستان میں ہماری سلطنت قائم ہے ورنہ انگریزی قوم کو کوئی ایسی اعلیٰ فوقیت حاصل نہیں ہے۔ اگر ہندوستان میں اٹلی کی طرح قومی تحریک پیدا ہو جائے تو انگریزی حکومت اسکا آنا بھی مقابلہ نہ کر سکے جتنا آسٹریا نے اٹلی میں کیا تھا۔ بلکہ فوراً اس کے سامنے فنا ہو جائے، کیونکہ انگلینڈ کے پاس، جو فوجی سلطنت بھی نہیں ہے، کون ایسا سامان ہے جس سے ۲۰ کروڑ رعایا کی بغاوت کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔ کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ جس طرح ہمنے انکو پہلے فتح کیا تھا اُسی طرح پھر فتح کر لیں گے۔ لیکن میں بیان کر چکا ہوں کہ تم نے انکو فتح نہیں کیا ہے میں بتلا چکا ہوں کہ جس فوج نے انکو مفتوح کیا اسکا ۴/۵ حصہ دیسی سپاہ پر مشتمل تھا۔ چونکہ ہندوستان میں قومیت نہیں تھی اسلئے ہمکو کرایہ پر سپاہی وہاں دستیاب ہو گئے۔ اب اگر قومیت کا کمزور جذبہ بھی پیدا ہو جائے اور اگرچہ اُنکے اندر اجنبیوں کو ملک سے نکال باہر کرنے کی پُرزور خواہش نہ بھی پیدا ہو جائے تو بھی تمام رعایا کے دل میں یہ خیال پیدا ہونا ناگزیر ہے کہ اپنے ملک پر حکومت کرنے میں غیروں کی امداد کرنا نہایت شرمناک ہے۔ جونہی یہ خیال پیدا ہوا ہماری حکومت کا خاتمہ ہے۔ کیونکہ وہ فوج جو ہمکی پشت پناہ ہے ۴/۵ دیسی سپاہ پر مشتمل ہے تم سوچو اگر حکومت آسٹریا اٹلی پر، اطالوی فوج کی مدد سے قابض ہوتی تو اہل اٹلی کیلئے اسکو اپنے ملک سے خارج کر دینا کتنا آسان ہوتا۔ اب فرض کرو کہ ہندوستان میں دیسی سپاہ کی بھرتی ناممکن ہو جائے، تو ایک ہی لمحہ میں ہندوستان پر قابض رہنے کی حقیقت کھل جائیگی۔ ہمارا قبضہ قطعی ناممکن ہو جائیگا۔ ہندوستان میں ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اُسپر بغیر محنت کے قابض رہا جا سکتا ہے۔ جس طرح انگریزی قوم نے بغیر خاص کوشش کے اسکو فتح کیا اُسی طرح وہ اسپر متصرف بھی رہیگی۔ ہم اسکو برقرار رکھنے کے لئے کروڑوں روپیہ اور بے شمار فوج نہیں قربان کر سکتے اور نہ اسکے لئے تیار ہی ہیں۔ جس وقت ہندوستان حقیقی طور سے اپنے کو مفتوح سمجھنے لگے گا، جیسا کہ ہم ابھی تک لاپروائی سے سمجھ رہے ہیں، اُس وقت ہمکو معلوم ہو جائیگا کہ اسکا قبضہ میں رکھنا ممکن نہیں ہے۔

الغرض نظر غور کے سامنے حیرت و اعجاز کا وہ طلسمی سراب جو اس سلطنت کے گرد نظر آتا ہے فوراً غائب ہو جاتا ہے علی الخصوص اُس وقت جب ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ باوجودیکہ ہم غیر ملکی حکمران ہیں لیکن ایسے فاتح نہیں ہیں جسکا انحصار اعلیٰ طاقت پر ہو اور چونکہ ہم ہندوستان کے باشندوں کی مرضی کے مطابق حکومت نہیں کرتے اسلئے لازماً انکی مرضی کے خلاف حکومت کرینگے۔ آزادی کی محبت کے لئے پہلی شرط سیاسی بیداری ہے جس ملک میں یہ نہیں ہوگی وہاں کے باشندوں میں غیر ملکی حکومت کا احساس نہیں ہوگا اور حکومت عرصہ تک بغیر جانفشانی و تدبر کے سرسبز رہیگی جو ملک اکثر مفتوح و مغلوب ہوتا رہا ہے اسکے اندر یہی مجہول احساس جڑ پکڑ لیتا ہے۔ بسا اوقات مستبد سے مستبد حکومتیں جن کے پاس بغاوت کے مقابلہ کا کوئی ذریعہ نہیں تھا صدیوں تک قائم رہی ہیں محض اس وجہ سے کہ انھوں نے رعایا کی عادات میں دخل نہیں دیا، کیونکہ رعایا طبعاً اطاعت پسند تھی۔ روس کی سولھویں صدی کی تاریخ پڑھو۔ ایک بڑی آبادی نے زار کے مظالم اور تشدد کو کیوں چپ چاپ برداشت کر لیا۔ اسکا جواب بالکل سادہ ہے۔ اہل روس دو صدی تک برابر تاتاریوں کے پاؤں تلے روندے جاتے رہے، جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ انکی طبیعتیں اطاعت مجہول کی خوگر ہو گئیں

اسی طرح ہندوستان کی پوری تاریخ میں کہیں احساس آزادی کا پتہ نہیں چلتا۔ اہل اٹلی اپنی گزشتہ تاریخ میں جمہوریت روما کو

دیکھتے تھے۔ رینزی (Rienzi) نے صرف لیوی (Livy) سنا سنا کر انھین بغاوت پر آمادہ کر دیا ہندوستانی لیڈر کے پاس کوی ایسی کتاب نہین جسے وہ اپنی قوم کو سُنائے۔ ہندوستان مین انگریزون کی آمد سے قبل سات سو برس تک صرف ظالم ہی نہین بلکہ غیر ملکی مستبد حکمران بادشاہت کر چکے تھے۔ البتہ ایسے ملک کے لئے تعجب انگیز بات یہ ہوگی کہ وہان اس امر کا احساس پیدا ہو جائے کہ حکومت کا قیام و انحصار رعایا پر ہے، اور حکومت پر نکتہ چینی کرتے، اُسکے استیصال کے ذرائع سوچنے یا اُسکی مخالفت مین تنظیم پیدا کرنیکی عادت پیدا ہو جاے

ہندوستان مین ہماری حکومت دو صورتون مین معجزہ کہی جاسکتی۔ اول تو اس صورت مین کہ ہندو اپنے ہی ہم ملکون کی حکومت کے عادی اور حکومت سے مقابلہ کرنیکے خیال سے آشنا ہوتے۔ لیکن ہندوؤن مین یہ بات نہین چنانچہ وہ غیر ملکیون کی اطاعت کرتے ہین۔
تاریخ مین ہوتا آیا ہے کہ وسیع آبادیون نے ایسی حکومتون کی اطاعت قبول کرلی جنکو وہ چاہتیں تو با سانی جڑ سے اکھاڑ پھینکتین۔
چین آج بھی ایک تاتاری حکومت کا مطیع ہے، خود ہندوؤن نے انگریزون کی آمد سے قبل مغلون کی حکومت کے آگے سر جھکا دیا تھا۔
بیشک ہندوؤن پر مغلون کے تسلط سے یہ بخوبی ثابت ہوتا ہے کہ اُن پر ہمارے غلبہ کے لئے ضروری نہین ہے کہ ہمارے اندر سیاست کی غیر فطری لیاقت ہو۔ کیونکہ مغلون کی تاریخ پڑھکر ہر شخص کو وہی بات کھٹکے گی جو حکومت انگریزی کی تاریخ مین کھٹکتی ہے۔ یعنی یہ کہ مغلون نے بھی قریب قریب بغیر ظاہری وسائل کے ہندوستان فتح کیا۔ سلطنت مغلیہ کا بانی بابر جب ہندوستان آیا تو اُسکی پشت پر کوئی زبردست قوم نہین تھی، اور نہ اسکو کسی طاقتور ریاست کی تنظیم پر بھروسہ تھا۔ وسط ایشیا مین ایک چھوٹی سی تاتاری ریاست اُسکو وراثت مین ملی لیکن وہ بھی ازبک حملہ آورون کی نذر ہو گئی۔ کچھ دنون تک وہ ادھر اُدھر گھومتا رہا پھر افغانستان مین ایک چھوٹی سی ریاست پر قابض ہو گیا۔ سلطنت کا یہ ابتدائی تخم سب سے زیادہ بے حقیقت تھا۔ اس تاتاری نے کابل مین افغانون پر حکومت کرتے ہوے ایک ایسی سلطنت قائم کرلی جو تقریباً ۲۰ سال مین نصف ہندوستان پر پھیل گئی، اور ایک صدی مین قریب قریب کل ہندوستان پر (اگرچہ برائے نام ہی سہی) مین یہ نہین کہتا کہ وسعت و استحکام کے اعتبار سے سلطنت مغلیہ ہماری حکومت کی مقابل تھی لیکن وہ بھی ہماری ہی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ خود بخود قائم ہوی۔ کمپنی کے پاس کم از کم انگریزی روپیہ، انگریزی فوجی فنون اور ایک غیر فانی کارپوریشن تو تھی بابر اور اُسکے جانشینون کے پاس کیا تھا، وہ کون اسباب تھے جنکی بدولت اُنکی سلطنت معرض وجود مین آئی البتہ ہم صرف اتنا جانتے ہین کہ وسط ایشیا مین ایسی بے خانمان قومین بھری تھین جو فطرتاً کرایہ پر جنگ کرنا جانتی تھین۔ اسلئے روپیہ اور مال غنیمت کے لالچ مین وہ بآسانی والی کابل کی ملازمت مین داخل ہو گئین

دوسری صورت ہماری حکومت کے معجزہ ہونیکی یہ ہوگی کہ کل کے کل ۲۰ کروڑ ہندوؤن مین تنہا ایک قوم کی طرح ایک ساتھ سوچنے کی عادت ہوتی لیکن چونکہ ایسا نہین ہے اس لئے ہماری حکومت کوئی معجزہ نہین ہے۔ ایک ایسی جماعت کو جسکے اندر اشتراک مفاد کا احساس نہو مغلوب کرلینا بالکل آسان ہے۔ کیونکہ ایسی حالت مین ایک فرد کو دوسرے کے خلاف عمل کرنے پر آمادہ کیا جاسکتا ہے۔ مین بتا چکا ہون کہ ہندوؤن کے درمیان رشتہ اتحاد کس قدر ناکافی اور کمزور ہے۔ اگر تم دیکھنا چاہتے ہو کہ اس داخلی اتحاد کی عدم موجودگی نے ہماری حکومت کو کسقدر

تقویت ہوبجائی تو تم صرف غدر کی تاریخ کا مطالعہ کرو۔ مین بتا چکا ہون کہ ہماری دیسی فوج مین معمولی سی بغاوت بھی ہماری سلطنت کے لئے نہایت مہلک ہوگی۔ اُسوقت تمھارے دل مین خیال گذرا ہوگا کہ باوجود ۱۸۵۷ع کے غدر کے ہماری سلطنت ابتک اسی طرح فروغ پر ہے۔ لیکن غور کرو مین نے ایسی بغاوت کا ذکر کیا تھا جو تحریک قومیت سے عام رعایا مین پیدا ہو کر فوج مین پھیل گئی ہو۔ ۱۸۵۷ع کی بغاوت اس قسم کی نہین تھی، کیونکہ یہ فوج مین پیدا ہوی، قوم نے اس مین کوی حصہ نہین لیا۔ اسکے رونما ہونے کے اسباب مخصوص فوجی شکایات تھین، حکومت غیر ملکی کے خلاف جذبات قومیت کو اس سے کوی سروکار نہین تھا۔ اب مین دریافت کرتا ہون کہ یہ بغاوت رونما ہونے کے بعد کس طرح فرو کی گئی؟ مجھے اندیشہ ہے انگلینڈ مین عام خیال یہی ہے کہ انگریزون نے اپنی غیر معمولی شجاعت اور ہندوؤن پر اپنی ناقابل قیاس برتری کی بدولت اسکو کچل دیا۔ اب مین تمھارے سامنے کرنل چسنی (Col. Chesney) کی کتاب Indian Policy (دستور سلطنت ہند) سے اسی کے الفاظ مین اس واقعہ کی حقیقت پیش کرتا ہون۔ کرنل موصوف لکھتا ہے "بے ادبی، اپنے آقا کے خلاف جذبات منافرت اور اپنی قوت پر اس حد تک یقین کرنے مین کہ وہ انگریزونکا تختہ الٹ دینگے، ہندو اور مسلمان مین کوئی فرق نہین تھا۔" آگے چلکر وہ بیان کرتا ہے کہ "خوش قسمتی سے نام نہاد احاطہ بنگال مین تمام تر باقاعدہ فوج متعین نہیں تھی۔ چار بٹالین گورکھا فوج جو اس جماعتی جذبہ سے محفوظ تھی باستثنا، ایک بٹالین خیر خواہ رہی۔ ان مین سے ایک بٹالین نے برطانیہ کی خاطر جس نمایان بہادری اور اطاعت شعاری کا اظہار کیا اسکا اعتراف اُنکے انگریزی رفیقون نے بھی کیا ہے۔ وہ دو زائد رجمنٹین بھی جو پنجاب اور ہمسایہ اضلاع سے بھرتی ہوئین ثابت قدم رہین۔ لیکن زیادہ مدد پنجاب کی بے قاعدہ فوج سے ملی۔ اگرچہ اسکا نام بے قاعدہ تھا لیکن اُسکی ترتیب، تنظیم اور تعلیم ویسی ہی با اصول اور مضبوط بنیاد پر تھی جیسی باقاعدہ فوج کی ہوتی ہے۔ اس فوج مین ۷ رجمنٹ پیدل اور ۵ رجمنٹ سوارونکی شامل تھین۔ علاوہ ازین انکے اندر ۴ مقامی سکھ رجمنٹین بھی تھین جو عموماً پنجاب ہی مین متعین رہا کرتی تھین۔ یہ فوجین براہ راست اُسی صوبہ کی حکومت کے ماتحت تھین، مرکزی حکومت کے ماتحت نہین کیونکہ باقاعدہ فوج کی ڈسپلن بگاڑنے مین مرکزی حکومت کا بھی حصہ تھا۔ انھین فوجون نے اُن تھوڑے سے یورپین سپاہیون کیساتھ جو بالائی ہند مین متعین تھے پہلے پہل باغیون کا مقابلہ کیا۔ اسی اثنا مین صوبہ پنجاب کے باشندون کی ہمدردی انکے حکمرانون نے حاصل کین۔ چونکہ یہ لوگ ابھی حال مین مفتوح ہوے تھے اور اپنی فوج کے شکست ہو جانیکے باعث اپنے طبعی پیشہ سے محروم ہوگئے تھے اسلئے اُن ہندوستانی فوجون کو جو انکے ملک مین متعین تھین پسندیدہ نظرون سے نہین دیکھتے تھے۔ چنانچہ جب اُنسے اُنکے موروثی دشمنون کا تختہ الٹ دینے کی اپیل کی گئی تو بڑی مستعدی سے انھون نے اس اپیل کا خیر مقدم کیا۔ جس قدر آدمیون کی ضرورت ہوتی فوراً مہیا ہو جاتے اور جس قدر جلد ممکن ہوتا سامان اور قواعد سے آراستہ کرنے کے بعد مقام جنگ پر بھیج دئے جاتے۔ چنانچہ جب فوج بنگال کی دوبارہ تنظیم ہوی تو اُسکے اندر اس فوج کا بہت بڑا حصہ تھا۔"

تم دیکھ سکتے ہو کہ ہندوستانی قومون ہی کو ایک دوسرے کے خلاف لڑا دینے کی وجہ سے بڑی حد تک بغاوت فرو ہوی۔ جب تک ایسا ممکن ہے، جب تک وہان کے باشندون مین حکومت پر، خواہ کیسی ہی حکومت کیون نہ ہو، نکتہ چینی کرنے اور اُس سے بغاوت کرنیکی عادت نہین پیدا ہوگی، ہندوستان پر انگلینڈ کی حکومت ممکن رہیگی اور اس مین کوی حیرت و استعجاب کی بات نہین ہے۔ لیکن جیسا کہ مین نے کہا ہے، اگر موجودہ صورت حالات مین تبدیلی پیدا ہو جاے، اور کسی ذریعہ سے ہندوستان کے باشندے ایک قومیت کے رشتہ مین منسلک ہو جائین اگر اُنکے اور ہمارے

باہمی رشتہ کو آسٹریا اور اٹلی کے تعلق سے دور کی بھی مشابہت ہو جائے، تو میرے نزدیک ہمین اپنی سلطنت سے بغیر کسی اندیشہ کے فوراً مایوس ہو جانا چاہئے۔ میرے خیال مین ہمین عالمگیر بغاوت کے خطرہ سے ڈرنا نہین چاہئے۔ بعض خوفناک رسالون مین جیسے مسٹر الیٹ کی کتاب ہے ہندوستان کی غریب رعایا کی مفلوک لحالی اور تباہی کا ہولناک نقشہ کھینچنے کے بعد یہ نتیجہ نکالا گیا ہے کہ ان کا انجام یقیناً عام بے اطمینانی کی شکل مین رونما ہوگا اور ہم وہان سے نکال باہر کر دیے جائینگے آیا یہ نقشہ صحیح ہے یا نہین، اُسکی تحقیق کا یہ موقع نہین ہے لیکن اگر بنظر بحث فرض کر لیا جاے کہ یہ صحیح ہے تو مجھے تاریخ مین کوئی ایسی نظیر نہین ملتی جسمین ان اسباب کی بنا پر کبھی انقلاب رونما ہوا ہو۔ مین نے بڑی بڑی آبادیون کو دیکھا ہے کہ وہ نہایت ذلیل افلاس مین صدیون تک چپ چاپ پڑی رہین لیکن کبھی بغاوت نہین کی بلکہ اگر وہ اس افلاس و نکبت کو برداشت نہین کر سکتی تھین تو فنا ہو جاتین یا جون توں کر کے زندگی کے دن کاٹ دیتی۔ انکے احساس مردہ ہو جاتے، انکی خواہشات تنگدستی سے دب کر مر جاتے آبادی وہی بغاوت کر سکتی ہے جو بلند حوصلہ ہو، جسکے اندر جذبہ امید ہو جسکو اپنی طاقت کا احساس ہو اگر اس قسم کی بیداری ہندوستان مین پیدا ہوی تو تا وقتیکہ دیسی فوج ہندؤن کو اپنا بھائی اور انگریز افسرون کو غیر ملکی سمجھنا نہ سیکھے گی ہم اسی فوج سے اس تحریک کا گلا گھونٹ دینگے۔ برخلاف اسکے اگر ایسا احساس پیدا ہو جاے اور تمام ہندوستان اپنے کو ایک قوم سمجھنے لگے (ہمارا دور حکومت شاید تمام سابق حکومتون سے زیادہ اسکے امکان مین معین ہے) ۔ تو اسوقت اسکی ضرورت نہین ہو گی کہ سارے ملک مین خوفناک بے اطمینانی کی لہر دوڑ جائے، کیونکہ اس حالت مین دیسی فوج اس جذبہ سے متاثر ہو جائیگی جس پر ہمارا بھروسہ ہے۔ ۱۸۵۷ء کا غدر اگرچہ خوفناک تھا لیکن اُسکے فرو کرنے مین ہم کامیاب ہو گئے، کیونکہ بغاوت فوج کی صرف ایک حصہ تک محدود تھی، رعایا نے اسکا ساتھ نہین دیا، بلکہ الٹے ہماری امداد کی لیکن اب جب بغاوت ہو گی تو یہ صرف بغاوت نہین ہو گی بلکہ عالمگیر جذبۂ قومیت کا اعلان ہوگا، اسوقت ہماری سلطنت کی سلامتی کی تمام امیدون کا خاتمہ ہو جائیگا اور قدرتاً ہونا ہی چاہئے۔ کیونکہ درحقیقت ہم ہندوستان کے فاتح نہین ہین اور نہ بحیثیت فاتح ہم اسپر حکومت کر سکتے ہین۔ اگر ہم ایسا ارادہ کرینگے تو ہمارا کامیاب ہونا قطعی غیر یقینی ہو گا

(مترجم)

عبدالقیوم رسا

سالومی

آسکر وایلڈ کے نہایت مشہور ڈرامہ کا ترجمہ جسے جناب مجنون گورکھپوری نے اُسی قوتِ بیان اور سلاست کے ساتھ کیا ہے جو آسکر وائلڈ کے خصوصیات انشا مین داخل ہین اس مین ایک مختصر مگر جامع مقدمہ بھی شامل ہے جس مین اُس ڈرامہ کی تاریخ و دیگر خصوصیات پر روشنی ڈالی گئی ہے قیمت علاوہ محصول ۱۲ار

مینیجر "نگار" لکھنؤ

ازدواج مکرر

مسٹر ذکی کی مسرت کی کوئی انتہا نہ تھی جب انھین بعض ذرایع سے معلوم ہوا کہ صفیہ نہ صرف تعلیم یافتہ بالکل ادیب بھی ہے

ایک زمانہ سے ذکی کی شادی صرف اسی بناپر ملتوی ہوتی آرہی تھی کہ اُن کے ذوق کے مطابق کوئی تعلیم یافتہ عورت نہ ملتی تھی، اور اس بات کا وہ عہد کر چکے تھے کہ جب تک کوئی خاتون اُن کے جذبات شعر وادب کی سمجھنے والی اور اسی زبان مین جواب دینے والی نہ ملیگی وہ عقد نہ کرینگے، چونکہ آدمی دولتمند اور معزز گھرانے کے تھے اس لئے پیام تو بہت جگہ سے آتے تھے لیکن کوئی ان کے مرضی کے موافق نہ ہوتا تھا، وہ نہ دولت چاہتے تھے نہ جاہ و ثروت، وہ نہ حُسن کے طلبگار تھے نہ کسی اور صفت کے۔ بلکہ وہ مختصراً یون سمجھ لیجئے کہ ایک مسلمان "سروجنی نائڈو" چاہتے تھے، جو ادب و انشاء کا نہایت پاکیزہ ذوق رکھتی ہو، اچھا شعر کہنے اور سمجھنے کی اہل ہو مضمون نگاری فسانہ نویسی، کر سکتی ہو اور زنانہ کلب یا کسی اور نسوانی جلسہ مین صدر بننے اور برمحل تقریر کرنے کی اہلیت رکھتی ہو

ان کے بعض احباب نے سمجھایا کہ کسی کمسن نوجوان لڑکی کا یہ تمام صفات اپنے ساتھ لانا ناممکن ہے مگر ہان یہ ہو سکتا ہے کہ بعد کو رفتہ رفتہ اس مین یہ تمام باتین پیدا ہو جائین، اس لئے اگر کوئی اچھی تعلیم یافتہ لڑکی مل جائے تو شادی کر لینا چاہئے اور پھر اس کی تربیت اپنے ذوق کے لحاظ سے خود اپنا فعل ہے۔ لیکن ذکی اس پر راضی نہ ہوا۔ اس مین کلام نہین کہ وہ خود نہایت اچھا شاعر پاکیزہ ذوق ادب رکھنے والا انسان تھا، اس کی تحریر و تقریر مین ایک خاص دلکشی، ندرت اور بلندی خیال ہوتی تھی، وہ جو چیز لکھتا تھا اس مین خاص جدت ہوتی تھی اور ملک کے رسایل و جراید اس کے مضامین کے متمنی رہتے تھے، لیکن ایک حد تک وہ ضدی تھا اور اس کے قیام مین اسکی دولت و خوشحالی نے اور زیادہ مدد کی

اس لئے جب ان کے ایک بہی خواہ مولوی مظہر نے صفیہ کیساتھ ان کے عقد کا مسئلہ پیش کیا تو انھون نے وہی سوال کیا کہ تعلیمی حالت کیا ہے۔ اور جب یہ معلوم ہوا کہ وہ شاعرہ و ادیب بھی ہے تو انھون نے فرط مسرت مین بلا کسی تحقیق و تفتیش کے اپنی رضامندی ظاہر کر دی اور شادی ہو گئی

(۲)

صفیہ ایک متوسط الحال خاندان کی لڑکی تھی لیکن وہ تمام صفات جو ایک شریف گھرانے کی لڑکی مین ہونا چاہئے اور جو ایک گھر کی ملکہ بننے کے لئے ضروری ہین اس مین موجود تھین صورت شکل کے لحاظ سے بھی بُری نہ تھی اور اُردو لکھ پڑھ لینے کی بھی کافی مشق تھی، مگر اس کو شاعرہ یا ادیب کہنا بالکل غلط تھا۔ یہ صرف مولوی مظہر کی شاعری اور مبالغہ تھا یا مصلحت اندیشی کہ انھون نے صفیہ کو اس رنگ مین پیش کر کے ذکی کو شادی کے لئے راضی کر لیا

اوّل اوّل جب ذکی نے اپنی بیوی کو دیکھا تو خاص شاعرانہ نگاہ سے اور یہ معلوم کر کے واقعی اُس کو بڑی مسرت ہوئی کہ اس کا نقشہ

اس کے خد و خال اور اس کی ادائین بہت معشوقانہ یقین اور وہ انکو اپنی غزلگوئی کا موضوع بنا سکتا تھا لیکن اس کے بعد جب اس کے ادبی ذوق اور شاعری کے امتحان کا وقت آیا تو وہ کوئی فیصلہ نہ کر سکا کہ آیا جو خبران کو ملی تھی وہ صحیح نہ تھی یا یہ کہ شرم و حجاب بھی کھل کھیلنے کے لئے مانع ہے۔

ذکی کے نزدیک ایک عورت کے تعلیم یافتہ ہونے کا معیار صرف یہ تھا کہ وہ غالب کے دقیق سے دقیق شعر کو پورے لطف و ذوق کے ساتھ سمجھ سکے۔ درد و میر کے جذبات تغزل پر سر دھنے اور جب اس موضوع پر گفتگو کرے تو ایک ماہر و محقق کی حیثیت سے اور صفیہ کے متعلق اسے ابھی تک یقین نہ ہوا تھا کہ وہ اس معنی مین تعلیم یافتہ ہے یا نہین

شادی کے دوسرے دن صبح کو بالاخانہ پر چاء سے فارغ ہونے کے بعد ذکی جھولے کی کرسی پر آہستہ آہستہ جھول رہا تھا اور صفیہ چوکی پر تکیہ کے سہارے بیٹھی ہوئی چھالیا کتر رہی تھی اسوقت تک ذکی کو صفیہ کی گفتگو سے صرف اسقدر علم حاصل ہوا تھا کہ وہ صاف و سلیس اور اسی کے ساتھ بہت صحیح اردو بول سکتی ہے، دوسرے کی گفتگو سمجھنے، کسی نتیجہ پر پہونچنے اور جواب دینے مین بہت ذہین اور حاضر طبیعت رکھتی ہے، لیکن خالص ادبیات کے متعلق اس کے معلومات یا ذوق کا کوئی علم اُسے حاصل نہ ہوا تھا

ذکی نے جھولتے جھولتے غالب کا یہ شعر گنگناتے ہوئے پڑھا

ترے خیال سے روح اہتزاز کرتی ہے   بہ جلوہ ریزی باد و بہ پرفشانی شمع

اور پھر کنکھیون سے اپنی بیوی کو دیکھا کہ اُدھر کیا اثر ہوا، اتفاق دیکھئے کہ اسی وقت غریب صفیہ کے پیٹھ پر ایک چیونٹی چڑھ گئی اور بدن مین جھرجھری سی پیدا ہونے لگی۔ ذکی سمجھے کہ یہ کیفیت پیدا ہوئی ہے غالب کا شعر سنکر بس پھر کیا تھا، قیامت آگئی، صبر و ضبط بات سے جاتا رہا، جذبات پر قابو نہ رہا اور بے اختیار ہو کر کہہ اٹھا، "مین سمجھتا تھا کہ تمھارا ذوق شعری یقیناً پاکیزہ ہوگا اور اس وقت تک تم نے محض شرم کی وجہ سے اس کا اظہار نہین کیا، مگر جلیلی طبیعت کہین رکتی ہے، غالب کا یہ شعر سنکر آخر کار تم بیتاب ہو ہی گئین۔ اچھا ایمان سے بتاؤ کہ عرفی کے بعد ایسی پیاری قسمین کسی نے کھائی ہین جیسی غالب نے اس شعر مین پہلے جلوہ ریزی باد کی قسم کھانا اور پھر پرفشانی شمع کی جو نتیجہ ہے اول کا اور پھر سارے مصرعہ کو مشبہ بہ کی صورت مین پیش کرنا اور اول مصرعہ کو مشبہ قرار دینا حقیقت یہ ہے کہ اس انداز بیان کی مثالین اگر کہین ملتی ہین تو صرف بیدل کے ہان، بیدل کا یہ شعر تم نے سنا ہوگا لیکن مین تو تمھاری صورت مین ہر وقت اس شعر کو دیکھتا رہتا ہون۔ اُف،

تجدید ناز آشفتہ رنگ لباس آرائیت   بے پردگی دیوانہ طرح نقاب افگندنت

کیا دنیائے شاعری مین حسن بیان، رنگ تغزل اور توازن مصرعین کی کوئی اور ایسی مثال آسانی سے ملسکتی ہے، شاعری کا الہامی چیز ہونا اسی نوع کے کلام سے ثابت ہوتا ہے"

ذکی اپنے جوش ادبیت مین غالب، بیدل، عرفی، نظیری، حافظ وغیرہ خدا جانے کن کن شعراء کے کلام پر ہلکی ہلکی ادبی تنقید کرتا ہوا جا رہا تھا اور صفیہ جس نے اس کے کسی ایک فقرہ کا بھی صحیح مفہوم نہین سمجھا، حیران تھی کہ "میرے متعلق جو یہ حسن ظن ان کو قایم ہو گیا ہے، اسے کیونکر گوارا کرے" اور کچھ وہ اس خیال سے خایف تھی کہ مبادا حقیقت کا علم ہو جانے کے بعد احتراز کی کیفیت ان مین پیدا ہو جائے وہ دیر تک ایک خاص کیفیت شرم و اضطراب کے ساتھ ذکی کی باتون کو سنتی رہی اور غالباً سنتی رہتی اگر وہ اسی سلسلہ مین

یہ سوال نہ کر بیٹھتا کہ

"مومن کی شاعری کے متعلق تمھاری کیا رائے ہے" جب تک وہ صرف سننے پر مجبور تھی، سنتی رہی، لیکن جب اس سے سوال کیا گیا اور جواب دینا اس کے لئے ناگزیر ہوگیا تو وہ بہت گھبرائی اور اس کی سمجھ مین نہ آیا کہ وہ کیا کہے

نظم کی کتابون مین اسنے سوائے مسدس حالی اور مناجات بیوہ کے کسی اور کتاب کو نہ دیکھا تھا اور وہ مطلق اس سے بیخبر تھی کہ مومن کون کافر ہے

وہ خاموش رہی، سر کو نیچا کئے ہوئے بدستور چھالیہ کترتی رہی اور ایک ہلکے سے رعشہ بدن کے ساتھ سوچتی رہی کہ اُسے کیا جواب دینا چاہئے

ذکی نے پھر اصرار کیا اور یہ اصرار زیادہ التماس محبت لئے ہوئے تھا، لیکن حسن اتفاق سے باہر سے اطلاع آئی کہ ذکی کے دوست اختر آئے ہین اور اس لئے ذکی کو اپنے سوال کا جواب حاصل کئے بغیر باہر چلا جانا پڑا۔ اور دوسرے روز صفیہ کا بھائی آکر اسے گھر لے گیا۔

(۳)

صفیہ کو گھر گئے ہوئے پانچ دن ہوگئے ہین اور ذکی حد درجہ بے چینی کے ساتھ اس کے خط کا انتظار کر رہا ہے اسنے چلتے وقت تاکید کردی تھی کہ ایک خط روزانہ مفصل روانہ کیا جائے اور اسی طرح روز ایک خط کی توقع کیجائے، چنانچہ وہ پانچوین دن کا پانچوان خط جو یکسر شاعری و ادب سے لبریز تھا اور جس مین بقول غالب "شوق وصل" "شکوہ ہجران" دونون کی غیر معمولی شرح و تفسیر کی گئی تھی، لکھ کر روانہ ہی کر چکا تھا کہ دوپہر کی ڈاک سے صفیہ کا خط اُسے ملا۔ چونکہ یہ صفیہ کی بالکل پہلی تحریر تھی اس لئے اسنے نہایت بیتابی سے اُسے کھولا کہ خدا جانے کیا کیا اور کیسے کیسے بدیعہ ہائے ادب و انشاء ہات آئین گے، لیکن جب وہ اسے ختم کر چکا تو اسپر ایک ایسی کیفیت طاری تھی جس کو صرف دم گھٹنے سے تعبیر کر سکتے ہین۔ خط کا مضمون یہ تھا۔

"ایک تو مین یہان آکر بیمار ہوگئی، دوسرے اس فکر مین پڑگئی کہ آپ کی قابلانہ تحریرون کا جواب کیا دون جبکہ مین انھین سمجھ بھی نہین سکتی۔ حقیقتاً یہ غم میرے لئے اب ناقابل برداشت ہوتا جاتا ہے کہ آپ نے جس صفیہ کو اپنی معیت کی عزت بخشی ہے، وہ غالباً وہ صفیہ نہین ہے، جو آپ کے ذہن مین تھی۔ سب سے آخری صحبت مین جو گفتگو آپ نے مجھ سے کی تھی اور جس سوال کو چھوڑ کر آپ باہر تشریف لے گئے تھے اس کا جواب اب مین تحریر کے ذریعہ سے دینا چاہتی ہون، کیونکہ میرے لئے غالباً یہ زیادہ آسان ہے کہ آپ کو اپنے سے ابتدا ہی مین متنفر کردون بجائے اس کے کہ آپ کو عرصہ تک فریب مین مبتلا رہنے دون، مین نہین کہہ سکتی کہ آپ کو کس نے اور کیون یہ یقین دلا دیا کہ میری تعلیمی حالت بہت بلند ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اُردو کی سوائے چند معمولی کتابون کے مین نے آجتک کسی شاعر کا دیوان دیکھا تک نہین بلکہ سچ پوچھئے تو مین شعر موزون بھی نہین پڑھ سکتی اس کی خوبیون کا سمجھنا تو خیر بڑی بات ہے

مجھکو جو تعلیم و تربیت دی گئی ہے وہ اس سے زیادہ نہین ہے کہ شوہر کی اطاعت کرون، اس کے آرام و آسائش کا خیال رکھون اور گھر کو ایسی صورت سے اس کے سامنے پیش کرون کہ جب وہ دنیا کی کشمکش سے خستہ ہو کر واپس آئے تو

اُس کی تمام کلفتین دور ہو جائین اور وہ محسوس کرے کہ اس دنیا مین اگر خلوص وصداقت کی آغوش کا سکون کہین دستیاب ہو سکتا ہے تو صرف گھر مین اُسی کے ساتھ مجھے یہ بھی سکھایا گیا تھا کہ شوہر کی مزاج شناسی کو مقدم سمجھون اور اُس کی پسندیدگی کا لحاظ ہر ممکن قربانی کی حد تک کردن ۔ لیکن میری کتنی بڑی بدنصیبی ہے کہ آپ کے علمی وادبی ذوق کو دیکھتے ہوئے (جو آپ کی زندگی کی تنہا مسرت معلوم ہوتا ہے) مین اپنے آپ کو اسدرجہ ناکام وپست پاتی ہون کہ آپ کو خوش رکھنے کے خیال سے میرے جسم پر رعشہ ساطاری ہو جاتا ہے ۔ اور مین اپنے مستقبل کی تاریکی کو دیکھ دیکھ کر کانپ اُٹھتی ہون مجھے شعروشاعری سے اتنا ہی بُعد ہے جتنا آپ کو اُس سے قُرب ، اس لئے سخت پریشان ہون کہ مین آپ کو کس طرح خوش رکھ سکتی ہون اور آپ کو مجھ سے کیا آرام وسکون میسر آسکتا ہے ۔ بہرحال نتیجہ جو کچھ ہو مین اس حقیقت کو ظاہر کئے بغیر نہین رہسکتی اور بےچینی کے ساتھ نتیجہ کی منتظر ہون کہ آپ نے میری نسبت کیا فیصلہ کیا ۔ آخر مین مجھے یہ بھی ظاہر کر دینا چاہئے کہ یہ خط نہ مین نے اپنے قلم سے لکھا ہے اور نہ مضمون میرا ہے ۔ چونکہ مین بہت بدخط ہون اور اپنے جذبات کو مناسب الفاظ مین ظاہر بھی نہین کرسکتی ، اس لئے عزیز سے لکھوارہی ہون "

اس وقت ذکی کی حالت بالکل اُس قیدی کی سی تھی جسے صبح پھانسی دیجانے والی ہو اور رات کو اپنی آزادی ورہائی کا خواب دیکھتے ہوئے دفعتہً اُسے چونکا دیا گیا ہو

دنیا مین امید ویقین کے خلاف کسی امر کا ظہور اسقدر تکلف دہ امر ہے کہ بعض اوقات جنون ودیوانگی کی سرحد یہین سے شروع ہو جاتی ہے ، اس لئے ذکی کے کرب واضطراب کا اندازہ آسان نہین ، وہ دیر تک سر پکڑ کر بیٹھا رہا اور پھر اُٹھ کر سراسیمگی کے عالم مین ٹہلتا رہا ۔ اس کا چہرہ غصہ سے تمتا رہا تھا ، اس کے ہاتھ پانون مین تشنج کی سی کیفیت پیدا تھی اور اگر اُس کے آنسو نہ جاری ہو جاتے تو نہین کہا جاسکتا کہ اسکے یہ جذبات کیسی خطرناک صورت اختیار کر لیتے

ذکی اپنی فطرت کے لحاظ سے نہایت نیک نفس اور سلجھا ہوا شخص تھا ، اس لئے جب جوش الم کم ہوا تو وہ تمام واقعات پر غور کرکے اس نتیجہ پر پہونچا کہ ۔ صفیہ یقیناً بیگناہ ہے اور اگر گناہگار ہو تو بھی اس اعتراف کے بعد اس کو قابل الزام قرار دینا خود بدترین گناہ ہے ۔ سوال یہ ہے کہ مولوی مظفر نے کیون غلط بیانی سے کام لیا ، ممکن ہے انھین خود اطلاع صحیح نہ ملی ہو یا میرا فائدہ سمجھ کر قصداً غلط بیانی سے کام لیا گیا ہو ۔ بہرحال اب ان سے بھی اس کی باز پرس بیکار ہے ، ظاہر ہے کہ صفیہ کو مین چھوڑ نہین سکتا ، نہ اس لئے کہ اس مین بدنامی ہے ، بلکہ اس لحاظ سے بھی کہ وہ واقعی اپنی خصوصیات کے لحاظ سے قابل قدر ہے ، رہی تعلیم سو ممکن ہے کہ مین اس کی کمی کو پورا کرسکون اور چند سال مین وہ اس منزل پر پہونچ جائے جہان مین اسے دیکھنا چاہتا ہون ۔ عورت یون بھی قدرتاً بہت ذہین ہوتی ہے اور صفیہ تو خصوصیت کے ساتھ غیر معمولی طور پر ذکی ...... لفظ ذکی پر پہونچتے ہی (کیونکہ یہی اسکا نام بھی تھا) اس کے دماغ مین دفعتہً ادبی میلان پیدا ہو گیا اور اس خیال سے کہ اگر صفیہ کا نام ہی صفیہ ذکی رکھدیا جائے تو کسقدر موزون ہوگا ، اس کے چہرہ پر تبسم کی ایک لہر دوڑ گئی ۔ اور اب وہ صفیہ نہین بلکہ

صفیہ ذکی کے مستقبل اور اس کی علمی و ادبی شہرت کے متعلق ایک خیالی کارگاہ قایم کرنے مین مصروف ہو گیا یہانتک کہ کامل دو گھنٹے اسی محویت مین صرف ہو گئے اور پھر دفعتہً کسی غیر معمولی تدبیر کے ذہن مین آجانے سے وہ اچھل پڑا اور انتہائی مسرت کے عالم مین اسنے فوراً صفیہ کو تار دیا کہ فوراً آجائے۔ مین بے چینی کے ساتھ منتظر ہون۔

(باقی)

نیاز

جنوری سنہ ۳۰ء سے

دار الاشاعت نگار سے ایک نئے رسالہ کا اجراء

اس رسالہ کا نام جن ہوگا۔ جن کے لغوی معنی ہین ہر اُس چیز کے جو حواس ظاہری سے پوشیدہ ہو، اس لئے اس رسالہ مین تمام اُن امور و واقعات سے بحث ہوگی جن کا تعلق "ماوراء عالم حواس" سے ہے اور جس مین جنات ارواح خبیثہ مابعد الطبیعیات، روحانیات، وغیرہ سب شامل ہین۔ اس مین نہ صرف جنات وغیرہ کے معتبر واقعات و حکایات ہونگے، بلکہ ان پر تنقید بھی ہوگی، عالم ارواح و روحانیت کے متعلق جدید ترین تحقیقات و معلومات بھی ہونگی، اور "حیات بعد الممات" کے متعلق اس وقت تک جو کچھ دریافت ہو چکا ہے اور ہوتا جارہا ہے وہ بھی درج ہوتا رہیگا

اس رسالہ کی تقطیع ۲۰×۲۶ ہوگی اور ۲۵ سطر کے مسطر پر دو کالم مین باریک خط سے لکھا جائیگا۔ حجم فی الحال دو جزو ہوگا جسمین ۸ صفحات مستقلاً علمی تحقیقات کے لئے وقف ہونگے۔ اس رسالے مین ارواح خبیثہ اور جنات کے جتنے واقعات درج ہونگے ان سب کو مصور پیش کیا جائیگا جس کے لئے ایک آرٹسٹ کی خدمات مستقلاً حاصل کی گئی ہین۔ رسالہ کی سالانہ قیمت للعہ تجویز کی گئی ہے اور ایک سال سے کم مدت کے لئے چندہ قبول نہ کیا جائیگا۔

جن حضرات کو اس دنیا سے دلچسپی ہو وہ براہ کرم اپنا پتہ بھیجدین تاکہ بعد اشاعت رسالہ کا نمونہ اُن کے پاس روانہ کیا جائے

اس کے ساتھ یہ استدعا بھی ہے کہ اگر کسی شخص پر اُس کی زندگی مین کوئی واقعہ ایسا گزرا ہے جسے وہ جنات یا بھوت پریت سے منسوب کرتا ہے تو براہ کرم اس کو قلمبند کرکے روانہ کردے زبان و تحریر کی پرواہ نہ کیجائے یہان اس کو درست کر لیا جائے گا اور واقعہ کے مطابق تصاویر طیار کرلی جائینگی۔ لیکن اس کا خیال رہے کہ صرف اپنا تجربہ و مشاہدہ پیش کیا جائے، دوسرون سے نقل کی ہوئی روایت نہ ہو۔

پہلا پرچہ جنوری سنہ ۳۰ء کے نگار کے ساتھ ہی ساتھ شایع ہو جائے گا

مینجر نگار۔ لکھنؤ

مرقع چغتائی

یعنے

دیوان غالب کا مصور اڈیشن

غالب کی موجودہ شہرت، روا ہو یا ناروا اس سے بحث نہین لیکن یہ واقعہ ہے کہ ہندوستان کے اُردو شاعرون مین جو آوازۂ قبول غالب کو نصیب ہوا، وہ اس وقت تک کسی دوسرے شاعر کو حاصل نہین ہو سکا۔ مشرق مین عام طور پر کسی کتاب یا تصنیف کی شہرت و مقبولیت کا اندازہ صرف اس سے کیا جاتا ہے کہ کتنے اڈیشن اس کے شایع ہوئے اور کتنی زبانون پر اس کا نام جاری ہے۔ مغرب مین بھی اعتراف کی یہ صورت جزو مشترک کی حیثیت رکھتی ہے، لیکن چونکہ وہان دولت ہے، علم ہے، ذوق ہے اور فنون کی ترقی اوج کمال کو پہونچ گئی ہے، اس لئے وہان تنقید کی نوعیتین بھی متعدد ہین اور اعتراف کمال کی صورتین بھی مختلف۔ ہم اگر کسی چیز کو پسند کرتے ہین تو اس کے حصول کی خواہش بھی قوۃ سے فعل مین نہین آتی اور وہان اس کے حاصل کرنے کے لئے بازار مسابقت قایم ہو جاتا ہے، جس مین دولت و زر کی نمایش سے زیادہ تفوق ذوقِ کا مظاہرہ مقصود ہوتا ہے۔ پھر یہ ہنگامہ اسی جگہ ختم نہین ہو جاتا بلکہ اس جوش کو متلاطم رکھنے کے لئے اور اپنے احساسِ اعتراف کو نمایان کرنے کے لئے ہر شخص اپنے اپنے ذوق کے شمول سے اس مین نئی نئی روح پھونکنا چاہتا ہے، یہانتک کہ اگر آپ لے ہر شخص کے نقطۂ خیال سے جدا جدا طور پر دیکھین گے تو اس کے مختلف مناظر آپ کے سامنے آئین گے اور ہر منظر آپ کو بجائے خود اک مستقل چیز معلوم ہوگا، گویا وہ فانوس خیال ہے کہ ایک ہی شمع کو آغوش مین لئے ہوئے اپنی گردش سے ہر پہلو کو ایک جدید نقش کی صورت مین پیش کر رہا ہے۔ یہان کسی شاعر کے حُسنِ کلام کا انتہائی اعتراف وہ ہے جسے ہم زیادہ سے زیادہ "سر دُھننا" سے تعبیر کرتے ہین لیکن وہان کے اعتراف کی حقیر ترین صورت بھی "ہلچل مچا دینے" سے کم نہین ہوتی۔ ہم اگر کسی اچھے شاعر کے دیوان کو دیکھین گے تو زیادہ سے زیادہ دس پانچ مرتبہ سر کو جنبش دے کر رہ جائین گے لیکن وہان ایک شعر مختلف مجلسون مین پہونچکر مختلف صورتین اختیار کر لیتا ہے۔ مغنی اُسے گاتا ہے، رقاص اس پر رقص کرتا ہے، نقاش اسے نقش کرتا ہے اور اس طرح گویا ایک داستان کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے ہر ٹکڑے کو ایک مستقل داستان بنا دیتے ہین، مثلاً خیام ہی کو لے لیجئے ہر چند حافظ نے یہ شعر اپنے ہی لئے کہا تھا کہ

زشعر حافظ شیراز می گویند و می رقصند   سیہ چشمان کشمیری و ترکان سمرقندی

مگر وہ صادق آتا ہے خیام اور اہل مغرب پر جہان خیام کا اعتراف "می گویند و می رقصند" کے منزل سے بھی آگے بڑھا ہوا نظر آتا ہے قصہ مختصر یون سمجھئے کہ ہمارا اعتراف حسن و کمال صرف "آہ" ہے اور اُنکا "واہ" اور یہ فرق قدرتی طور پر اک متشائم (Pessimism) اور متفاول (optimism) قوم کے درمیان ہونا چاہئے۔

اس مین شک نہین کہ مغربی تعلیم اور مغربی اصول تنقید کے سلسلہ مین اس کمی کا احساس یہان کے لوگون مین بھی پیدا ہو گیا ہے، لیکن کوئی علمی تحریک ابھی تک اس نوع کے پیدا نہین ہوئی تھی جسے ہم بجا طور پر نشان نہضت (Renaissance) کہہ سکین۔ اس لئے چغتائی کا یہ فخر کبھی ان سے نہین چھینا جا سکتا کہ سب سے پہلے انھون نے اس طرف توجہ کی اور "تقدیم اقدام" کا امتیاز انھون نے اپنے لئے مخصوص کر لیا۔ غالب کے دیوان کو ایک فلسفی نے دیکھا اور اسے الہامی کتاب کہدیا ہر چند یہ طفلانہ جسارت سے زیادہ حیثیت نہین رکھتا تاہم ایک فلسفہ طراز کی جانب سے اعتراف کی صورت یہی ہو سکتی تھی، ایک صوفی نے اس کا مطالعہ کیا اور "مطالب غالب" کو فصوص الحکم کا ہم پایہ قرار دیا۔ یقیناً یہ تقلید تنگ ظرفی منصور" سے زیادہ اہمیت نہین رکھتا، تاہم ایک متصوف اس سے زیادہ اور کیا کہہ سکتا ہے اخیر مین پنجاب کا ایک نوجوان نقاش اُٹھا اور اس نے حقیقی معنی مین صرف اپنے مو قلم سے "سخنہائے گفتنی" کی تشریح اور اپنے اعتراف خلوص کو بعض خطوط و نقوش کی صورت مین پیش کیا۔ اور اس سے کسی کو انکار ہو سکتا ہے کہ اگر شاعری اور نقاشی کا امتزاج صحیح کسی وقت ہو جائے تو پھر اس کی داد دینا حیرت و سکوت کے بس مین بھی نہین۔ تو کیا چغتائی کا مرقع واقعی یہی حیثیت رکھتا ہے، کیا حقیقتاً اُسے چغتائی کی "انتہائی تمنا" اور "او ر بلند ترین آرزو" کہہ سکتے ہین؟ اس بحث مین مجھے اسی موضوع پر لکھنا ہے اور اسی حقیقت سے بحث کرنا

مرقع چغتائی یعنی دیوان غالب کا مصور اڈیشن یون تو تنقید کے لئے مختلف حیثیتین رکھتا ہے لیکن گفتگو مین آسانی پیدا کرنے کے لئے مین صرف دو تقسیمین کرونگا، ایک متعلق بہ دیوان اور دوسری متعلق بہ نقاشی۔ امر اول کی نسبت مجھے زیادہ نہین کہنا سوائے اس کے کہ نفیس کاغذ پر نفیس جدول و حاشیہ کے ساتھ بلاک سے چھاپا گیا ہے جس کو طباعت کی پاکیزہ ترین صورت کہا جاتا ہے۔ اخیر مین نسخہ حمیدیہ کو دیکھ کر بعض ان اشعار کو بھی بصورت انتخاب درج کر دیا ہے جو عام مطبوعہ دیوانون مین نہین پائے جاتے، میری رائے مین جناب چغتائی اس امر مین اپنے حدود سے آگے بڑھ گئے ہین اور اس کو مین اگر غیر شاعرانہ نہین تو "غیر نقاشانہ" جسارت سے ضرور کہونگا۔ ابتدا مین ڈاکٹر جیمس کزنس اور ڈاکٹر اقبال کی مختصر تمہید و تقریب انگریزی زبان مین ہے۔ ڈاکٹر کزنس نے جو نقاشی کے ماہر سمجھے جاتے ہین مختصراً چغتائی کے فن نقاشی پر روشنی ڈالی ہے اور ڈاکٹر اقبال نے ایک خاص دلکش انداز مین مجملاً شاعری و نقش کے ارتباط کو فلسفیانہ مگر سرسری انداز سے سمجھانے کی سعی فرمائی ہے۔

خود جناب چغتائی نے بھی "سخنہائے گفتنی" کے عنوان سے چند خیالات پریشان (astray thoughts) (جو کہین کہین "بکھرے ہوئے موتیون" سے کم دلچسپ نہین ہین) ظاہر کئے ہین اور اس سلسلہ مین انھون نے مشرق و مغرب کی نقاشی کا جو فرق بتایا ہے وہ بہ لحاظ انشا و خیال بہت لطیف اور بہ لحاظ حقیقت نہایت مستحکم ہے۔ کیا اچھا ہوتا اگر اس ایتھری (Etherial) قسم کی انشا کو "اُتروانا" "کیچڑ" اور "لتھڑا رہنے والے" وغیرہ ایسے الفاظ سے پاک رکھا جاتا۔ جمیل ترین چہرہ مین حقیر ترین بدنمائی بھی اچھی نہین معلوم ہوتی

اب مین اس حصہ کی طرف متوجہ ہوتا ہون جسے صحیح معنی مین مرقع چغتائی کہا جا سکتا ہے اس مجموعہ مین کُل ۴۴ تصویرین ہین ۲۱ تصویرین چار رنگون کی ہین باقی ایک رنگ کی ہین یا صرف پنسل کا خاکہ یا محض رنگین خطوط کا مجموعہ

قبل اس کے کہ مین ان نقوش پر تنقید کرون مختصراً یہ ظاہر کر دینا ضروری سمجھتا ہون کہ چغتائی کس اسکول کے نقاش ہین چغتائی ایرانی اسکول کے نقاش ہین اور ایرانی اسکول کی وہ خصوصیت جسے "رومانیت نقش" کہنا بہ نسبت "نقش رومانیت" کے زیادہ موزون ہے

ان کے موقلم مین تکمیل کے ساتھ ودیعت ہوئی ہے۔ ایک نقش کے عناصر بالعموم تین ہوا کرتے ہین، ایک وہ جسے بیک گرونڈ (فضائے بعید) کہتے ہین دوسرے تصویر کا اندرونی داخلی منظر اور تیسرے خود اصل تصویر جسے مرکز یا نقطۂ انشعاب کہنا زیادہ مناسب ہے پھر چونکہ نقش بجائے خود کوئی چیز نہین ہے بلکہ وہ محض نقاش کے دماغ کی اپج ہے، یا یون سمجھیے کہ ایک خیال ہے جو خطوط کی صورت مین نمایان ہوتا ہے اس لئے ایک تصویر کی خوبی یہی ہے کہ نقش کا کوئی خط، کوئی نقطہ "واقعیت" خیال کے حدود سے آگے نہ بڑھے "واقعیت خیال" سے مراد وہ فطری حدود ہین جن کی پابندی سے آزاد ترین تخییل کو بھی چارہ نہین۔ یعنی جس طرح شعر مین حد سے زیادہ مبالغہ شعر کے لطف کو غارت کر دیتا ہے اسی طرح نقش مین "واقعیت خیال" سے آگے بڑھ جانا ذوق کے منافی ہے۔ پھر جس طرح شعر کے مختلف اقسام ہین اسی طرح نقش کی بھی کئی قسمین ہوسکتی ہین، اور اس لحاظ سے ان کے محاسن کی جانچ ہوتی ہے۔ اگر شعر مین آپ محاکات، معاملہ بندی، اور جذبات نگاری وغیرہ وغیرہ کی علحدہ علحدہ تعیین کر سکتے ہین تو نقش مین بھی اسیطرح واقعیت، تخییل، رومان، اور احساسات کی جستجو ہوسکتی ہے، لیکن فرق یہ ہے کہ نقش کا تعلق بہ نسبت شعر کے مادیت سے بہت کم ہے اور وہ نقاش جو صرف تنوع مادیت کے اظہار کو اپنا مقصود قرار دیتا ہے اُسے بجائے نقاش کے صناع کہنا زیادہ موزون ہے۔

فرض کیجیے کہ ایک حسین عورت کا نقش طیار کرنا ہے تو وہ نقاش جو مادہ کی حدود سے آگے نہین بڑھتا، صرف یہی کریگا کہ اسکی صورت، اس کے خد و خال، اس کے اعضا اور اس کے ملبوس کو نہایت جمیل و دلکش بنا دیگا، لیکن وہ نقاش جو رومان و احساس کا پرستار ہے، اس کی صورت سے زیادہ اعتنا نہ کریگا بلکہ خود اپنے جذبات و تاثرات کو تصویر کے ماحول اور فضا مین اس طرح بھر دیگا کہ حسن سے زیادہ عشق نمودار ہو جائے اور مرکز انشعاب اپنے ماحول مین اس طرح تحلیل ہو جائے کہ حسن و عشق کے حدود کی تعیین و تمیز آسان نہ رہے۔

اگر نقاش صرف نقال ہے تو وہ مادیت سے آگے نہین بڑھتا اور اگر خلاق ہے تو مادہ سے گزر کر روحانیت مین پہونچ جاتا ہے، وہ مادہ کا پابند رہتا ہے اور یہ مادہ کو اپنا پابند بنا لیتا ہے، اس کا موقلم منظر کے تغیر کے ساتھ ساتھ جنبش کرتا ہے اور یہان منظر مصور اس کے جنبش قلم کے ساتھ ساتھ متغیر ہوتا ہے، وہ محکوم و تابع ہو کر کاغذ مین رنگ بھرتا ہے اور یہ اک حاکمانہ اقتدار کے ساتھ اپنے رنگ مین موضوع (Subject) کو رنگ دیتا ہے۔ اس لئے آپ دیکھیں گے کہ جتنے نقاش جمالیاتی تخلیق کے لئے مشہور ہوئے ہین ان کے ہان ایک نقش کے عناصر سہ گانہ مین سے مرکز انشعاب یا موضوع نقش اسقدر نمایان نہین ہوتا جتنا ماحول اور فضا، ایسے نقوش مین دیکھنے والے کی نگاہ، مرکز سے فضا کی طرف نہین جاتی بلکہ فضا سے مرکز کی طرف آتی ہے۔ چغتائی کی نقاشی بھی چونکہ زیادہ تر روحانی یا احساسی قسم کی ہے اس لئے وہ لوگ جو حقیقت سے ناواقف ہین ان کی تصویر کے مرکزی حصہ مین نقص محسوس کرتے ہین اور وہ اس حقیقت سے بیگانہ ہین کہ وہ تمثیل (Symbol) سے ہیولیٰ (chaos) نہین پیدا کرتا بلکہ ہیولیٰ سے تمثیل کو نمایان کرتا ہے۔

لوگ کہتے ہین کہ چغتائی کی تصویرون کی آنکھ، ناک، اور انگلیان بدنما، خلاف اصل، اور مضحک ہوتی ہین، لیکن یہ یہی لوگ ہین جو چغتائی کے نقش کی اصل رُوح سے واقف نہین اور جن کی پسندیدگی مادی نقاشی سے آگے نہین بڑھتی

چغتائی نے غالب کے جن اشعار یا مصرعون کو نقش کیا ہے وہ یہ ہین:-

(۱) نقش فریادی ہے کس کی شوخی تحریر کا کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

چونکہ غالب کے اس شعر سے دیوان شروع ہوتا ہے اس لئے چغتائی نے بھی اس سے ابتدا کی ہے، چغتائی کا یہ نقش بالکل کارچوبی (Japanese ornament) قسم کا ہے اور اس لئے فضا کے لحاظ سے بالکل سادہ اور ماحول کی حیثیت سے معمولی ہے۔ یا بالفاظ دیگر یوں کہئے کہ جیسا شعر غالب کا ہے ویسا ہی اس کا نقش ہے۔ نہ شعر سے کسی خاص لطیف جذبہ میں تحریک پیدا ہوتی ہے اور نہ تصویر مین کوئی پاکیزگی پائی جاتی ہے

(۲)۔ اس کے بعد "مطرب بہ نغمہ رہزن تمکین و ہوش ہے" کا نقش ہے۔ افسوس ہے کہ یہ مصرع بھی مادی حدود سے آگے خیال کی رہبری نہیں کرتا اس لئے چغتائی کو بھی زیادہ گنجائش نہ تھی، تاہم وہ مصرعہ کے پہلے ٹکڑے کو کسی حد تک اور دوسرے ٹکڑے کو بڑی حد تک نمایاں کر سکے ہیں، لیکن دونوں میں امتزاج کامل نہیں ہے۔ مطرب (مطربہ؟) ساز لئے ہوئے ہی لیکن اس سے فارغ۔ نغمہ کا مفہوم صرف اسکے ہاتھوں اور انگلیوں سے پیدا کیا گیا ہے جس سے تالی اور چٹکی بجانے کا رنگ پوری طرح تصویر سے نمایان ہو گیا ہے۔ دوسرے ٹکڑے کو صرف فضا کے اثر سے ظاہر کیا گیا ہے اور نسبتاً زیادہ تکمیل کے ساتھ

(۳) ہان مہ نو سنین ہم اس کا نام جس کو تو جھک کے کر رہا ہے سلام

اس کا نقش نئی چیز نہین بلکہ اس سے قبل ہلال عید کے عنوان سے پنجاب کے بعض رسایل مین شایع ہو چکا ہے اس تصویر کو اس شعر کا نقش قرار دینا میرے نزدیک بالکل ذوق کے خلاف ہے۔ جہانتک ہلال عید کا تعلق ہے یہ تصویر یقیناً اچھی ہے لیکن اس شعر سے متعلق کرنے کے بعد اس کی تمام خوبیان زایل ہو جاتی ہین۔ چاند کو دیکھ کر ایک ضعیفہ بیٹھی ہوئی ہات اٹھائے دعا مانگ رہی ہے، ایک چھوٹا بچہ اس کی گردن مین ہات ڈالے ہوئے چاند کو دیکھ رہا ہے اور خود بھی اس معانقہ کی حالت مین تقلیداً ہات دعا کے لئے کھولدیتا ہے۔ پیچھے ایک نوجوان دوشیزہ انتہائی معصومیت کے ساتھ دعا مانگ رہی ہے افق کے شفقی روشنی مین ہلال نظر آرہا ہے اور دور مسجد کے گنبد و مینار بھی نمایان ہین تصویر بہ حیثیت مجموعی اس تمام معصومیت و تقدس کو لئے ہوئے ہے جو ہلال عید کے دیکھنے کے بعد ایک مسلمان گھرانے کے افراد مین پیدا ہو سکتی ہے۔ لیکن غالب کے شعر سے اسے کوئی لگاؤ نہین ہے

(۴) غم ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج شمع ہر رنگ مین جلتی ہے سحر ہونے تک

یہ شعر نقاشی کا اچھا موضوع ہو سکتا ہے اور واقعہ یہ ہے کہ چغتائی نے اس خیال کو بغیر کسی فضائے بعید کے پیدا کئے ہوئے نہایت خوبی سے "منقوش" کیا ہے۔ اس تصویر مین اگر ایک طرف غالب کا تکلم بالنفس (Soliloquy) ظاہر ہے تو دوسری طرف مصرعہ ثانی کو بھی پوری قوت کے ساتھ نمایان کیا گیا ہے اور مین کہہ سکتا ہون کہ اس شعر کا کوئی لفظ ایسا نہین ہے جس سے چغتائی نے کام نہ لیا ہو یا تصویر سے پیدا نہ کیا گیا ہو

ایک مرد ضعیف (جو یقیناً غالب ہے) طاق مین رکھے ہوئے چراغ کے پاس ایک خاص انداز حسرت داندوہ سے کھڑا ہوا دیکھ رہا ہے اور چراغ کا تیل جو ٹپک ٹپک کر دیوار کو داغدار بنا چکا ہے اب بھی نہایت ہی ہلکا سا شعلہ قایم کئے ہوئے ہے منظر کی تاریکی بتا رہی ہے کہ ابھی

سحر قریب نہین ہے اور اس طرح نقش کو دیکھ کر "غم ہستی" "جز مرگ" "علاج" اور جلتی ہے سحر ہونے تک" سب کا سمان انفرادی اور مجموعی دونون طور پر بیک وقت سامنے آجاتا ہے اور یہ نقاش کی معمولی کامیابی نہین ہے

(۵) سب کہان کچھ لالہ وگل مین نمایان ہوگئین — خاک مین کیا صورتین ہونگی کہ پنہان ہوگئین

اس نقش کا تعلق بیشک فضائے بعید سے ہے اور اس مین کلام نہین کہ چغتائی نے شعر کے مفہوم کو واضح کرنے کے لئے جو فضا پیدا کی ہے وہ بہت مناسب ہے، لیکن اس نقش مین ایک غیر ضروری جز شامل کرکے اس کے اثر کی قوت کو ضعیف کردیا ہے۔ لالہ وگل کے پاس کسی انسانی ہستی کو دکھانے کی ضرورت نہ تھی۔ اگر وہ اس تصویر کے دو حصے کرکے ایک مین ایک مصرعہ کو اور دوسرے مین دوسرے مصرعہ کو بغیر کسی جاندار چیز کے شمول کے ظاہر کردیتے تو اس تصویر کی رمزی (Symbolic) قوت بہت زیادہ ہوجاتی

(۶) چاہے ہے پھر کسی کو مقابل مین آرزو — سرمہ سے تیز دشنۂ مژگان کئے ہوئے

نہ غالب کا یہ شعر در خور نقش ہونے کا اہل تھا اور نہ چغتائی اس مین کامیاب ہوئے ہین۔ یہ نقش، صنعت کے حدود مین آگیا ہے اور بجائے نقاش کے کسی صناع کے دماغ کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے

(۷) باوجود یک جہان ہنگامہ پیدائی نہین — ہین چراغان شبستان دل پروانہ ہم

چغتائی نے ہر چند اس شعر کو صرف یک رنگ خطوط مین نقش کیا ہے، لیکن مین نہین سمجھ سکتا کہ اس سے زیادہ تکمیل کے ساتھ یہ شعر منقوش ہوسکتا ہے۔ غالب نے پہلے مصرعہ کا جیسا زبردست ثبوت دوسرے مصرعہ مین دیا ہے وہ نہایت ہی بلند وعمیق نقاشی کا مقتضی تھا اور واقعہ یہ ہے کہ چغتائی نے پوری داد اس خیال کی دی ہے۔ چراغ کے دھوین کے بیچ وتاب سے "شبستان دل پروانہ" قایم کرنا اور پھر اس مین پروانون کی سوختگی و برشتگی کے ساتھ ان کی "نیمۂ داغ و نیمہ خاکستر" حالت کو، چراغان کی صورت سے دکھانا، ایسی زبردست تخلیق فنی ہے کہ مشکل سے دوسری نظیر اس کی مل سکتی ہے

(۸) وہ فراق اور وہ وصال کہان — وہ شب و روز و ماہ و سال کہان

مین حیران ہون کہ چغتائی نے اس شعر کا انتخاب کیون کیا۔ اگر یہ تصویر اُن کی پہلی تصویرون مین سے ہے اور محض مرقع مین داخل کرنے کے لئے غالب کے کسی موزون شعر کی جستجو ہوئی تھی تو کوئی دوسرا شعر تلاش کرتے۔ تصویر بری نہین ہے لیکن اس شعر نے اس کو بہت گرادیا ہے

(۹) نفس نہ انجمن آرزو سے باہر کھینچ — اگر شراب نہین انتظار ساغر کھینچ

اس نقش مین سوائے اس کے کہ ایک خاتون کی حالت منتظرہ دکھا دی ہے اور کوئی غایر جذبہ ایسا پیدا نہین ہوتا جو غالب کے اس شعر کے مطابق ہوسکے

(۱۰) رو مین ہے رخش عمر کہان دیکھئے تھمے — نے ہات باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب مین

یہ نقش بھی منجملہ اُن چند نقوش کے ہے جن پر چغتائی کیا دنیا کے بہتر سے بہتر نقاش کو ناز ہوسکتا ہے۔ غالب نے دوسرے مصرعہ سے

پہلے مصرعہ کے مفہوم کو جسقدر وسیع مستحکم کر دیا ہے، وہ نقش کے لئے بھی ویسی ہی عمیق و بالغ نگاہ چاہتا تھا اور حقیقت یہ ہے کہ جو جلال (Sublimity) اس نقش مین پیدا کیا گیا ہے وہ اپنے مرکز، فضا اور ماحول کے لحاظ سے خیال کو اُس لانہایت (Infinity) تک لیجاتا ہے جو مشکل ہی سے غالب کے شعر سے سامنے آسکتا ہے۔ چغتائی کا یہ نقش ایک ایسا زائیدۂ خیال ہے کہ اگر اُسے اُن کے عہد نقاشی کا سرمایۂ حیات قرار دیا جائے تو بیجا نہ ہوگا

(۱۱) - اس کے بعد ایک غیر متعلق تصویر ملکۂ صحرا کے عنوان سے دی گئی ہے، جو رنگین خطوط کے دوایر، زوایا اور انحنا خطوط کا ایک پاکیزہ مجموعہ ہے۔ صحرا مین جس کی فضائے بعید مشرقی وضع کی گنبد دار عمارتون سے ہلکے طور پر آباد نظر آتی ہے، ایک خاتون خاص انداز سے سہمی ہوئی بیٹھی ہے اس کی پشت پر ایک نہایت ہی حسین اونٹ گردن اُٹھائے کسی دور کی چیز کو دیکھ رہا ہے، محمل کی آرایش اور حریری زیبایش اس کو ملکۂ صحرا ثابت کرنے مین پوری طرح مدد دے رہے ہین۔ تصویر صحرا ے نجد کی شہرۂ آفاق داستان لیلے و مجنون کو پوری تازگی کے ساتھ سامنے لے آتی ہے۔ اگر خاتون کا بائین ہاتھ (جو ضرورت سے زیادہ سکڑا ہوا معلوم ہوتا ہے) بڑھا کر محمل کے پردہ تک لیجایا جاتا اور اس لحاظ سے اس کی انداز نشست مین تغیر کر دیا جاتا، تو یہ تصویر بہت زیادہ رومانی ہو جاتی

(۱۲) ساقی بجلوہ، دشمن ایمان و آگہی

یہ مصرعہ نقش کے لئے انتخاب کے قابل نہ تھا اور اس لئے نقش مین بھی کوئی خاص بات نہین ہے چونکہ چغتائی صرف احساسی نقاش ہین اس لئے وہ مادی قسم کی تصاویر مین کبھی کامیاب نہین ہوتے

(۱۳) آئینہ دیکھ اپنا سا منہ لیکے رہ گئے صاحب کو دل نہ دینے پہ کتنا غرور تھا

میرے نزدیک چغتائی کا یہ نقش ان کے بدترین نقوش مین شمار کئے جانے کے قابل ہے اور اس قدر سطحی طور پر اس کی تکمیل کی گئی ہے کہ مجھے حیرت ہوتی ہے انھون نے مرقع مین اسے کیون شامل کیا۔ اس مین ناکام رہنے کا وہی سبب ہے جو ابھی عرض کیا گیا

(۱۴) قطرہ مین دجلہ دکھائی نہ دے اور جزو مین کل کھیل لڑکون کا ہوا دیدۂ بینا نہ ہوا

غالب کا یہ شعر بہت مشکل سے نقش پذیر ہو سکتا تھا، لیکن چغتائی اس مین پوری طرح کامیاب ہوئے ہین۔ اس شعر کے چار ٹکڑے ہین قطرہ مین دجلہ۔ جزو مین کل۔ کھیل لڑکون کا۔ دیدۂ بینا۔ اور یہ چارون حصے نہایت تکمیل کے ساتھ دکھائے ہین

بچہ بلبلے بنا بنا کے اڑا رہا ہے، اس کے ارد گرد کچھ کھلونے پڑے ہوئے ہین، مان سامنے آنکھین بند کئے ہوئے دیدۂ بینا کی تصویر بنی ہوئی بیٹھی ہوئی ہے۔ اس تصویر کی فضا، ماحول اور مرکز سب اپنی اپنی جگہ مکمل ہین اور سب کا امتزاج بھی ایک عجیب متاملانہ کیفیت پیدا کر دیتا ہے جو اصل روح ہے اس شعر کی

(۱۵) شمع بجھتی ہے تو اس مین سے دھُوان اُٹھتا ہے شعلۂ عشق سیہ پوش ہوا میرے بعد

اس شعر کو بھی پوری تکمیل کے ساتھ نقش کیا گیا ہے "بجھتی ہوئی شمع" اور "میرے بعد" ان دونون خیال کو ملا کر قبر سے ظاہر کرنا نہایت ہی مکمل تعبیر ہے۔ اسی طرح شعلۂ عشق کے سیہ پوش ہونے کے لئے سوگوار بیوہ کو قبر کے پائین متالم حالت مین دو زانو دکھانا

اور پھر تمام فضا مین ایک حزین والم آگین تاریکی پیدا کرکے اس خیال کو اور زیادہ گہرا کر دینا، اسقدر عمیق خیال ہے کہ شاید ہی اس مین کوئی اور اضافہ ہو سکے

(۱۶) مین ہون اپنی شکست کی آواز — نہ گل نغمہ ہون نہ پردۂ ساز
ماہتاب ہالہ پیرا گردۂ تصویر ہے — ہے جہان فکر گستید نہائے نقش روئے یار

دونون نقش بہت معمولی ہین اور کوئی قابل ذکر لمس مُوقلم کا ان مین نہین پایا جاتا

(۱۷) میری سنو جو گوش نصیحت نیوش ہے — دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو

اچھا نقش ہے اور شعر کی تمام کیفیات کا حامل ہے۔ ایک مرد ضعیف چند بچون سے مخاطب ہے۔ ایک طرف بچون کا تمام لاعبانہ کیفیات کے ساتھ گردنین اُٹھا اُٹھا کر پیر مرد کو دیکھنا اور دوسری طرف پیری واضمحلال کے تمام آثار و علائم کے ساتھ خمیدہ کمر لئے ہوئے بچون سے گفتگو کرنا خاص اثر پیدا کرتا ہے، اس تصویر کی بیک گرونڈ اور رنگ کے انتخاب مین نہایت ماہرانہ ذوق سے کام کیا گیا ہے اور انھین دونون نے اس نقش مین جان ڈالی ہے

(۱۸) اس کو کہتے ہین عالم آرائی — دیکھو اے ساکنان خطۂ پاک
روکش سطح چرخ مینائی — کہ زمین ہو گئی ہے سرتا سر

اس نقش مین بھی کوئی قابل التفات بات نہین پائی جاتی

(۱۹) اک شمع رہگئی ہے سو وہ بھی خموش ہے — داغ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی

چغتائی کا یہ نقش بھی غیر فانی ہے اور اسقدر زبردست رمزی (Symbolic) تصویر ہے کہ اس کی خوبی الفاظ سے ادا نہین ہو سکتی

(۲۰) جوش قدح سے بزم چراغان کئے ہوئے (۲۱) بلبل کے کاروبار پہ ہین خندہ ہائے گل
(۲۲) چمن کا جلوہ باعث ہے مری رنگین نوائی کا

(۲۳) گو ہات مین جنبش نہین آنکھون مین تو دم ہے — رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

سہ رنگی تصویرون مین قابل ذکر نہین

(۲۴) مانگے ہے پھر کسی کو لب بام پر ہوس — زلف سیاہ رخ پہ پریشان کئے ہوئے
(۲۵) سازیک ذرہ نہین فیض چمن سے بیکار — سایۂ لالۂ بیداغ سویدائے بہار

یک رنگی تصویرون مین معمولی چیز ہین اور قابل ذکر نہین

(۲۶) یک نظر بیش نہین فرصت ہستی غافل — گرمی بزم ہے اک رقص شرر ہونے تک
(۲۷) گلفشانیہائے ناز جلوہ کو کیا ہو گیا — خاک پر ہوتی ہے تیری لالہ کاری ہائے ہائے

یک رنگی تصاویر مین یہ دونون نہایت دلکش چیزین ہین۔ پہلے مین رقص شرر کی تعبیر اور دوسری تصویر مین خاک پر لالہ کاری کا رمز (Symbol) بہت عجیب و غریب ہے

غیر متعلق یک رنگی تصویرون مین (Soliloquy) (تکلم بالنفس) بھی نہایت ہی مکمل نقش ہے

اس مرقع کی ابتدا مین ایک صفحہ پر " الاعمال بالنیات " بھی درج ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ چغتائی اپنے ان نقوش پر " بازپرس محشر " سے خایف ہین اور " دفع دخل " کے طور پر پہلے ہی سے اس " حدیث " کو اپنا وکیل بنا کر پیش کئے دیتے ہین - اگر میرا یہ خیال صحیح ہے تو چغتائی کے نقوش مین کہین کہین خامی و لغزش کا پایا جانا بے وجہ نہین اور جب تک وہ اس کو نمایش و عبادت سمجھکر اختیار نہ کرینگے کبھی کمال کی حد تک نہین پہونچ سکتے۔ یہ ہے نتیجہ اُس تربیت کا جو ہمیشہ مذہب کو فنون لطیفہ کا دشمن بناتی ہے اور ایک فطری نقاش کو بھی اپنے فریب مین مبتلا کرکے " صراط مستقیم " سے ہٹا دیتی ہے

مین اپنی تفصیلی رائے مرقع چغتائی کے متعلق ظاہر کر چکا اور اس مین شک نہین کہ بہ حیثیت مجموعی وہ بہت قابل قدر چیز ہے، لیکن اسی سلسلہ مین مجھے اس حقیقت کے اظہار سے باز نہ رہنا چاہئے کہ چغتائی اگر چاہتے تو موضوع نقش کے لئے ان سے بہتر اشعار غالب کے ان کو ملسکتے تھے اور مین ان کو مخلصانہ مشورہ دونگا کہ آیندہ وہ اس مسئلہ کو نظرانداز نہ کرین۔ مثالاً مین چند اشعار غالب کے ایسے پیش کرتا ہون جو چغتائی کے مخصوص ذوق نقاشی کے لئے بہت موزون ہوسکتے ہین

جی ڈھونڈھتا ہے پھر وہی فرصت کہ رات دن　　بیٹھے رہین تصور جانان کئے ہوئے
کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب　　آؤ نہ ہم بھی سیر کرین کوہ طور کی
ناکامی نگاہ ہے برق نظارہ سوز　　تو وہ نہین کہ تجھ کو تماشہ کرے کوئی
سنبھلنے دے مجھے اے ناامیدی کیا قیامت ہے　　کہ دامان خیال یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے
ہان کھائیو مت فریب ہستی　　ہرچند کہین کہ ہے، نہین ہے
ہر قدم دوری منزل ہے نمایان مجھ سے　　میری رفتار سے بھاگے ہے بیابان مجھ سے
آغوش گل کشودہ برائے وداع ہے　　اے عندلیب چل کہ چلے دن بہار کے
جبکہ تجھ بن نہین کوئی موجود　　پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے
شق ہو گیا ہے سینہ خوشا لذت فراغ　　تکلیف پردہ داری زخم جگر گئی

الغرض اس قسم کے بہت سے اشعار ملسکتے ہین جن کو خارجی و ذہنی (Subjective , objective) یا مادی و روحانی دونون قسم کی نقاشی کا موضوع زیادہ تکمیل و وضاحت کے ساتھ بنایا جاسکتا ہے مین نے جس اڈیشن کو دیکھ کر یہ تنقید کی ہے وہ معہ کی قیمت کا ہے۔ پہلا اڈیشن ایک سو دس روپیہ کی قیمت کا بھی مین نے دیکھا ہے اور ان دونون مین کوئی زیادہ فرق نہین پایا جاتا۔

آخیر مین مجھے یہ بھی کہنا چاہئے کہ باوجود اس اہتمام کے بھی کہین کہین کتابت کی غلطیان باقی رہگئی ہین اگر ممکن ہو تو آیندہ اس نقص کو بھی دور کر دینا چاہئے۔

نیاز

مومن وکلام مومن

تمہید جس طرح شہرت "دلیل کمال نہین، اسی طرح "گمنامی" نقص کا ثبوت نہیں بن سکتی شہرت کے کئی اسباب ہوتے ہین

۱- طالب شہرت ایسے ذرایع اور تدابیر اختیار کرے کہ وہ مشہور ہوجاتا ہے حقیقت موئد شہرت ہو یا نہ ہو جیسا کہ آجکل عام طور پر ہو رہا ہے۔

۲- "حلقۂ شہرت" کے نزدیک وجہ شہرت فضل وکمال نہ ہو بلکہ روایات اور پروپگنڈا ہون، اس کے افراد مین نقد وتنقید کی صلاحیت نہ ہو۔ انہین کے لئے "العوام کالانعام" کا حکم ہے

۳- کس کی شہرت یا گمنامی کسی خاص خیال اور غرض کے تحت مین ہو

۴- فضل وکمال کی بنیاد پر "شہرت" ہو، یہ اسوقت ممکن ہے جب "حلقۂ شہرت" مین فرق اور امتیاز جانچنے کا مادّہ ہو

یہ جس طرح آج مفقود ہے، زمانہ سابق مین بھی کمیاب تھا فرق صرف اسقدر ہے کہ آج بیشتر وہ لوگ مشہور ہین جو پہلی اور دوسری دفعہ مین آتے ہین، پہلے اہل فضل وکمال بھی مشہور ہوتے تھے لیکن کم ایک زمانہ ایسا بھی ماننا پڑیگا جو صرف اہل فضل وکمال کا موئد تھا۔ ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ شہرت اور گمنامی کی بنیاد اگر حقیقت پر نہ ہو تو اس کا وزن کہانتک قابل ذکر ہے؟ مبصرین اور عقلا کے نزدیک اسکی کچھ حقیقت نہین

اس مین شبہہ نہین کہ ۲ و ۳ صورتون نے بہترین فضل وکمال کا گلا گھونٹ کر ان لوگون کو روشناس کیا ہے جنکی چمک بالکے ذرون سے نہیں ایسے مواقع کے لئے کہا گیا ہے (all that glitters is not gold) ہر چمکنے والی چیز سونا نہین ہوتی

جب کبھی قوم یا کسی ملک مین خیرہ نظری کی یہ صورت رونما ہو جائے کہ ہر چمکنے والی چیز سونا، چاندی، اور جواہرات سے تعبیر ہو تو سمجھنا چاہیے کہ اس کے دن اچھے نہین زمانے نے جن لوگون کو باوجود "فضل وکمال" ابھرنے نہ دیا ان مین حکیم مومن خان "مومن" بھی ہین حکیم مومن خان کو علوم وفنون کے ساتھ شاعری مین جس درجہ کمال تھا اسی قدر وہ محروم شہرت تھے اسباب گمنامی پر تذکرہ نویسون اور نقادون نے جسقدر تحقیق کی ہے بیشتر ناتمام اور تشنہ رہگئی ہے اسوقت تفصیل کے ساتھ اس پر بحث کرنے کی ضرورت ہے۔

جس طرح "آفتاب بہت دنون تک بادل مین نہین رہتا اسی طرح "کمال" پردے مین رہنے کی تاب نہین لاتا ملک مین ایسی ہستیان بھی پیدا ہو گئین جو غالب اور ذوق کے نقار خانۂ شہرت مین مومن کے کمال کے لئے آواز طوطی بنگئیں

عرصہ سے مجھ کو خیال تھا کہ مومن کے کمال کو روشناس کرنا اردو شاعری پر بہت بڑا احسان ہے، مجھ کو اپنے اس خیال کی تائید حسرت موہانی سے ہوی کہ دنیائے شاعری مین "مومن" آفتاب تھے مین نے نواب عماد الملک مرحوم کی فرمایش اور محترم جناب مولوی

محمد عثمان صاحب فاروق وکیل کی تائید اور اصرار سے انتخاب کلام مومن کی شرح رسالہ العلم مین لکھنا شروع کی اس کے بعد سبحان مین افسوس ہے کہ تکملہ سے پہلے دونون رسالے بند ہو گئے اس اثنا مین "مومن" کے مویدین کی تعداد ملک مین بڑھتی گئی یہانتک کہ نیاز فتحپوری نے اپنے رسالہ نگار اور مولوی عبدالحق صاحب نے رسالہ اُردو مین مومن کی شاعری پر مبسوط مضامین لکھوائے، ان دونون رسالون مین اکثر غیر مشہور واقعات اور ضروری مواد یکجا ہو گئے، نیاز صاحب کے رسالے مین دادِ تحقیق یقیناً "زیادہ دیگئی - مومن کا کلام اینک جو محروم شہرت رہا اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ مومن اور اکثر شعرا کی طرح علام وفنون سے بے بہرہ نتھے بلکہ اہل فضل وکمال شعرا مین ان کا درجہ اکثر سے بلند ہوا انھون نے شاعری کی جامہ مین علوم وفنون، کو اس طرح بھر دیا کہ دیکھنے اور سمجھنے والے چیستان سمجھنے لگے مثلاً کہین نجوم ہے، کہین جفر، کہین ریاضی ہے کہین فلسفہ، معانی وبیان کے اکثر مسائل کا ان کی غزلین مرقع ہین اس طرح کہ اگر ان کے اشعار ترتیب کے ساتھ یکجا کئے جائین تو یہ تمام مسائل مسلسل منضبط نظر آئین، معانی وبیان کے اعتبار سے ان کے کلام مین جو جواہر ہین ان کی تفصیل ملاحظہ فرمائیے اور "مومن" کے فضل وکمال اور اعجاز شاعری کو تسلیم کیجئے

تفصیل وتشریح

مثلاً کہتے ہین ؟

۱- ہر جامہ ہے تیرا جلوہ لیکن دیکھا تو کہین نظر نہ آیا

تو واحد وبے نظیر وہمتا تو حاکم وخالق برایا

تجھ کو بھی نہ کہہ سکین ترا مثل یان تک نقش دوئی مٹایا

پہلے دو شعر علم معانی کے مسئلہ اسناد حقیقی عقلی کے حامل ہین، اسناد حقیقی عقلی کی چار قسمین ہوتی ہین ان مین سے ایک وہ ہے جو واقعہ اور اعتقاد دونون کے مطابق ہو اوصاف مذکورہ پر اسلامی نقطۂ خیال سے اعتقاد بھی ہے اور انکی حقیقت بھی ہے تیسرے شعر مین علم کلام کا مسلم مسئلہ بیان کیا ہے کہ خدا کا مثل نہین "قل ہو اللہ" کی اس آیت کی طرف تلمیح ہے وَلَمْ يَكُن لَّهُ كُفُوًا أَحَدٌ (اس کا کوئی مثل نہین) اس مسئلہ خشک کو غزل کی رنگینی مین بیان کرنا "مومن" کا کمال ہے

اسکو بھی سمجھ لینا چاہیے، کہ مومن کرّ مسلمان تھے

۲- مسندالیہ کی تعریف علمیت کے ساتھ اس طرح کہ اظہار تعظیم کے لئے نظر ہو

تری غلامی کی دولت سے خاک پائے ہلال سفیدۂ رخ فغفور چین وقیصر روس

یہ شعر نعت مین ہے، انصاف کیجئے نعت کا یہ مضمون آقائے دو عالم کے غلام کی شان کہان پہونچاتا ہے

۳- اظہار علمیت سے علم کا کنایہ اصلی معنی کی طرف بھی ہوتا ہے:-

آج ہوتا کمال تو کہتا اب تخلص مرا ہے نقصانی

کمال شاعر ایرانی کا تخلص ہے یہان اصلی معنی مین استعمال ہوا

گر ترے کوچہ سے دی کعبہ کو نسبت کیا گناہ — مومن آخر تھے کبھی اے بندۂ اسلام ہم

اس قسم کی رعایت "مومن" کے اکثر مقطعون مین ہے
تیسرا شعر دیکھئے۔

ے نام آرزو کا تو دل کو نکال دین — مومن نہ ہون جو ربط رکھین بدعتی سے ہم

اکثر جگہ مومن نے ایک ایک شعر مین مختلف اور متعدد مسائل بیان کئے ہین، معانی و بیان بھی، فلسفہ و کلام بھی، لفظی رعایت بھی معنوی خوبی بھی پھر لطف یہ کہ روانی اور تغزل کو ہاتھ سے جانے نہین دیا

۴۔ کبھی علم کا اظہار اس سے ہوتا ہے کہ سامع کے دل مین رحم آجائے ۔

کر ترے صدقے مری جان مومن — جانِ مومن ترے قربان مومن

دوسرا شعر ہے۔

مومن زار کہ تھا گرم بیان — سوزش سینہ سے تھا شعلہ فشان

۵۔ مسند الیہ کی تعریف موصول بنا کر ہو اس کے ایک قسم مین اشارہ ہوتا ہے کہ فلان خبر ایسی ہو گی ۔

وہ جو ہم مین تم مین قرار تھا تمھین یاد ہو کہ نہ یاد ہو — وہی وعدہ یعنی نباہ کا تمھین یاد ہو کہ نہ یاد ہو

۶۔ مسند الیہ نکرہ ہوتا ہے اور تنکیر سے تجدید مقصود ہوتی ہے ۔

کوئی کہتا ہے حاشا ہے یہ گرمی غب خالص کی — اسی جانسوز شعلے نے دھوان دل کا اُڑایا ہے

کوئی کہتا ہے ترکیب اور غالب خلط بلغم ہے — رطوبت گر نہین تو کیون پسینے مین نہایا ہے

پہلے شعر مین بیان مسئلہ کے ساتھ الفاظ کی نشست اور معنوی تناسب کو بھی ہاتھ سے جانے نہین دیا ہے، دوسرے شعر مین طب کا معرکتہ الآرا مسئلہ بیان کر کے تشریح مزاج انسانی بھی کی ہے

۷۔ مسند الیہ موصوف ہوتا ہے اور صفت اس کی توضیح کرتی ہے ۔

اُڑتے ہی رنگ رخ مرا نظرون سے تھا نہان — اس مرغ پر شکستہ کی پرواز دیکھنا

مرغ کی صفت پر شکستہ اس لئے ذکر کی ہے کہ بیان پرواز مین ندرت ہو۔

۸۔ مسند الیہ کے عطف سے حصر پیدا ہوتا ہے، کوئی دوسرا تیسرا سمجھا نہین جاتا ۔

عشق کے دیکھے ہین ہم نے عالم — عشق جانے ہین اور عشق کو ہم

۹۔ معطوف اور معطوف علیہ مین التزام ہوتا ہے ۔

بعد یک چندے گر خدا چاہے — مین ہون اور تیرے در کی دربانی

۱۰- مسند الیہ کے عطف سے تعجب اور حیرت کا اظہار ہوتا ہے ؎

مومن اور عشق بتان اے پیر و مرشد خیر ہے
یہ ذکر اور منہ آپ کا صاحب خدا کا نام لو

دوسرا شعر دیکھئے ؎

در تبخانہ و عشق بتان اور آپ اے مومن
یہ حضرت آگئی اکبار کیا طبع مقدس مین

۱۱- مسند الیہ پر اس لئے عطف کیا جاتا ہے کہ مخاطب راہ خطا سے صواب کی طرف پھیرا جاے ؎

قابل نزک تھی خوے ستم آرا نہ کہ مین
لائق سہو تھی یہ رنجش بیجا نہ کہ مین

۱۲- متکلم شک مین ہوتا ہے اس وجہ سے عطف کیا جاتا ہے کہ مخاطب کو شک ہوجائے ؎

نکتہ سنجون سے جی مین ہے پوچھون
کہ مین شہری ہون یا بیابانی

۱۳- صنعت التفات مین تکلم سے خطاب کی طرف التفات عام طور پر اور شعرا نے بھی استعمال کیا ہے لیکن مومن کا رنگ بالکل جداگانہ ہے، یہ صنعت قرآن پاک مین بہت ہے ؎

رکھے مجھکو جیسا مین اس کو عزیز
نہ معشوق و عاشق مین ہووے تمیز

نہین اب چپ کہ مومن دعا ہو چکی
بہت زاری و التجا ہو چکی

مثنوی کے اشعار ہین

۱۴- خطاب سے غیبت کی طرف التفات۔

مومن اب ختم کر دعا پہ سخن
تا کجا لافہاے طولانی

۱۵- ایک غزل مین خطاب تکلم۔ غیبت اور تکلم دونون ؎

غیر کو سینہ سکنے سے یسم بر دکھلا دیا
تمنے کیا کچھ کس کو اتنی بات پر دکھلا دیا

زرد منہ دکھلا دیا غم کا اثر دکھلا دیا
آج ہم نے اس کو اپنا زور و زر دکھلا دیا

صبح سے تعریف ہے صبر و سکون غیر کی
کس نے شب مجھکو تڑپتے بیش ورد دکھلا دیا

موت کے صدقے کہ وہ بے پردہ آئے لاش پر
جو نہ دیکھا تھا تماشا عمر بھر دکھلا دیا

پہلے شعر مین خطاب دوسرے تیسرے مین تکلم ہے چوتھے مین تکلم اور غیبت دونون

۱۶- اضمار قبل ذکر کبھی ناپسندیدگی اور کراہیت کی بنیاد پر ہوتا ہے:۔

وہ ہے خالی تو یہ خالی یہ بھرے تو وہ بھرے
کاسۂ عمر عدو حلقۂ آغوش ہوا

۱۷- تقئید مسند فعلی باشرط، کبھی تجاہل عارفانہ کے ساتھ ہوتی ہے ؎

نچوڑ ینگے ہم اپنا دامن تر
جہنم مین ہے اے واعظ اگر آگ

۱۸- مخاطب کے اعتقاد کے مطابق کلام کیا جاتا ہے

گردیتی ہون اس مین دم مین تجھکو ہو تیغِ علی کی مار مجھکو +

مومن کی مثنوی کا شعر ہے

۱۹- ماضی و حال کے ساتھ اگر مسند فعلی کی تقیید شرط کے ساتھ ہو تو اس سے یقین مراد ہوتا ہے

جب سے گئے وہ ادھر نہین یاد کیا پوچھی نہین کچھ خبر نہین یاد کیا

۲۰- نکتۂ بدیعی کی وجہ سے شرط کے بعد جزا مین صیغۂ ماضی استعمال کیا جاتا ہے۔

بالطبع گر کرم ہو تو مفلس بھی ہے کریم ہوتا ہے سائے کو شجر بے ثمر سے فیض

۲۱- ذکر شرط سے تفاول منظور ہوتا ہے ؎

ہو حق وفا ادا قضا نے چاہا کعبے کا سفر بخت رسا نے چاہا ہے ترک علاج ان بتوں کا مومن دیکھو چاہین گے گر خدا نے چاہا

ایک مسلمان کو ہر دم انشاء اللہ کہنا چاہئے، مومن نے اس مسئلہ کا بھی ذکر کر دیا ہے

۲۲- مقام تعظیم مین مسند کا حرف ؎

اللہ رے تیری بے نیازی یعقوب کو مدتون رُلایا

۲۳- تنکیر مسند مین مقصود بالتمثیل سائل ہوتا ہے مگر سائل کا حصر مسند الیہ پر منظور نہین ہوتا اور نہ سائل کا تعین مقصود ہوتا اسکی صورت یہ ہوتی ہے ؎

کب تلک چشم سے خون ہو جاری کب تلک درد کرے دلداری

۲۴- کبھی تفخیم کا فائدہ ہوتا ہے ؎

سچ ہے کہ یہ ایک بیوفا ہین جتنے ہین حسین بری بلا ہین

۲۵- تقدیم مسند اہمیت کی وجہ سے ؎

بیٹھین نہ اسے یہ کھول کر بال رووین نہ یہ منہ پہ دھر کے رومال

۲۶- کبھی اس لئے تقدیم ہوتی ہے کہ بُرائی کے اظہار مین عجلت ہو

کوئی اس دور مین جیسے کیو نکر ملک الموت سے ہے ہر ایک بشر

۲۷- متعلقات فعل مین مفعول کی شان کا اہتمام اس طرح مد نظر ہوتا ہے

تجھ کو بھی نہ کہہ سکین ترا مثل یان تک نقش دوئی مٹایا

یہ شعر ایک جگہ اور دوسری خصوصیات کے ساتھ ذکر ہو چکا ہے

۲۸- موصوف پر صفت کا قصد۔

لائق جور و جفا ہے وہ نہ مین مفتخر کہ فتنہ بلا ہے وہ نہ مین

۲۹- قصر کی ایک صورت یہ ہوتی ہے کہ اس سے اعتقاد باطل ہو جائے تو

نہ وہ خالق ہے مگر ہے اثر باعث خلق نہ وہ رازق ہے مگر قاسم رزقِ مقسوم

اس صفت مین انکار سے اقرار کا ثبوت ہوتا ہے

۳۰- قصر کے لئے الفاظ معین ہین ان مین ایک "تنہا" بھی ہے

تھا مین اس گھات مین کہ گر اک آن ملے تنہا وہ راحتِ دل و جان

بیان انشا

۳۱- انشا مین ایک چیز تمنا ہوتی ہے تمنا چاہے ممکن الحصول شے کی ہو یا محال عقلی کی:۔

کاش ہوتے چشمِ نرگس دیدہ بادام ہم پہونچتے وان تو اس پردہ نشین کو دیکھتے

۳۲- استفہام کے لئے الفاظ "کیون" "کس لئے" بھی آتے ہین

کیون گر غیر سے مست مل تو کہوے طعن سے رُک کر یہ کیون؟ کس واسطے؟ ہم ایسے تیرے ہو گئے بس مین

۳۳- استفہام سے تعین زمانہ اس طرح ہوتا ہے۔

عمر رفتہ کی جستجو کب تک اپنے مرنے کی آرزو کب تک

۳۴- استفہام سے تعریف و تحسین مطلوب ہوتی ہے ؎ کیا صورت، پاک اللہ اللہ کیا تن نہ خاک اللہ اللہ

۳۵- استفہام سے تفصیل مطلوب ہوتی ہے ؎ دل کیا نالہ کیا فریاد کیا کیا کرون اللہ سب ہین بے اثر

۳۶- استفہام سے حسرت و افسوس مراد ہوتا ہے ؎

کہان وہ ربط بتان اب کہ اس کو تو مومن ہزارون سال ہوے سیکڑون برس گزرے

۳۷- صیغہ امر دعا کے لئے ؎

خدایا لشکرِ اسلام تک پہونچا کہ آ پہونچا لبون پر دم بلا ہے جوش خون شوق شہادت کا

۳۸- فصل و وصل کے سلسلے مین معطوف اور معطوف علیہ کی صورت

نالہ اکدم مین اڑا ڈالے دھوین چرخ گیا اور چرخ کی بنیاد گیا

۳۹- کمالِ اتصال ہو ؎

کہا اس بت سے، جب، مرتا ہے مومن کہا مین کیا کرون مرضی خدا کی

۴۰- جملہ حالیہ مین ایک جملہ مین ثبوت اور دوسرے مین تجدد مقصود

کب گل کھلے گا دیکھئے ہے فصل گل سے دور اور سوے دشت بھاگتے ہین کچھ ابھی سے ہم

۹۶۔ صنعت جمع و تفریق ؎ آئینہ ہے صفا سے دل میرا کیا ہوا اگر نہین ہے حیرانی
دوست کرتے ہین ملامت غیر کرتے ہین گلہ کیا قیامت ہے مجھی کو سب برا کہنے کو ہین

۹۷۔ صنعت رجوع ؎ خنجر تھا آلہی یا زبان تھی خنجر سے زیادہ تر روان تھی

۹۸۔ حسن التعلیل ؎ خمیدہ کس لئے تو آسمان ہے تجھے بھلا نہ تھا ازل سے جو مدنظر ترا پابوس

۹۹۔ احتجاج بدلیل ؎ شبہ کیا عصمت تخت جگر احمد مین جب مسلم ہے کہ معصوم ہے جزو معصوم

۱۰۰۔ صنعت ادماج ؎ تیرا اقبال روز افزون ہو جیسے مومن پہ فضل رحمانی

۱۰۱۔ تبلیغ ؎ دم مصاف ترے دشمنون کے لشکر مین صدائے نوحہ و شیون ہے شور غلغل کوس

۱۰۲۔ رعزق۔ (مبالغہ قریب لعقل بعید العادت کا نام ہے) ؎ گرگ نے دور عدل مین اس کے سیکھ لی راہ و رسم چوپانی

۱۰۳۔ صنعت تعجب ؎
زخم کھایا زہر کھایا تو بھی کچھ ہوتا نہین دیر گزری مرگ کو کیا جانئے کیا ہو گیا

۱۰۴۔ صنعت تلمیح ؎ ہر آہ کہ لب پہ ہے شرر ریز دیپک کا ہے نغمۂ جنون خیز

اس تفصیلی بیان کے سلسلے مین یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ "مومن" نے اُن صنایع و بدایع لفظی و معنوی کو لیا ہے جو فصاحت اور بلاغت کے اعتبار سے مستحسن اور پسندیدہ ہین اور غیر پسندیدہ صنایع سے سخت احتراز کیا ہے، یہ صنائع اور بدایع وہ ہین جو روانی کلام میں خود بخود پیدا ہو جاتے ہیں

باقی "کیفی چریاکوٹی"

کلیات و دواوین (اردو)

دیوان میر حسن دہلوی ۔ نہایت درد انگیز کلام ہے ــــ ۱؎
دیوان مردان صفی تصوف کا رنگ کوٹ کوٹ بھر دیا گیا ہے ۔ ۵؎
کلیات مومن ۔ معہ تصاویر و مثنویات ــــ عہ
کلیات ظفر ۔ ہر چہار جلد کامل دو جلد ۶؎
دیوان ناسخ استعارات و تشبیہ مین انکا کلام اپنی آپ نظیر ہے ــــ ۱۲؎

مسٹر رینالڈز کے انگریزی ناولون کے ترجمے

فسانہ الہ دین و لیلی: مشہور ناول اسٹار آف منگریلیا کا ترجمہ رنگین داستانون کے ضمن مین بہشت دوزخ کی سیر کرائی ہے پڑھکر دل دہڑک جاتا ہے مترجمہ منشی امیر حسین صاحب تحصیلدار کاکوری قیمت عہ
فریب حسن ناول فاسٹ کا اردو ترجمہ جس مین قصہ کے پیرایہ مین بدکردارون کے زبون نتائج دکھائے گئے ہین۔ عہ (مینجر نگار)

مرد اور عورت!

ابتکار و تقلید مین!!

کیا فریقین قواء عقلی مین برابر ہین؟

اپنی رفیقۂ حیات یا اپنی عزیز محبوبہ کسی سے بھی فریقین کی حقیقت کے متعلق مباحثہ کرو تو وہ اس امر کا اعتراف کرینگی کہ مستورات مردون کے مقابلہ مین عموماً قد کی چھوٹی، وزن مین ہلکی، عضلات کی کمزور، اور مصیبت کے وقت بے صبر ہوتی ہین، لیکن اگر ان سے تم اس امر کا اعتراف کرانا چاہو کہ وہ فہم و ذکا، کے میدان مین بھی مردون سے پیچھے ہوتی ہین۔ تو یہ ان کے لئے ایک ناقابل تسلیم حقیقت ہوگی

عورتون کے مقابلہ مین مردونکے تفوق عقلی پر زمانہ قدیم سے سب کا اتفاق چلا آتا ہے چنانچہ اسی وجہ سے لوگون نے جنس لطیف کو ناقص العقل کہنا شروع کر دیا لیکن حقیقت مین اسوقت مستورات کا جو طبقہ قیود ماضی کی بیڑیون سے آزاد ہو چکا ہے۔ اور واقعی معنون مین زندگی کے تمام شعبون مین مکمل طور سے آزاد ہے، اس کے حیرت انگیز کارنامے، مردون کے تفوق عقلی کے اس خیالی دعویٰ کی بنیاد کو بہت کچھ کمزور بنا رہے ہین

پھر اصل معاملہ کی واقعی حقیقت کیا ہے؟ کیا مرد و عورت دونون قواء عقلی مین ایک ہی طبقہ کے دو مساوی فرد ہین؟ جرمن کا مشہور فلسفی کانٹ کیزر لنگ آخری دنون مین جب امریکہ کی زیارت کے لئے گیا، تو اُسنے وہان تحول اجتماعی کے جو روح پرور مناظر دیکھے، انکو اپنے لفظون مین اس طرح بیان کرتا ہے۔ "مین نے امریکہ مین جہان دیکھا، جن جن شعبون مین دیکھا اکثریت اور غلبہ جنس لطیف ہی کو حاصل تھا"

جرمن فلسفی کی یہ رائے حقیقت مین مشاہدہ پر مبنی ہے۔ اور یہ ضروری نہین کہ ہر مشاہدہ حقیقت کے مطابق ہو۔ کبھی مشاہدہ واقعی بھی ہوتا ہے اور کبھی حقیقت و امتحان اسکی تائید نہین کرتے، علامہ پاپنر پروفیسر جامعہ کورنل (امریکہ) نے البتہ اس موضوع پر ایک علمی بحث کی ہے۔ جو نفس مسئلہ پر بہت کچھ روشنی ڈالتی ہے۔ پاپنر نے ہلین گارڈنز مشہور زعیمۂ نسوان کے دماغ کی علمی طریقہ پر باریک تحقیقات کی تو انکو ثابت ہوا کہ عورت، کا دماغ رتبہ اور مرتبہ مین مرد کے دماغ سے نہ چھوٹا ہوتا ہے نہ کمزور۔ چنانچہ مسز گارڈنز کے دماغ کا مسٹر ویلڈر موسس جامعہ کورنل کے دماغ سے موازنہ کیا گیا تو دونون پلڑے برابر رہے۔ حالانکہ ان دونون دماغون کا وزن صرف ۱۱۵۰ گرام تھا جو عام دماغون کے توسط وزن سے بھی کم ہے۔ اکابر رجال کے دماغ کا وزن عموماً ۱۳۰۰ یا ۱۴۰۰ گرام ہوتا ہے۔ تاریخ مین صرف تین شخص ہین، جن کے دماغ کا وزن ۲۰۰۰ گرام تھا۔ انمین سب سے زیادہ مشہور روس کا نامور قصہ گو تورجینیو ہے

جامعہ کورنل (امریکہ) مین دماغی مسائل کی تحقیقات کے لئے مشاہیر حکماء کی کھوپڑیان نہایت احتیاط کے ساتھ محفوظ رکھی

جاتی ہین۔ امریکہ کا یہ خاص طریقہ ہے کہ مشہور ہستیان اپنی حیات مین وصیت کر جاتی ہین کہ مرنیکے بعد ہمارے دماغ اس یونیورسٹی کے سپرد کردے جائین، چنانچہ یہ مبارک رسم ابتک جاری ہے۔ اور اسی رسم کے مطابق مسز گارڈنر نے بھی اپنے دماغ کو اسی مجموعہ مین شامل کرنے کی حاتمانہ وصیت کی تھی،

پابنر نے جب مسز موصوفہ کے دماغ کی نوعی تحلیل کی تو انکو ثابت ہوا کہ اس قسم کے دماغون مین مادۂ سنجابیہ کی مقدار زیادہ ہوتی ہے لیکن کسی شخص کے سر کی بڑائی یا چھوٹائی سے اس شخص کے فہم و ذکاء کو قیاس کرنا ایک ناقابل توجہ بات ہے۔ حجم سر سے یا دماغ کے وزن سے مرد کی ذکاوت کا صحیح اندازہ لگانا ہماری استطاعت اور بس کے حدود سے باہر ہے

تاریخی حیثیت سے جامعۂ کولمبیا کے مشہور پروفیسر استاذ کیٹل ماہر فلسفہ عقلیات نے ایک ہزار مشہور تاریخی نوابغ کے سیر و حالات جمع کئے تو انکو معلوم ہوا کہ ان نوابغ کی صف مین اکتیس ۳۱ خواتین بھی مردون کے دوش بدوش موجود ہین، ڈاکٹر کیٹل کی فہرست نوابغات مین گیارہ فرمانروا شاہزادیان ہین جنکو سلطنت و جہانبانی وراثۃً ملی تھی، اور ۸، حسن و جمال، خوبی و شمائل کی پاک دیویان ہین ۱۰، ادب و لٹریچر کی ماہرہ ہین، دو باقیات الصالحات پر ایک یونان کی مشہور شاعرہ سافو اور دوسری جان ڈارک فرانس کی بطلۂ مقدسہ ہے،

خواتین شہیرات کے سوانح حیات مین غور کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انھون نے مختلف لائنون مین مردون کے مقابلہ نمایان کامیابی حاصل کی ہے، اس تاریخی شہادت سے یہ پتا چلتا ہے کہ انسانی عقل و فکر کی ترقی کے میدان مین مستورات نے مردون کے ساتھ چلنے کی کوشش ہی نہین کی، ورنہ اس میدان مین مردون کے بھدے پانؤن، عورتون کے ہلکے قدمون سے بازی نہ لیجاتے

لیکن پھر یہ سوال ہوتا ہے کہ کیون مستورات مین نبوغ بہت کم پایا جاتا ہے؟ بعض مرد اس کا یہ جواب دیتے ہین کہ "اسلئے اور صرف اسلئے کہ فہم و ذکاء مین مستورات مردون سے کمزور ہوتی ہین" لیکن مردون کا یہ جواب حقیقت مین غبارت خامی نہین، جنس لطیف اسکا یون رد کرسکتی ہے کہ اگر یہ صحیح ہے تو پھر مردون نے یہ کیسے ثابت کیا کہ مدارس مین طالبات کی ذکاوت کا درجہ طلباء سے کہین زیادہ بلند ہوتا ہے۔ اور جنسین مین بلندی دستی کا یہ انداز سن مراہقت تک باقی رہتا ہے۔ مراہقت کے بعد البتہ مرد عورت سے آگے نکل جاتے ہین۔ باقی بلوغ کے پہلے اور اس کے بعد فریقین کے فہم و ذکاء کا اوسط کم از کم متقارب ہوتا ہے'

ماہرین فن نے جنسین کی طالب علمانہ زندگی پر غور کیا تو انکو ثابت ہوا کہ جن دروس و اسباق مین تفکیر و تحلیل، اور ابتکار کی زیادہ ضرورت نہین ہوتی، انمین مستورات زیادہ تیز ہوتی ہین۔ وہ ضروری باتین بلا کسی تردد یا حیرت کے اپنے حافظہ کے اعتماد پر فوراً یاد کرلیتی ہین انکو اسباب و علل کے اختلافات سے کچھ سروکار نہین ہوتا۔ درجات مدارس کے حصول مین ان کے غیر معمولی تفوق کا یہی اصلی راز ہے۔ اور نوجوان طلبہ چونکہ ہر چیز کی علت اور اسباب ڈھونڈھتے پھرتے ہین۔ اسی لئے وہ ہمیشہ متحیر اور متسائل نظر آتے ہین۔ اور یہی وجہ ہے کہ جن اسباق مین بحث و مقارنہ کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے (جیسے طبیعیات، تاریخ، اور کیمیا، وغیرہ) انمین یہ زیادہ ممتاز ہوتے ہین۔ مختصر یہ کہ مرد کی امتیازی خصوصیت صرف اعمال قدیمہ کو علمی جامہ پہنانے کیلئے وسائل جدیدہ کا ابتکار ہے۔ اس بنا پر یہ کہنا صحیح معلوم ہوتا ہے کہ عورت کی عقل ٹھیک اسی طرح محاکاۃ و تقلید کی طرف زیادہ مائل ہے، جس طرح مرد کی عقل ابتکار و اقدام کی طرف!!

لیکن صنف نازک ان اقوال کی پھر یون تردید کرتی ہے کہ چونکہ عورتون کو فرصت اس قسم کا موقعہ نہین دیتی، کہ وہ اپنے مقدرات اور نبوغ، جوہر اور فکر کو بروئے کار لا سکین، اسی لئے وہ ابتکار و اقدام مین مردون سے پیچھے نظر آتی ہین، جب کام کا وقت آتا ہے، اور مرد، مکتشفات کا اکتشاف، مستنبطات کا استنباط، آراء و مذاہب کا ابتکار کرتے ہین، اور متین و پائدار بنیادون پر حضارۃ و عمران کی بنا ڈالتے ہین۔ تو اسوقت وہ اپنی عائلانہ زندگی مین نوابغ کو دودھ پلاتی ہوتی ہے

اس جواب مین اگرچہ صحت وصداقت کا ایک بڑا حصہ موجود ہے، لیکن پھر بھی یہ کہا جاسکتا ہے کہ اگر مردون کے اعمال مین انکو شرکت کرنے کا موقعہ نہ ملا۔ تو وہ زنانہ اعمال (فرش بیوت، زنانہ لباس، فلسفۂ اطفال کے ابتکار وغیرہ) مین کیون فائق نہ ہوئین؟ حالانکہ جن نوابغ نے عالمگیر شہرت اور جہانگیر عظمت حاصل کی اُنھون نے بھی یہ مراتب علیہ ومقس اور حریر پر چلکر نہین پائے، بلکہ بارہا اس راہ مین انکو بھی الم وعذاب، فشل واعراض، تکلیف ومصیبت، درد وغم کے خونخوار عفاریت سے مقابلہ کرنا پڑا، تاریخ کے صفحات اس قسم کے واقعات سے لبریز ہین۔ اگر انکو تفصیل سے عرض کیا جائے تو وہ بجائے خود ایک لمبی داستان ہوگے اسلئے ہم اسکو نظرانداز کرتے ہین۔ غرض یہ کہ تاریخ کے مشہور ترین نوابغ نے جو جو مصیبتین جھیلی ہین ان مصاعب عظیمہ کے مقابلہ مین عورتون کی عائلانہ زندگی کے بکھیڑے بہت ہی معمولی اور غیر اہم ہین

علامہ لویا جامعہ برن کے مشہور پروفیسر فلسفہ اعقلیات کا خیال ہے کہ دنیا مین سینکڑون ایسے عمدہ کام کرنیوالے افراد موجود ہین۔ جنکو ترقی اور تفوق کی طرف صرف انکے شعور اور احساس نے برانگیختہ کیا، ذکاوت کو اس کامیابی مین کوئی دخل نہین ہے،

عورتون کے مقابلہ مین مردون کے تفوق کی ایک یہ وجہ بھی بتائی جاتی ہے کہ: مرد چونکہ فہم وذکا کے استعمال مین زیادہ روشن ہوتے ہین۔ اور عورتون مین روشنی کا یہ جوہر نہین پایا جاتا۔ اس لئے عورتون مین نبوغ کم ہوتا ہے، اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ذکا مین عورت و مرد دونون مساوی ہین، فرق ہے تو صرف طریقۂ استعمال کا فرق ہے۔ اور حقیقت مین مردون کی اس شرف ومزیت کا اصلی سبب صرف اُنکی جسمانی طاقت کی زیادتی ہے کسی بیوجی جاننے والے سے اس حقیقت کے متعلق سوال کرو تو وہ تمکو بتائے گا کہ اس کا اصلی راز غدد صما ہین، یہی غدد ہین جو اپنے قدرتی اثر سے جسم کے حجم کو بڑا، عضلات کو مضبوط اور عزم وارادہ کو روشن بناتے ہین۔ چنانچہ جب کسی سبب سے یہ غدد بیکار ہوجاتے ہین تو مرد اپنے ممتاز ترین صفات رجولیہ سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے، بعض ماہرین فن نے مرغ کے انھی غدود کو نکال کر مرغی کے جسم مین لگادے تو کچھ ہی دنون مین خود مرغی کے اندر مرغ کی صفتین ظاہر ہوگئین

بہرحال! نبوغ کیا چیز ہے؟ کیا نبوغ صرف انہی اعمال عظمہ کا نام ہے۔ جو تاریخی صفحات مین جگہ پانے والے اور بظاہر نظر فریب ہین (مثلاً کسی حیرت انگیز آلہ کا استنباط، یا کسی طبیعی حقیقۃ کا اکتشاف، کسی مملکۃ کی تدویخ یا کسی مجسمہ اور تمثال کی صورت، کسی بہترین صورت کی تصویر، یا کوئی مفید اور دلچسپ نظم وغیرہ) اور کیا یہ صحیح نہین کہ لفظ نبوغ کا اطلاق ان اعمال پر بھی کیا جائے جو گھرون کے گوشے مین، مکانون کے کونے مین بلا کسی اعلان اور شور کے پورے ہوتے ہین؟ اور جن کا ترقی عمران مین ایک مخصوص اثر بھی ہوتا ہے؟

اگر یہ صحیح ہے تو پھر اسی سلسلہ مین اب ہمین ان عورتون کو بھی شمار کرنا ضروری ہوگا جو اپنی محبت و دوستی، عطف ومواساۃ،

حسن انتظام اور خوش سلیقگی مین خود مردون سے بھی خراج تحسین وصول کئے بغیر نہین رہتین،

حقیقت یہ ہے کہ ابتدا تاریخ سے لیکر آج تک طبقہ مستورات مین جو مخفی عامل کارفرما ہے، وہ انکو صرف محبت و وداد، الفت و دوستی، زوجیۃ وامومۃ مالکہ، مکان اور مربی بیت کی حیثیت سے ممتاز کرتے رہے۔ چنانچہ وہ ان فضائل مین اپنی نظیر آپ ہین اور ان کے اس عظیم الشان تفوق کا کوئی دانشمند انسان انکار نہین کر سکتا

غرض یہ کہ جہانتک مین نے غور کیا عورتون مین قلت توابغ کا سبب اساسی صرف یہ سمجھ مین آتا ہے کہ مستورات خود توابغ ہونا ہی نہین چاہتین، بلکہ وہ صرف "عورت" بننا چاہتی ہین اور "عورت" ہی ہونے کو اپنا بہت بڑا فخر سمجھتی ہین، ورنہ اگر وہ اس میدان مین اُتریں تو یقیناً مردون سے کسی طرح پیچھے نہین رہ سکتی ہین،

"بدر اصلاحی"

تصانیف علیاحضرت بیگم صاحبہ بھوپال دام ظلہا

ان بیش بہا تصانیف کا ہر تعلیم یافتہ گھر مین ہونا لازمی ہے

کتاب	موضوع	قیمت
بچون کی پرورش	زچہ وبچہ کی ضروریات، ولادت کی احتیاط۔ زمانہ طفولیت کی بیماریان اور علاج وغیرہ۔	۱عہ/
تندرستی	اصول حفظان صحت اور امراض متعدی سے بچنے کے طریقے بیان کئے گئے ہین۔	عہ/
تربیت الاطفال	بچون کی تعلیم وتربیت اور ان مین تہذیب وشائستگی ودیگر اوصاف حسنہ پیدا کرنیکے لئے نہایت مفید ہے	۸/
حفظ صحت	روزمرہ کے وہ تمام اصول جو عورتون کی صحت جسمانی قائم رکھنے کیلئے ضروری ہین۔	۱۲/
سلطانیہ سلسلہ (۴ حصے)	لڑکیونکو نہایت دلکش بیان مین امور خانہ داری کی تعلیم دینے والی کتاب۔	۸عہ/
انتظام خانہ داری (۲ حصے)	یہ مختصر رسالہ امور خانہ داری کی تعلیم کیلئے بہترین اُستاد ہے	عہ/
جارج کُکنگ	انگریزی کھانون اور مٹھائیون اچار چٹنی وغیرہ کی مفصل ترکیبین۔	۹عہ/

کتاب	موضوع	قیمت
تہذیب النسوان	امور خانہ داری تدبیر منزل کے ساتھ ساتھ مذہبی احکام مین	۸عہ/
ہندوستانی گھرون مین تیمار داری	تیمار داری اور مختلف اعضاء جسم پر پٹیان باندھنے کے طریقے مع نقشہ	۸عہ/
منتک (۲ حصے)	موزہ بنیائن اور بیلین بُننے کی ترکیبین مع تصاویر	۸عہ/
فرائض مادری	بچونکی تعلیم وتربیت اور حفظان صحت کے متعلق بیش بہا ہدایتین	۱۲/
ہدیۃ الزوجین	زوجین کے شرعی وقانونی حقوق واختیارات	۱۰/

خطوط شبلی موسومہ محترمہ زہرا بیگم فیضی و عطیہ بیگم فیضی صاحبہ

یہ مجموعہ علامہ شبلی مرحوم کی ادبی سحرطرازی اور لطیف انشاپردازی کی آخری یادگار ہے۔ اس مجموعہ کا ہر خط اور ہر خط کی ایک سطر جواہر مین تولنے کے قابل ہے۔ کوئی خط ایسا نہین جسمین فصاحت اور ادبی لطافتون کے ساتھ ساتھ دل آویزی اور دلکشی نہ ہو۔ کتاب کے شروع مین مولانا کی تصویر خط کا فوٹو۔ اور مولوی عبدالحق صاحب سکریٹری انجمن ترقی اردو کا نہایت دلچسپ اور پُرلطف مقدمہ بھی شامل ہے۔ لکھائی چھپائی دیدہ زیب۔

قیمت ایک روپیہ علاوہ محصولڈاک۔

منیجر رابعہ بُک ایجنسی نظر گنج۔ بھوپال

ایک سیاح کی ڈائری

(سیاحت نامۂ لکھنؤ کی دوسری قسط)

لکھنؤ کے محرم کا ہنگامۂ "مسرت" ختم ہونے کے بعد میرا خیال تھا کہ شاید کوئی غیر معمولی "سوگ" یہان کی فضا مین پیدا ہو جائیگا اور مجھے اس "ماتمکدہ" کو جلد چھوڑ دینا پڑیگا، لیکن میرا یہ خیال غلط نکلا۔ یہان کی آبادی خواہ کسی قدر اپنے سینون کو فگار دکھانے کی کوشش کرے، لیکن دلون کے اندر ابھی تک وہی "نشاط غیر معصوم" (مگر فطری) موجزن ہے جس کی ابتدار، اولین فرمانروائے اودھ کے عہد مین ہوئی اور جس کی انتہا آخری شاہ اودھ کی اُس سیرت پر جو قیصر باغ کے ایک ایک حوض سے عریان ہو کر نکلنے والی دوشیزہ کو "موج کوثر و تسنیم" مین ڈوبی ہوئی حور سمجھکر "مالِ یغما" نہین بلکہ "حصۂ مومن" کی حیثیت سے قابض ہو جاتی تھی۔ اُس "فراموشکارِ فردا" عہد کے "ذرات مبثوثہ" یہان کے فضا مین اب بھی بالکل اسی طرح نظر آتے ہین جیسے کسی رقاصہ کی محفل سے اُٹھ جانے کے بعد اس کے زر کار ملبوس مین سے ٹوٹے ہوئے "بادلہ کے ریزے" کہین کہین فرش پر چمکتے ہوئے مل جائین

یہان کی آبادی کا دولت وجاہ والا عنصر وہ ہے جس کا اصطلاحی نام "تعلقہ داران اودھ" ہے اور جن مین ہندو مسلمان دونون افراد شامل ہین۔ ان کی کوٹھیان، ان کے قصر، ان کے مکانات لکھنؤ کے مختلف حصون مین منتشر ہین اور جب وہ اپنی دیہی زندگی کے بے آب ورنگ مشاغل سے تھک جاتے ہین تو یہان کی متمدن فضا مین آکر قیام کرتے ہین اور تمام وہ "لوازم نشاط" جو دولت سے حاصل کئے جاسکتے ہین ان کی دسترس سے باہر نہین رہتے، ہر چند ان کی اقتصادی حالت قابل تعریف نہین، لیکن جس حد تک حکومت کے ساتھ وفادارانہ تعلق رکھنے کے بعد آزادیٔ اخلاق، کا استحقاق پیدا ہو سکتا ہے وہ سب انہین حاصل ہے اور اس کے لئے زر و مال کی کمی کی شکایت انھین کبھی پیدا نہین ہوئی۔ صوبۂ اودھ مین اس جماعت کو وہی درجہ حاصل ہے جو رُوئے زیبا پر مصنوعی خال کا ہوا کرتا ہے کہ بعض کے نزدیک وہ یکسر تصنع ناروا ہے اور بعض کے نزدیک "افزایش حسن" —— مین نے بھی رات کے وقت ان "کاشانہائے حسن و جمال" کو برقی روشنی مین جگمگاتے دیکھا، اور خیال کی ایک مکمل "کارگاہِ معصیت" مین اپنے آپ کو مرکزی حیثیت دیکھکر پورا لطف تصور بھی اُٹھایا ہے۔ حیران ہون کہ جن پر عیش و مسرت کی گھڑیان اس انداز سے ہمیشہ گزرتی رہتی ہین وہ زندہ کیونکر رہتے ہین کیا سرمایہ و عمل کی جنگ یا اشتراکیت و جماعیت کا اصول اسی نوع کے انتہائی غیر عادلانہ تقسیم فطرت کو دیکھ کر تو پیدا نہین ہوا؟

یہان کا دوسرا مخصوص طبقہ جو اپنے "سقوط راس" اور "زرۂ آفتاب تابانیم" دونون حیثیتون سے خالص لکھنوی ہے وثیقہ دارون کا ہے، جن مین بعض وہ ہستیان بھی ہین جو لاکھون کی مالک ہین اور بعض وہ متوکل نفوس بھی ہین جن کے اخلاق کا ارتقاء گداگری پر ختم ہوتا ہے، متوسطین کی حالت گداگرون سے بدتر ہے کہ ان کے پاس حصول معاش کا یہ ذریعہ بھی نہین اور وثیقہ کی تنگی

انہین جی کھولکر " افیون پیامی " کی بھی اجازت نہین دیتی - ان کا ایک ایک بال قرض مین بندھا ہوا ہے، غالب کی تنخواہ مین ساہوکار صرف تہائی کا شریک ہوا تھا مگر وہ دلی کی باتین ہین اور دور کی، یہان لکھنؤ مین ساہوکار تین چوتھائی سے زیادہ کا شریک ہے اور باقی چوتھا حصہ "چھنیا بیگم " کے لئے بھی کافی نہین ہوتا، " قدر کفاف " اور " سدرمق " کا کیا ذکر ہے اس جماعت کی اخلاقی و معاشری حالت کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جب دولت " مزد " کی حیثیت سے ہٹکر صرف " دست غیب " "یا ترکہ " کی صورت مین ملتی ہے تو اس مین کسقدر "عفونت و گندگی " پیدا ہو جاتی ہے - لوگ بہو بیگم کی تعریف کرتے ہین کہ لاکھون کا وثیقہ ان کی ذات سے لوگون کو ملا- مین کہتا ہون کہ وہ اس سے زیادہ ظلم اہل لکھنؤ پر کوئی اور کرہی نہ سکتی تھین کہ اتنی بڑی جماعت کو بیکار و بے دست و پا بنا کے رکھدیا اہل لکھنؤ کی پست ذہنیت کا بڑا سبب یہی " غلط بخشی " ہے اور یہ جو لکھنؤ سے باہر ہر جگہ یہان کا زنانہ پن بدنام ہے، اس کی علت بھی اسی کو قرار دے سکتے ہین جس نے تو اعمل کو بیکار کر کے عورتون کی طرح مجہول زندگی کا عادی بنا دیا۔

مین یہان کے ایک بڑے وثیقہ دار سے ملنے گیا جنکی آمدنی گانون اور وثیقہ کی ملا کر ایک ہزار سے کم نہین ہے، آباد اجداد کا چھوڑا ہوا ایک عالیشان قصر بھی ہے موٹر بھی رکھتے ہین، حاجب دربان بھی موجود ہین، لیکن حالت یہ ہے کہ ان کے مکان کی فضا وہان کا ماحول اور ایک ایک چیز پر ادبار کا گہرا سوگ برس رہا ہے اور وہان پہونچتے ہی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاید خون کی روانی رگون کے اندر کم ہو گئی ہے - اور غنودگی سی رُوح پر طاری ہو رہی ہے - ان کے یہان کی محافل اس مین شک نہین کہ بڑی حد تک ان کے اسلاف کی یادگار ہین، وہی کبوتر و بٹیر کی لت وہی فسانۂ آزاد کے صف شکن خان بٹیر کی تعریف کرنے والے مصاحبون کا گروہ، وہی ارباب نشاط کا ہجوم اور وہی ذوق رقص و موسیقی، لیکن چونکہ حقیقتاً رُوح نشاط سے خالی ہے، اس لئے یہ تمام سامان بجائے مسرور کرنے کے میرے دل کو دُکھا رہا تھا اور حیران تھا کہ یہ لوگ جنھون نے تمام عمر ایک دن بھی اپنے جسم و دماغ کو محنت سے تھکا کر تفریح کے لئے آمادہ نہین کیا وہ کس طرح اس سے لطف حاصل کر سکتے ہین اور کیون نہین وہ ان تمام اسباب عیش و تفریح سے بیزار ہو کر خودکشی کر لیتے - اس مختصر سی صحبت مین کبوترون کے عجیب و غریب نام، ان کے سیکڑون اقسام، فن کبوتر بازی کی اصطلاحین، بٹیر بازی کے بہت سے رموز و نکات، موسیقی کے متعدد دل تڑپا دینے والے ٹکڑے، مصاحبون کی خالص لکھنوی ذہنیت کا پتہ دینے والی لکھنوی ٹکسالی زبان سبھی کچھ مین نے دیکھا اور سُنا، لیکن بالکل سرمایۂ اعتبار و بصیرت سمجھ کر اور پھر مجھ مین ہمت نہین ہوئی کہ دوبارہ اس المناک مسرت کا اذیت کوش لطف حاصل کرون

یہان کے وثیقہ دارون کی جماعت خواہ وہ ایک ہزار کا وثیقہ یاب ہو یا ایک روپیہ کا یکسان طور پر ایک ہی نسبت سے مقروض ہے - اور شب و روز ڈگریون کے خوف سے مکان کے اندر مقفل رہنا اس طبقہ کی مشہور خصوصیت ہے، صبح کو بالائی اور باقرخانی کا ناشتہ کرنا اور شام کو تھیٹر جانا (اگر بدقسمتی سے کوئی تھیٹر موجود ہو) خواہ بیگم کا کلی دار پاجامہ ہی کیون نہ علٰحدہ کرنا پڑے مشاہدات روزانہ مین داخل ہے جہانتک غذا کا تعلق ہے فصلی چیزون کے باب مین ان کی نزاکت " سو ہضم " کے حدود تک پہونچ جاتی ہے اور یہان کا نازک سے نازک تن نواب بھی جس کے متعلق مشہور ہے کہ مولی کا پتہ بھی پانون کے نیچے آکر زکام کا باعث ہو جاتا ہے،

جس وقت کاجر، سنگھاڑا، شکر قند کھانے پر آجاتا ہے تو محکمۂ حفظان صحت کے ملازمون کے لئے ایسا ناکافی ڈھیر چھلکون کا نہین چھوڑ جاتا کہ ان کی طرف سے تن آسانی کی شکایت پیدا ہو سکے، لباس یہان کی تمام لکھنوی آبادی کا تقریباً ایک ہی سا ہے، دوپلی سفید ٹوپی جس سے مقصود صرف مانگ کا چھپانا ہے، فیلبان سے لیکر فیل نشین تک ایک کے سر پر نظر آتی ہے، اچکن کا رواج بھی کثرت سے ہے لیکن بر کے پائنچے اب کم نظر آتے ہین اس کی جگہ چوڑیدار پاجامے نے لیلی ہے، بہ حیثیت مجموعی ان کی وضع سے ایک نوع کی نسائیت ضرور ظاہر ہوتی ہے، علی الخصوص اس وقت جب وہ فرط نزاکت سے "زیر قدمت ہزار جانست" کے قسم کی چال دکھانے پر آجائین۔ یہان سلام کرنیکا بھی مخصوص انداز ہے، سرو گردن کے ایک ایسے خم کے ساتھ جو پشت تک موثر ہوتا ہے، داہنے ہات کو سینہ کے محاذ مین لاکر ہتیلی اور انگلیون کو پورا پھیلاکر ناگہ کلائی کے جوڑ کو ڈھیلا کر کے مسلسل کئی بار جلدی جلدی جنبش دیتے ہین اور اس طرح سارے ہات مین تھرتھری پیدا کرنے کو رسم سلام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ مین نے غور کیا کہ کہین میرزا مظہر جانجانان نے اسی "ادائے کورنش" کا ذکر تو اس شعر مین نہین کیا

دل ازین تیغ بُردن آسان نیست آہ، مظہر خمِ سلام کسے

لیکن مین مطمئن نہ ہو سکا کہ لکھنوی اندازِ سلام واقعی اسی حد تک دلربا ہے۔

ہات جوڑ کر صدر درجہ اظہار عجز و انکسار کے ساتھ بات بات مین قبلہ، حضور کے الفاظ سے خطاب کرنا یہان آداب گفتگو کی خصوصیت مین داخل ہے اور اس مین شک نہین کہ بڑی حد تک مردم فریب بھی ہے، لیکن تجربہ کرنے کے بعد وہ ایک غیر حقیقی نمائش سے زیادہ کوئی چیز نظر نہین آتی۔

یون تو ہر جگہ ایک انسان کی اندرونی اور بیرونی اخلاق و معاشرت مین فرق ہوتا ہے، لیکن لکھنؤ مین یہ فرق حد سے متجاوز ہے آپ ایک شخص کو دیکھتے ہین کہ نہایت صاف ستھرے کپڑے پہنے چوک سے گزر رہا ہے اور آپ اس کی صفائی سے بہت متاثر ہوتے ہین، لیکن اس کا گھر کسی طرح مزبلہ سے کم نہ ہوگا اور وہان کی ایک ایک چیز سے آپ کو اس کی گندگی و عفونت کا ثبوت ملیگا۔ آپ دوسرے شخص کو دیکھتے ہین کہ نہایت ہی انکسار سے ہات جوڑ کر گفتگو کر رہا ہے، لیکن اس کے معنی صرف یہ ہین کہ وہ ایک لفظ بھی صحیح معنی مین استعمال نہین کرتا اور آپ سے جدا ہونے کے بعد اتنی ہی گالیان دیگا جتنی تعریف آپ کے سامنے کر گیا ہے۔ یہان کی معاشرت مین کذب و دروغ، مکر و فریب اس درجہ سرایت کر گیا ہے کہ اس کے معیوب ہونے کا احساس ہی محو ہو گیا ہے اور وہ اس طرح کام نکال لینے کو فراست و ہوشیاری سے تعبیر کرتے ہین یہان کے معمولی سودا بیچنے والون کا یہ حال ہے کہ جس چیز کی قیمت وہ پانچ روپیہ کہہ رہے ہین، اس کو وہ نہایت آسانی سے ایک روپیہ بلکہ اس سے بھی کم مین دیدینگے۔ چنانچہ یہان کا ایک قصہ مشہور ہے کہ ایک اجنبی نخاس گئے وہان ایک آدمی ٹوپی کا بٹا بیچ رہا تھا۔ وہ ان کی وضع و صورت دیکھ کر بھانپ گیا کہ اجنبی (یا لکھنوی زبان مین گنوار) ہین۔ انھون نے بٹے کی قیمت دریافت کی، اسنے اپنی تمام دلفریب اداؤن کے ساتھ کہا کہ "حضور یہ بٹا ہے تو نہایت قیمتی۔ بارکے محمد علی خان کے ہات کا کشید کیا ہوا اور انھین کے صاحبزادے میان احمد علیخان کے ہات کا گڑھا ہوا ہے۔ حضور شاید واقف ہونگے کہ یہ محمد علیخان وہی ہین جن کے کشید کئے ہوئے اور کاڑھے ہوئے

رومال ولایت جاکر ہزارون مین بکتے ہین۔ وقت پڑگیا ہے اس لئے جدا کر رہا ہون، ورنہ اسی قسم کے پلے کل ہی منولال بزاز نے ایک رئیس کے ہات دس دس روپیہ مین بیچے ہین۔ آپ سے مین صرف پانچ روپیہ لیلونگا۔ زرا حضور ملاحظہ تو فرمائین کہ کیا چیز ہے، ایک ایک پتی مُنہ سے بول رہی ہے، پلا کیا ہے چمن کھلا ہوا ہے" وہ غریب ایک نگاہ دیکھنے کے بعد چلے گئے کچھ دور چلے ہونگے کہ اسنے پھر آواز دی کہ "اے حضور کیا آپ خفا ہوگئے، اچھا تو یارون کی چھوٹ بھی دیکھتے جایئے۔ اور آٹھ ہی آنے دلوایئے" وہ حیران رہگیا کہ یہ کیا تماشہ ہے اور لوٹ کر قیمت ادا کی اور پلا لے لیا۔ جب وہ جانے لگا تو اس نے ہنسکر کہا کہ "آپ زیادہ افسوس نہ کرین، اس تم مین بھی چار آنے یارون کے کہین نہین گئے"

یہ قصہ غلط ہو یا صحیح لیکن اس سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ یہان کے ذہنیت کیا ہے اور اہل لکھنؤ سے معاملہ کرنا کسقدر خطرناک امر ہے

لکھنؤ کے دو حصے ہین ایک مشرقی جو امین آباد سے شروع ہوکر حضرت گنج بلکہ صدر تک چلا گیا ہے اور دوسرا مغربی حصہ جو رکابگنج کے بعد سے شروع ہوکر قریب قریب سعادت گنج تک چلا گیا ہے۔ پہلا حصہ وہ ہے جسے اہل لکھنؤ، لکھنؤ سے علحدہ سمجھتے ہین اور یہان کی آبادی کو گھسیارون، خانساما ؤن، کی آبادی کہتے ہین۔ مغربی حصہ خالص لکھنؤ کہلاتا ہے اور نوابون، وثیقہ دارون، طبیبون، شاعرون، افیونیون اور دستکارون کی آبادی اس حصہ مین زیادہ ہے اور بہت سے لکھنوی تجربات یہین کی گلیون مین پھرنے سے حاصل ہوتے ہین۔ اس حصہ مین امام باڑے اور عزاخانے بھی ہین یہین بٹیرون کی پالیان قایم ہوتی ہین اسی جگہ کنکوے لڑتے ہین اور یہین شیعہ سنی علماء کا مخزن ہے

ہر چند مجھے اس حصہ کے مطالعہ کا کم وقت ملا، لیکن اس قلیل فرصت مین بھی یہ نتیجہ نکالنا میرے لئے دشوار نہ تھا کہ وہ جراثیم جو نوابان اودھ کے عہد مین پیدا ہوگئے تھے وہ ہنوز مختلف صورتون مین یہان پائے جاتے ہین اور تا وقتیکہ یہ سارا حصہ برابر نہ کردیا جائے بقول آتش "زمین کے نشیب و فراز کا دھبہ مٹنا" بالکل محال ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ اگر زندگی کا صرف لاعبانہ پہلو پیش نظر ہو تو بلا خوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ

خدا آباد رکھے لکھنؤ کو پھر غنیمت ہے

اہل لکھنؤ کی گفتگو یقیناً اہل دہلی سے زیادہ شایستہ، شگفتہ نرم اور دلچسپ ہوتی ہے، دہلی پنجاب کے لب و لہجہ سے متاثر ہوکر اپنی خصوصیات زبان کو کھو چکی ہے اور لکھنؤ باوجود اس کے کہ بڑا حصہ یہان کی آبادی کا دہقانیون اور پوربیون پر مشتمل ہے، ابھی تک اپنی خصوصیات زبان کو سنبھالے ہوے ہے لیکن غلطی ہوگی اگر اس زبان کو کوئی علمی درجہ دیا جائے یا اس کو شعر و شاعری مین استناداً پیش کیا جائے کیونکہ ہر ملک کی علمی زبان بازاری یا کاروباری زبان سے علحدہ ہوتی ہے اور شاعری کی لطافت خیال بھی ایک مخصوص انداز بیان کی محتاج ہے جس کو روزمرہ یا کسی مختص المقام محاورہ سے صرف اس حد تک سروکار ہو سکتا ہے کہ وہ شعر خود کوئی ٹکنکل یا اصطلاحی حیثیت نہ اختیار کرے

مین ہرچند شاعر نہین ہون لیکن "عالم بالا" سے زیادہ "شعر فہمی" کا مدعی ضرور ہون اور اس بنا پر اگر لکھنؤ آنے کے بعد میرے اندر یہان کے محافل شعر وادب، یہان کے اکابر شعراء سے ملنے کا ولولہ پیدا ہوا تو بیجا نہ تھا یون تو رسایل کے ذریعہ سے مین یہان کے بعض شعراء اور اڈیٹرون سے واقف ہو چکا تھا لیکن جی چاہتا تھا اور بالکل بے اختیارانہ طور پر کہ ان سے خود ملون اور ان کی باتین سنون اور ان کا مطالعہ زیادہ قریب سے کرکے کسی نتیجہ پر پہونچون۔ اجنبی ہونے کی حیثیت سے مجھے اس کی تکمیل مین ضرور کچھ نہ کچھ دشواریان اٹھانا پڑین، لیکن نہ اسقدر کہ انکا ذکر ضروری ہو

شام کا وقت تھا، امین آباد پارک کے سبزہ پر تنہا بیٹھا ہوا صبح آیندہ کا پروگرام مرتب کر رہا تھا کہ دو صاحب جن مین سے ایک دُہرے بدن کے اوسط قد والے اور دوسرے اکہرے جسم کے پستہ قامت شخص تھے مجھ سے کچھ دُور آکر بیٹھ گئے اور گفتگو کرنے لگے انکی گفتگو کا موضوع یکسر ادبی تھا اور وہ کسی غزل پر تنقید کر رہے تھے۔ مین جسارت کرکے اٹھا اور قریب جاکر عرض کیا کہ "اگر دو شاعرون کے درمیان کسی غیر شاعر وجود کو برداشت کیا جاسکتا ہے تو براہ کرم مجھے اجازت دیجئے کہ قریب سے آپ حضرات کی گفتگو سنون اور نووارد سیاح ہونے کی حیثیت سے آپ کی اعانت چاہون" اس کا جواب وہی ملا جو ملنا چاہئے لیکن بجائے اس کے کہ وہ اپنے سلسلۂ گفتگو کو جاری رکھتے، انھون نے خود میرے حال کی تحقیق شروع کردی۔ مین نے نہایت سنجیدگی سے جواب دیا کہ "میرا نام لیخ تھدرپے، کرۂ مریخ کے ایک شہر منہنعکاز کا رہنے والا ہون، آج ہی صبح بغرض سیاحت مافوق البنفسجی شاعون پر سوار ہوکر یہان آیا، تمام دن اس کوشش مین صرف ہوگیا کہ انسان بنکر باہر نکلون کرۂ زمین کا باشندہ ہونے کی حیثیت سے تفریح کرون لیکن پہلے تو گھنٹون یہی فیصلہ نہ کرسکا کہ یہان کی بہترین معیاری صورتِ انسانی کیا ہوتی ہے۔ کبھی ضرورت سے زیادہ ناک لمبی ہوگئی کبھی دہانہ ایک کان سے دوسرے کان تک پھٹ کر رہگیا، کبھی ابرو آنکھ کے نیچے پنہنچ گئی اور کبھی ہونٹون کے اوپر، الغرض بڑا وقت تو اسی تعمیری کام مین خراب ہوا آخر کار مین نے یہ فیصلہ کیا کہ آنکھ بند کرکے بیٹھ جاؤ اور پھر آنکھ کھولنے کے بعد جو شخص سب سے پہلے نظر آجائے اس کا نمونہ طیار کرو۔ ہرچند میرا یہ فیصلہ درست نہ تھا کیونکہ جس وقت مین نے اسپر عمل کرکے اپنے آپ کو انسان بنایا اور سڑک پر نکلا تو کسی نے پشت سے آواز دی کہ "جالب صاحب، جالب صاحب" اور اب مین سمجھا کہ کسی دوسرے کی صورت بننا بہت ذمہ داری کا کام ہے اس لئے مین گھبرا کر ایک گلی مین ہوگیا اور خود ہی اپنی ذہانت سے کام لیکر دوسری فرضی صورت اختیار کرکے یہان بیٹھا ہی تھا کہ آپ حضرات تشریف لے آئے"

مین نے یہ گفتگو صرف اس لئے کی تھی کہ تمام منازل تکلف دفعۃً دُور ہوجائین اور مین جلد سے جلد ان کی آزاد صحبت دگفتگو مین شریک ہوسکون۔ چنانچہ مین اس مین کامیاب ہوا اور اسی وقت شام کو ان مین سے ایک صاحب مجھے اپنے گھر لے گئے اور دیر تک ان سے گفتگو ہونے کے بعد یہان کے شعراء سے ملنے کا پروگرام مین نے طیار کیا۔

(باقی)

ایجاز و اطناب

۴۱۔ مساوات ؎ تم مرے پاس ہوتے ہو گویا — جب کوئی دوسرا نہین ہوتا
۴۲۔ تطویل ؎ نہ جاؤنگا کبھی جنت مین مین نہ جاؤنگا — اگر نہوے گا نقشہ تمھارے گھر کا سا
۴۳۔ اطناب بہ شکل اعتراض تہدید کے لئے ؎
ہم نکالین گے سن اے موج ہوا بل تیرا — اس کی زلفون کے اگر بال پریشان ہونگے

علم بیان

۴۴۔ مشبہ اور مشبہ بہ حسی حس کا تعلق حس سامعہ سے ہے
دمِ مصاف ترے دشمنون کے لشکر مین — صدائے نوحہ و شیون ہے شور و غلغل کوس
۴۵۔ مشبہ اور مشبہ بہ حس ذائقہ کے متعلق ؎
جھوٹی شراب اپنی مجھے مرتے دم تو دے — یہ آب تلخ شربت قند و نبات ہے
۴۶۔ مشبہ حسی اور مشبہ بہ عقلی
بات کرنے مین رقیبون سے ابھی ٹوٹ گیا — دل بھی شاید اسی بدعہد کا پیمان ہوگا
۴۷۔ مشبہ عقلی اور مشبہ بہ حسی
رنگینی بزم کا بندھا دھیان — جون بوے گل اُڑ گئے سب اوسان
۴۸۔ وجہ شبہ واحد حسی ؎ بادہ کش ایسی تلخ کام کہے — کفِ مارِ سیہ مئی احمر
۴۹۔ مشبہ اور مشبہ بہ عقلی ؎ رکھے مجھ کو جیسا مین اسکو عزیز — نہ معشوق و عاشق مین ہوئے تمیز
دوسرا شعر عیش وطن اندوہِ غریبان — دستِ جنون سے چاک گریبان
۵۰۔ وجہ شبہ متعدد ؎ بار انداز ہوا روزِ سفید — نکلی وہ گھر سے کہ نکلا خورشید
۵۱۔ غرض تشبیہ اک داغِ سیاہ خال سا تھا — یہ لطفِ فغان شعلہ زا تھا
۵۲۔ غرض تشبیہ سے لاغری مقصود ہے۔ جیسے شجرِ خزان رسیدہ — یہ حالتِ قامتِ خمیدہ
۵۳۔ شبہ سے غرض ہجو نفس اجل تصویر دیا تھی — صورتِ فتنہ شکل بلا تھی
بات مین وہ آواز مسلسل — صور کا جیسے نفخہ اول
۵۴۔ تشبیہ سے مشبہ بہ کی شان ظاہر کیجاتی ہے اسکو اظہار مطلوب کہتے ہین
صورت وہی عظمت وہی گردش وہی گیتی — حیران ہے کہ یہ چرخ ہے یا آبلہ اپنا
۵۵۔ حرف تشبیہ "جون" سے مشبہ اور مشبہ بہ ایک دوسرے کے عین سمجھے جاتے ہین

گاہ آوازِ خوش سنا دینا — جون سحر گاہ مسکرا دینا

۵۶- تشبیہ قریب — لبریز بہارِ صد جنون تھا — ہر سنگ وہان کا بے ستون تھا

۵۷- تشبیہ مفصل — دُردِ شراب و سختی قاتل — تلخ سخن مانند ہلاہل

۵۸- تشبیہ مجمل — داغ اس کے زبس مثالِ گل تھے — تھے ہاتھ کہان نہالِ گل تھے

۵۹- وجہ شبہ پوشیدہ — ہے رگِ خواب سے غفلت محسوس — ہو گئی طرزِ تجاہل کابوس

۶۰- صرف وصفِ مشبہ مذکور ہو۔ — تھی پشت خمیدہ یا کمان تھی — تھا تیر کہ آہِ خونچکان تھی

۶۱- تشبیہ کفایہ — ابرِ رحمت تپِ عذاب الیم — سایہ نادرِ احتراقِ جحیم

استعارہ

۶۲- استعارہ غیر متعارف — دشمن مومن رہے یہ بت سدا — مجھ سے مرے نام نے یہ کیا کیا

۶۳- وجہ جامع

در نایاب تو کیا خاک سے بھی منہ نہ بھرے — جس کے در پر مین کرون لوے شاداب نثار

۶۴- طرفین استعار اور مستعار لہ کا حسّی ہونا — ہے مجھے بھی خیالِ طوفِ حرم — خضرِ رہ گر ہو فضلِ رحمانی

۶۵- مستعار لہ اور مستعار منہ حسّی

اے غارتِ جان و جانِ مومن — اے آفتِ خان و مانِ مومن

۶۶- شبہ فعل مین استعارہ

خندہ زن کس کا ہوا زخمِ درون — شدّتِ گریۂ مرنہان کیون ہے

۶۷- کبھی مضاف الیہ سے استعارے کا فائدہ حاصل ہوتا ہے — ساقیا زہر پلا دے مجھ کو — شربتِ مرگ چکھا دے مجھ کو

۶۸- اقرار ہے صاف آپ کے انکار سے ظاہر — ہے مستی شب نرگسِ میخوار سے ظاہر

آنکھ کا استعارہ نرگس سے کرکے آنکھ کے مناسب مستی اور بیخودی کا ذکر کیا ہے

۶۹- استعارہ بالکنایہ

لطف سے اس کے زمین غیرتِ باغِ فردوس — خلق سے اس کے زمان رشکِ دکانِ عطار

۷۰- استعارہ تخییلیہ

ہان جوشِ تپش چھیڑ چلی جائے کہ پرتو — جھڑ جائینگے فرسودہ اگر دام نہ ہوگا

۷۱- مجاز مرسل مین جو لفظ سبب کے واسطے موضوع ہو اس کو سبب پر استعمال کرین۔

ساقیا دے چک آبِ آتش رنگ — گرم و سردِ زمانہ سے ہون تنگ

۷۲- کنایہ کی تصریح سے

چاک پردہ سے یہ غمزے ہین نواے پردہ نشین ایک مین کیا کہ سبھی چاک گریبان ہون گے

۷۳- خون کے میرے ارادہ سے ہوا ذابح سعد قتل پر میرے کمر باندھے یہ شکل جبّار

سعد ذابح سے قمر کی بائیسوین منزل مراد ہے سے

۷۴- وہ قہرمان فلک توسن و نجوم حشم کہ ترکِ چرخ غلام اس کا مہرجا کرہے

بترکِ چرخ مریخ سے کنایہ ہے۔

۷۵- کنایہ قریب سے

مو سفیدی کے قریب اور ہے غفلت مومن نیند آتی ہے بہ آرام مگر آخر شب

۷۶- تعریض سے

مین ہی تو رہا ہون کہین شب سرخوش و خرم مین نے ہی تو کی بادہ کشی غیر سے باہم

۷۷- رمز سے بیٹھین لب آب جو پہ اکدم پہونچائین سبو سبو پہ اکدم

علمِ بدیع

۷۸- تجنیس تام مماثل سے

یوسف سے عزیز کو کئی سال زندانِ عزیز مین پھنسایا

۷۹- تجنیس مرکب مفروق سے

وان سے جواب صاف ہی لائی بات بنائی پر نہ بن آئی

۸۰- تجنیس زائد و ناقص سے

ہم نکالین گے سُن اے موجِ ہوا بل تیرا اسکی زلفون کے اگر بال پریشان ہونگے

۸۱- تجنیس مضارع سے

بن ترے بزمِ سور مین ہین یہ قیامتین کہ ہے نغمۂ صور کا اثر نغمۂ نے نواز مین

صور اور سور مین تجنیس مضارع ہے

۸۲- تجنیس لاحق سے

سرمۂ تسخیر سے ہم خود مسخر کیون نہ ہون آنکھ کی پتلی جو تھی جادو کا پتلا بن گیا

۸۳- صنعت شبہ اشتقاق سے

کیا کیا جلی ہے بزم مین تجھ بن نہ جب پھرے پروانے شمع شعلہ شمائل کے آس پاس

۸۴- ردالعجز علی الصدا مع تکرار سے

دل ایکی بار ہوا ایسی بے جگہ مائل — کہ جان کو بھی ٹھکانے لگا رکھے کا دل

۸۵- ردالعجز علی الحشو مع الاشتقاق

ہے طبع مین ہر روز فزدون رنج فزائی — اپنے مین سماتے نہین کیا دل مین سمائی

۸۶- صنعت سیاق الاعداد سے

جز نہ سپھر ہین۔ مرے دشمن تو اور بھی — لیکن بڑے غضب یہی دو تین چار ہین

۸۷- صنعت معما سے

کیفیتِ وصال بس اب کچھ نہین رہی — کیونکر نہ ہون ملول مین شب کچھ نہین رہی

شب کے معنے رات کے ہین عربی مین لیل کہتے ہین، الفاظ ملول مین سے لیل نکالا مومن رہگیا۔

۸۸- صنعتِ لغز سے

نہ بولے وہ جب تک کہ کوئی بولائے — نہ لفظ اور معنی سمجھ مین کچھ آئے — شب روز غوغا مچایا کرے — اسی طرح سے مار کھایا کرے

اس لغز یا پہیلی سے گھڑیال مراد ہے

صنائع معنوی

۸۹- طباق ایجابی سے

جب تلک باعثِ نشاط و ملال — ہے وصال و فراق جانانی

۹۰- طباق سلبی سے — بات اپنی وہان نہ جمنے دی — اپنے نقشے جمائے لوگون نے

۹۱- صنعت تشابہ الاطراف سے

زبان گنگ ہے عشق مین گوش کرے — برا سنتے سنتے بھلا کہتے کہتے

۹۲- صنعتِ ارصاد سے

غیر بیمروت ہے آنکھ وہ دکھا دیکھین — زہر چشم دکھلائین پھر ذرا مزا دیکھین

کچھ نظر نہین آتا آنکھ لگتے ہی ناصح — گر یقین نہین حضرت آپ بھی لگا دیکھین

۹۳- صنعت تجرید سے — سوزِ غضب سے ہے گرہ نار سینے مین — اک مشتِ خاک ور یکین لے فلک دریغ

۹۴- صنعتِ مقابلہ سے — ہون مین سیہ روز کہ وہ شمع رو — شام کو آیا تھا سحر کر گیا

۹۵- صنعت تجاہل عارفانہ سے

تارے آنکھین جھپک رہے تھے — تھا بام پہ کون جلوہ گر رات

عام طور سے بدل جاتی ہے - فتح کیلئے جنگ لازمی ہوتی ہے اور پھر اُسکے قیام کیلئے انتظام کی - اور ان دونون باتون کے لئے جدید طرز حکومت اور مستحکم مالی حالت لازمی ہیں - ہندوستان میں سلطنت انگلینڈ کی سب سے بے نظیر خصوصیت یہ ہے کہ ہندوستان اور انگلینڈ کا رشتہ اتحاد بالکل ہی بے حقیقت ہے - بالفاظ دیگر انگلینڈ ہندوستان کے ردعمل کی زد سے باہر ہے - میں بیان کرچکا ہون یہ صورت کیونکر پیدا ہوئی - میں نے واضح کیا ہے کہ ہم نے ہندوستان کو اس طرح حاصل کیا کہ ہمکو کوئی قیمت اسکی نہین دینا پڑی - انگلینڈ اگر ایک ریاست کی حیثیت سے سلطنت مغلیہ کو تہ و بالا کرنے پر کمربستہ ہوتا تو خود اسکا نظام اسی طرح تباہ ہوجاتا جسطرح رومہ کا فتح یورپ کی سعی میں ہوگیا - کیونکہ اس صورت مین انگلینڈ کیلئے ازبس ضروری ہوتا کہ وہ اپنے کو ایک اعلی درجہ کی فوجی سلطنت میں تبدیل کرے لیکن چونکہ سلطنت ہند چند انگریزوں نے بدامنی کے زمانہ میں وہاں کے حالات پر قابو حاصل کرکے قائم کی اور اُنسے انگلینڈ کو ورثہ میں ملی اسوجہ سے اُس کے خانگی معاملات میں زیادہ گڑبڑی نہیں ہوی - اسمیں شک نہیں کہ اسکی بدولت انگلینڈ کی خارجی حکمت عملی میں ایک حد تک تبدیلی پیدا ہوگئی ہے لیکن خود انگلینڈ کی اندرونی حالت میں کوئی تغیر نہیں پیدا ہوا - اس معنی میں ہندوستان، انگلینڈ پر اتنا ہی کم اثر انداز ہوتا ہے جتنا وہ نئی سلطنتین جنکا حال ہی میں الحاق ہوا ہے - مثلاً ہنےور (Hanover) اور ہالینڈ (Holland) اس مثال میں تمدن اعلی کا اثر تمدن ادنی پر زوردار اور مسلسل پڑتا ہے لیکن یہ بات رومن یا یونانی سلطنت کو مشرق میں نہیں حاصل تھی - اُن صورتون میں تمدن ادنی نے تمدن اعلی کو جوں ہی اسنے اول الذکر کو اپنی سطح پر لانا چاہا فنا کردیا - یونانیت نے مشرق کو ڈھک لیا لیکن خود یونان کی عظمت ہمیشہ کیلئے رخصت ہوگئی - تمام قومیں رومن شہریت میں جوق درجوق شامل ہوئیں لیکن اصلی رومنون کا کیا حشر ہوا - برخلاف اسکے انگلینڈ اس جوہر کی کمی سے جو اِس سے نکل جاتا ہے مطلق ضعیف نہیں ہوتا - وہ ہندوستان کو عہد وسطی سے نکال کر عہد جدید میں لانا چاہتا ہے - اس کام میں اُسکو دقتون اور خطرون کا سامنا کرنا پڑتا ہے لیکن انگلینڈ کو اس بات کا مطلق اندیشہ نہیں ہے کہ ہندوستان اسکو نیچی سطح پر کھینچ لائیگا یا ایک لمحہ کیلئے اُسکی ذاتی ترقی میں حارج ہوگا -

یہ ہے انجام لیکن ایک عرصہ تک کسی کو یقین نہیں تھا کہ اس انجام کی نوعیت یہ ہوگی - برطانوی ہند کی تاریخ میں دو باب نہایت دلچسپ ہیں بلکہ میرا تو خیال ہے کہ ساری دنیا کی تاریخ میں ان سے زیادہ سبق آموز کوئی باب نہیں ہوگا - پہلا باب ہمکو بتاتا ہے کہ کس طرح ہندوستان کی طرف سے انگلینڈ کو مضرت رسان ردعمل سے محفوظ رکھا گیا اور دوسرا یہ کہ کس طرح بہت پس و پیش کے بعد قصداً یورپین تہذیب کا بار ہندوستان کے سینہ پر ڈالا گیا - پہلا باب جارج سوم کے عہد نصف اول پر حاوی ہے - یہ زمانہ تاریخ انگلینڈ میں نہایت ہی پر آشوب اور غیر مستقل تھا کیونکہ اُسی وقت ایک طرف امریکہ ہاتھ سے گیا اور دوسری طرف ہندوستان ہاتھ آیا - اسمین کلایو اور ہسٹنگز کا عہد داخل ہے اسکے آخر میں لارڈ کارنوالس کا عہد حکومت ممتاز ہے جو ۱۷۸۵ء سے شروع ہوا - دوسرا باب موجودہ صدی کے ابتدائی چالیس سالون پر حاوی ہے اور

اس عہد کا ممتاز اور آخری نقطہ لارڈ ولیم بنٹنگ کی گورنر جنرلی ہے۔ کیونکہ ہندوستان میں لارڈ کارنواس اور لارڈ ولیم بنٹنگ دو ہی اعلیٰ درجہ کی قانون ساز ہستیاں گذری ہیں جس طرح کہ کلایو کے بعد لارڈ ولزلی۔ لارڈ ہسٹنگز۔ اور لارڈ لہوزی تین بڑے بڑے فاتح گذرے۔ چونکہ ہندوستان میں ہم تمدن کی رفتار ترقی پر غور کرتے ہیں یہ دو بڑی قانون ساز ہستیاں ہماری کمال توجہ کی مستحق ہیں

پہلے ہمکو دیکھنا چاہئے کہ شروع میں کس طرح ہندوستان کی جانب سے رد عمل کا خطرہ پیدا ہوا اور پھر کس طرح اسکا دفعیہ کیا گیا۔ اٹھارھویں صدی کے سنہ ۸۰ و سنہ ۹۰ کی تمام تحریرون مین وہ خوف نہایت ہی دہشتناک ہے جسکا اظہار برک نے وارن ہسٹنگز کے خلاف اپنی تقریروں میں کیا تھا۔ اسوقت انگلینڈ ہندوسیاست کے غار عمیق میں کود پڑا تھا۔ اُسوقت انگریز مسلمان نوابون کے وزیر مال یا نوابی فوجون کے سپہ سالار مقرر ہوتے تھے اور انگلینڈ میں سلطنت مغلیہ کا مال غنیمت لالا کر بھر رہے تھے۔ اُسوقت ہمارے لئے دو خطرات تھے ایک تو یہ کہ مبادا انگریزی عادات خراب ہو جائیں کیونکہ وہ لوگ بھی جو ہندو عادات کے مداح ہیں یہ تسلیم کرینگے کہ گذشتہ صدی میں ہندو سیاست نہایت ہی ناگفتہ بہ اور مذموم تھی۔ اور دوسرا خطرہ یہ تھا کہ وہ مالدار اولو العزم اشخاص جو ہندوستان سے لوٹ کر ایشیائی خیالات ساتھ لیکر انگریزی سیاسی زندگی میں داخل ہوتے تھے، مبادا اُسکے نظام ترکیبی کو درہم برہم کردیں۔ یہ خطرہ اسوقت خاص طور سے تھا کیونکہ اس زمانہ میں پارلیمنٹ کی بہت سی نشستین ایک طور سے فروخت ہوتی تھین۔ علاوہ ازین اس وقت حکومت کی سب سے بڑی طاقت کا ذریعہ سیادت تھی۔ لہذا یہ اندیشہ رہتا تھا کہ ممکن ہے کوئی فریق ہندوستان کی سیادت پر نہ چھاپا مار بیٹھے اور یہ دولت ایسی تھی کہ چاہے بادشاہ کو ملتی یا وگ پارٹی (Whig) کو اسکا پانے والا قوت اعلیٰ کا مالک ہو جاتا

اس خطرہ کا ایک نمونہ دینے کے خیال سے جو اُسوقت کے سر برآوردہ اشخاص کو لاحق تھا میں تمھارے سامنے ایک پارہ ولیم پٹ (Pitt) کی اس تحریک سے پڑھکر سناؤنگا جو اُسنے اصلاح پارلیمنٹ کی غرض سے سنہ ۱۷۸۲ء میں پیش کی تھی۔ وہ کہتا ہے "ہمارے قوانین میں بخیال رقابت یہ قاعدہ ہے کہ کوئی غیر ملکی شخص پارلیمنٹ کے نمایندہ کو ایک ووٹ نہ دے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ غیر ملکی والیان ریاست نہ صرف ووٹ دیتے ہیں بلکہ پارلیمنٹ کی نشستین خریدتے ہیں، اور اپنے ایجنٹون کو بحیثیت نمائندہ قوم ہمارے برابر بیٹھنے کیلئے بھیجتے ہیں۔ میں جس امر کی طرف اشارہ کر رہا ہون اُسکے سمجھنے میں کسی کو دقت نہیں ہوگی۔ ہمارے درمیان راجہ تنجور اور نواب ارکاٹ کے ممبران بیٹھے ہوئے ہیں جو چھوٹے چھوٹے مشرقی مستبد حکمرانوں کے نمائندے ہیں۔ یہ بات اب عام طور سے مشہور ہے لوگ کھلے میدان اسکا تذکرہ کرتے ہیں لیکن لاپرواہی سے کوئی انکی طرف توجہ نہیں کرتا۔ ہماری بے عزتی روز روشن کی طرح نمایاں ہے۔ اب تو یہ اسقدر عام بات ہو گئی ہے کہ کسی کو اسپر مطلق حیرت نہیں ہوتی۔ اب یہ ایک معمولی بات سمجھی جاتی ہے کہ چند برطانوی راے دہندگان نے اپنے ووٹ بے ایمانی سے رشوت لیکر غیر ملکی حکومتون کے ہاتھ فروخت کردئے یا یہ کہ ہمارے سینٹ کے بعض ممبران کسی غیر ملکی مستبد کے اختیار میں ہیں، اور یہ کہ ہمارے مبعوثین برطانوی

اوصاف حمیدہ کے نہیں بلکہ مشرق کے ذمائم اور بدکاریوں کے نمائندے ہیں

اس کشاکش کے قابل ذکر واقعات یہ ہیں، فاکس ([illegible]) کے انڈیا بل پر کولیشن منسٹری Coalition minis کی شکست، اور پٹ ([illegible]) کے انڈیا بل کا منظور ہونا، وارن ہسٹنگز پر مقدمہ چلایا جانا، لارڈ کارنوالس کا اسکی جگہ گورنر جنرل ہونا اور ہندوستان میں اسکا انتظامی اصلاح جاری کرنا۔ میں صرف ان واقعات کی طرف اشارہ کررہا ہوں تاکہ انکی اہمیت کا اندازہ ہوجاے اور معلوم ہوجاے کہ اُن سے کیسے کیسے نتائج رونما ہوے۔ اگر میں تفصیل میں جاتا تو تمکو دکھا سکتا تھا کہ فاکس کے انڈیا بل پر جو اسقدر شور شغب مچایا گیا اور ہسٹنگز کے خلاف جو اسقدر شدید حملے کئے گئے ان میں کس حد تک نامعقولیت تھی۔ میں اُس دوگانہ حکمت عملی پر بھی اعتراض کرسکتا تھا جو پٹ کے انڈیا بل نے ہندوستان میں جاری کی لیکن اگر وسعت نظر سے دیکھا جاے تو یہ تسلیم کرنا پڑیگا کہ خاص خاص خطرات سے کامیابی کیساتھ نجات مل گئی اور لارڈ کارنوالس نے خراج احسانمندی اور اڈمنڈ برک نے عزت و آرام حاصل کیا۔ کیونکہ لارڈ کارنوالس کے عہد حکومت میں کمپنی کے دامن سے بداخلاقی کا دھبہ جادو کی طرح دور ہوگیا، گورنر جنرلوں کو ایک کبھی نہ فراموش کرنے والا سبق سکھا دیا گیا اور ساتھ ہی ساتھ ہندوستان کے تعلق سے جو سیاسی خطرہ تھا وہ گذر گیا

انگلینڈ نے ان زنجیروں کو جنسے اُسے مقید ہونے کا خطرہ تھا توڑ دیا۔ یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ انگلینڈ جس نے اس سختی کیساتھ ہندوستان کا اثر قبول کرنے سے انکار کردیا، ہندوستان پر اپنا اثر ڈالنے میں کہاں تک حق بجانب تھا۔ ہم اچھی طرح سے محسوس کرتے تھے کہ ہماری اور ہندوستان کی تہذیب میں زمین آسمان کا فرق تھا، ہماری تہذیب کو بحیثیت مجموعی ترجیح حاصل تھی، لیکن کیا ہمکو ہندوستانیوں سے اپنے خیالات منوانے کا کوئی حق تھا۔ ہمارا مذہب، فلسفہ، تاریخ اور سب کچھ مختلف تھا۔ کیا۔ کیا ہندوستانیوں کے ساتھ ہمارا صریح معاہدہ نہیں تھا کہ یہ تمام چیزیں ہم سرکاری طور سے اُن سے علٰحدہ رکھینگے۔ شروع شروع میں لوگوں کا یہی خیال تھا۔ یہ عام طور سے مسلمہ تھا کہ انگلینڈ اپنی سلطنت کیساتھ وہ کھیل نہیں کھیلیگا جو روما نے کھیلا تھا۔ نہیں بلکہ اسے اپنی تہذیب ایک طرف رکھکر ہندوستان پر ہندوستانی نقطۂ خیال ہی سے حکومت کرنا چاہئے تھا۔ جوں جوں پہلی نسل کے اینگلو انڈینوں پر علم سنسکرت کی جدید اور موہوم دنیا کھلتی جاتی تھی ان کے اندر یہ خیال تقویت حاصل کرتا جاتا تھا۔ وہ ایک قدیم فلسفہ اور خیالی تاریخ سے مسحور ہوگئے تھے، گویا ایک طرح وہ برہمنیت میں داخل ہوگئے تھے، اور نہیں چاہتے تھے کہ اپنی مسحور مشرقی چہاردیواری کے اندر عیسائیت یا کسی اور مغربی علوم کو داخل ہونے دیں

اس لکچر میں اب اتنی گنجائش نہیں کہ اجمال سے بڑھکر میں تفصیل میں پڑوں صرف اتنا اشارہ کرنا کافی ہوگا کہ کیونکر بتدریج ہم اس خیال کو چھوڑتے گئے اور بلاخوف اپنے کو بحیثیت اوستادان تہذیب" اور " متمدن گر" پیش کردیا یہ تبدیلی ۱۸۱۳ء میں شروع ہوئی جب کمپنی کے عہدنامہ کی تجدید کیوقت ایک رقم قدیم علوم کے احیاء اور کارآمد فنون و علوم جدید کے اجراء کے لئے منظور ہوی۔ اس قانون پر ایک تعلیمی کمیٹی ۲۰ برس تک بحث کرتی رہی کہ آیا علوم و فنون کو مشرقی نقطۂ خیال سے ہمیں سمجھنا چاہئے تھا یا اپنے معتقدات کی روشنی میں

آیا ہمکو سنسکرت اور عربی کی تعلیم دینا چاہئے تھی یا انگریزی کی

روے زمین پر اس سے زیادہ اہم مسئلہ پر کبھی بحث نہیں ہوی ہوگی۔ سنہ ۱۸۳۵ء میں لارڈ ولیم بنٹنگ کے عہد حکومت میں یہ بحث زوروں پر تھی، اُسوقت حسن اتفاق سے ایک ایسا مشہور شخص موجود تھا جسکی وجہ سے اس قابل یادگار بحث کو بڑی آب وتاب حاصل ہوی۔ یہ لارڈ میکولے کی رائے تھی جس نے کہ اس بحث کا انگریزی کے حق میں فیصلہ کیا۔ میکولے کی اس یادداشت میں یا سر ہی۔ بڑے ولبن ([illegible]) کی کتاب "ہندوستان میں مسئلہ تعلیم" میں تم اس بحث کو بخوبی دیکھ سکتے ہو۔ تم دیکھوگے کہ اس بحث میں ایک عجیب غلطی سرزد ہوی۔ اس مسئلہ پر اس نقطہ نظر سے بحث ہوئی گویا ایک طرف عربی اور سنسکرت اور دوسری طرف انگریزی میں انتخاب کرنا تھا یہ تمام زبانین عام آبادی کیلئے یکسان غیرمانوس ہیں، عربی اور انگریزی تو غیرملکی ہی تھین لیکن سنسکرت بھی ہندؤں کیلئے وہی حیثیت رکھتی تھی جو یورپ کے باشندون کے لئے لاطینی۔ اسی سے تمام خاص خاص مروجہ زبانین نکلی ہیں لیکن خود یہ مردہ ہے، اور لاطینی سے زیادہ عرصہ سے مردہ ہے کیونکہ تیسری صدی قبل مسیح میں اسکا شمار مستعمل زبانوں میں نہیں تھا۔ سنسکرت کی نظمون، فلسفیانہ اور مذہبی کتب کے بیشتر حصہ سے بڑی تصنع اور آورد کی بو آتی ہے۔ ٹھیک اس طرح لاطینی زبان کی ([illegible]) اور ([illegible]) کی منظومات ہے۔ میکولے کو سنسکرت پر آسانی سے فتح حاصل ہوگئی کیونکہ یہان پر اسکو محض یہ ثابت کرنا تھا کہ انگریزی کی نظمین سنسکرت کی نظمون سے کسی طرح ادنی نہیں ہیں اور اول الذکر کا فلسفہ، تاریخ اور سائنس تو سنسکرت سے کہیں ترقی یافتہ ہے۔ لیکن سوال یہ ہوتا ہے کہ انتخاب صرف مردہ زبانون سے کیوں کیا گیا۔ کیا لارڈ میکولے کا خیال تھا کہ ۲۵ کروڑ اہل ایشیا کو انگریزی سکھانا آسان کام ہے؟ غالباً نہیں بلکہ قوی گمان یہ ہے کہ اُسنے سوچا کہ محض ایک مختصر سی تعلیم یافتہ جماعت پیدا کیجاے۔ میرا بھی خیال ہے کہ میکولے کی کلاسکل زبانون کی تعلیم نے اُسکے اندر یقین پیدا کردیا تھا کہ مردہ زبان تعلیم کے لئے ضروری ہے لیکن واقعی اگر ہندوستان کو روشن دماغ بنانا ہے تو یہ مقصد نہ تو سنسکرت سے حاصل ہو سکتا ہے اور نہ انگریزی سے، بلکہ اُسکی دیسی زبانوں سے جیسے ہندوستانی ہندی، بنگالی وغیرہ۔ میکولے نے کسی مبہم خیال کی وجہ سے ان زبانون کو اس قدر نا ملائم سمجھا کہ اُنکو فلسفہ اور علوم کا ذریعہ بنانا مناسب نہیں سمجھا، اگر وہ انگریزی کے مقابلہ میں ان زبانوں کے خلاف اپنے دلائل پیش کرتا تو یقیناً ناکام رہتا اگرچہ یہ عظیم غلطی ہوگی۔ البتہ ۱۸۵۴ء میں سر چارلس وُڈ کی تعلیمی کمیشن کی سفارشات کے بعد سے قدرے اسکی تلافی ہو چکی ہے، لیکن جس فیصلہ کی طرف لارڈ میکولے کی یادداشت نے رہنمائی کی وہ ہماری سلطنت کی تاریخ کا درخشان واقعہ ہے خصوصاً اس لحاظ سے کہ ہماری سلطنت ایک انجمن تہذیب ہے۔ یہ واقعہ اس زمانہ کی یاد دلاتا ہے جب ہم نے قصداً اپنے تئین مکلف کرلیا کہ ایشیا میں ہمارے اوپر ایک ایسا فرض عائد ہوگیا جیسا روسہ نے یورپ میں اپنے ذمہ لیا تھا، اور یہ فرض ان تمام فرائض سے جنکی انجام دہی کسی حکومت کے سر پڑ سکتی ہے زیادہ اہم ہے

(ترجمہ)

عبدالقیوم رسا

ازدواج مکرر

(افسانہ)

(بہ سلسلۂ ماسبق)

(۴)

صفیہ کو آئے ہوئے تقریباً ایک ماہ کا زمانہ گزر چکا ہے اور اس دوران میں کوئی ایسا واقعہ ذکی اور صفیہ کی زندگی میں پیش نہیں آیا، جسے کوئی خاص اہمیت دیجائے۔ صفیہ کو گھر کے انتظام، اور اُن نسوانی مصروفیتوں سے جو شادی کے بعد ایک عورت کا محبوب ترین مشغلہ ہوجاتے ہیں، اتنی فرصت ہی نہیں ملتی کہ وہ ذکی کے ادبی و علمی انہماک پر غور کرکے اپنے آپ کو اس میں حصہ لینے کے قابل بنائے اور نہ ذکی کو تحریر و مطالعہ اس امر کی اجازت دیتے ہیں کہ بیوی سے اس موضوع پر کوئی گفتگو کر سکے

گھر کی فضا اس وقت یہ ہے کہ ذکی بظاہر اپنی جگہ مطمئن ہے کہ صفیہ تعلیم یافتہ ہو یا نہ ہو لیکن بیوی ضرور ہے اور صفیہ بھی اپنی جگہ اس خیال سے خوش ہے کہ ذکی لاکھ آزاد خیال سہی لیکن صحیح معنی میں شوہر و انسان ہے

جب صفیہ میکہ سے واپس آئی تو اُسے خیال تھا کہ شاید ذکی پھر اُس بحث کو چھیڑے گا اور ممکن ہے کہ اس کا جہل یا غیر تعلیم یافتہ ہونا پھر کس وقت ذکی کی کبیدگی کا باعث ہو، لیکن اس ایک مہینے میں ایک بار بھی ذکی نے اس کا ذکر نہیں کیا اور تمام وہ التفات جسکی توقع ایک مرد کی طرف سے عورت کو ہوسکتی ہے اسپر صرف کئے گئے، ہر چند وہ اس کو ضرور محسوس کرتی تھی کہ ذکی جب گھر میں آتا ہے تو کوئی خاص موضوع گفتگو کا اُسکے پاس نہیں ہوتا اور زیادہ حصہ یا تو خاموشی میں بسر ہوتا ہے یا پھر کتابوں کے مطالعہ میں لیکن چونکہ اس انداز میں وہ کسی نوع کی نفرت نہیں پاتی تھی اس لئے اُسے کوئی شکایت بھی نہ تھی۔ فرصت کے اوقات میں وہ اس امر کی کوشش کرتی تھی کہ اپنے اندر ادبی ذوق پیدا کرے، لیکن جہاں اُسنے کسی نظم کی کتاب یا کوئی دیوان اُٹھا کر دیکھا اور اس کو وحشت ہوئی وہ ایک مصرعہ بھی موزون نہ پڑھ سکتی تھی اور قطعاً اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ ایک شریف مرد یا عورت ایک غزل کا مطالعہ کیونکر کرسکتا ہے جبکہ اس میں اسقدر بے حجابانہ اور شرم انگیز طور پر محبت کا اظہار کیا جاتا ہے۔

اسنے بارہا الماری سے داغ وغیرہ کا دیوان نکال کر دیکھنے کی کوشش کی اور باوجود تنافر کے اسنے جبر کرکے اس کو سمجھنا بھی چاہا لیکن کبھی ایسا نہیں ہوا کہ اسنے کسی شعر پر غور کیا ہو اور آخر کار اسنے منفعلانہ انداز سے اُسے بند کرکے نہ رکھدیا ہو۔ اس لئے بظاہر اس کو کوئی امید نہ تھی کہ وہ اب یہ کسی وقت اپنے ادیب و شاعر شوہر کے ذوق ادب کی ہم آہنگ ہوسکے گی بلکہ بعض اوقات وہ ذکی کے جانب سے بھی یکسر استفسار و استفہام ہوجاتی تھی کہ وہ شخص جو شاعری کا اسقدر دلدادہ ہو کیونکر اس کے چال چلن کی طرف سے اطمینان ہوسکتا ہے

ذکی کی زندگی ہر چند گھر کے اندر نہایت ہی سادہ معلوم ہوتی تھی لیکن اس کی یہی سادگی باہر جاکر "پرکاری" میں تبدیل ہوجاتی اور اس کے وقت کا اکثر حصہ اپنے احباب کو اس امر کے یقین دلانے میں بسر ہوجاتا تھا کہ اس کی بیوی بے مثل ادیب وشاعرہ ہے۔ وہ پہلے ہی فیصلہ کرچکا تھا کہ اگر وہ خود براہ راست اپنی بیوی کی تعلیم یافتہ ہونے کے برکات ونعایم حاصل نہیں کرسکتا تو کم از کم وہ دنیا کو ضرور اس کا یقین دلاکر اپنی زندگی کو دوسروں کے نزدیک قابل رشک ثابت کریگا۔ چنانچہ وہ اب اپنے مضامین سے زیادہ اپنی بیوی ہی کے افکار نظم ونثر لوگوں کو سنایا کرتا تھا اور جس وقت داد ملتی تھی تو وہ پھولا نہیں سماتا تھا۔ انسان جب اول اول اپنے آپ کو فریب میں مبتلا کرتا ہے تو کچھ عرصہ تک اس کو اس فریب کا احساس رہتا ہے، لیکن جب طبیعت اس کے عادی ہوجاتی ہے تو پھر یہ احساس بھی محو ہوجاتا ہے اور اس کو جھوٹی مسرت ولذت بھی اصلی وواقعی سی معلوم ہونے لگتی ہے۔

بالکل یہی حال ذکی کا تھا کہ وہ اپنی بیوی کے نام سے مضامین لکھ کر لوگوں کو سناتا، رسایل میں شایع کرتا اور اُن کی داد ملتی تو وہ خود بھی یہ سمجھکر کہ واقعی اس کی بیوی کے یہ کارنامے ہیں، بہت خوش ہوتا اور ایسا محسوس کرتا کہ اس وقت ساری دنیا اس کے خوش بختی پر رشک کررہی ہے۔

صفیہ ان حالات سے ابتک بالکل بے خبر تھی کیونکہ ڈاک باہر ہی آتی تھی اور ذکی نے انتظام کردیا تھا کہ کوئی رسالہ خط یا اخبار اندر نہ جانے پائے۔ وہ چاہتا تھا کہ خود کسی وقت بیوی سے ذکر کرکے اس خلش کو بھی دور کردے لیکن چونکہ اس کا ضمیر اس باب میں گناہگار تھا اور صفیہ کے مزاج سے وہ خایف تھا کہ مبادا اس کو پسند نہ کرے اسلئے اس کو ہمت نہ ہوتی تھی

ایک دن صبح اسنے آرٹ پر ایک مضمون صفیہ کی طرف سے لکھا اور اس کو تمام اُن نزاکتوں اور لطافتوں سے بھر دیا جنکی اس موضوع پر ایک عورت کی طرف سے توقع کیجاتی ہے۔ وہ بہت خوش تھا۔ اتنا خوش کہ بے اختیارانہ اس کو لئے ہوئے اندر چلا آیا اور اس عزم کے ساتھ کہ آج وہ صفیہ سے ذکر کرکے اس پردہ کو بھی اوٹھا دیگا۔ صفیہ تمام کاموں سے فارغ ہوکر ایک رسالہ کے مطالعہ میں مصروف تھی اور ایک غزل کو موزوں پڑھنے کی کوشش کررہی تھی۔ ذکی کو آتا دیکھ کر اسنے رسالہ الٹ کر رکھدیا، لیکن ذکی نے آتے ہی فوراً رسالہ اُٹھا لیا اور اپنی بیوی کے ذوق میں یہ تبدیلی دیکھ کر اس کے ارادہ میں اور تقویت پیدا ہوگئی اسنے بیٹھتے ہی پورے لطف وانبساط کے ساتھ مسکراتے ہوئے دریافت کیا۔ "کہئے اس رسالہ میں آپ کو کوئی مضمون پسند آیا یا نہیں؟"

صفیہ نے جو بہت زیادہ بے تکلف ہوگئی تھی ہنستے ہوئے جواب دیا کہ "میں تو ایک غزل کو پڑھ رہی تھی اور غور کررہی تھی کہ شاعری میں وہ کیا بات ہے جس پر آپ لوگ اس قدر سر دھنتے ہیں میں تو اس مشغلہ کو نہایت ہی شرمناک بات سمجھتی ہوں"

اس عجیب وغریب تنقید کو سنکر ذکی ہنس پڑا اور بولا کہ "بتائیے وہ کونسی غزل ہے اور اسمیں کیا شرمناک بات ہے"

صفیہ۔ کسی ایک غزل پر کیا موقوف ہے، میں تو جب کسی شعر کو پڑھتی ہوں، یا تو وہ بالکل جھوٹ نظر آتا ہے یا بالکل فحش۔ کل میں نے کسی کتاب میں یہ شعر پڑھا:۔

چھوڑوں گا میں نہ بات چلے آؤ ساتھ ساتھ   نازک کلائی دُکھتی ہے تو آستین سہی

میں سچ کہتی ہوں کہ شرم سے پانی پانی ہوگئی۔ لاحول ولاقوۃ۔ آپ لوگ کیونکر ایسی بیہودہ باتوں کو پسند کرتے ہیں"
ذکی بے اختیار ہنس پڑا اور بولا کہ "بالکل صحیح ہے، میں خود بھی اس شاعری کو پسند نہیں کرتا، لیکن سب شعر ایسے تھوڑے ہی ہوتے ہیں"۔ اور صفی نے رسالہ لیکر ورق گردانی کی اور کہا کہ اچھا بتاؤ اس شعر میں کیا خرابی ہے:۔

مرے صیاد سر گرداں سے اتنا کوئی کہدیتا   جہاں رُک جائے بجلی ہے وہ شاخ آشیاں میری

صفیہ :۔ "ماشاءاللہ، کیا کہنا ہے۔ بجلی بھی کہیں کسی سے رُک سکی ہے اور فرض کرو اگر وہ چٹیل میدان میں کسی جگہ رُک جائے تو وہاں شاخ آشیاں کہاں سے آئے گی۔ اس کے علاوہ صیاد سے کہنے کا کیا سبب ہے کیا شاعر کوئی چڑیا ہے جس کو صیاد گرفتار کرنا چاہتا ہے اور ایسا ہو بھی تو چڑیا کہیں خود اپنا پتہ بتا سکتی ہے۔ الغرض مجھے تو اس میں جھوٹ ہی جھوٹ نظر آتا ہے۔ آپ بتائے اگر کوئی خاص بات اس میں ہو"

ذکی :۔ "میں خود تو کچھ نہیں بتا سکتا، مگر کوشش کرونگا کہ تم کو خود ایسی جگہ لے آؤں جہاں تم اس قسم کا کوئی اعتراض نہ کرسکو۔ اچھا یہ شعر کیسا ہے:۔

دل نے دنیا نئی بنا ڈالی   اور ہمیں آجتک خبر نہ ہوئی

صفیہ :۔ "اس شعر کا پہلا حصہ بالکل جھوٹ ہے۔ دل کوئی نئی دنیا نہیں بنا سکتا۔ اس دنیا کے اندر جو دنیا بن سکتی ہے وہ اسی دُنیا کی ہوگی"

ذکی :۔ "اچھا یہ شعر کیسا ہے:۔

ہے کوئی بات آج ہونے کو   جی بہت چاہتا ہے رونے کو

یہ شعر سنکر صفیہ کے جسم میں بے اختیار اک جھرجھری سی پیدا ہوگئی اور خاموش سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ چونکہ اس کے پہلے مصرعہ میں ایک نسائی اعتقاد کی جھلک موجود ہے اور دوسرے مصرعہ کی کیفیت اسپر ایک آدھ مرتبہ گزر چکی تھی اس لئے اسپر بہت اثر ہوا اور تھوڑی دیر بعد بولی کہ "وہ شعر جو انسان کو افسردہ کردے کس کام کا۔ رونے کے لئے آدمی کے پاس یونہی کیا کم اسباب موجود ہیں کہ اس میں شعر کا اضافہ کیا جائے۔ مہربانی کرکے اب کوئی شعر میرے سامنے اس طرح کا نہ پڑھیے۔ خدا جانے مجھے کیا کیا وہم پیدا ہونے لگتے ہیں" اُس کی آنکھوں میں تری جھلک آئی تھی اور اس کا چہرہ مضمحل سا معلوم ہوتا تھا"

ذکی دیر تک غور کرتا رہا اور اندر ہی اندر اس تجربہ سے بہت مسرور ہوا کیونکہ آج اسنے صفیہ کے حقیقی ذوق شعری کو معلوم کرلیا تھا اور اس کی مُردہ امید دل میں از سر نو آثار حیات پیدا ہونے لگے تھے۔ وہ اس وقت تک یہی سمجھ رہا تھا کہ صفیہ بالکل بے حس ہے، لیکن آج اسے معلوم ہوا کہ اس کے اندر شاعری کی نہایت لطیف و پاکیزہ حس موجود ہے اور اگر اس میں کوئی تحریک پیدا ہوجائے تو پوری قوت کے ساتھ بروئے کار آسکتی ہے اسنے جرأت کرکے پھر اس مسئلہ کو اُٹھایا اور بولا "میں نے آجتک...

تم سے ایک بات چھپائی ہے، لیکن اب اس کا پوشیدہ رکھنا بیکار ہے۔ خفا نہ ہو تو کہوں"۔

صفیہ۔ یہ آپ نے کیا کہا میں آپ سے خفا ہو سکتی ہوں، عورت خفا ہونے کے لئے نہیں پیدا ہوئی بلکہ منانے کے لئے دنیا میں آئی ہے؟ ذکی اُس کے اس عاشقانہ کیفیت رکھنے والے فقرہ سے بیتاب ہو گیا اور بولا" تم کو غالباً وہ وقت یاد ہوگا جب تم نے مجھے خط لکھا تھا اور میں نے تمھیں تار دیکر فوراً طلب کیا تھا۔ تمھیں حیرت ہوگی کہ میں نے پھر کوئی ذکر تم سے نہیں کیا اور نہایت خاموشی کے ساتھ اتنا زمانہ بسر کر دیا

واقعہ یہ ہے کہ میری انتہائی مسرت کی صورت صرف یہی ہو سکتی تھی کہ تم شاعر ہوتیں، ادیب ہوتیں، تمھارے مضامین رسایل میں شایع ہوتے اور میں ان کی تعریف دیکھ دیکھ کر خوش ہوتا، لیکن جب میں اس طرف سے مایوس ہوا تو میں نے ایک نمایشی اور غیر حقیقی مسرت پر قناعت کرنا مناسب سمجھا اور تمھاری طرف سے میں نے غزلیں، نظمیں، مضامین اور فسانے وغیرہ لکھ کر شایع کرائے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آج ہندوستان کے ہر گوشہ میں تمھاری قابلیت و ذہانت کا ذکر ہو رہا ہے اور اس کثرت سے تمھارے نام تعریف کے خطوط آرہے ہیں کہ ایک بکس اُن سے بھر گیا ہے، تمھارا ادبی نام اپنے نام کی رعایت سے میں نے صفیہ ذکی رکھا ہے اور تمھیں نہیں معلوم کہ آج صفیہ ذکی کتنی شہرت و عزت کی مالک ہے"

صفیہ یہ سنکر سکتہ میں رہگئی اور ذکی کو اس طرح دیکھنے لگی گویا وہ کوئی اجنبی شخص ہے، غصہ و انفعال سے اس کا چہرہ پر نم آلود سُرخی دوڑ گئی تھی اور وہ ایسا محسوس کر رہی تھی کہ کسی بازار میں برہنہ کھڑی ہے اور لوگ اس کو دیکھ دیکھ کر قہقہہ لگا رہے ہیں۔ فرط تاثر سے اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں اور وہ ایسے غم و غصہ کے عالم میں جو کبھی انتہائی مایوسی کے عالم میں پیدا ہو جاتا ہے اس سے زیادہ نہ کہہ سکی کہ" آپ نے بڑا غضب کیا"

اب اس کا جسم تھر تھر کانپ رہا تھا، آنکھوں سے آنسو جاری تھے اور ذکی جو کبھی اس نتیجہ کی توقع نہ کر سکتا تھا، حیرت و افسوس سے صفیہ کی اس حالت کا مطالعہ کر رہا تھا۔ جب کچھ دیر کے بعد صفیہ کا وہ اضطراب کم ہوا تو ذکی نے کہا کہ" یہ بات ایسی اہم تو نہ تھی کہ تمھیں اسقدر تکلیف ہوتی"

صفیہ۔" میں پوچھتی ہوں کہ آپ کو اس سے کیا فایدہ ہوا۔ اگر واقعی میں ویسی ہوتی جیسی آپ چاہتے ہیں تو بھی اسکا اعلان بیکار سی بات تھی چہ جائیکہ بالکل خلاف واقعہ و حقیقت لوگوں کو اس کا یقین دلائیں۔ میں نہیں سمجھتی کہ اس سے زیادہ توہین میری اور کیا ہو سکتی ہے اور اس سے زیادہ رسوائی میری اور کیا ہوگی

میں حیران ہوں کہ وہ لوگ جو اپنی بیویوں کی قابلیت و ذہانت، خوش سلیقگی و تہذیب کا اعلان کرنا پسند کرتے ہیں وہ کس نتیجہ کو سامنے رکھ کر خوش ہونا چاہتے ہیں۔ اس جذبہ کا مدعا سوائے اس کے کچھ نہیں ہو سکتا کہ دنیا اُن کی بیویوں کی طرف سے ایک خیال پسندیدگی و ستایش پیدا کرکے غائبانہ ان سے محبت کرے بے تکلف صحبتوں میں انکا ذکر کرکے غیر مہذب و ناشایستہ الفاظ سے یاد کرے اور موقعہ ہو تو خط و کتابت سے ان پر اپنی محبت کا اظہار کرکے اپنی طرف مایل کرے آپ اگر اپنی

کسی چیز پر دنیا کو مبتلائے رشک کرنا چاہتے ہیں تو اس کے معنی صرف یہ ہیں کہ آپ جانتے ہیں دنیا اس کے حصول کی خواہش کریگی یا کرسکتی ہے۔ پھر جو آپ نے مجھ کو اس صورت سے دنیا پر ظاہر کیا تو کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ لوگ مجھ سے محبت کریں اظہار عشق کریں، میرے حصول کی خواہش اُن کے دلوں میں پیدا ہو اور آپ اُن کی ناکامی، نامرادی اور مایوسی کو دیکھ دیکھ کر خوش ہوں۔ اگر میں واقعی ایسی ہوتی تو بھی ایک صورت تاویل کی پیدا ہو سکتی تھی، لیکن موجودہ حالت میں، آپ کا یہ جذبہ میرے نزدیک ایک غیر شریفانہ حرکت سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ (صفیہ کا غصہ بڑھتا جاتا تھا)۔ میں صرف اس وقت تک آپ کی بیوی رہسکتی ہوں جب تک آپ اس تعلق کا احترام کریں، لیکن جب آپ مجھ سے کسی ایسے امر کی توقع کرینگے جو میرے اس تعلق کی توہین کرنے والا ہے تو میں انتہائی افسوس کے ساتھ آپ سے نافرمانی کرنے کی معصیت کو تو گوارا کرلونگی، لیکن آپ کو خوش کرنے کا ثواب حاصل کرنے کی ہمت مجھ میں کبھی نہ ہوگی۔ جسوقت میں اپنی اس رسوائی کا خیال کرتی ہوں تو شرم وغیرت سے زمین میں گڑ جانا چاہتی ہوں۔ خدا جانے لوگ کیا سمجھتے ہونگے میری غزلوں کو دیکھ کر جن میں یقیناً آپ نے نہایت ناروا جذبات کا اظہار کیا ہوگا، میرے چالچلن کی طرف سے کسقدر مشتبہ ہوگئے ہونگے اور یقیناً ایسے خطوط بھی آپ کو ملے ہونگے جو کبھی آپ مجھے نہیں دکھا سکتے اور کسے خبر ہے کہ آپ نے میری طرف سے اُن کو کیا جواب دیا ہوگا اور ان کی جسارتیں کس حد تک بڑھگئی ہونگی

میں نے آپ کو پہلے ہی لکھ دیا تھا کہ میں قطعاً آپ کے ادبی ذوق کو پورا نہیں کرسکتی اور میں آج کہتی ہوں کہ وہ عورتیں جو اپنے شوہروں کے اس ذوق کو پورا کرنے والی ہیں وہ سب کچھ ہو سکتی ہیں لیکن بیوی نہیں بن سکتیں اور اس لئے مجھے ایک لمحہ کے لئے اس امر کے اعتراف میں شرم نہ کرنا چاہئے کہ میں جاہل ہوں، غیر تعلیم یافتہ ہوں اور جس تہذیب و تعلیم کی جستجو آپ لوگ عورتوں میں کرتے ہیں اس کو میں اپنی انتہائی توہین خیال کرتی ہوں

خدا کے لئے بتائے کہ اب آپ نے کیا سوچا ہے اور مجھے اس عذاب سے کیونکر نجات دلا سکتے ہیں" ذکی اس میں شک نہیں کہ نہایت سنجیدہ انسان تھا اور مشکل ہی سے اس کو غصہ آتا تھا، لیکن اس وقت صفیہ کی اس برہمی اور سخت تنقید سے وہ اس حدتک نادم ہوگیا تھا کہ چارۂ کار بغیر اس کے نہ رہگیا تھا کہ وہ اپنی شوہریت کے اقتدار سے کام لے اور غصہ کا جواب غصہ سے دے اس نے صفیہ کی گفتگو کو دفعۃً روک دیا اور بولا کہ "مہربانی کرکے مجھے درس نہ دیجئے اور خاموش رہئے۔ جو کچھ ہوچکا ہے اس کی تلافی امکان میں نہیں ہے اور نہ اس کی ضرورت، آئندہ بھی یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہیگا۔ آپ کی اگر اس میں توہین ہے تو ہو مجھے پرواہ نہیں کیونکہ صفیہ ذکی جس کے مضامین شایع ہورہے ہیں وہ میری دوسری بیوی کا نام ہے اور اس کے متعلق آپ کو بولنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے

. . . .

. . . .

گزشتہ واقعہ کو پندرہ روز ہوچکے ہیں اور اس دوران میں ذکی ایک مرتبہ بھی اندر نہیں آیا۔ سولھویں دن دوپہر کی

ڈاک سے بعض اخبار ورسایل آئے تو ان سب میں یہ اعلان اس کو نظر پڑا:۔

"نہ میں شاعر ہوں نہ ادیب"

مجھے معلوم ہوا ہے کہ کچھ عرصہ سے بعض مضامین نظم و نثر میرے نام سے نکل رہے ہیں، اور دنیا کو غلط طور پر یہ یقین دلایا جا رہا ہے کہ میں بڑی قابل و فاضل عورت ہوں۔ حالانکہ اس میں مطلق صحت کا شائبہ نہیں ہے۔ میں اس کو اپنی سخت توہین جانتی ہوں کہ کسی قسم کی کوئی تحریر میرے نام سے منسوب کیجائے اس حال میں کہ وہ میری نہیں ہے۔ نہ میں نے اس وقت تک کبھی کچھ لکھا اور نہ آیندہ اس کی توقع ہو سکتی ہے۔ میں بہت کم سواد معمولی پڑھی لکھی عورت ہوں اور شعر موزوں بھی نہیں پڑھ سکتی چہ جائیکہ خود تصنیف کروں۔ اس لئے میں اس تحریر کے ذریعہ سے پبلک کو آگاہ کرتی ہوں کہ آیندہ اس نام سے شایع ہونے والی تحریروں کو نہ مجھ سے منسوب کرے اور نہ مجھ سے خط و کتابت کرے صفیہ (اہلیہ مسٹر ذکی ....)

اس کے بعد ذکی اور صفیہ کے درمیان جو گفتگو ہوئی اس کی تفصیل بیکار ہے، مختصراً یوں سمجھ لیجئے کہ صفیہ کو اپنے گھر آجانا پڑا اور ذکی مجبور ہو گیا کہ اپنا غم و غصہ دور کرنے کے لئے کہیں باہر چلا جائے۔ ہر چند اس نے صفیہ کو طلاق نہیں دی تھی، لیکن جدائی بظاہر ہمیشہ کے لئے ہو گئی تھی اور دونوں اپنے مستقبل سے بے خبر حد درجہ غمزدہ زندگی بسر کرنے پر مجبور تھے۔

(باقی)

نیاز

تذکرۂ خندۂ گل

یا ظریف شاعروں کا تذکرہ

جسمیں ۳۰۰ سو سے زاید اردو، فارسی کے ظریف شاعروں کے حالات، انکے لطایف و ظرایف اور انتخابات کلام درج ہیں۔ یہ کتاب اردو میں اپنے موضوع کے لحاظ سے بالکل اچھوتی چیز ہے اور ہر صاحب ذوق کی لائبریری میں اس کا رہنا ضروری ہے تنہائی میں اس سے بہتر مونس، غمگینی میں اس سے زیادہ کامیاب ذریعہ تفریح اور اہل تحقیق کے لئے اس سے زیادہ مواد اس موضوع پر اور کہیں نہیں مل سکتا حجم تقریباً ۵۰۰ صفحات۔

قیمت مع محصول ڈاک للعہ ر (چار روپیہ)

منیجر "نگار" لکھنؤ

آرٹ

روح کی پرواز ترقی کی طرف ہے لہذا اپنے تجربات کو کبھی دُہراتی نہیں بلکہ ہمیشہ کوشاں رہتی ہے کہ نئے اور زیادہ حسین وجمیل نقوش پیدا کرے۔ اگر عامۃ الناس کی طرح کاموں کی تقسیم اُنکے مقصد کو مدنظر رکھتے ہوئے مفید اور خوش آیند میں کیجائے تو اس قول کا اطلاق دونوں اقسام پر ہوگا۔ فنون لطیفہ کا منشا تخلیق ہے نہ کہ نقالی۔ کسی منظر کی مصوری میں صناع کی یہ کوشش ہونا چاہیئے کہ اُس سے خوبصورت مرقع کھینچے جسکا ہمکو علم ہے۔ تفصیل یعنی فطرت کے تلون کو دبانا اور صرف روح اور اُسکی رعنائیاں دکھانا چاہیئے

ہر صناع کو یاد رکھنا چاہیئے کہ کوئی خاص منظر اُسکی نگاہ کے لئے سامان نشاط اس لئے مہیا کرتا ہے کہ ایسے خیال کا ترجمان ہے جسکی وہ صناع قدر کرتا ہے۔ اور قدر اس لئے کرتا ہے کہ وہی طاقت جو اُسکی آنکھوں کے ذریعہ سے دیکھ رہی ہے اُس منظر میں بھی کارفرما ہے۔ ایسا ملکہ پیدا ہوجانے پر وہ بجائے فطرت کے فطرت کے انکشافات کا دلدادہ ہو جائیگا اور اپنی تیار کردہ فرد میں صرف وہی خیال وخط نمایاں اور مرتفع کریگا جنھوں نے اُسکے دل میں خوشی کی لہر دوڑائی۔ ایک یہی صورت ہے کہ وہ نور سے کسب نور اور ظلمت سے اُسکے راز چھین سکتا ہے۔ کسی شخص کی تصویر بنانے میں اُسکے ناک نقشہ سے زیادہ اُسکی سیرت کی طرف توجہ کرنا چاہیئے کیونکہ جو شخص سامنے بیٹھا ہے ایک ناقص تمثال اور دور کی شبیہ ہے اُس حوصلہ مند اصل کی جو پس پردہ ہے

تمام روحانی مصروفیت میں جو شان اختصاص وانتخاب پائی جاتی ہے وہ اسی جذبۂ تخلیق کا کرشمہ ہے۔ ایک پرتو ہے اُس الہام کا جو گہرے معانی کو سادہ الفاظ میں بیان کرنا سکھاتا ہے

انسان کیا ہے؟ خود نمائی میں فطرت کی شاندار کامیابی! انسان کیا ہے؟ ایک منظر جو زیادہ خوشنما اور زیادہ بلیغ ہے اُن مظاہر سے جو افق کی زینت ہیں۔ وہ فطرت کا نقطۂ انتخاب ہے! اُسکی تقریر، اُسکا جذبۂ مصوری، اُسکی شیفتگی فطرت کیا ہے؟ ایک بلند تر کامیابی!

تھکانے والے کالے کوس، فاصلہ اور ابعاد ثلثہ کا بار گران دور ہوگیا اور اُنکا جوہر بار کی موسیقی سے لبریز ایک لفظ یا پنسل کی ایک پُرکار جنبش میں مقید کر لیا گیا!

لیکن صناع مجبور ہے کہ وہی نشانیاں استعمال کرے جو اُسکے عہد اور اُسکی قوم میں رائج ہیں تاکہ اُسکے ہم جنس اُسکا پیغام سمجھیں۔ یہی وجہ ہے کہ آرٹ میں جو کچھ جدید ہے اُسکا ماخذ قدیم ہے البتہ دور حاضر کی فطانت اپنی کبھی نہ مٹنے والی مُہر کر دیتی ہے اور یہی دلکشی بھرتی ہے جو ناقابل اظہار ہے اور جس سے صرف متخیلہ لذت اندوز ہوتا ہے۔ صناع جسقدر اپنے عصر کے روحانی خصوصیات سے مغلوب ہوگا اور اُنھیں اپنے مخلوقات میں نمایاں کریگا اُسی قدر اُسکے کارناموں کی عظمت دیرپا ہوگی اور آنے والے نقاد اُسکے

سامنے نامعلوم وناگزیر وربانی قوتوں کے مظاہر پیش کریگا۔ کوئی شخص اس عنصر احتیاج کو اپنی محنت سے علیحدہ نہیں کرسکتا۔ اپنے دَور اور اپنے ملک کے قیود سے آزاد نہیں ہوسکتا۔ نہ کوئی ایسا نمونہ پیش کرسکتا ہے جس میں اُس عہد کی تعلیم، مذہب، اقتصادیات، روایات اور علوم وفنون کا حصہ نہو۔ چاہے اُس میں کتنی ہی اُپج ہو، چاہے کتنا ہی خود مختار و آزادہ رَو ہو اُن خیالات کے نقش ونگار نہیں دھو سکتا جس میں نشو ونما پائی۔ ایسا احتراز ہی اُس رواج کی چغلی کھائیگا جس سے بچنا چاہتا ہے۔ وہ اپنی مرضی کے خلاف اور بلا ارادہ اُس فضا سے مجبور ہے جس میں سانس لیتا ہے اُن تخیلات سے متاثر ہونا لابد ہے جو اُسکے اور اُسکے معاصرین کے مایۂ حیات وحاصل سعی ہیں۔ وہ اپنے زمانہ کے خصوصیات کا علمبردار ہوتا ہے اگرچہ واقف نہیں ہوتا کہ وہ خصوصیات کیا ہیں۔ کسی عمل کا وہ حصہ جو فطرتًا ترتیب پاتا ہے ہمیشہ اور ہرحال میں اُس حصہ سے زیادہ دلکش ہوتا ہے جس میں انفرادی ذہانت گُل کھلا رہی ہو کیونکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک دیو کا ہاتھ صناع کے قلم یا چھینی کو تاریخ نسل انسانی میں ایک سطر کے اضافہ کی رہبری کررہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مصری وہندی وچینی مورتیں خواہ کیسی ہی بھدی اور بدشکل ہوں اہمیت رکھتی ہیں۔ اُن سے پتہ چلتا ہے کہ اُس دور خاص میں روح انسانی کی اعلیٰ ترین تحریک کیا تھی۔ وہ خیالی تصویریں نہیں ہیں بلکہ وہی گہری ضرورت جو تکوین عالم کا موجب ہوئی اُنکی بھی موجد ہے

شاید اسکے بعد یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ تمام فنون لطیفہ کی اہمیت کا راز اس میں مضمر ہے کہ وہ مکمل تاریخیں اور خوبصورت یادگاریں ہیں نقاش ازل کے ساختہ مرقع قضا وقدر کی جس کے اشارہ پر ہر شئے اپنی قسمت کی تکمیل کو منزل کی طرف قدم بڑھا رہی ہے

تاریخی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو فنون لطیفہ کا منصب ادراک حسن ہے۔ ہم بحر حسن میں غرق ہیں لیکن آنکھوں کو اُسکا جلوہ صاف نظر نہیں آتا۔ ضرورت ہے کہ اُسکے خصوصیات کو فردًا فردًا نمایاں کیا جائے تاکہ ہمارا سویا ہوا وجدان جاگ اُٹھے اور صحیح راستے پر لگایا جائے۔ جب ہم بت تراشی یا مصوری کرتے یا ان فنون کے نمونے دیکھتے ہیں تو ہماری حالت ایسے طالبعلم کی ہوتی ہے جو محض ترتیب وساخت کی لطافتوں کا مطالعہ کرتا ہو۔ حالانکہ کمال فن تحلیل میں ہے، کسی شئی کو اُسکے پریشان کن ملحقات سے علیحدہ کرنا۔ جب تک ایک چیز دوسری چیزوں کے اشتعال سے پاک نہ کیجائے ہم اُس سے لطف اُٹھا سکتے ہیں اُسکا تصور کرسکتے ہیں لیکن اُسکا صحیح اندازہ نہیں ہوتا نہ اس نہج سے ہماری شادمانی والم کا کچھ ماحصل ہوتا ہے۔ شیرخوار بچہ اطمینان سے خاموش پڑا رہتا ہے لیکن اُسکے ذاتی کردار اور اُسکی عملی قوت کا انحصار اس طرح روزانہ ترقی کرنے میں ہے کہ ایک شئی کو دوسری شئی سے جدا کرے اور ایک وقت میں ایک ہی شئی سے سروکار رکھے۔ محبت اور دیگر جذبات کا تقاضا ہوتا ہے کہ تمام زندگی ایک ہی ذات سے وابستہ کردیجائے۔ بعض طبائع کا خاصہ ہے کہ اپنی پوری توجہ بغیر کسی استثنا کے ایک وقت میں ایک ہی شئی یا ایک ہی خیال یا ایک ہی نقطہ کے لئے وقف کرکے اُسی کو دنیا بھر کا وکیل یا مشیر بنا دیتے ہیں۔ یہی لوگ صناع یا مقرر یا سوسائٹی کے پیشوا ہیں علیٰحدہ کرنا اور علیحدہ کرکے توسیع کی قدرت اُس طلاقت لسانی کا جوہر ہے مقرر یا شاعر جسکا مالک ہوتا ہے۔ یہی طلاقت یا کسی شئی کی

عارضی شوکت کو قائم کر دینے کی مہارت مصور یا بت تراش رنگ یا پتھر میں منتقل کر دیتا ہے۔ اس قدرت کا دارومدار اس امر پر ہے کہ صناع نے زیر غور شئی کو کتنی گہری نظر سے دیکھا۔ ہر شئی کا سلسلہ فطرت مرکزی پر مختتم ہوتا ہے اور اسکی شرح اس طرح کیجا سکتی ہے کہ وہی دنیا بن جائے لہذا طباعی کا ہر عمل ایک خاص وقت میں تنہا بلا شرکت غیرے حکمران ہوتا اور پوری توجہ اپنی طرف پھیر لیتا ہے۔ اُسوقت وہی ایک کام ہے جو قابل ذکر ہے غزل ہو یا راگ، یا کسی منظر کی تصویر یا کوئی مجسمہ، یا خطبہ، یا کسی مندر یا میدان جنگ کا نقشہ، یا کسی نئے خطۂ ارض کی تلاش میں بحری سفر۔ زیادہ وقت نہیں گزرتا کہ پہلی شئی کی طرح ایک دوسری شئی پیش پیش ہو کر مطمح نظر بنتی اور جاذب توجہ ہوتی ہے۔ مثلاً ایک باغ جو خوش سلیقگی سے لگایا گیا ہو۔ اُس وقت ایسا معلوم ہوتا ہے کہ باغ کے سوا کوئی اور کام کرنے ہی کا نہیں۔ میں آگ کو دنیا کی بہترین چیز سمجھوں اگر آب، خاک، باد سے واقف نہوں۔ ہر قدرتی شئی، حقیقی ذہانت، اور ودیعت شدہ اوصاف کو یہ حق حاصل ہے اور اُنکی سرشت ایسی ہے کہ ایک خاص وقت میں وہی دنیا کی چوٹی پر ہوں۔ ایک گلہری جو ایک شاخ سے دوسری شاخ پر کودتی اور پورے جنگل کو اپنی اُمنگ میں درخت واحد سمجھتی ہے ایک شیر سے کم جاذب نظر نہیں ہوتی۔ وہ بھی خوبصورت مکمل اور فطرت کی نائب ہے۔ ایک اچھا گیت سامعہ نواز ہو کر میرے دل کو اُسی طرح کھینچتا ہے جس طرح ایک رزمیہ نظم۔ کسی کامل فن کی بنائی ہوئی کتے کی تصویر اُسی طرح میرے ذوق کی تشنگی بجھاتی ہے جس طرح اینجلو کے تیار کردہ مرقع۔ دلپذیر اشیا کے اسی تواتر سے آخر کار دنیا کی عظمت اور فطرت انسانی کے مالامال ہوتے کا سبق ملتا ہے۔ اسی کے ساتھ یہ علم بھی ہوتا ہے کہ جس بات نے مجھے پہلی چیز میں متحیر کیا اور دل کو موہ لیا وہی کیفیت دوسری چیز کے مشاہدہ سے بھی پیدا ہوئی لہذا خوبی تمام اشیا میں مشترک ہے

مصوری اور بت تراشی کا درجہ محض ابتدائی ہے۔ بہترین تصویریں اپنا آخری راز بتا دیتی ہیں۔ وہ بھدے نمونے ہیں یعنی معدودے چند نقطوں لکیروں اور رنگوں کے جو مجتمع ہو کر ہمیشہ متغیر ہونے والے منظر حیات کا سماں دکھاتے رہتے ہیں اور جن کے درمیان ہم زندگی بسر کرتے ہیں۔ مصوری آنکھ کے لئے وہی کرتی ہے جو رقص اعضا کے لئے۔ جہاں بدن کا سادھنا آگیا، جسم میں پھرتی اور حرکات میں تناسب پیدا ہوا رقاص جانچ جانچ کر قدم رکھنا بھول جاتا ہے۔ اسی طرح مصوری رنگوں کی خوشنمائی اور خال و خط کی مناسبت کی تعلیم دیتی ہے۔ جتنی زیادہ تصویریں اور کمال فن کے نمونے دیکھنے میں آتے ہیں اُس نامتناہی ذخیرہ کا اندازہ ہوتا جاتا ہے جو مصور کے موقلم میں پنہاں ہے۔ اُسے اختیار ہے کہ بیشمار تمثالوں میں جسے چاہے اپنا موضوع بنائے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب وہ ہر شئی کی شبیہ بنا سکتا ہے تو پھر کسی شئی کی شبیہ کیوں بنائے؟ اب میری آنکھیں کھلتی ہیں اور آنکھوں میں وہ تصویریں پھرنے لگتی ہیں جو نقاش فطرت ہر رہگزر میں بنایا کرتا ہے۔ مرد اور بچے فقیر اپنی گدڑی میں اور خوبصورت عورتیں زرق برق لباس پہنے ہوئے متحرک نظر آتے ہیں۔ کسی کے بال لمبے ہیں کسی کے گھونگھر والے کوئی سرخ و سفید ہے کوئی سیاہ فام، کسی کے چہرہ پر جھریاں ہیں کوئی بلند بالا ہے، کوئی پست قد کسی کا سینہ فراخ ہے، کسی کا تنگ، کوئی فربہ ہے کوئی لاغر، کوئی متین کوئی شوخ......

پتھر کی مورتیں بھی یہی تعلیم دیتی ہیں مگر ذرا سادگی کے ساتھ۔ تصویر سے رنگوں کا پتہ چلتا ہے اور مجسمہ سے اوضاع

واطوار کا۔ جب میں کوئی عمدہ مجسمہ دیکھکر کسی مجمع عام میں داخل ہوتا ہوں تو اُس شخص کے قول کی تصدیق ہوتی ہے جو کہتا تھا کہ ہومر کی قراءت کے بعد ہر فرد بشر دیو معلوم ہوتا ہے۔ میں بھی محسوس کرتا ہوں کہ تصویر کشی و بت سازی تحفہائے عشق ہیں تاکہ آنکھ اپنے فرائض کی باریکیاں اور سحر کاریاں دیکھے

کوئی مجسمہ چلتی پھرتی تصویروں کا مقابلہ نہیں کرسکتا، انکو پے بہ پے تغیر کی وجہ سے اصنام خیالی پر بدرجہا شرف حاصل ہے۔ کیسا عمدہ مجموعہ فن کے شاہکاروں کا ہے! کس جدت پسند صناع نے اتنی مختلف جماعتیں اور ایسی نئی نویلی تمثالیں بنائی ہیں! اے لو! صناع اپنے دل سے باتیں گڑھتا اور جٹانیں تراش رہا ہے! بہت مصروف ہے اور بہت خوش۔ ابھی ایک خیال آیا، ابھی دوسرا، اور ہر لحظہ پوری فضا، پورا منظر، پورا اسلوب بدلتا رہتا ہے حالانکہ وہی مٹی ہے اور وہی خمیر!
لے جاؤ روغن اور تختۂ قرمز کو، سنگ مرمر اور چھینیوں کو، سب خرافات ہے! اگر ان سے دائمی آرٹ کی جادو طرازیوں کے مشاہدہ کے لئے ہماری آنکھیں نہیں کھلتیں تو محض فیلسوفی و شعبدہ بازی ہے!

فن کے ہر نمونے کو آخرکار ایک طاقت اولیٰ سے منسوب کرنے سے اس حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے کہ ان میں جو مشترکہ خوبی ہے یہ ہے کہ دنیا بھر اُن سے محفوظ ہوتی ہے اور اُن میں یہ استعداد ہے کہ ہماری سادگی ہمکو واپس دیں علاوہ بریں انمیں مذہبی شان پائی جاتی ہے کیونکہ وہ جس کمال کا آئینہ ہیں روح مطلق کا ظہور ثانی ہے۔ اُسی چشمۂ نور کی ایک دھار ہے۔ اُنکے مشاہدہ سے دل پر وہی نقوش مرتسم ہونا چاہیے جو مناظر قدرت کے مشاہدہ سے ہوتے ہیں۔ مبارک اوقات میں فطرت ہمارے سامنے صرف ایک صورت میں ظاہر ہوتی ہے یعنی فن کمال کو پہونچا ہوا۔ یہی شان ایک صناع کے اختراعات فائقہ کی ہوتی ہے۔ وہی شخص آرٹ کا بہترین ناقد ہے جس میں سادہ جذبات اور عظیم حادثات انسانی سے متاثر ہونے کی صلاحیت مقامی واقعات اور مخصوص رجحانات پر جو تربیت کا نتیجہ ہیں فائق رہے۔ حسن دستیاب نہیں ہوسکتا چاہے اُسکی تلاش میں ہم دنیا بھر چھان ڈالیں تاوقتیکہ ہم اُسکو اپنے ساتھ لئے نہ پھریں۔ حقیقی حسن سطح کی دلکشی، خطوط کی ترتیب یا قواعد فن سے ماوراء ہے۔ وہ صناع کی تخلیق میں انسانی کردار کی جلوہ گری ہے، حیرت انگیز اظہار ہے پتھر یا قرمز یا سُریلی آواز کے ذریعہ سے ہماری فطرت کے عمیق و سادہ ترین خصوصیات کا۔ لہذا حسن کو وہی افراد سمجھ سکتے ہیں جنکی روح میں وہ خصوصیات موجود ہیں۔
یونان کے سنگین مجسموں، روما کی عمارتوں اور اُستادان فن کی تیار کردہ تصویروں میں سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ تمام دنیا اُنکا پیغام سمجھ سکتی ہے۔ تہذیب نفس، خلوص محبت، امید اُنکے پردے میں سانس لیتے ہیں۔ ہم اُنکے پاس جو کچھ لے کر جاتے ہیں وہی واپس لاتے ہیں البتہ حافظہ کے لئے خوبصورت مثالوں کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ جو سیاح وٹیکن جاتا اور مختلف کمروں سے سلسلہ در سلسلہ گزرتا ہے جن میں مجسمے، ظروف، کتبے، جھاڑ فانوس اور ہر قسم کی حسین و قیمتی اشیا آراستہ ہیں اُسکو یہ خطرہ رہتا ہے کہ اُن اصول کی سادگی کو نہ بھول جائے جن کی بدولت یہ اشیا معرض وجود میں آئیں اور یہ کہ اُنکا سرچشمہ وہی

خیالات و قوانین ہیں جو خود اُسکے سینہ میں جوش زن ہیں۔ وہ اُن یادگاروں میں ترتیبی قواعد کا مطالعہ کرتا ہے یہ نہیں یاد رہتا کہ یہ اشیا متفقہ مساعی کا نتیجہ نہیں ہیں بلکہ مختلف زمانوں اور مختلف ملکوں کے عطیے ہیں۔ ہر فرد کسی ایک صناع کی تخلیق ہے اور محنت کرتے وقت اُسے کسی دوسرے نمونہ کا شاید علم ہی نہ تھا۔ حیات اور تاہل کی زندگی شیریں و تلخ ذاتی تعلقات، دھڑکتے ہوئے دلوں، لڑتے والی آنکھوں، افلاس و احتیاج و امید و بیم کے علاوہ کوئی شبیہ پیش نظر نہ تھی۔ یہی اُس کے ملہمات ہیں اور وہی تاثرات آپ کے اور میرے دل و دماغ پر طاری کرتا ہے۔ جسقدر شدت کے ساتھ اُسنے کسی جذبہ کو خود محسوس کیا اُسی شدت کے ساتھ اُسکا کردار اُسکے کارنامہ سے ظاہر ہوگا صناع کو ساز و سامان و آلات کی بنا پر مجبور یا محدود نہ ہونا چاہئے بلکہ جہاں یہ نکتہ سمجھا کہ اپنے عمل میں اپنی روح منتقل کر دے سنگ خارا بھی موم ہو جائیگا اور پورے اقتدار و رعنائی کے ساتھ ایک معقول حد تک اُسکے محسوسات کی ترجمانی کریگا۔ اُسکو حاجت نہیں کہ مروجہ و مسلمہ طرز کی پیروی کرے یا یہ دریافت کرے کہ روما و پیرس میں کیا دستور ہے اُسکا مکان، موسم، طرز معاشرت جسکو افلاس اور غیر معروف خاندان میں پیدائش نے بیک وقت ناگوارا اور پیارا بنا دیا ہے وہ لکڑی کا میلا اور بے رنگ و روغن کا شانہ جو گمنامی کے ایک گوشہ میں کسی گاؤں یا جنگل کے قریب ہے یا تنگ و تاریک مسکن جو شہر کے مفلوک الحال باشندوں کے لئے مخصوص ہے کسی روشن ماحول کی طرح اُس خیال کی جنبش کو کافی ہیں جو ہر شئی سے بلا امتیاز اُبل پڑتا ہے ؎

اُس روح کو غرض نہیں پست و بلند سے
جو آپ کارساز ہے اور گرم کار ہے
جس جا ہے ایسی روح وہاں ہے سب اور کچھ
ہر جا ہے ایسی روح اُسی کی بہار ہے

فنون لطیفہ کی ثنا و صفت میں جو کچھ بھی کہا جائے یہ ماننا پڑیگا کہ ابھی ابتدائی منزل میں ہیں۔ ہم اُس مقصد کی تعریف کرتے ہیں جو پیش نظر تھا نہ کہ نتیجہ کی وہ شخص انسانی امکانات کی تحقیر کرتا ہے جو سمجھتا ہے کہ فنون لطیفہ کی تخلیق کا بہترین زمانہ ختم ہو گیا حالانکہ جو کچھ ہوا چند لہروں سے زیادہ وقیع نہیں جو دریائے فطرت کے سطح پر اٹکھیلیاں کرتی ہوئی گزر گئیں وہ صرف اُس طوفان کا پتہ دیتی ہیں جو قعر دریا میں کروٹیں لے رہا ہے اور جسکا میلان تخلیق کی طرف ہے۔ آرٹ ابھی تکمیل کو نہیں پہونچا، اُسکو چاہئے کہ دنیا کی قوی ترین تحریکات کے دوش بدوش بڑھے اُسکا پہلو عملی و اخلاقی ہو، ضمیر سے وابستہ ہو، غریبوں اور عدم تربیت یافتہ لوگوں کو بآواز بلند دعوت صلح و امن دے۔ آرٹ کا ایک ماحصل اور ہے جو فنون لطیفہ سے بلند تر ہے، یہ فنون تو ایک ناتمام یا ضایع شدہ تحریکِ نفس کے ایسے بچے ہیں جو میعاد معینہ سے قبل پیدا ہوں۔ آرٹ تخلیق کی ضرورت کا نام ہے لیکن اسکی اصل عمیم و عالمگیر ہے۔ اپاہج اور بندھے ہوئے ہاتھوں سے کام کرنا اسکو شاق ہے اور تصویروں اور مجسموں کے مماثل لولے لنگڑے کا داک عفریت پیدا کرنا باعث ننگ سمجھتا ہے۔ اسکا کوئی مقصد ایسا نہیں جو انسان اور فطرت کی تخلیق سے پست ہو، آرٹ کچھ نہیں اگر انسان کے پورے مقدور کا مظہر نہیں، آرٹ کو چاہئے کہ دلوں میں خوشی کی ترنگ پیدا کر دے اور تمام امتیازات و افتراقات کو مٹا دے تاکہ دیکھنے والا کُل کائنات میں وہی قدرت و تناسب و ہم رشتگی دیکھ لے

جسکا پتہ کسی صناع کی ذات میں اُسکا صنعتی عمل دیتا ہے۔ اسکا یہ اثر ہوگا کہ ویسے ہی دوسرے صنعت گر پیدا ہونگے۔
اس معنی میں ہر قابل قدر ہستی مع اپنے اقوال و افعال و اوضاع کے ایک مجسمہ ہے۔ ہر خوبصورت عورت جو اہل نظر کو اپنے حسن و جمال سے شریفانہ و غیر ملوثانہ طریقہ پر والہ و دیوانہ کردے ایک تصویر ہے۔ اور زندگی ایک نغمۂ شیریں و افسانۂ رنگیں۔

(ماخوذ) از ایمرسن

اثر لکھنوی

جنوری ۳۰ء کا نگار

جو ظفر شاہ کیلئے مخصوص ہے، مرتب ہو رہا ہے اور مضامین کی کتابت بھی شروع ہو گئی ہے لیکن اس وقت تک بہت کم مضامین موصول ہوئے ہیں اور جو آئے ہیں وہ بھی قابل ذکر نہیں اسلئے ہم نے وصولی مضامین کی تاریخ ۳۰ نومبر ۲۹ء تک بڑھادی ہے۔ امید ہے کہ ارباب علم و قلم اس طرف توجہ فرماکر تاریخ مقررہ تک اپنے مضامین بھیجدینگے۔

اگر اب بھی کافی مضامین موصول نہ ہوئے تو جو مضمون آجائیں گے انھیں شایع کردیا جائیگا اور انعامی مقابلہ کی میعاد آیندہ ۶ ماہ تک اور بڑھادیجائیگی لیکن جنوری ۳۰ء کا نگار بہر حال کم از کم ۱۰۰ صفحات پر شایع ہوگا خواہ کا سب ظفر کیلئے مخصوص نہ ہو۔ مینیجر نگار

رسالہ جن کا نمونہ نمبر

اخیر نومبر ۲۹ء تک طیار ہوجائیگا۔ اسلئے جن حضرات نے ابھی تک نمونہ کی درخواست نہیں بھیجی وہ فوراً روانہ کردیں ورنہ **پرچہ ختم ہونیکے بعد پھر نمونہ مفت نہیں ملیگا۔**

رسالہ جن اردو زبان میں بالکل نئی چیز ہوگا اور عالم ارواح، عالم خواب، مابعد الطبیعیات، قرأت افکار، مقناطیسیت، حاضرات، مسمریزم، اور تمام اُن امور و مباحث پر جو انسانی رُوح و دماغی ارتقا سے تعلق رکھتے ہیں، تاریخی، علمی تحقیق بحث کریگا اور اُن تجربات و واقعات کو بھی درج کریگا جو عالم رُوح کی عجوبہ زار دنیا سے واسطہ رکھتے ہیں ضخامت فی الحال ڈھائی جزو ہوگی اور قیمت عہ سالانہ۔
۶ ماہ کیلئے خریداری منظور نہ کیجائیگی۔ مینیجر رسالہ نگار لکھنؤ

باب المراسلة والمناظرہ

مکرمی - السلام علیکم - آپکا والانامہ لکھنؤ سے میرے پاس آیا - آپکی یادآوری کا ممنون - آپ کا نگار بین عرصہ دو سال سے دیکھتا ہوں - آپکے ادبی مقالات کی میں بہت قدر کرتا ہوں - لیکن افسوس ہے کہ آپکی مذہبی تحقیقات میری سمجھ سے باہر ہیں - شروع میں تاویلات کر لیا کرتا تھا لیکن رفتہ رفتہ تاویلات کا دائرہ تنگ ہوتا گیا اور اب باوجود کوشش میں سمجھنے سے قاصر ہوں - پچھلے دو مہینہ کے پرچہ دیکھنے سے مجھے اطمینان ہو گیا کہ میری طرح اور اصحاب کو بھی آپکی مذہبی تحقیقات میں اعتراض ہے - اگر میرا خیال صحیح ہے تو یقیناً آپکی تصریحات مذہبی ایمانیات کی جڑونکو مضبوط کرنیکے بجائے متزلزل کر دینگی - اسلئے میں مجبور ہو گیا کہ آپکی توجہ دلاؤں امید ہے کہ آپ میری جسارت کو معاف فرما دینگے اور اپنی تحریرات کو پھر ایک مرتبہ نظر غور سے ملاحظہ فرما دینگے افسوس ہے کہ اس زمانہ میں ایسی ہستیوں کی امید رکھنا جو اپنی غلطیوں پر مطلع ہو کر تسلیم کریں بیسود ہے - جبکہ تاویلات کا دروازہ کھلا ہوا ہے ہر معاملہ کی تاویل کیجا سکتی ہے - بلکہ جو لوگ اہل قلم ہیں وہ الفاظ اور لغات کا پردہ ڈال دیا کرتے ہیں آپ نے اپنے خط میں پرچہ ماہ اگست کے مطالعہ کی طرف ہدایت فرمائی ہے - میں نے اوسکو دیکھا لیکن افسوس ہے کہ اسکی تصریحات اب بھی تشفی بخش نہیں ہیں اسلئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آپکے مقالات مذہبی پر ایک سرسری تبصرہ کر کے میں نے جو نتیجہ نکالا ہے پیش کروں

"تو خواہ از سخنم پند گیر یا کہ ملال"

قرآن - قرآن کے نسبت آپکا نظریہ یہ ہے کہ "قرآن کو اصول فطرت ہی کے مطابق سمجھنے دیجئے اور غیر متعلق باتوں کو اوس میں شامل کر کے مذہب کی سادگی کو تباہ نکیجئے"

اصول فطرت سے آپکا کیا مطلب ہے اسکی تصریح کرنا چاہئے - غیر متعلق باتوں سے آپ نے کون باتیں مراد لیں ہیں وضاحت کی ضرورت ہے - کیا اصول فطرت وہی ہیں جنکے پابند ہو کر آپنے قرآنی آیتوں کی تفسیر کی ہے - جیسکے چند نظائر ذیل میں درج کرتا ہوں مثلاً حضرت عیسی علیہ السلام کی پیدائش کے بارے میں قرآن فرماتا ہے :-

مثل عیسی کمثل آدم خلقہ من تراب ثم قال لہ کن فیکون - آپ یوسف نجار کو اونکا باپ بتاتے ہیں - کیونکہ آپکے اصول فطرت میں بغیر باپ کے لڑکا پیدا نہیں ہو سکتا - لیکن معلوم نہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام کے بارےمیں جناب کیا ارشاد فرما دینگے - پھر افسوس ہے کہ الفاظ قرآنی اور سیاق عبارت بھی آپکا ساتھ نہیں دیتے کیونکہ حضرت آدم علیہ السلام کی تمثیل اور لفظ کن فیکون کا ہونا - جگہ جگہ حضرت عیسی علیہ السلام کے نام کے ساتھ ابن مریم فرمانا سب بیکار ہو جاتا ہے - پھر انہیں حضرت عیسی علیہ السلام کے بارے میں بطور خرق عادت کے استحسانا ارشاد ہوتا ہے -

واذ تخلق من الطین کھیئۃ الطیر باذنی فتنفخ فیھا فیکون طیراً باذن اللہ وتبری الاکمہ والابرص باذنی

واذ تخرج الموتی باذنی ۔ لیکن جناب کے نزدیک یہ خرق عادت نہیں ہے ۔ اسی طرح حضرت موسی علیہ السلام کا عصا یا ید بیضا صرف ایک تعبیر کامیابی تھی ۔ اس موقع کے الفاظ قرآنی ملاحظہ فرمائیے

فالقی عصاہ فاذا ھی ثعبان مبین ۔ ونزع یدہ فاذا ھی بیضاء للناظرین ۔ دوسری جگہ بجای ثعبان مبین کے حیتہ تسعی ارشاد ہوا ہے اور واضمم یدک الی جناحک تخرج بیضاء من غیر سوء ایتہ اخری اب ثعبان اور حیتہ تسعی کے کیا معنی ہیں ۔ تخرج بیضاء من غیر سوء سے کیا مراد ہے یہ سب نظر بندی ہے یا تعبیر کامیابی ۔ اسی طرح دریا کا پھٹ جانا اور پانی کا مثل دیوار کے قائم ہو جانا ۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے بارہیں قرآن زنان مصر کی زبان سے جو عجب حسن سے مرعوب ہوگئیں تھیں ۔ ماھذا بشرا ان ھذا الا ملک کریم فرماتا ہے لیکن آپ اوسکو افسانہ سمجھتے ہیں ۔ یہ وہی افسانہ ہے جسکو خدا احسن القصص فرماتا ہے

نماز کے بارے میں خدا ۸۲ جگہ سے زیادہ قرآن میں مختلف عنوان سے ہدایت فرماتا ہے اور اوسکو مسلمانوں پر ان الصلوۃ کانت علی المومنین کتابا موقوتا سے فرض عین کرتا ہے ۔ حتیٰ کہ خوف جان کی حالت میں بھی وقت سے بیوقت پڑھنے کی اجازت نہیں دیتا بلکہ نماز پڑھنے کا جنگ کی حالت میں طریقہ بتاتا ہے اسی آیت سے پہلی آیتیں قرآن کھول کر پڑھیئے ۔ اور آپکا یہ فرمانا کہ خدا کی بتائی ہوئی عبادت ، رسم ورواج یا ظاہری نقوش وحرکات کی پابند نہیں ہو سکتی ، اب آپ فرماتے ہیں کہ عبادت کی غرض اتقیاد امر اور اجتناب از معاصی ہے صرف الفاظ کا پردہ ڈالنا ہے ۔ اس سے کس کو انکار ہے لیکن یہی ظاہری حرکات وارکان مقصود تک پہونچنے کا ذریعہ ہیں ۔ اور ذریعہ مقصود سے مقدم ہوتا ہے ۔ تمام دنیا جانتی ہے کہ طہارت سے مراد ظاہری پانی بہا کر اعضا کو صاف کرنا نہیں ہے ۔ بلکہ اعضا کو گناہوں اور دل کو خیالات فاسدہ سے پاک کرنا مراد ہے ۔ قرآن نے بھی اسی طرف اشارہ فرمایا ہے ۔ قد افلح من ذکہا لیکن باوجود اسکے ارشاد ہوتا ہے ۔ اذا قمتم الی الصلوٰۃ فاغسلوا وجوھکم وایدیکم الی المرافق وامسحوا برؤسکم وارجلکم الی الکعبین ۔ یہ صرف پانی بہا کر اعضا کو پاک کرنا ہی ۔ چونکہ وسیلہ ہے مقصود تک پہونچنے کا اسلئے ہدایت فرمائی ۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام آپ سے زیادہ جانتے تھے کہ کعبہ سے مقصود توجہ الی اللہ ہے لیکن پھر بھی خود خدا سے ارکان حج کی تعلیم چاہتے ہیں ۔ وارنا مناسکنا ۔ اسپر احرام باندھنا ۔ طواف کرنا ۔ سعی کرنا وغیرہ وغیرہ تعلیم فرمایا جاتا ہے جو بجنسہ آجتک رائج ہے ، اب آپکا یہ فرمانا کہ قرآن میں نماز موجودہ کی تصریح نہیں ہے یہ بھی تائید لفظی ہے ۔ اور بے معنی ہے ۔ بلکہ آپ جانتے ہیں کہ قرآن ایک متن متین ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا آپنے قرآن کو ایک ضابطہ کی شکل میں پیش کیا ۔ اجمال کی تفصیل کی ۔ یا خدا کی طرف سے خود تفصیل بتائی گئی ۔ چنانچہ نماز کے بارے میں بھی حضرت جبرئیل کا آنا اور نماز کا طریقہ تعلیم فرمانا صحیح حدیثوں سے ثابت ہے ۔ لیکن چونکہ آپ کے نزدیک کوئی صحیح حدیث موجود نہیں ہے ہم استدلال میں پیش نہیں کرتے صرف معقولات سے جو آپ کے نزدیک ذریعہ رشد وہدایت کا ہے ، گفتگو کرتے ہیں ۔ ہر صورت میں نماز کی فرضیت نہیں جاتی ۔ مثلاً وضو کے بارہیں صرف یہ آیت سے

اذا قمتم الی الصلوٰۃ الخ - لیکن کس طریقہ سے عمل کیا جاوے قرآن ساکت ہے نماز میں صرف اوقات نماز اور ارکان کے الفاظ مثلاً رکوع و سجود و قیام و قعود کو بتایا ہے لیکن نہ کوئی خاص تعیین وقت کی ہے نہ تعداد رکعت کی نہ طریقہ ادا کی۔ اسی طرح حج کو فرض کرتے ہوئے کوئی خاص طریقہ حج کا بیان نہیں کیا صرف ارکان مثلاً احرام - طواف - سعی وغیرہ بتائی ہیں روزہ میں صرف ایکماہ کا روزہ اور تعین وقت ہے زکواۃ میں صرف مصرف زکوۃ - کیا اس مجمل بیان کی وجہ سے آپ ان سب باتوں کی فرضیت سے انکار کرینگے - اور اسکو نظام قومی اور سوسائٹی کا فرض بتا کے ختم کر دینگے، ظاہر ہے کہ اگر قرآن میں ہر ایک بات کی تصریح اور تفصیل کیجاتی تو معلوم نہیں کتنے دفتر طیار ہو جاتے - اسلئے کہیں تفصیل کر دی کہیں اشارہ کر دیا - اسکے ساتھ مسلمانوں کو رسول کی اطاعت فرض کر دی - چنانچہ ملاحظہ ہو آیات قرآنی - وما اتاکم الرسول فخذوہ وما نہاکم عنہ فانتہوا و من یطع الرسول فقد اطاع اللہ - و قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ - ولکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ - اس صورت میں رسول اللہ صلی علیہ وسلم نے جو قرآن کے اجمال کی تفصیل کی ہے وہ بھی دراصل قرآنی ہے -

کیا اس صورت میں آپ احادیث میں جو قرآنی تفسیر یا تشریح ہے اوسکو غیر متعلق باتوں میں شامل کرکے اوسکی اہمیت کو کم کر دینگے

میرے نزدیک قرآن کی تفسیر کے بارے میں یہ نظریہ ہونا چاہئے کہ

۱- قرآن کے مطالعہ و فہم کا وہ طریقہ ہو جو تمام تر قرآن پر مبنی ہو ۲- قرآن میں باہر کے اثرات کو دخل نہو مثلاً منطق فلسفہ سائنس - بنی اسرائیلیات - ۳- عربی لغۃ کے صاف اور معروف معانی - ۴- عربی بول چال کے بے تکلف اور سادہ محاورات ۵- صدر اول کا بے لاگ ذوق فہم - ۶- اور رسول اللہ کا فطری اور غیر صناعی اسلوب بیان کیونکہ انبیا کرام کی تعلیم کا مقصود بحث و نظر نہیں ہوتا بلکہ تلقین اور یقین پیدا کرنا ہوتا ہے - قرآن نے خود جا بجا اپنے نام گنائے ہیں وہ کہتا ہے کہ میں موعظتہ ہوں - ذی الذکر ہوں - تبیانا لکل شئے ہوں - تذکرہ ہوں - ھدی و رحمۃ ہوں اور یہ ظاہر ہے کہ جو بات موعظت ہو تذکیر ہو - نصیحت ہو ہدایت ہو - روح و دل کے روگوں کی شفا ہو وہ تاویلات کا بے پایاں دفتر نہیں ہو سکتا - نہ منطق و فلسفہ کا اکھاڑہ - خود امام رازی جنھوں نے تفسیر اسی رنگ میں لکھی تسلیم کرتے ہیں کہ لقد تاملت الطریق الکلامیہ و المناہج الفلسفیہ فما رایتھا تشفی علیلا - و رایت اقرب الطریق طریقۃ القرآن کیا مصیبت ہے کہ قرآن عربی زبان میں عرب میں نازل ہوتا ہے - تمام فصحا، قریش اوسکی فصاحت کے آگے سربسجود ہو جاتے ہیں - لیکن آج تیرہ سو برس کے بعد ایک شخص فتحپور میں پیدا ہوتے ہیں جو قرآن کو مجموعہ تاویلات اور معقولات کا ظاہر کرتے ہیں -

حدیث - کے متعلق آپکا نظریہ یہ ہے کہ بخاری جو اصح کتاب بعد قرآن ہے گیارہ سو برس سے مانی جاتی ہے آپ اوسکو ترک اسلام کا مرادف بتلاتے ہیں استدلال یہ پیش کرتے ہیں کہ دو سو برس کے بعد حدیث کی کتابیں تصنیف ہوئیں جب تحقیق کے دروازہ مسدود ہو چکے تھے اسلئے ناقابل اعتبار ہیں - گویا امام بخاری کی سولہ برس کی جانکاہی آپنے نوک قلم سے عبث اور بیکار ثابت کر دی - بلکہ جناب علامہ سید مقبول احمد صاحب تو کسی حدیث کی کتاب کو ہضم نکر سکے مجبوراً اونکو تے کرنا پڑی - شاید

انکو معلوم نہیں کہ غذا معدہ کی قوت۔ صلاحیت اور مناسبت سے ہضم ہوتی ہے۔ قرآن کا تو خود دعوی ہے کہ بعض قلوب جن کی دلیں روگ ہے اس سے گمراہ ہوجاتے ہیں۔ کا کلمہ تو لوگ ہضم نکرسکے قتل اور جلا وطن ہونا منظور کیا۔ آفتاب کی روشنی بھی کمزور آنکھوں کو پسند نہیں آتی۔ پانی کی خاصیت طبعی سبزہ کو اوگاتی ہے لیکن بعض زمینوں مین روئیدگی بھی پیدا نہیں ہوتی پھر اونکو اگر حدیث کی کتابیں ہضم نہ ہوسکیں تو کیا تعجب ہے معلوم نہیں کہ امام ابو حنیفہ رح جو پہلی صدی میں ہوئے تھے اونکے مسانید کیوں نا قابل قبول ہیں۔ اکثر احادیث مختلف طریق سے روایت کی گئیں ہیں تو کیا قدر مشترک بھی صحیح نہیں ہوسکتا اب جبکہ تمام احادیث کی کتابیں بقول سید مقبول احمد صاحب مجموعہ اکاذیب اور بقول آپکے ترک اسلام کے مرادف ثابت ہوگئیں اور اوسپر جناب نے ایک کلیہ بھی ارشاد فرمادیا کہ یہ کہنا "حدیث میں یہ آیا ہے بے معنی طریقہ رشد و ہدایت کا ہے" پھر اگست کے پرچہ میں ارشاد فرمانا کہ وحی کی دو قسمیں ہیں ایک متلو دوسری غیر متلو ایک بے معنی جملہ ہے یا مغالطہ اسواسطے کہ جب غیر متلو کا وجود ہی نہیں ہے تو اوسپر بحث کرنا بیفایدہ یا حوالہ دیا ہوتا کہ فلاں کتاب کی حدیث یا کم از کم فلاں فلاں حدیث قابل استدلال اور صحیح ہے۔ معلوم نہیں کہ خدا کے اس حکم کی تعمیل کہ لکم فی رسول اللہ اسوۃ الحسنہ کیسے ہوسکتی ہے جبکہ اسوہ حسنہ کا پتا نہیں۔

فقہ ۔ فقہ کے نسبت آپ فرماتے ہیں کہ دفتر بے پایاں ہے۔ اور بغیر سوچے سمجھے عرب میں بیٹھکر تمام دنیا کی قسمت کا فیصلہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کردیا گیا کیسے ممکن ہے کہ تمام دنیا کے لئے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کافی ہو جبکہ تمام دنیا کا تمدن اور تہذیب طرز معاشرت رسم و رواج میں مختلف ہونا یقینی ہے۔ یہ نظریہ ہے جناب کا معلوم نہیں کہ قرآن کو اس کلیہ سے کیوں مستثنیٰ فرماتے ہیں۔ حالانکہ اوسکے بارے میں جناب ارشاد فرماتے ہیں کہ یہ کافر مومن ہر شخص کے لئے ہر ملک کے لئے قیامت تک کے لئے کافی ہے آپ جانتے ہیں کہ ان محدثین اور فقہائے اخلاص اور محبت کے ساتھ نہایت جانفشانی سے اپنی تمام عمر صرف اسکے لئے وقف کردی تھی۔ محض حدیث کی صحت کیلئے ایک خاص فن معرفت الرجال کا نکالا۔ ہر راوی کی تحقیق نہایت غیر طرفداری سے کی۔ کھرے کھوٹے کو علیحدہ کردیا۔ اسی اعتبار سے احادیث کی قسمیں کیں ان قسموں کے اعتبار سے احکام کی تفریق کی۔ یہ ممکن اور بہت ممکن ہے کے باوجود ان کوششوں کے کہیں غلطی واقع ہوگئی ہو۔ پھر اگر باقتضا بشریت کہیں غلطی واقع ہوگئی ہو اور میں کہتا ہوں کہ ضرور ہوگئی پھر بھی وہ اصحاب اور اونکے کارنامے موجب تحسین ہیں نہ سبب نفریں لیکن اگر یہ کوششیں بھی جناب کے نزدیک قابل اعتبار نہیں ہیں تو پھر دنیا کی تاریخ سب بیکار ہوجائیگی جس نے محض خیالی بنیاد قائم کی ہے۔ پھر تمام دنیا جانتی ہے کہ ایک معمولی گھر کا انتظام بھی بغیر قاعدہ اور قانون اور اجتماعی حالت کے چل نہیں سکتا۔ سلطنت کے کاروبار چلانے کیلئے بھی ایک قانون اور اوسپر اجتماعی طور سے پابند ہونیکی ضرورت ہے لیکن آپ تمام دنیا کے مسلمانوں کو دعوت دیتے ہیں کہ انفرادی حالت میں ہر شخص کو چاہئے کہ جسکی جو سمجھ میں آوے کرے۔ حالانکہ جب تمام دفتر فقہا کا بیکار ہوگیا تو انفرادی حالت میں سب کا ایک مرکز پر جمع ہوجانا کیسے ممکن ہے۔ بہرحال جنکی تعداد فی ہزار نو سو ننانوے ہے کس قانون کے مطابق چلیں

کیا آپ بتا سکتے ہیں کے ہندوستان میں آپ جیسے علامہ کتنے ہیں جنھوں نے چھ برس کی عمر میں فارسی درسیات سے فراغت حاصل کی ہو۔ کتنے ہیں جو چودہ برس کی عمر میں فضیلت کی دستار کے مالک بنگئے ہوں۔ ان بیچاروں کے لئے کیا ہدایت ہے۔

تقلید۔ اسکو آپ لعنت فرماتے ہیں۔ اسواسطے کہ ہر شخص کا پیدائشی حق آزادی ہے کوئی وجہ نہیں کے اوسکو پابند بنایا جاوے بیشک ہر شخص محکوم ہونا لعنت سمجھتا ہے۔ غلامی کی زندگی کو موت سے بدتر سب سمجھتے ہیں۔ ذلیل رہنا کس کو گوارا ہے۔ لیکن مجبوراً سب کچھ کرنا پڑتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک جوان عقل وسمجھ کا انسان ایک طفل صغیر ناسمجھ کی تقلید پر مجبور ہے۔ مریض ایک غیر مہذب ڈاکٹر کے آگے سر تسلیم خم کر دیتا ہے۔ محض اسوجہ سے کے نابینا یہ سمجھتا ہے کہ راستہ کا علم اسکو ہے اسی طرح مریض سمجھتا ہے کے اسنے پانچ سال اس فن کو لاہور یا لکھنؤ کالج میں حاصل کیا ہے۔ اعلی ادنی کو جذب کر لیتا ہے۔

گر تو سلطاں نہ رعیت باش　　　چو نبی نیستی زامت باش

جو جواب اسکے بارے میں آپ دیں وہی ہماری طرف سے قبول فرمائیے۔ اور پھر جاہلوں کے بارہیں آپ کیا ہدایت فرمادینگے۔ کیا اونکو بھی اجازت ہے کہ ہر کہ آید در دلت بے خوف کن۔ ضیاء الدین احمد خانصاحب کی طرح کسکو کسکو نگار کے مطالعہ کی ہدایت فرماوینگے

ہم بھی چاہتے ہیں کے یہ قلاوہ گردن سے اوتار کے پھیکدیں لیکن ہماری سمجھ میں ابتک کوئی صورت نہیں آئی۔ میں آپکا بڑا ممنون ہونگا اگر آپ تقلید سے میری گردن چھوڑادیں۔ سب سے پہلی بات جو اسمیں سنگ راہ ہے وہ حدیثوں کی تحقیق اور اوسکے رواۃ کی جانچ ہے۔ فقہا اور محدثین کے اجتہاد کو علیحدہ کر کے کوئی صورت بتائیے۔ جبتک براہ راست حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیثین نہ ملیں تقلید کرنا پڑیگی۔ آج تیرہ سو برس کے بعد اسباب کے یقین کرنیکی کون صورت ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے یہ حسن ہے۔ یہ مرفوع ہے یہ مرسل ہے

آپ فرماتے ہیں کہ یہ ایسا زبردست ترقی کا زمانہ آیا ہے کہ اب منقولات کی سپر کام نہیں دیسکتی اور حفاظت کی صورت اگر کوئی ہے تو صرف معقولات

اسکے متعلق مجھے صرف یہ عرض کرنا ہے کہ زبردست ترقی کے زمانہ سے آپکی کیا مراد ہے۔ کس چیز میں زبردست ترقی ہے۔ علم وحکمت میں۔ الحاد وزندقہ میں دولت وثروت میں بے دینی اور لامذہبی میں۔ اگر علم وحکمت مقصود ہے تو کس علم کی طرف جنابنے اشارہ فرمایا ہے۔ فلسفہ۔ حکمت سائنس۔ منطق۔ انگریزی۔ فارسی۔ عربی۔ ظاہر ہے کہ چونکہ قرآن فصیح زبان عربی میں نازل ہوا ہے اس لئے قرآن کا سمجھنا بغیر عربی کے ممکن نہیں اور ابتک کوئی آلہ ایسا ایجاد نہیں ہوا جسکے ذریعہ سے ایک علم کے پڑھنے سے تمام دوسرے علوم پر دستگاہ اور عبور ہو جاوے، کیا آپ اسبات کو تسلیم کرتے ہیں کہ ہر شخص طب کی کتابوں کا ترجمہ دیکھکر ایک طبیب حاذق ہو سکتا ہے۔ یا قانونی کتابوں کے ترجمہ سے دفعات کے مطالب حل کر سکتا ہے اگر نہیں ہو سکتا تو پھر کیسے ممکن ہے کہ بغیر عربی کی دستگاہ کامل رکھے ہوے قرآن کے مطالب حل کر سکے۔ اور قرآن کے مطالب حل کرنیکے لئے کن کن علوم کی ضرورت ہے اور ان علوم سے ہندوستانکے کالجوں میں کتنے طالب علم ماہر ہیں۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ اس زبردست ترقی کے زمانہ میں کتنے ابو حنیفہ ہیں کتنے شافعی ہیں کتنے بخاری

یا مسلم ہیں کتنے بایزید اور جنید و شبلی ہیں کتنے غزالی اور رازی ہیں - بریلی اور دیوبند کی بارگاہیں تو بند ہوگئیں کسی کالج ہی کی بارگاہ کا پتہ بتا دیجئے جہاں ان علوم کی تعلیم ہوتی ہو - اگر انمیں سے کچھ نہیں ہے تو بے معنی الفاظ سے جملہ مرکب کرنا سوائے مغالطہ دینے کے اور کیا فائدہ ہے

اب رہی سائنس سو اسکا تمام تر مدار تجربہ اور مشاہدہ پر ہونیکے باوجود کیا آپکو معلوم نہیں کہ روزانہ اسکے اصول بدلتے رہتے ہیں کیا سائنس کی مطابقت قرآن سے کرنا چاہتے ہیں - تاکہ جب سائنس کا اصول بدلجائے تو قرآن کے احکام پھر غلط ہو جائیں - افسوس طوالت مانع ہے ورنہ علمائے سائنس کے اصول ہم آپکے سامنے رکھتے اور دریافت کرتے کہ اب اُنکی کیا حالت ہے - رہگیا فلسفہ و حکمت اسکے اصول خود ظنی ہیں پھر ظن کو یقین سے بدلنا آپ جیسے علامہ کا نظریہ ہو سکتا ہے علاوہ اسکے کیا آپ کہہ سکتے ہیں کہ انبیاء کرام فلسفہ اور حکمت کی تعلیم دینے کے لئے آئے تھے - اگر انبیاء کرام اپنے طریق تعلیم میں فلسفہ اور حکمت کا طریقہ اختیار کرتے تو ظاہر ہے کہ انکا خطاب عام نوع بشر سے نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ بجز چند افراد کے جنہون نے علوم وضعیہ کا طریقہ سیکھا ہے نہ سمجھ سکتے ہیں نہ مکلف ہو سکتے ہیں - یا دہ ایمان کی براہ راست دعوت دینے کے بجائے مدرسون میں تعلیم دلواتے پھر اون سے بحث و جدل کرکے قایل کرکے ماننے کے لئے مجبور کرتے - لیکن پھر بھی اس نام نہاد فتح و شکست سے سچائی کا فیصلہ کس طرح ہو سکتا تھا - قرآن اور سنت پر تدبر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اور اس قسم کے تمام طریق حصول مقصد کے لئے سود مند نہیں ہیں بلکہ ہدایت اور یقین کی راہوں سے دور کر دینے والے ہیں -

اب یہ بات کہ خلاف عقل باتوں کو اس طرح باور کرانا کہ حدیث میں ایسا آیا ہے بے معنی صورت رشد و ہدایت کی ہے ، معلوم نہیں کہ جناب نے عقل کا معیار کیا قرار دیا ہے علم کی کمی بیشی کا اثر عقل پر پڑ سکتا ہے یا نہیں اگر پڑ سکتا ہے تو سب لوگوں کا ایک مرکز پر جمع ہو جانا کیسے ممکن ہے ہیئت اجتماعی کیسے پیدا ہو سکتی ہے - بڑے بڑے عقلمندوں نے عقل دوڑائی اور عجائب و غرائب قدرت کے کارخانوں کو دیکھ دیکھ کر اور سوچ سوچ کر جان لڑائی اور کچھ نہ جانا اور جو جانا غلط جانا کیونکہ اگر عقل کی رو سے جاننا چاہئے تو ہزارہا امور ایسے ہیں جو دھوکا دیتے ہیں اور صحیح راستہ اور منزل حق تک نہیں پہونچنے دیتے - جب مشاہدہ اور تجربہ ہمیشہ دھوکا دیتے ہیں تو عقل کیسے رہنمائی کر سکتی ہے - جو صرف ایک ظنی علم ہے - مجبوراً بڑے بڑے سائنس دانوں کو ماننا پڑا کہ وہ دھوکہ میں ہیں چنانچہ اڈورڈ کلاڈ کہتا ہے کہ "بیسویں صدی کے انکشافات گزشتہ صدی کی تحقیقات سے بازی لیجائینگے لیکن یہ عجیب بات ہے کہ ہم جسقدر عقل میں ترقی کر رہے ہیں اوسیقدر اسرار کائنات پیچیدہ ہوتے جاتے ہیں" - مسٹر براٹ اسپنسر جسکو مسائل سائنس کو فلسفیانہ رنگ میں بیان کرنے میں ید طولی حاصل تھا اپنی مشہور کتاب اصول اولیہ میں بیان کرتا ہے کہ "عقل انسانی علم حقیقی کے حصول سے عاجز ہے" یوشین صاحب لکھتے ہیں کہ "خدا تعالی نے بے شک اس بات کے دکھانیکو کہ انسان اگر مطلق اپنی عقل پر چھوڑ دیا جاوے تو اوسکا ہی روپ ہو جاتا ہے جو اہل مصر کا تھا جنہون نے عقل انسانی کو اعلی درجہ پر پہونچا دیا تھا اور پھر ایسی نفرت انگیز بیہودہ بت پرستی میں پھنسے کہ لوگوں کا تماشہ گاہ بنے - یونان کی بھی یہی حالت ہوئی - افلاطون

جسنے صحیفہ قدرت سے بعد غور کامل چند اصول لکھے تھے افسوس ہے کہ وہ خود بھی انپر قائم نہ رہ سکا۔ اسلئے ایسی فطرت عالیہ کا وجود ہدایت کے لئے ضرور ہے جو حق کو باطل سے تمیز کرکے بتا سکے اور تمام خلق کو اصلی راہ دکھا سکے جو آیندہ نسلوں کے لئے مشعل ہدایت ہو"
یوروپین علماء کے نتائج تحقیقات ہمنے اسلئے پیش کئے کہ آپنے انھیں سے مرعوب ہوکر عقل کو معیار الہیات کے حاصل کرنے کا قرار دیا ہے۔ حالانکہ یہ وہی آواز بازگشت ہے جسکو معمولی درجہ کے اسلامی شعرانے کئی سو برس پہلے ملک کے سامنے پیش کیا تھا۔ چنانچہ حافظ شیرازی اپنی مستانہ ادا میں فرماتے ہیں کہ

حدیث مطرب ومی گو و راز دہر کمتر جو ۔۔۔ کہ کس نکشود و نکشاید بحکمت ایں معمارا

نظامی گنجوی فرماتے ہیں

مہندس بسے جوید از راز شاں ۔۔۔ نداند کہ چوں کردی آغاز شاں ۔۔۔ خرد تا بد و مرزتا بد ترا ۔۔۔ کہ تا ب خرد برنتا بد ترا

وغیرہ وغیرہ۔ حیرت اور سخت حیرت ہے کہ جو لوگ علم الادیان میں دریدہ دہن نظر آتے ہیں وہی علم الابدان میں دہن بستہ ہوجاتے ہیں۔ کیا وجہ ہے کہ ایک بزرگ کا کہنا جسنے اوس علم کے حاصل کرنے میں اپنی تمام عمر صرف کی ہو۔ بدترین صورت رشد وہدایت کی سمجھی جاے اور دوسرا شخص جسنے صرف چار پانچ سال ایک فن کو حاصل کیا ہو بڑے بڑے عقلا کی زبان بند کردے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ مذہب کی باتیں عقل وسمجھ سے باہر ہیں لیکن ہر شخص کی سمجھ ایک مرکز پر جمع ہوجاے اور ایک ہی قسم کا نتیجہ نکالے اصولاً غلط ہے۔ یہ سچ ہے کہ قانون قدرت پر غور وفکر کرنے سے ایسی باتونکو جو انسان کی طبیعت کو دھوکا نہ دین دریافت کرسکتے ہیں مگر کب جبکہ انسان کے معلومات کو ایک کافی ترقی اور قوانین قدرت پر اور اُن مختلف قویٰ کے اسرار پر جو اوسکے بانی نے اوسمیں رکھیں ہیں ایک معتدبہ آگاہی بھی حاصل ہو پھر تمام انسان اون دقایق پر نہیں پہونچ سکتے اور بالفرض جو پہونچ بھی سکتے ہیں وہ معدودے چند کے سوا نہیں ہوسکتے اور وہ بھی نہ اپنی عمر میں بلکہ پشتوں در پشتوں اور صدیوں در صدیوں میں۔ پس اسلئے کہ اوس قادر مطلق کی حکمت بیکار نرہے ضرور ہوا کہ وقتاً فوقتاً ملک اور زمانہ کے لحاظ سے ایسے ہادی پیدا کئے جائیں جو باعتبار اپنی فطرت کے سچے اخلاق کے بیان کا مخزن ہوں اور لوگونکو دہوکا کھانے سے بچادیں اور اس راہ کی تکمیل فرمادیں۔ انھیں کو اصطلاح شرع میں نبی رسول اور پیغمبر کہتے ہیں اور چونکہ ہر وقت اور ہر زمانہ میں ایسے ہادی نہیں رہ سکتے اسلئے یہ بھی ضرور ہوا کہ وہ اصول زریں اور سچے اخلاق جو نبی اور رسول نے بتائے ہیں اپنی اصلی حالت پر قائم رہیں اور ایک ایسی قوم انکی جانشین ہو جو دوسروں کو پہونچا دے۔ نبی کی کامیابی اور اوس کی سرگرمی صرف اسبات میں ہے کہ اوسکے افعال اور احکام ممد بقا ہوں نہ ممد فنا۔ اور اپنی اصلی حالت پر باقی رہیں۔ لیکن اگر آپکے نظریہ کے مطابق دیکھا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ نبی سے جو سنا اوسکو غلط کرکے دوسرونکو پہونچایا اور جنکو پہونچا یا انھوں نے غلط نتیجہ نکالکر ایک مجموعہ اغلاط ملک کے سامنے پیش کیا۔

کیف یجوز لاحد من المسلمین ان یتکلم بمثل ھذا ویبدل کلام اللہ من تلقاء نفسہ ویحرفہ عن موضعہ سبحانک ھذا بھتان عظیم۔ کیا حضرت امام ابو حنیفہ یا امام شافعی رحمہ اس قسم کے لوگ تھے۔ ذرا مولانا شبلی کی

سیرۃ النعمان اوٹھا کر دیکھیے تو آپکو معلوم ہوگا کہ حدیث میں انکی نظر کسقدر وسیع تھی اصول درایت جسپر آپ بہت زور دیتے ہیں وہ انھیں کی ایجاد ہیں پھر تدوین فقہ کے لئے انھوں نے اپنے خاص شاگردوں میں چالیس آدمی منتخب کئے تھے مسائل کا استنباط زیادہ تر قرآن سے کرتے تھے بمجبوری صحیح حدیثوں سے مدد لیتے ہیں۔ حضرت امام شافعی رح فرماتے ہیں کہ تمام خلق امام ابوحنیفہ کی فقہ میں عیال ہیں۔ تقلید کو آپ لعنت کہتے ہیں۔ حالانکہ اجلہ علما مثلاً امام غزالی جنکے آگے آج بھی مشاہیر یورپ سر جھکانے کو تیار ہیں امام شافعی کی تقلید پر فخر کرتے تھے۔ صوفیائے کرام بھی تقلید کرنیکے لئے مجبور ہوے خود حضرت سیدنا و مولانا عبد القادر جیلانی رحمہ اللہ حضرت امام حنبل رح کے مقلد تھے۔ علما کے نسبت جناب کا نظریہ یہ ہے کہ اس جماعت کے اکثر افراد اپنے علم کے لحاظ سے اس قدر جاہل۔ مذہب کی حیثیت سے اس درجہ نامسلمان اور اخلاق کے لحاظ سے اتنے منافق ہوتے ہیں کہ اگر اسلام کا معیار صرف انکی ذات کو قرار دیا جاوے تو پھر معیار کفر و نامسلمانی قائم کرنے کیلئے کوئی اور ہستی نہیں مل سکتی" جزاک اللہ اسکے بارے میں ہمکو زیادہ لکھنا نہیں کیونکہ ہم علما کی طرف سے وکالت کرنا نہیں چاہتے اسکے متعلق صرف اسقدر عرض کرنا ہے کہ چونکہ آپنے اکثر کا لفظ استعمال کیا ہے اوس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اب بھی کچھ علما ہیں جنکو صحیح معنوں میں عالم اور اونکی ذات کو معیار کفر و نامسلمانی قائم کرنیکے لئے پیش کیا جاسکتا ہے کیا براہ مہربانی جناب مطلع فرمادینگے کہ یہ کس علم کے حاصل کرنے سے آپکے نزدیک بھی مسلم الثبوت مانے گئے۔ وہی بخاری کی حدیث جو ترک اسلام کے مرادف ہے اور وہی فقہا کا دفتر پایاں جو غلط اصول پر مرتب کیا گیا ہے یا کوئی نئی کتاب حدیث کی جمع کی ہے اور اوس سے نیا دفتر فقہ کا مرتب کیا گیا ہے

اب آخر میں نہایت ادب سے عرض کرتا ہوں کہ شکست و ریخت بہت آسان ہے لیکن تعمیر مشکل ہے۔ نکتہ چینی سہل ہے لیکن انتظامی قابلیت کی جلوہ آرائی مشکل ہنگامہ آفرینی سب کرسکتے ہیں مگر سکون اور امن قائم کرنیکے واسطے تدبر کی ضرورت ہے۔ آگرہ کا تاج محل یا آصف الدولہ کا امام باڑہ گرانیکے لئے ہر جگہ مزدور مل سکتے ہیں لیکن شاہجہاں کی معجز نما عمارت بنانیوالا کوئی ایک کاریگر نہیں مل سکتا۔ زبان سے جو چاہنا بک دینا قلم سے جو چاہنا لکھدینا ہر شخص کرسکتا ہے۔ آپکو اوسوقت تک فقہا یا محدثین کے کارناموں پر پانی پھیرنیکا حق حاصل نہیں ہے جبتک اوسکی جگہ دوسرا مجموعہ نہ طیار کرلیں۔ نصاب نظامیہ کو آپ بدترین نصاب فرماتے ہیں براہ مہربانی بہترین نصاب سے مطلع فرمائیے

من انچہ شرط بلاغ است با تو میگویم — تو خواہ از سخنم پند گیر یا کہ ملال

اندکے پیش تو گفتم غم دل ترسیدم — کہ دل آزردہ شوی ورنہ سخن بسیار است

ربنا اغفرلنا ولاخواننا الذین سبقونا بالایمان ولا تجعل فی قلوبنا غلا للذین امنوا ربنا انک رؤف الرحیم

بدیع الزمان از فتحپور

نگار:- میرے محترم دوست جناب مولوی بدیع الزماں صاحب فتحپوری نے (جن کے ہم وطن ہونے اور ایک ہی استاد کے سامنے زانوئے ادب تہ کرنے کا فخر مجھے بھی حاصل ہے) اپنے مکتوب میں جس محبت وخلوص اور جس تاثر و دردمندی کے ساتھ میری لجردی

اظہارِ تمنا

(ایک افسانہ)

ولنگٹن، پطرو وچ پریدرکِن نے، جو ایک قبول صورت نوجوان تھا، شام کا لباس پہنکر، اپنے نفیس، نوکدار جُوتے پہنے اور طرحدار، شاعرانہ ٹوپی سے آراستہ ہوکر، بدقت تمام اپنے جذبات کو قابو مین رکھتے ہُوے، شہزادی ویرا زیکانا کے گھر کا راستہ لیا

ناظرین! اگر آپ شہزادی ویرا کو نہین جانتے تو بڑے افسوس کی بات ہے —— اُس لبریز لطافت، اور سحر طراز ہستی کو جو نیلین آنکھوں اور زمین لفونکی مالک ہے سمندر کی موجین ساحل سے ٹکرا کر پلٹ جاتی ہین، لیکن اُسکی لفونکی موجین، سخت سے سخت پتھر کو پانی کر دیتین۔ اُسکے دلاویز تبسم، اور چھوٹے، خندان چہرے کے حُسن سے متاثر ہوکر بے قابو نہ ہونا، مردہ دلی، اور بے حسی کی نشانی ہے جو اُسکو بات کرتے، ہنستے اور اُسکے سفید دانتوں کو چمکتے دیکھ کر اپنے آپکو فلکِ ہفتمین پر تصور نہ کرے وہ ایک مجسمہ چلبلی ہوئی اور بس

وہ شہزادی کے مقابل بیٹھا، اور جذبات سے بے قابو ہو کر کہنے لگا —— "شہزادی! کیا تم میری گفتگو سننا گوارا کرو گی"؟ "ہان ہان!"

"شہزادی —— معاف کرنا، سمجھ مین نہین آتا، کیونکر ابتدا کرون —— تمھین اچنبا ہوگا ...... اس طرح دفعتاً ......

...... خفا تو نہ ہو گی؟" —— اُس نے اپنی جیب سے رومال نکالا، ور منہ پونچھا۔ شہزادی مسکرا رہی تھی، اور مستفسر نظروں سے اُسکی طرف دیکھ رہی تھی

"شہزادی" اُسنے سلسلۂ سخن جاری رکھا" جب سے مین نے تمکو پہلی بار دیکھا، میری روح ایک غیر مفتوح تمنا کا شکار ہے ......

یہ تمنا مجھے رات دن چین نہین لینے دیتی ...... اور اگر یہ پوری نہ ہو تو مجھے ...... مجھے سخت تکلیف ہوگی"

شہزادی نے متفکرانہ انداز سے آنکھین نیچی کر لین

"تمکو فی الحقیقت تعجب ہوگا ...... شہزادی، تم مادی اشیا سے بہت بلند ہو لیکن ...... میرے لئے تم بہت مناسب ......" خاموشی

"خصوصاً اس وجہ سے کہ میری جائداد تمھاری زمین سے متصل ہے ...... مین بھی کافی دولتمند ہُون اور ......"

"مگر یہ سب کس لئے؟" شہزادی نے آہستگی سے سوال کیا

"یہ سب اس لئے ہے، شہزادی" پریدرکن نے بے قابو ہوکر اپنی کرسی سے اُٹھتے ہُوے کہا "مین التجا کرتا ہُون کہ انکار نہ کرنا ......

...... اپنے انکار سے میری تمام تدابیر پر پانی نہ پھیر دینا ...... عزیز من! مین صرف یہ تجویز پیش کرنا چاہتا ہون کہ ......"

ولنگٹن پطرووچ پھر جلدی سے بیٹھ گیا۔ اور شاہزادی کی طرف جُھک کر سرگوشی کرنے لگا

"صرف یہ تجویز ...... تجویز بہت نافع ہے کہ۔ ہم کو اپنی ملحقہ زمینون مین، اُون کی ایک باقاعدہ، مشترکہ محدود کمپنی قائم کرنا چاہئے ...... اس طرح ہم سال بھر مین ایک لاکھ گٹھے اُون کے بہ آسانی بیچ سکین گے ...... ہے نا؟"

شہزادی نے لمحہ بھر سوچ کر جواب دیا ...... "بالکل ٹھیک بات ہے۔ اور مین اسپر راضی ہون

عزیز احمد

باب الاستفسار

کس زبان کی شاعری ہی

جناب محمد سجاد صاحب - امیرا کدل - سرینگر

یہان کشمیر مین ایک نہایت ہی معمر شخص ہین جو ہین تو ایرانی النسل لیکن اب ایک زمانہ سے یہین رہتے ہین اور مصاحبانہ خوش باش زندگی بسر کرتے ہین - ان کو فارسی، کشمیری، عربی زبان کے ہزارون شعر یاد ہین اور جس وقت وہ اپنے ترنگ مین ہوتے ہین تو ان کو ایک خاص لحن سے پڑھا کرتے ہین - بعض مرتبہ وہ ایسے شعر پڑھتے ہین جو بظاہر فارسی کے معلوم ہوتے ہین لیکن انکا مفہوم کچھ نہین ہوتا - ان سے پوچھئے تو ہنسنے لگتے ہین اور کوئی جواب نہین دیتے - منجملہ اُن کے ایک شعر یہ بھی ہے

جو از غمت بدر مرا ہر وخ کہ شو مرا ۔۔۔ یک شو بیا بر دم تا ببینم چتو مرا

کیا آپ بتا سکتے ہین کہ یہ کیا بلا ہے؟

نگار :- آپ کے معمر دوست سبزواری معلوم ہوتے ہین یا یہ کہ انھون نے اس زبان کا مطالعہ کرکے اس زبان کے اشعار یاد کرلئے ہین - رایل ایشیاٹک سوسائٹی جرنل مین مسٹر آدونو نے اپنی تفتیش و تحقیق کی بنا پر ایک مقالہ سبزواری زبان کی شاعری پر کئی سال ہوئے شایع کرایا تھا اور اس مین سبزوار کی دہقانی زبان کی شاعری پر بھی بحث کی تھی - اس سلسلہ مین انھون نے نیّر اور فیاض دو سبزواری شاعرون کا نمونۂ کلام بھی دیا تھا - آپ کے دوست کا یہ شعر فیاض سبزواری کا کلام ہے اور انتخاب مین درج ہے

پروفیسر براؤن نے بھی ایک درجن سے زیادہ ایسے ایرانی شاعرون کا نمونۂ کلام دیا ہے جو نیچے طبقہ کی دہقانی و مختص المقام زبان مین شاعری کرتے تھے - اسی طرح بدایونی نے اپنی منتخب التواریخ مین ہفت اقلیم مین امین رازی نے اور ریاض الشعراء مین والہ داغستانی نے بعض ایسے شعرا کا ذکر کیا ہے - انھین مین سے ایک ایک دانئی بھی تھا - دانہ ایک گانون ہے نیشاپور کے قریب یہین کا رہنے والا تھا اور کاشتکاری کا پیشہ کرتا تھا لیکن اس پیشہ کو چھوڑ کر اسنے شاعری اختیار کی اور عہد اکبری مین ہندوستان آیا - امین رازی اور بدایونی نے عہد اکبری کے شعراء مین اس کا بھی ذکر کیا اور نمونۂ کلام دیا ہے - اس کے بعض اشعار (جنھین مشکل سے شعر کہا جاسکتا ہے) اکبر کی مدح کے یہ ہین اور مسٹر ادانو نے بھی انھین ان تذکرون سے نقل کیا ہے

قلم آنشوخ خرد گک مکنہ ۔۔۔ جان فدائش کہ خوش ملک مکنہ

شہ جلال الدین محمد غازی ۔۔۔ کہ دعائش بر فلک ملک مکنہ

صلۂ شعر شاعران گذر یک لک و دو لک وسہ لک مکنہ
مچہ نالم ز احمد و محمود ہر چہ مکنہ بمن فلک مکنہ

(خرد لگ - خُرد کی تصغیر مکرر ہے - یعنی بہت ہی چھوٹا - مکنہ - مکنند - گذر - دگر - مچہ - من چہ

مسٹر اوانو نے لکھا ہے کہ ایک شاعر اور حُسینا تھا جو خالص دہقانی زبان میں شعر کہتا تھا - اس کی رباعیاں اضلاع سبزوار نیشاپور اور ترشیز وغیرہ میں اب بھی گائی جاتی ہیں - اسی طرح ایک شخص ملا صبوحی برجندی تھا جو اب سے ایک صدی قبل پایا جاتا تھا ایران کے اور صوبوں میں بھی اس قسم کے شاعر پائے جاتے تھے - والہ داغستانی نے ان میں سے عبدالحیٔ اصفہانی کا ذکر کیا ہے اور ایک دوسرے شاعر لطیف کا - لطیف اچھا شاعر تھا لیکن چونکہ جاہل تھا، اس لئے وہ سخیف محاورات بھی استعمال کرجاتا تھا اور وزن و تقطیع کا بھی لحاظ نہ رکھتا تھا - ایک اور طہرانی شاعر ملا سحری تھا جو طہران کی بازاری زبان میں شعر کہتا تھا - یہ تینوں سترھویں صدی عیسوی کے اخیر میں پائے جاتے تھے

اصفہان کے ایک اور شاعر درویش عباس المتخلص بہ جزی تھا پروفیسر زکوسکی نے اس کی بعض نظمیں مرتب کرکے شایع کی ہیں - ایران کے جنوبی مغربی حصہ میں فایز، بجمہ، دفتری، محمد تقی خان، حیدر خان اسی رنگ کے شاعر گزرے ہیں اور ایزدی و علی اصغر خان نہاوندی کی یاد تو اب تک وہاں کے لوگوں میں تازہ ہے - وسط ایران میں مشہور شاعر یغما جندقی کے علاوہ اس کا ہمعصر و رقیب نعیمہ سمنانی بھی قابل ذکر شاعر تھا

مسٹر اوانو نے نیر و فیاض کا نمونۂ کلام دیتے ہوئے لکھا ہے کہ فیاض سبزوار کے قریب ایک گاؤں مغیثہ کا معمولی زمیندار تھا یہ عمال و امراء عصر کی تعریف میں شعر کہا کرتا تھا - نیر کا اتنا حال بھی نہیں معلوم ہوسکا - فیاض اور نیر دونوں معمولی قسم کے شاعر تھے جو دیہ و شہر کے ملی جلی زبان میں شعر کہتے تھے - لیکن نیر زیادہ ذہین معلوم ہوتا ہے

آپ نے جو شعر لکھا ہے وہ فیاض کا ہے - میں اس کو یہاں مکرر درج کرکے اس کی اصلی ہیئت بھی پیش کرتا ہوں تاکہ سمجھنے میں مدد ملے

جو از غمت بدر مرہ ہر وح کہ شو مرہ
یک شو بیا بر دم تد ببینم چیتو مرہ

(یعنی)

جان از غمت بدر میرود ہر وقت کہ شب میشود
یک شب بیا برم تا ببینم چہ طور می شود

اسی غزل کے اور شعر مسٹر اوانو نے یہ درج کئے ہیں :-

گر بندو زم نگا بگلزار رخسار رش
چو نی طبق زدیک ہی چشموم گلو مرہ

(یعنی)

گر بیند از نگاہ بگلزار رخسار تش
جو نی طبق زدیک دو چشم گلاب میرود

گر پہ سمت رقیب بردہ بگو کہ ہو
ور گوی کہ نے دلم از قصہ آو مرد

(یعنی)

گر پہ سمت رقیب مُرد بگو کہ بلی
ور گوی کہ نے دلم از غصہ آب میشود

نیر کی شاعری کا بھی نمونہ ملاحظہ فرمایئے :-

به پهلوی رخ یاقیت رنگش رخ سودائی
به نزدیک آ و جیوتش حیر چه لیه

(یعنی)

به پهلوئے رخِ یاقوت رنگش ریخت سودائے
به نزدیک آب حیاتش حور چولامی ست

اس غزل میں یہ تین شعر بہت فحش لکھے ہیں:۔

بشیخ شیخی نظر کردم میون جفته مستتش
بدیدوم بلبلیش از خشتک تمبوش منویه

که ناگه ململیم ور جبرف توقال سیمنبش
چو قوشی که زبندش سردهی رقال بلویه

که ناگه میشکا قوم در درش رف تا نافش
زجا ور جس ور سرزه که گے زیه وکے گیه

ان کے معنی اس لئے نہیں لکھتا کہ ان کی عریانیاں عام نہ ہو جائیں

آپ اپنے دوست کو یہ اشعار سنائے ممکن ہے اس کے بعد کچھ اور کلام آپ کو سنائیں اگر ایسا ہو تو میرے پاس یہ تمام اشعار ضبط کرکے بھیجدیجئے

اگر میں مسٹر اوآنو کے مضمون کو اس سے قبل نہ دیکھ چکا ہوتا تو میں قطعاً کوئی جواب آپ کے استفسار کا نہ دیسکتا تھا۔ آپ کا استفسار پڑھتے ہی میرے ذہن نے یہ مرتسمات پیش کردئے جو آپ تک پہونچاتا ہوں

نیاز

علم کیمیا کا کرشمہ　　**کایا پلٹ ہیر آئیل**　　حیرت انگیز معجزہ

گنجے کو صرف یہ تیل ہی نہیں بلکہ اپنے اثرات کے لحاظ سے اکسیر کو بھی مات کرتا ہے۔ یہ تیل نہایت قیمتی اور نادر الوجود نباتاتی و کیمیاوی اجزا سے جدید اصول پر طیار کیا گیا ہے جس کی تصدیق بڑے بڑے سائنس دانوں نے کی ہے۔ اس کے فوائد کی تفصیل مختصر اشتہار میں ناممکن ہے مختصراً یوں سمجھ لیجئے کہ گھر میں اس کی ایک شیشی رکھنا گویا بہت سے امراض کو دفع کر دیتا ہے۔

اگر۔ سر یا چندیا کے بال گر گئے ہیں یا گر رہے ہیں۔ یا بالخورہ اور گنج ہو گیا ہے

اگر۔ نزلہ دردِ سر یا شقیقہ، دوران سر، ضعف دماغ و ضعف بصر، بے خوابی یا نسیان کی شکایت ہے

اگر۔ سر اور جسم کی پھوڑیاں، پھنسیاں، گرمی دانے، خارش یا دیگر امراض جلدی کا دفع کرنا مقصود ہے

اگر۔ کنٹھ مالا، سل اور دق وغیرہ سے محفوظ رہنا ہے ——— **تو**

ان سب کا واحد علاج **کایا پلٹ ہیر آئیل ہے**

جو نہ صرف خوشبو بلکہ اپنی مقدار و وزن کے لحاظ سے بھی بازار کے تمام خوشبودار تیلوں سے اچھا اور ارزان ہے۔

ڈاکٹر سیج بہادر سہروالہ آباد سے اپنی تحریر میں تصدیق فرماتے ہیں کہ اس تیل کے فواید اشتہار کے مطابق پائے گئے ہیں اور مرزا جعفر علی خانصاحب بی اے ڈپٹی کلکٹر رائے بریلی نے دوامی آرڈر ہر ماہ ایک شیشی کا دیدیا ہے۔ اور بھی متعدد سرٹیفکٹ موجود ہیں۔

جوابی امور کے لئے جوابی کارڈ یا ٹکٹ ضروری ہے　　**منیجر کایا پلٹ ہیر آئیل۔ لکھنؤ**

قیمت معہ محصول .... (ہے)

الہام شعر

جب شب کی سکون پرور تاریکی دنیا پر چھا جاتی ہے
تارون کے فسون موسیقی سے ہوتی ہے، مسحور فضا
خاموش ہوائین، بیخود موجین، صحرا گم، خوابیدہ چمن
غفلت کی پریشان جمعیت ہوتی ہے یہانتک ضبط شکن
ہر چیز رہین خواب گران، ہر سمت سکوت و بیخبری
اس وقت مین اپنی خلوت مین، اک پیکر حسرت ہوتا ہون
کیا تجھکو بتاؤن مین ہمدم، کیا دل پہ گذرتی ہے میرے
سینہ مین تلاطم ہوتا ہے دل کی اُبھر آتی ہین چوٹین
ہر چیز پہ گرد و پیش مرے ہوتی ہے خموشی چھائی ہوی
ناگاہ بجھا دیتی ہے اسے بھی موج سبک رفتار صبا
اس تلخ دھندلکے مین کچھ یون دم گھٹنے لگتا ہے میرا
اک چشم زدن مین لیکن پھر اس طرح بدلتا ہے یہ سمان
ہوتا ہے مجھے محسوس کچھ ایسا گویا میرے ہر جانب
ہو جاتی ہین خیرہ میری نگاہین اور ادھر تاریکی مین
رہتا ہے یہ منظر کچھ لمحے، یکبار درونِ خلوتِ دل
ہوتا ہے حریم ہوش و خرد پر پردۂ کیفِ بیخبری
کچھ نغمۂ شیرین دھیمے سرون مین جس سے پیہم اُٹھتے مین

سرشار ہوا کی ہر جنبش راحت کے ترانے گاتی ہے
جان بخش مئے آسائش بے تخصیص پلائی جاتی ہے
کچھ غور مین اس دنیا کی ہر شے محو سی پائی جاتی ہے
احساس عمل کی بیداری، خود تاج ظفر پہناتی ہے
اک نقطۂ ساکن پر کھنچکر، بیچین فضا آ جاتی ہے
تصویر نشاط عہد تمنا آنکھون مین پھر جاتی ہے
آلام کی آتش افروزی کن شعلون کو بھڑکاتی ہے
ہر موج صبا اک تازہ پیام حسرت و عبرت لاتی ہے
دھندلی سی فقط اک شمع مری حالت پہ اشک بہاتی ہے
مین اور انیس غم میری اب تاریکی رہجاتی ہے
جس طرح سے قید جسم مین روح حیوانی گھبراتی ہے
مین غرق تحیر ہو جاتا ہون جنبش دل تھم جاتی ہے
ہلکی سی نظر افروز تجلی حلقہ کرتی جاتی ہے
یہ موج ضیا بڑھتے بڑھتے تا حد نظر چھا جاتی ہے
خوابیدہ حسین کروٹ لیتی ہین، روح مین قوت آتی ہے
اور پیش نگاہ صرف تحیر، برق ہی اک لہراتی ہے
وہ جن کی لطافت رگ رگ مین اک لہر نئی دوڑاتی ہے

جو مجھکو بتایا جاتا ہے پیغام وہی مین دیتا ہون
سنتا ہون جو کچھ اس عالم مین کاغذ پہ اسے لکھ لیتا ہون

سید علی اختر۔ اختر

مشاہدات

(۱)

حوض مین مستانہ بط کے تیرنے سے جس طرح — کائی مین پڑتا چلا جاتا ہے خطِ رہگزار
حافظے پر یون ہین اک بیدار کن گہری خراش — ڈال دیتی ہے شبِ مہ مین پپیہے کی پکار!

(۲)

مسکرایا خواب مین اس طرح اک طفلِ صبیح — ہو گیا دل دیکھنے والون کا شاد و باغ باغ
اور اس نرمی سے جیسے بتکدے کے طاق مین — جھٹپٹا ہوتے ہی روشن کر دیا جائے چراغ!

(۳)

شاد و فرحان ہین نئے احباب تیرے لطف سے — سرد مہری سے قدیم احباب کا رُخ زرد ہے
یہ تری سیرت ہے ایسے تیز موٹر کی طرح — جسکے آگے روشنی ہے، اور پیچھے گرد ہے!

(۴)

رکھے ہوئے سونے کا طبق ناز سے سر پر — کہرے مین نظر آتی ہے یون صبحِ درخشان
ہو جاتی ہے جس طرح کہ انسان کی شرافت — ہنگامۂ افلاس مین کچھ اور نمایان!

(۵)

سر سے نزدیک ہو کے اک طائر — یون اُڑا صبح نیند جیسے آئے
نصف ملنے کے واسطے مجکو — تننے اِس طرح شہپرون کے سُنائے
ذہن سے جس طرح کہ بات، کوئی — یاد آتے ہی محو ہو جائے!

(۶)

شب کو اکثر کھوکھلی تاریکیان میدان کی — روح پر کرتی ہین طاری اس طرح خوابِ گران
دل سمجھتا ہے کہ ہے غم کی گھٹا چھائی ہوئی — جس طرح کہرے پہ ہو جاتا ہے بارش کا گمان!

(۷)

خاکِ گلشن پہ دُھندلکے کی املتا کی مین — یون ہین پامال شگوفون پہ نقوشِ بیداد
عید کے چاند کی ہلکی سی چمک سی جس طرح — دل مین معصوم یتیمون کے ہو مان باپ کی یاد!

(۸)

سب سے پہلے عشق کی شب مین دلِ عشاق کو
چٹکیون مین یون مسلتا ہے خیالِ رُوئے یار
صبح کچی نیند سے جس طرح چونک اُٹھنے کے بعد
کمسنی کی پھول سی آنکھون مین چبھتا ہے خمار!

(۹)

وداعِ طفلی و قُربِ شباب کے باعث
تری "نگاہ" ہے، "بادہ" "خیالِ دل افروز"
بدل رہا ہے جو پہلو ضمیرِ شاعر مین
اور آب و تاب سے موزون نہین ہوا ہے ہنوز!

(۱۰)

کیا بتاؤن کہ وہ درِ گلگشت
کس طرح سے قدم اُٹھاتی ہے
جیسے کلیون پہ رشحۂ شبنم
جیسے آنکھون مین نیند آتی ہے

جوش

حجابات

عصمت جذبۂ تقدیس کی تصویر ہون مین
عشق اک خواب ہے - اور خواب کی تعبیر ہون مین
مست ہو جاؤن تو تقدیر ہے پابند مری
ہوش مین آؤن - تو وابستۂ تقدیر ہون مین
خلشِ عشق کبھی دل سے یہ کہہ اٹھتی ہے
تو مجھے درد سمجھتا ہے مگر تیر ہون مین
عیشِ امروز ہے پیغامبرِ آزادی
غمِ فردا کا اشارہ ہے کہ زنجیر ہون مین
یہ محبت کی لطافت ہے تو شاید اک دن!
مری تصویر ہو تو - اور تری تصویر ہون مین
حسن اور عشق نے ترتیب دیا تھا جس کو
اسی "افسانۂ معصوم" کی تفسیر ہون مین
یون تو دل - تیری محبت مین رہا ہے معصوم
تو اگر چاہے تو ہان --- قابلِ تعزیر ہون مین
ابتدا تھی مری تخلیقِ نظامِ ہستی
انتہا میری کہ شرمندۂ تدبیر ہون مین
صبر آجائے مجھے بے اثری پر اپنی!
اے خداوند! نہ منت کشِ تاثیر ہون مین
اے روش! "جلوہ گہ حسن" ہے دنیا میری
میری قسمت کہ "محبت کا جہانگیر" ہون مین

روش صدیقی

غزلیات

اثرؔ رحمانی رام پوری

دل کا مقابلہ ہی کیا تیرِ نگاہِ ناز سے
کیسے بچاتے ہم اسے عشق کے ترکتاز سے

قابلِ احترام ہے ہمتِ اہلِ عشق بھی
گھس گیا سنگِ آستان ناصیۂ نیاز سے

اتنے حواس تھے کہ مین خود تو وہان سے آسکا
دل کو مگر نہ لا سکا اُن کے حریم ناز سے

غیرتِ عشق کے سبب آگے نہ بڑھ سکا قدم
بچ کے ذرا چلا تھا مین جادۂ امتیاز سے

افسرؔ صدیقی امروہوی

شمع کے زیرِ قدم لاش ہے پروانے کی
انتہا خوب ہوئی عشق کے افسانے کی

کوہ و صحرا نے دیا نعرۂ وحشت کا جواب
گئین خالی نہ صدائین ترے دیوانے کی

اے جنون کون سے عالم مین گنون آکو مین
نام گھر کا ہے مگر شکل ہے ویرانے کی

صُوَرِ عالمِ فانی کو نہ دے دل مین جگہ
دیکھ پڑ جائیگی بنیاد صنم خانے کی

عالم ہوش مین آجاؤن اگر مین افسر
جوشِ وحشت کی قضا موت ہے دیرانے کی

عشق رامپوری

غلط کہ الفتِ بیداد گر نہین ہے مجھے
مگر ہے یہ بھی کہ اپنی خبر نہین ہے مجھے

کسی کی دید کا خواہان ہون کیا قیامت ہی
یہ جانتا ہون کہ تاب نظر نہین ہے مجھے

تمھارے ظلم سے تعبیرِ لطف کرتا ہون
یہ اور کیا ہے محبت اگر نہین ہے مجھے

نہ پوچھ دل کی مصیبت کا حال کچھ مجھسے
یہی خبر ہے کہ کچھ بھی خبر نہین ہے مجھے

وفائے عہد قول و قسم غلط تہی
سکون قلب میسر مگر نہین ہے مجھے

فراق گورکھپوری

قتل یون ہونے محبت کے گنہگار آئے
ہین یہ تیور کہ انھین نیند سرِ دار آئے

ہین یہی اے نگہ ناز ترے قدر شناس
بید لون پر تجھے اللہ کرے پیار آئے

بادِ صرصر بھی تھمی آبلہ پا بھی ٹھہرے
دشتِ غربت مین نظر شام کے آثار آئے

یا تو یہ ہو کہ مین اُس شوخ کو دیکھون ہی نہین
یا جو دیکھون بھی تو اتنا نہ مجھے پیار آئے

اے فراق آؤ کرین کھوئے ہوئے دل کی تلاش
بعد مدت کے سرِ کوچۂ دلدار آئے

ناطق جیلانی

جنھین ذوقِ شورِ وجود تھا وہ اسی ہوس مین فنا ہوئے
جو اُٹھے تو اُٹھ کے کہین نہ تھے یہ ہوا کہ بانگِ درا ہوئے

جو تمھین ادہر ہو تمھین اُدہر تو کہان گئے مرے ہم نظر
دمِ جلوہ تمنے یہ کیا کیا وہ جو دیکھتے تھے وہ کیا ہوئے

یہ بنائے دیر نگاہ کر یہ نہین حقیقتِ بندگی
جو بیانِ اہل مجاز ہے تو ہمین بتون کے خدا ہوئے

یہ مآلِ اہل حسد ہوا کہ وبالِ جان ہوئی زندگی
یہ حریف ایسے تھے ناسزا کہ جو آپ اپنی سزا ہوئے

ہمین ہمسفر سے خلش رہی یہ رہِ طلب کی روش رہی
نہ کسی کو راہ نما کیا نہ کسی کے راہ نما ہوئے

یہ نمازِ اہل نیاز ہے کہ کبھی پڑھین نہ قضا کرین
اُنھین فکرِ قیدِ رسوم کیا جو بذوقِ نارِ فنا ہوئے

وہ ہمارے گھر جو نہ آئین گے تو ابوالحسن ہمین جائین گے
کوئی ہم تو اُن سے خفا نہین وہ ہوا کرین جو خفا ہوئے

طرزِ زندگی

مصنفہ سید محمد نسیم نہٹوری برق مصنف زرنگستان

اپنی خوبیون کے لحاظ سے (عدیم النظیر) تصنیف

یہ کتاب نصیحت اور عبرت کا مرقع ہے۔ اور پھر خوبی یہ کہ ایک بار پڑھ کر آپ مکرر و سکرر پڑھنے کے لئے مجبور ہون گے۔ زن و شوہر کے تعلقات خوشگوار رہنے کے اصول نہایت ہی سادہ پیرایہ مین اس عنوان سے بیان کئے گئے ہین کہ دل پر نقش ہو جاتے ہین۔

یہ تصنیف عورتون مردون اور بچون کے لئے یکسان مفید ہے۔ پہلے اڈیشن کا اختتام ہو رہا ہے آپ آج ہی اپنی فرمائش روانہ کر دین۔ قیمت ---------- عہ

منیجر نگار لکھنؤ

ثاقب جالندھری

یہ پست و بلندِ عالم ہے یہ نازو نیازِ ہستی ہے
لوگ اس کو بلندی سمجھے ہین جو حق مین ہمارے پستی ہے

بس ٹوٹ گیا بس ٹوٹ گیا ہر تارِ نفس مین ساز جو تھا
اب کس کو سناتے نغمہ ہو اب کونسی ایسی ہستی ہے

ہم عشق کرین وہ ہم سے کھنچین یہ دہر مین ہوتا آیا ہے
آباد انہی دو چیزون سے تو عالم کی یہ بستی ہے

آباد کبھی وہ دل بھی تھا برباد جسے اب دیکھتے ہو
سنسان نظر جو آتی ہے وہ ایک پرانی بستی ہے

ہے حسنِ ازل ہر ایک جگہ خالی نہین اس سے کوئی فضا
کیون دیر و حرم کے گوشون تک محدود تلاشِ ہستی ہے

جرعاتِ محبت پیتے ہی ثاقب یہ ہمارا عالم ہے
ہر وقت ہے پیشِ چشم کوئی آنکھون مین ہمیشہ مستی ہے

نوٹس

ہندوستانی اکاڈمی صوبہ متحدہ الہ آباد کے مطبوعات

ازمنۂ وسطیٰ مین ہندوستان کے معاشرتی اور اقتصادی حالات

از علامہ عبد اللہ یوسف علی - ایم - اے - ایل ایل - ایم - سی - جی - ای

مجلد	عہ۴
غیر مجلد	عہ

زیرِ طبع

(۱) مغلون سے پہلے عرب ہندوستان کے تعلقات۔ (از مولانا سید سلیمان صاحب ندوی)

(۲) مسلمانون کے تمدن پر ہندوؤن کا اثر۔ (از مولانا محمد امین صاحب عباسی)

(۳) ازمنۂ وسطیٰ کا ہندوستانی تمدن۔ (از رائے بہادر مہا مہو پادھیا گوری شنکر ہیرا چند صاحب وجھا)

(۴) ہندی شاعری۔ (از ڈاکٹر اعظم صاحب کریوی)

جنرل سکریٹری ہندوستانی اکاڈیمی الہ آباد

معلومات

سرزمین عجائبات

دنیا مین چار نزہت گاہین سب سے زیادہ مشہور ہین۔ شعب بوان، صغد سمرقند، نہر ابلہ، اور غوطۂ دمشق۔ مگر یہ کل دلکش مقامات بطور "سینی ٹوریم" (تفریح گاہ) کے ہین ان مین بجز سبزہ زار، آب روان اور میوہ دار درختون کے کوئی عجیب و غریب بات نہین۔ ذیل مین ہم ایک ایسے عجیب و غریب خطہ کا ذکر کرتے ہین جو اپنے محیر العقول عجائبات کے باعث (Wonder Land) مشہور ہے

دی یلو اسٹون پارک (The Yellow Stone Park) (اس مقام کا نام ہے) یہ پہلے ریاست ڈیومینگ کے قبضہ مین تھا۔ مگر ۱۸۷۲ء سے امریکہ کے قبضہ مین آگیا ہے یہ پارک عام تفریح گاہ کے طور پر استعمال نہین کیا جاتا نہ اس پارک سے وہ پر لطف باغ مراد ہین جو شہرون مین ہوتے ہین۔ اسکا کل رقبہ ۳۳۰۰ مربع میل ہے اور غالباً دنیا مین کوئی اسقدر مختصر خطہ اتنے زیادہ عجائبات کا قابض ہوگا

ہم اس مین شمالی راہ سے داخل ہوتے ہین اور تقریباً پانچ میل پہاڑی راستہ کو طے کرکے گرم چشمون کے قریب پہنچتے ہین۔ یہان سے ایک رہبر کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہان کا بوقلمون منظر! سبحان اللہ! اس نظارہ کو دیکھکر آنکھین کھلی کی کھلی رہجاتی ہین۔ کٹورے کی طرح تالاب بھرے ہوئے ہین جن پر کُہر کا لطیف سائبان ہر وقت معلق رہتا ہے۔ جب اسکے پار نگاہ گزرتی ہے تو صدہا دلآویز مختلف رنگ نظر آنے لگتے ہین۔ تالاب کے خوشنما کنارون پر گرم گرم پانی کی بلورین موجین آکر لگتی ہین تو سفید سفید کف جمع ہوجاتا ہے۔ "سطح آب کا یہ سحر کار منظر ایک قسم کے خوشنما پودو نکا رہین منت ہے جو اسکے اندر اُگے ہوئے ہین" ان الفاظ سے رہبر سیاح کی حیرت کو رفع کرتا ہے۔

چشمون سے آگے بڑھکر ایک عجیب سرزمین نظر آتی ہے جسکو (Goblin Land) یا ارض شیاطین کہتے ہین۔ اسکے متعلق روایت ہے کہ پہاڑ کی ایک جانب سے شیطان اور دوسری جانب سے اسکی بیوی کے پھسل پڑنے سے اس مقام کی ایسی ہیئت ہوگئی ہے اور اسی مناسبت سے یہ مشہور ہے۔ واقعی یہ عجیب سرزمین ہے اور پر بلند پہاڑ ہے جس کے دامن مین بڑے گہرے غار ہین۔ گورنمنٹ امریکہ نے ارض شیاطین مین سے سڑک نکالنی چاہی تھی مگر غارون کی وجہ سے کامیابی نہوئی

گرم چشمون سے بارہ میل کے فاصلہ پر ہم ایک سڑک پر سے گزرتے ہین جو ٹھوس شیشے کی بنی ہوئی ہے اسکے ایک سمت بیور جھیل کا نیلا پانی جھلکتا نظر آتا ہے اور محاذ مین پہاڑی حصار ہے۔ سڑک کے دوسری طرف شیشے کا ایک ٹھوس پہاڑ کھڑا ہے جسکی سیاہ سطح چکنی اور نہایت چمکدار نظر آتی ہے اس پہاڑ کے دامن مین سڑک بنانا بھی بہت دشوار امر تھا کیونکہ سیاہ کانچ کے بڑے بڑے تودے ہر طرف کھڑے تھے جنکو نہ بارود سے اڑایا جاسکتا تھا نہ اوزارون سے توڑا جاسکتا تھا۔ چنانچہ یہ ترکیب کیگئی کہ انکو پہلے خوب گرم کردیا گیا اسکے بعد ان پر پانی ڈالدیا جس سے پاش پاش ہوکر رہگئے

اسکے بعد ہم (Geysers) دیکھنے بڑھتے ہین "جیسر یا گیسر" کی حقیقت سمجھنے کے لئے اسکو "چشمۂ آتش فشان"

کہنا چاہئے - زمین کے اعماق مین پانی جمع ہوجاتا ہے اور وہان حرارت سے بھاپ بنکر نہایت شدت سے اُبل پڑتا ہے - "جیسرز" گرم پانی کے بڑے بڑے تالاب ہین - جسوقت اُن مین اشتعال آتا ہے تو پانی کے علاوہ کیچڑ تک کا پتہ نہین چلتا - یہ کیفیت ہمیشہ نہین رہتی ہے مگر اسکا بھی کسی کو علم نہین کہ کب دفعتہً پانی مین آگ لگ جائے - ان چشمہ ہائے آتش فشان مین (Norris) بڑا ہے جسکا کھولتا ہوا نیلا پانی دور سے نظر آتا ہے - اس سے تھوڑی سی دور دوسرا چشمہ ہے جسکا نام (Monarch) ہے جو ان تمام چشمون کا بادشاہ معلوم دیتا ہے - اسکی وسیع سطح گرد و نواح مین خوشنما پہاڑون کا منظر پھر پانی کھولنے کی ترنم ریز آواز بخارات کے لطیف بادل عجیب دلکش سینری پیش کرتے ہین اسکے اشتعال کا بھی کوئی وقت مقرر نہین جب چاہتا ہے اپنے دہانۂ آبی سے آگ اُگل دیتا ہے

یہان سے سیر کرتے ہوئے ہم ایک عجیب دہشتناک مقام پر پہنچتے ہین جسکا نام (Hell) یا سقر ہے واقعی یہ سرزمین نمونۂ سقر ہے - یہان کے وحشت خیز مناظر اور بھیانک چیزون کو دیکھکر گمان ہوتا ہے کہ یہ جن یا شیاطین کا مسکن ہے - کہر اور بھاپ کے دل بادل ہمارے سرون پر معلق ہوجاتے ہین - تمام فضا "گوگردی" بو سے پر ہے جسمین سانس لینا سخت دشوار ہے - دم گھٹنے لگتا ہے اور ضیق کی کیفیت پیدا ہوجاتی ہے - پھیپھڑون مین خراش و سوزش ہونے لگتی ہے - ہر طرف چھن چھن کی آوازین اس طرح آتی ہین گویا کسی گرم گرم بڑے برتن پر پانی پڑ رہا ہے - خود زمین اسقدر گرم رہتی ہے کہ پیر جھلس جاتے ہین الغرض سقر کی تمام صعوبتین یہان آکر محسوس ہونے لگتی ہین

یہان سے چلکر (Excelsior) کے پاس پہنچتے ہین جو دنیا مین سب سے بڑا چشمۂ آتش فشان ہے - وہ عرصے سے خاموش پڑا ہوا ہے - اسوقت اسکے اندر نیلا کھولتا ہوا پانی بھرا ہوا ہے جس کے کنارون پر سفید کف کا حاشیہ بہت بھلا معلوم دیتا ہے - اسکے قریب ہی ایک اور چشمہ ہے جسکا نام (Fountain) ہے - اسکا پانی اسقدر صاف و شفاف ہے کہ ۱۵ - ۱۶ فیٹ تک گہرائی مین نظر پہنچ جاتی ہے - اسکی تہ زمین سے پانی کے بڑے بڑے بلبلے اس طرح سطح پر آکر پھوٹتے ہین گویا دیگ مین پانی کھول رہا ہے

(Morning glory) یا "چشمۂ نور سحر" ان تمام چشمون مین دلفریب ہے - پانی کا ایک صاف چشمہ ہے جہان صبح کے آثار اُس کی بلّورین لہرون مین جذب ہوکر مختلف رنگون مین رونما ہوتے ہین بوقلمونی رنگ کی آبی تہ، جسمین سے آفتاب کی پہلی شعاع گزرکر سینکڑون قوس و قزح کے مناظر پیدا کردیتی ہے ایسا دلآویز نظارہ ہے کہ طبیعت پھڑک اُٹھتی ہے - جب سطح ساکن ہوتی ہے تو یہ معلوم دیتا ہے گویا تمام تالاب مین نقرہ یا منجمد پارہ بھرا ہوا ہے! اسکے ساتھ ہی یہ تمام فریب کار منظر، یہ نقرئی سطح نہایت خطرناک بھی ہے - تھوڑی ہی دیر بعد وہی کھولتا ہوا پانی اور اُٹھتی ہوئی بھاپ کے گرم گرم بھبکے پھر موجود ہین - فطرت کی یہ فریب کاری معصوم جانورون کی جان بھی لے لیتی ہے بھولی بھالی چڑیان، اس دلفریب منظر کی شیدائی، کلیلین کرتی ہوئی اس گرم چشمے مین غسل کرنے آتی ہین اور مرکر نکلتی ہین - کئی آدمی بھی ان چشمون مین گرکر بھُن گئے - یہ تمام سرزمین اس قسم کے چشمون سے بھری پڑی ہے، ان تمام کی سیر کرنے کو ایک عرصہ چاہئے - ان مین (Giantess) بھی بہت مشہور ہے - ایک شخص اُسکے اشتعال کا چشم دید

رجسٹرڈ نمبر اے ۴۶۶

نگار

قیمت فی کاپی ۸ر

آیندہ جنوری کا "نگار" ریاض خیرآبادی نمبر ہوگا۔ مفصل اشتہار صفحہ ۴۰ پر ملاحظہ فرمایئے

نگار

چندہ سالانہ صہ ر — اڈیٹر: نیاز فتحپوری

جلد ۴۲ — فہرست مضامین اکتوبر ۱۹۴۲ء — شمارہ ۴

ملاحظات		۲
ایرانی لٹریچر کا تاریخی پس منظر	سید حکیم احمد نقوی	۳
سائنس کے گورکھ دھندے		۸
نواب مرزا شوق کی مثنویاں	ساحل بلگرامی	۱۵
اُردو میں اعداد کا ناقص طرز تحریر	سید محمود نقوی سہیل	۲۰
شاعر فطرت (نظم)	خان بہادر مرزا جعفر علی خاں اثر	۲۲
روس کی موجودہ صحافت		۲۳
سرود پس منظر (نظم)	پروفیسر شور	۲۵
چین کی خفیہ سوسائٹی		۲۶
مکتوبات نیاز		۲۸
پاتال پانی (نظم)	ادیب سہارنپوری	۳۲
باب الاستفسار		۳۳
منظومات	کاوش ۔ نشور ۔ قہر	۳۵
کشکول		۳۶
مطبوعات موصولہ		۳۸
بقیہ ملاحظات		۳۹

ملاحظات

رفتارِ جنگ

لڑائی کا چوتھا سال شروع ہو چکا ہے اور شاید دُنیا توقع رکھتی ہوگی کہ یہ لڑائی کا آخری سال ہے لیکن یہ کوئی نئی بات نہیں۔ پچھلے سال بھی ہم نے یہی سمجھا تھا جو پورا نہ ہوا اور کون کہہ سکتا ہے کہ اور کتنے سال ہمیں انھیں مایوسیوں میں گزارنا ہیں

دُنیا کا ہر واقعہ خواہ وہ کتنا ہی ہیبت ناک کیوں نہ ہو اس کے حد و انتہا کی کچھ صورتیں سمجھ میں آجاتی ہیں، لیکن موجودہ جنگ تاریخ عالم کا اتنا عجیب و غریب واقعہ ہے کہ زمانہ کے ساتھ اس کی عمر بھی بڑھتی جا رہی ہے اور کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کا انجام کیا ہوگا۔ یقیناً ایک وقت آئے گا جب یہ خونیں ورق اُلٹا جائے گا، لیکن اُس وقت کرۂ زمین کا جغرافیہ کیا ہوگا، نئی دنیا کی نئی تاریخ کس عنوان سے شروع کی جائے گی اور علم و حکمت کے کون کونسے اور تاریک پہلو نئے خطرات کی صورت میں متعین ہو چکے ہوں گے، یہ کہنا بہت مشکل ہے

لوگ غالباً خیال کرتے ہوں گے کہ دُنیا کی تمام پچھلی لڑائیوں کی طرح موجودہ جنگ کو بھی کسی نہ کسی فریق کی فتح پر ختم ہو جانا ہے اور اسکے بعد دُنیا پھر اپنی اصلی حالت پر آجائے گی، لیکن ایسا سمجھنا غالباً درست نہیں، کیونکہ دُنیا کی یہ پہلی لڑائی ہے جو فتح و شکست کا کوئی مفہوم نہیں رکھتی اور جو غالب و مغلوب دونوں کو یکساں تباہ کر دینے والی ہے۔ یہ جنگ دو مخالف قوموں کی جنگ نہیں بلکہ دو متضاد عناصر کی جنگ ہے، انسانوں کی لڑائی نہیں بلکہ خیال و اعتقاد کی لڑائی ہے، نیک و بد کی لڑائی ہے اور اس کا فیصلہ اُسی وقت ہو سکے گا جب کرۂ ارض پر یزدان و اہرمن میں سے صرف ایک کی حکومت آیندہ کے لئے متعین ہو جائے اور یہ شاید اس قدر آسان نہیں

اسوقت روس کا محاذ دُنیا کے بیم و رجا کا مرکز بنا ہوا ہے اور اسٹالن گراڈ کی خبروں پر ہر وقت لوگوں کے کان لگے ہوئے ہیں، لیکن کیا اسٹالن گراڈ کا فیصلہ جنگ کا فیصلہ ہے، کیا قفقاز میں جرمن کامیابیاں اتحادیوں کی شکست کا مفہوم رکھتی ہیں اور اگر ہم فرض کر لیں کہ جاپان ہندوستان پر قابض ہو جاتا ہے تو کیا اس سے آتشِ جنگ سرد پڑ جائیگی؟ ہرگز نہیں۔

(سلسلہ کے لئے ملاحظہ ہو صفحہ ۳۹)

ایرانی لٹریچر کا تاریخی پس منظر

(بہ سلسلۂ ماسبق)

اب اصل پہلوی کی تاریخ کی طرف پھر رجوع کیا جاتا ہے - اس زبان کی یادگاریں حسب ذیل ہیں :-

(۱) پارتھیوں کے زمانے کے سکّے --- (۲) ساسانیوں کے بعد کے زمانے کے سکّے - کتبے - اور کتابیں --- (۳) ساسانیوں کے بعد کے زمانے کے سکّے - کتبے --- اور کتابیں -

سکّوں اور کتبوں کی تحریر اتنی مغلق نہیں - انھیں کی مدد سے کتابوں کی عبارت بہت کچھ حل کی گئی ہے کیونکہ اُن کے حروف بہت کم مختلف الصوت ہیں - ایسا معلوم ہوتا ہے کہ امتدادِ زمانہ سے ساسانیوں کے زمانہ میں حروف کی شکلیں ایسی تبدیل ہو چکی تھیں کہ کئی حرف ایک ہی شکل کے ہو گئے تھے جس کی وجہ سے یہ پہچاننا مشکل ہو گیا کہ کونسا حرف استعمال کیا گیا ہے - پہلوی تحریر کے سکّوں اور کتبوں کا رواج عربی حکومت کے زمانہ میں بھی عرصہ تک رہا اور عربوں کے صیغۂ مال میں پہلوی ہندسہ اور زبان ہی استعمال میں آتے رہے -

پہلوی لفظ کا نمونہ باعتبار کتابت کے اوپر درج ہو چکا ہے - ذیل میں باعتبار تلفظ کے ایک کتبہ درج کیا جاتا ہے - یہ کتبہ اردشیر پاپکان کے وقت کا نقشِ رستم سے لیا گیا ہے اور اس طرح پڑھا جاتا ہے :-

"پتکاری - زنا - مزدیسن - بگی - ارتخشتر - ملکان ملکا - ایران - منوچتری - من - یزتان - بارہ - پاپگی - ملکا"

ترجمہ --- "یہ تصویر اُس مزدہ کے پجاری دیوتا ارتخشتر شہنشاہِ ایران کی ہے جو دیوتاؤں کی پاک نسل سے ہے اور جو پاپک بادشاہ کا لڑکا ہے"

پہلوی کتابوں کی تین قسمیں قرار دی گئی ہیں - کسی کتاب کا مسودہ ۱۳۲۳ء سے قبل کا دستیاب نہیں ہوا ہے - بالعموم یہ کتابیں اسلامی عہد کی تالیف پائی جاتی ہیں - اقسام یہ ہیں :

(۱) آوستا کے ترجمے --- (۲) مذہبی کتابیں --- (۳) مذہب سے غیر متعلق کتابیں -

آوستا کے پہلوی ترجمے آوستا کے الفاظ اور عبارت کی ترتیب و ترکیب کے اس قدر پابند پائے جاتے ہیں کہ اُن کو پہلوی ادب کا نمونہ تصور کرنا قرینِ صحت خیال نہیں کیا جاتا -

مذہبی کتابوں کی تعداد پچپن ہے جن میں تقریباً چار لاکھ چھیالیس ہزار لفظ استعمال میں آئے ہیں - یہ کتابیں دعاؤں - تفسیروں - روایات - نصائح - احکام امتناعی - اقوالِ متبرک وغیرہ پر مشتمل ہیں - ان میں سے چند ممتاز کتابوں کے نام یہ ہیں :-

(۱) دینؔ کرتؔ - (احکام مذہبی) - اِس کتاب میں مذہب مزدی کے اُصول - رواج - روایات - تاریخی کیفیت کی تشریح کی گئی ہے - اس کی تالیف آترفرن باگ سے منسوب ہے اور اُس کا زمانۂ تصنیف نویں صدی عیسوی - (مامون رشید کا زمانہ) قرار دیا گیا ہے -

(۲) بندؔ اہشؔ - یہ مذہبی معلومات کا ذخیرہ ہے اور اُس کی تالیف گیارھویں یا بارھویں صدی عیسوی سے متعلق ہے -

(۳) داتستانِ دینِک - اس کتاب میں بانوے مسئلوں کے متعلق مذہبی رائے ظاہر کی گئی ہے اور اُس کا زمانۂ تالیف نویں صدی عیسوی ہے -

(۴) شکند گمانِک وِچار - (ماحی شکوک مقدمہا) - اس کتاب میں مذہب زردشت کے نقطۂ نظر سے عیسائی - یہودی اور اسلامی عقائد متعلقِ خیر و شر سے بحث کی گئی ہے -

(۵) دِینائے مینوئے خِرَد - (روح یا فرشتۂ عقل کی رائے) - اس کتاب میں دینِ زردشتی کے متعلق باسٹھ سوالات کے جواب فرشتۂ عقل نے دئے ہیں۔ یہ پہلوی کی سب سے آسان کتاب سمجھی جاتی ہے -

(۶) اَردوِراف نامک - اس کتاب میں اسکندر ملعون کے حملہ اور حکومت سے ایران کی جو دینی اور دینوی تباہی ہوئی اُس کا بیان ہے - ساسانیوں کے زمانہ میں مذہبی اور قومی معاملات کی تجدید جس طرح ہوئی اُس کی کیفیت درج کی گئی ہے اور مذہب زردشتی میں حیاتِ آیندہ کے متعلق جو عقاید ہیں اُن کا تذکرہ ہو اسی کتاب میں بہشت و دوزخ کا نظارہ کرایا گیا ہے جو اسلامی کتابوں کے بیانات سے ملتا جُلتا ہے -

(۷) جاماسپ نامک) - یہ کتاب قدیم بادشاہوں کے افسانوں پر مشتمل ہے -

(۸) اَنْدَرزِ خسروِ کاوتان - اس میں شاہ نوشیرواں (انُوشک رُوان یعنی غیر فانی روح یا جان) کے پند و نصائح و احکام درج ہیں -

غیر مذہبی کتابوں کی تعداد صرف گیارہ ہے اور اُن میں تقریباً چار ہزار ایکسو الفاظ مستعمل ہوئے ہیں - ان کتابوں میں سے چند کے نام یہ ہیں :-

یادگار زریران - شاہنامہ گشتاسپ یا پہلوی شاہنامہ - کارنامک ارتخشتر پاپکان - درخت عسوریگ - چترنگ نامک -

قیاس یہ کیا گیا ہے کہ علمائے زردشتی نے ایسی کتابوں سے کوئی دلچسپی نہیں لی جن کا تعلق مذہب سے نہ ہو - یہی وجہ خیال کی گئی ہے کہ آوستا کے وہ حصے جو علمی یا فلسفی مضامین پر مشتمل تھے علما کی لاپروائی سے ضائع ہوگئے - اسی طرح پہلوی علم ادب کی کتابوں کی کیفیت پائی جاتی ہے - خیال یہ ہے کہ ایسی تصنیفات بہت زیادہ ہوں گی کیونکہ بعض کتابوں کے نام اور اُن کے مضامین کا حوالہ اسلامی عہد کی کتابوں میں پایا جاتا ہے لیکن وہ کتابیں اب دستیاب نہیں ہوتیں - جو کتابیں اسوقت موجود ہیں بالعموم وہ قومی روایتوں اور افسانوں سے معمور نظر آتی ہیں - زمانۂ حال میں بھی بعض پہلوی کتابیں تصنیف ہوئی ہیں جن میں سے چند کے نام یہ ہیں :

زرتُشت نامہ - صددار - علمائے اسلام - قصۂ سنجان

قصۂ سنجان میں وہ حالات درج ہیں جو ایران سے ہندوستان کی طرف پارسیوں کی ہجرت سے متعلق ہیں - اس کتاب میں چند قدیم پہلوی عبارتوں کی تشریح بھی بزبان فارسی پائی جاتی ہے -

اسوقت تک کسی پہلوی نظم کا کھوج نہیں لگا ہے جو ساسانی یا اشکانی دور سے متعلق ہو - دل اس کو تسلیم نہیں کرتا کہ ساسانی بادشاہوں کے درباروں میں گانے یا شعر پڑھنے کا چرچا نہ ہوتا ہو - قدیم روایات میں چند نام شاعروں یا گانے والوں کی ذیل میں لئے گئے ہیں - قیاس یہ چاہتا ہے کہ ایسے لوگ اُس زمانہ میں ضرور ہونگے جو سازوں پر گیت گاتے ہوں - ان لوگوں میں سے باربد کا نام بہت مشہور ہے جس کو عربی میں بھلبذ لکھا گیا ہے اور جو غالباً پہلوی 'پہلیت' ہے - روایات کی بناء پر عربی مصنفین نے اِن لوگوں کا ذکر کیا ہے - باربد کی نسبت ایک عربی شاعر نے اپنی نظم میں یہ ظاہر کیا ہے کہ وہ خسرو پرویز کے دربار کا رکن تھا اور بادشاہ کے منھ ایسا لگا تھا کہ جو بات اور کوئی شخص بادشاہ کے حضور میں نہ کہہ سکتا تھا وہ اُس کے ذریعہ سے کہلوائی جاتی تھی - قصہ یہ ہوا کہ بادشاہ کا ایک گھوڑا شبدیز نامی تھا جس کو بادشاہ بہت عزیز رکھتا تھا - محبت کی وجہ سے اُس نے یہ حکم دے رکھا تھا کہ جو شخص اُس گھوڑے کی موت کی خبر سُنائے گا وہ قتل کر دیا جائیگا اتفاق سے جب وہ گھوڑا مرا تو کسی کو جرأت نہ ہوئی کہ بادشاہ کو خبر پہونچائے - آخر کار باربد سے رجوع کیا گیا اور اُس نے پرویز کے روبرو ایسا گیت بنا کر سنایا جسکے مضمون سے بادشاہ گھبرا گیا اور بے ساختہ بول اُٹھا کہ شاید میرا گھوڑا مر گیا - باربد نے جواب دیا کہ حضور ہی ایسا فرما سکتے ہیں اور فرماتے ہیں - اس طرح سے گھوڑے کے مرنے کی خبر سُنانے کا الزام کسی کے ذمہ عاید نہ ہوا -

باوجود اس کے نظم کی کوئی یادگار ساسانی یا اشکانی زمانہ کی موجود نہیں ہے -

پہلوی زبان کا رواج بند ہو جانے کے بعد وہ زبان عربی کی آمیزش سے جاری ہوئی جس کو فارسی حال کہتے ہیں - اس کی کتابت عربی حروف میں ہوتی ہے اور وہ عربی قواعد صرف و نحو کی بھی بڑی حد تک پابند ہے - لیکن اب اس زبان میں بھی تبدیلی کے آثار پیدا ہوتے جاتے ہیں - زبان کا ڈھنگ اس اعتبار سے کہ اُس میں نئے نئے لفظ داخل ہوتے جاتے ہیں - نئے نئے خیالات سیاسی - اقتصادی - معاشرتی اور تمدنی روز بروز پیدا ہو رہے ہیں - طرح طرح کے محاورات کا استعمال رواج پاتا جاتا ہے اور جس کو روزمرہ کہتے ہیں وہ زبان کا عنصرِ خاص بن گیا ہے - سادہ بیانی کی طرف توجہ ہے اور مرصع نگاری اور پر پیچ خیال

آفرینی کی راہیں چھوٹتی چلی آتی ہیں۔ بہت کچھ بدلا ہوا نظر آتا ہے اور اگر یہ تحریک جاری رہی اور اُس نے کچھ زور پکڑا کہ عربی الفاظ زبان سے کم کر دئے جائیں اور حروف بھی بدل دئے جائیں تو کیا معلوم فارسی زبان کس رنگ میں دکھائی دے۔ اس نئے رنگ کی زبان کو جس میں کئی اصنافِ سخن مثل ناول۔ ڈراما وغیرہ کا اضافہ ہوتا جاتا ہے اہلِ ہند فارسی جدید کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ چند نمونے پیش کئے جاتے ہیں :-

ناول موسوم بہ 'عشق و سلطنت' ۔ (ومی تواں گفت اولین زمانے ست کہ در ایران با اسلوبِ مغرب زمین تالیف شدہ) "بلے این تہیۂ تہنیۂ عروسی است و گماں ندارم کہ عروسی جز برائے کورس پادشاہِ با اقتدارِ پارس ودی باشد۔ چہ کہ امروز کسے جز او ایں قدر نزد اہالی اکبتان محبوبیت ندارد کہ مردم عروسی اورا چوں عیدے بزرگ دانستہ و بازار ہا را زینت کردہ و از صمیمِ قلب اظہارِ سرور و شادمانی نمائند"۔

ڈراما موسوم بہ 'گزارشِ مردم گریز' :-

مونس — (بہ پیشِ فرّاش میرود) — چہ ہست فرّاش ؟
بیا بہ بینم !

فرّاش : دارم دو حرف با سرکار،

مونس : تواں دو حرف خودت را کنی بلند اظہار،

فرّاش : رئیس دیوان آں را کہ بندہ ام فرّاش،
مرا بدست بداد ست حکم حاضر باش،
بتو........

مونس : بکہ ؟ بمن ؟

فرّاش : آرے بتو،

مونس : برائے چہ کار،

فرّاش : بحرفِ مفت (ابدی) و حضرتِ سرکار

ڈراما بطرزِ دیگر موسوم بہ 'حکایت کربلا رفتنِ شاہ قلی مرزا' — ماخوذ از تیاتر میرزا ملکم خاں (شاہ قلی مرزا مردے بود بلند قامت در ویش دراز و شکبر و مناعت طلب و درشت خوے در ۱۲۳۳ھ بعزمِ زیارتِ کربلا از طہران حرکت کرد در حین عبور چند روزے در کرمان شاہ نزد حاکم آنجا مہمان می شود شب اول بعد از ملاقات و حرفِ شام و صحبت ہائے متفرقہ برمیخیزد و میرود بمنزلیکہ برائے او تعین کردہ اند۔)

شاہ مراد میرزا حاکم ۔ (بہ شفیع بیگ پیشِ خدمت) - شفیع بیگ شاہزادہ مہمان ماست ایرج میرزا مواظب ست و تو مہمان دار بشش نفر فرّاش و یک نفر قہوہ چے بردار بہ زیرِ دست خود باشد درست متوجہ باشید بہ تنگ نہ در دبشاہزادہ۔

شفیع بیگ : بلے قربان چشم البتہ کارِ نوکر خدمت ست۔

شاہزادہ حاکم : خیر بلے قربان تنہا کافی نیست ایرج میرزا اند ایں شاہزادہ مردیست بسیار مشکل پسند و باریک بیں ۱۱ احمق و زود رنج باید با حتیاط حرکت بکنی برادرِ من ست مہمان ست مبادا رنجش بہم رساند۔

شفیع بیگ : قربان بیست سال ست در ظلِ رافتِ سرکارِ نواب والا تربیت یافتہ ام و امید وارم کہ ایں قسم خدمات زیں بندہ بر آید انشاء اللہ در کمالِ خوشنودی و امتنان تشریف خواہند بُرد خاطر جمع دارید۔

شاہزادہ حاکم : خوب ست حالا مرخصی فردا صبح برو سرِ خدمت و درست متوجہ باش۔

سیاحت نامۂ ابراہیم بیگ — (سیاحت نامہ اور ابراہیم بیگ دونوں فرضی ہیں۔ اس میں ایران اور ایران کے حاکموں کی حالت کا خاکہ اُڑایا گیا ہے جب ابراہیم بیگ وزیرِ جنگ کی خدمت میں حاضر ہو کر پوچھتا ہے کہ ملک کی حفاظت اور فوجوں کی ترتیب کا کیا انتظام کیا گیا ہے تو وزیر ناراض ہو کر اُسے پٹواتا ہے اور

مکان سے باہر نکال دیتا ہے۔ اس واقعہ کے متعلق انتخاب ذیل قابل ملاحظہ ہے)

...... آیا با سربازان شصت سالہ و سرتیپانِ بیست سالہ جلو این ہمہ دشمنان را کہ از چہار جانب چشم بوطن ما دوختہ اند تواں گرفت ؟ این سرتیپانِ بیست سالہ کدامین خدمت نمایاں بدولت و ملت کردہ اند کہ سزاوار شمشیر و حمائل سرتیپی شدہ اند ؟

چوں سخن بدیں جا رسید دیدم رنگ از رُخِ وزیر پریدہ با آواز مہیب صدا زد - اسد - اسد - اسد بیگ فراش باشی آمد - گفت این پدر سوختۂ فضول و یاوہ گو را کدام پدر سگ بدینجا راہ دادہ ؟ گفت قربان حاجی خان رقعہ بہ بندہ نوشتہ بود - گفت گہ خورد با پدرش بزنید این پدر سگ را بزنید ! بکشید بیرون - دیگر خود را ندانستم - ہی مشت و سیلی بود کہ بسر و صورت من از آسمان چوں قطراتِ باران فرو می ریخت - وقتے دیدم کہ نہ عبا دارم و نہ کلاہ در سر دارم، پنج شش نفر بزمین نقش بستم - چند تن ہم از پائین ہجوم کردند کہ گرفتہ بہ محبس ببرند - گفتم یا ! - برضائے خدا دور شوید ! وزیر فرمود بیرونش کنید حبس نہ فرمود - گفتند ممکن نیست - مشہدی حسن خود را رسانید - بزبان انگلیسی گفت اماں برادر جاں چہ خبر ست ؟ گفتم ہر چہ شدنی بود شد اما حکم حبس نداد طورے کنید کہ از اینجا بدر رویم - گفت پول داری ؟ گفتم ہیچ ندارم - گفت ساعت را در آر ! ہر چہ خواستم ساعت را در آرم دستم میلرزید، نتوانستم - مشہدی حسن جیبم را پارہ کردہ در آوردہ - بزنجیر بفراشان سپرد - دست از ما باز داشتہ مشغولِ تعیینِ قیمت ساعت و تقسیم آں شدند - ما از میان بدر شدیم -

مضمون ماخوذ از اخبار "صور اسرافیل"

چرند پرند - بعد از چندیں سال مسافرت ہندوستان و دیدن ابدال و اوتاد و مہارت در کیمیا و لیمیا و سیمیا الحمد للہ بتجربۂ بزرگی نائل شدم و آں دوائے ترک تریاک ست - اگر ایں دوا را در ہر یک از ممالک خارجہ کسے کشف میکرد ناچار صاحب امتیاز می شد - انعامات می گرفت - در ہمۂ روزنامہ ہا نامش بہ بزرگی درج می شد - اما چہ کنم کہ در ایران قدر داں نیست -

عادت طبیعت ثانوی ست - ہمینکہ کسے بکارے عادت کرد دیگر باین آسانیہا نمی تواند ترک کند - علاج منحصر باین ست کہ بترتیب مخصوصی بر وزماں کم کند تا وقتیکہ بکلی از سرش بیفتند -

حالا من بہ تمام برادران مسلمان غیور تریاکی خود اعلان می کنم کہ ترکِ تریاک ممکن ست ...... مثلاً یک نفر کہ روزے دو مثقال تریاک می خورد روزے یک گندم از تریاک کم کردہ دو گندم مرفین بجائے آں زیاد کند و کسے کہ دہ مثقال تریاک می کشد روزے یک نخود کم کردہ دو نخود حشیش اضافہ نماید و ہمیں طور مداومت کند تا وقتیکہ دو مثقال تریاک خوردنی بہ چہار مثقال مرفین و دہ مثقال تریاک کشیدنی بہ بیست مثقال حشیش برسد ......

...... و ہمیشہ بزرگان و متخصصین ہم کہ می خواہند عادتِ زشتے از سر مردم بیندازند ہمیں طور میکنند مثلاً وقتیکہ بزرگانِ ما فکری کنند کہ مردم فقیر اند و استطاعتِ نانِ گندم خوردن ندارند و رعیت ہمۂ عمرش را باید بزراعت گندم صرف کند و خودش ہمیشہ گرسنہ باشد ببینید چہ میکنند -

روز اول سال نان را با گندم خالص می پزند - روز دوم در ہر خروار یک من تخم - جو - سیاہ دانہ - خاک ارہ - یونجہ - مثلاً مختصر عرض می کنم معلوم ست در یک خروار گندم کہ صد من ست یک من از ایں چیزہا ہیچ معلوم نمی شود - روز دوم دو من می زنند و بعد از صد روز کہ سر ماہ و دہ روز باشد صد من گندم صد من تخم - جو - سیاہ دانہ - خاکِ ارہ - کاہ - یونجہ - شن شدہ است در صورتیکہ ہیچ کس ملتفت نشدہ و عادتِ نانِ گندم خوردن ہم از سرِ مردم افتادہ ست -

برادران غیور ...... ہمان طور کہ ممکن است عادت را از سر مردم انداخت ہماں طور ہم ممکن است عادت را از سر سنگ و کلوخ و آجر انداخت -

چرا کہ میان عالم صغیر و عالم کبیر مشابہت تمام است مثلاً یک مریض خانۂ حاجی شیخ ہادی مجتہد مرحوم ساخت - موقوفات ہم برائے آں معین کرد کہ ہمیشہ یازدہ نفر مریض در انجا باشند - تا حاجی شیخ ہادی حیات داشت مریض خانہ بہ یازدہ نفر عادت کرد - ہمیں کہ حاجی شیخ ہادی مرحوم شد طلاب مدرسہ بہ پسر ارشدش گفتند ما وقتے تو را آقا می دانیم کہ موقوفاتِ مریض خانہ را خرج ما کنی - حالا ببیند این پسر خلفِ ارشد بقوتِ علم چہ کرد - ماہِ اول یک نفر از مریض ہا را کم کرد - ماہ دوم دو تا - ماہ سوم سہ تا ماہ چہارم چہار تا و ہمیں طور تا حالا کہ عدۂ مریض ہا بہ پنج نفر رسیدہ و کم کم بحُسن تدبیر آں چند نفر ہم تا پنج ماہ دیگر از میاں خواہد رفت - پس بہ بینید کہ بانتسیر چہ طور می شود عادت را از سر ہمہ کس و ہمہ چیز انداخت - حالا مریض خانہ کہ یازدہ مریض عادت داشت بدون اینکہ ناخوش شود عادت از سرش افتاد (دخو)

(۳) کبلائے دخو - تو قدیم ہا گاہی بدردِ مردم میخوردی - مشکلے بدوستانت او میداد حل میکردی - ایں آخرہا کہ سروصدائے از تو نبود میگفتم بلکہ تو ہم تریاکی شدہ در گوشۂ اطاق پائے منقل لم دادۂ - آما گر کہ تو تا قلائے حقہ ہماں طور کہ توی صور اسرافیل نوشتہ بودی یواشکی بے خبر شنیدہ انم برائے تحصیل علم کیمیا و لیمیا و سیمیا گزاشتی در رفتی بہبند - حکماً گنج نامۂ ہم پیدا کردۂ - درحال اگر سوء ظنے درحق تو بردہ ام باید خیلے خیلے بہ بخشی عذر میخواہم - باز الحمد للہ بسلامت آمدی جائے شکرش باقی ست چرا کہ خوب سرو قلتش رسیدی - برائے اینکہ کارہا خیلے شلوق پلوق ست -

غدار فنگاں ہمہ را بیامرزد خاک براش خیر نبرد - در قفقازاں یک ملا اینکلی داشتیم روضہ خوان خیلے شوخ بود - حالا نداشتہ باشد باسن خیلے میانہ داشت - وقتے کہ میرفت روضہ بخواند اول یک مقدمۂ دورو دراز میچید - ہر چند بے ادبی ست میگفت مطلب ایں طور خرفہم تر میشود (بدمثل مناقشہ نیست) بنظرم می آید برائے شما ہم محض اینکہ درست بہ مطلب پے ببرید یک مقدمہ چنیم بد نیست -

مستزاد

اے شہنشاہِ جواں - شیرانِ جنگ آور نگر	در نگر	عالمے دیگر نگر
ملتے را راحت از مشروطہ سرتا سر نگر	در نگر	عالمے دیگر نگر
پادشاہی کن کہ دورانِ جہاں برکامِ تست	رامِ تست	شاہ احمد نامِ تست
در محامد خویش را ہمنامِ پیغمبر نگر	در نگر	عالمے دیگر نگر
دادخواہی کن دریں مشروطہ چوں نوشیرواں	در جہاں	زخشِ ہمت بر جہاں
خویش را والاتر از دارا و اسکندر نگر	در نگر	عالمے دیگر نگر
آخر ایں ایراں کہ بودہ جائے جم پائتخت کے	اہلِ وے	غرق غفلت تا کے
باغباناً - باغ را بے شاخ و برگ و بر نگر	در نگر	عالمے دیگر نگر
پارلماں را از وکیلانِ صحیح آباد کن	داد کن	ملتے را شاد کن
خائنیں را زد دکن اخراج بر محضر نگر	در نگر	عالمے دیگر نگر
مدتے با شیخ رفتی با حریفاں ساختی	تاختی	دیدی آخر باختی
حال و روز بعد از نیت را از یں بدتر نگر	در نگر	عالمے دیگر نگر

سید حکیم احمد نقوی

حضرت نیاز فتحپوری کی بعض کتابوں کے جدید اڈیشن

نقاب اُٹھ جانے کے بعد	شہاب کی سرگزشت	ترغیبات جنسی	مذاکرات نیاز
۸ر	عہ ر	سے ر	لگہ ر

یہ تمام کتابیں نظر ثانی کے بعد نہایت نفیس کاغذ پر، بہترین طباعت کے شایع ہوئی ہیں، اور پہلے اڈیشنوں میں جو غلطیاں رہ گئی تھیں، انھیں دور کردیا گیا ہے۔

چاروں کتابوں کے آرڈر پر محصول ڈاک معاف

مینیجر نگار - لکھنؤ

سائنس کے گھریلو شعبدے

(بہ سلسلۂ ماہ ستمبر ۴۲ء)

برف بنانا — فراہم کیجیے:- دوات کا ڈھکنا (جس میں بعض بوتلوں پر بجائے ڈاٹ کے لگا رہتا ہے) — پلیٹ — امونیم نائٹریٹ
Amm. Nitrate

پلیٹ میں اتنا پانی ڈالیے کہ اس کا درمیانی خالی حصہ بھر جائے۔ اس کے بعد چمچ کے ذریعہ سے دوات کے ڈھکنے کو امونیم نائٹریٹ سے نصف بھر دیجیے اور اُسکو پلیٹ کے درمیان رکھ دیجیے۔

پھر ڈھکنے میں آہستہ آہستہ ایک ایک قطرہ پانی ٹپکایئے، پلیٹ کا پانی جمکر برف ہو جائے گا۔

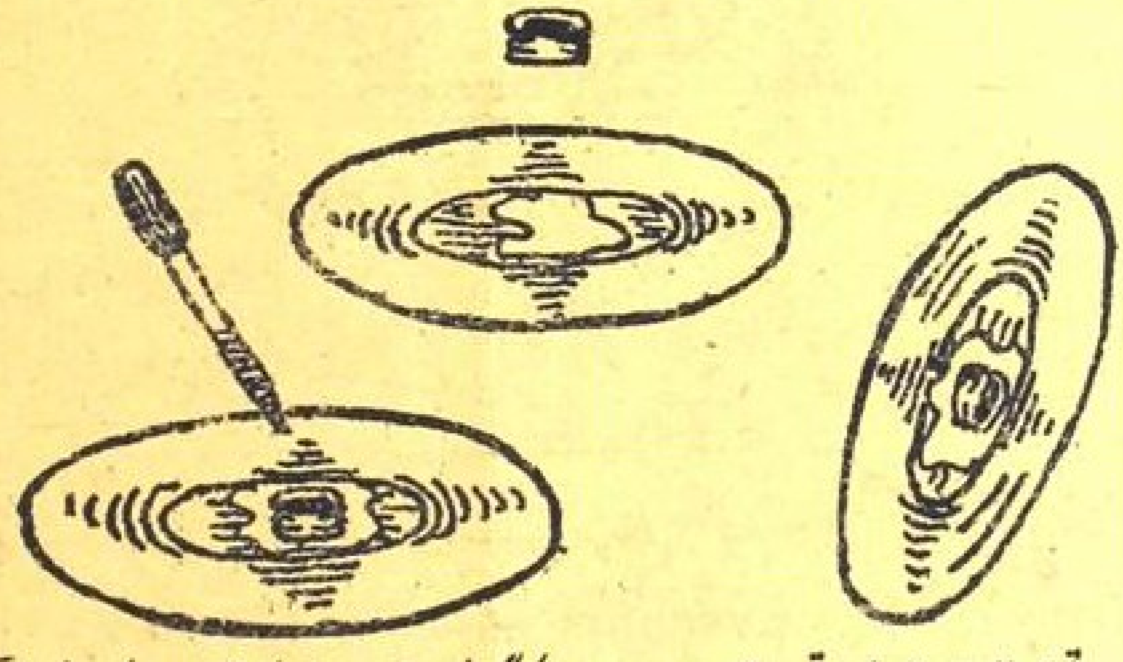

کیوں؟ جب کوئی منجمد چیز رقیق حالت میں تبدیل ہوتی ہے تو وہ چاروں طرف کی گرمی کو اپنے اندر جذب کرتی ہے۔ چونکہ امونیم نائٹریٹ گرمی کو زیادہ جذب کرتا ہے اس لئے جب پانی ڈالکر اسے رقیق کیا گیا تو اس نے پلیٹ کے پانی کی گرمی کو اس حد تک جذب کر لیا کہ وہ نقطۂ انجماد تک پہونچ گیا۔

شکر کے بلوری ٹکڑے — فراہم کیجیے:- شکر — پیالہ — دفتی — دھاگا — گرم پانی — کنکری۔

پیالہ کو گرم پانی سے بھر دیجیے اور جتنی شکر اس میں گھُل سکتی ہے ڈالدیجیے۔ اس پر ایک دفتی کا ٹکڑا رکھ کر بند کر دیجیے۔ ایک فٹ دھاگا لیکر اس کے کنارے چھوٹی سی کنکری باندھکر پانی میں لٹکا دیجیے۔ دفتی میں ایک سوراخ اتنا بڑا کر لینا چاہیے کہ دھاگا اس کے اندر سے گزر جائے — دو چار دن کے بعد آپ دھاگے کو نکالیں گے تو اسکے چاروں طرف شکر کے بلوری ٹکڑے نظر آئیں گے

کیوں؟ تمام محلول چیزوں کا خاصہ ہے کہ جب وہ رقیق حالت سے منجمد حالت میں منتقل ہوں گی تو وہ بلوری ٹکڑوں کی صورت اختیار کر لیں گی۔

شکر سے کوئلہ — فراہم کیجئے:- شکر — گندھک کا تیزاب — پیالہ — کانچ کا ٹیوب (Test tube) ۔

تھوڑی سی شکر ٹیوب میں رکھ کر گیس یا اسپرٹ کے چولہے پر گرم کیجئے، تھوڑی دیر میں وہ رقیق ہو جائے گی۔ آپ گرم کرتے رہئے، یہاں تک کہ وہ بالکل سیاہ ہو جائیگی۔

دوسری ترکیب یہ ہے۔ چار چمچ شکر ایک چمچ پانی میں ڈال کر جوش دیجئے۔ اس سے قوام طیار ہو جائے گا۔ اس میں قطرہ قطرہ گندھک کا تیزاب ڈالئے۔ اس سے شکر کوئلہ میں تبدیل ہو جائے گی اور پیالہ کے چاروں طرف یہ مادہ باہر آکر پھیل جائے گا۔

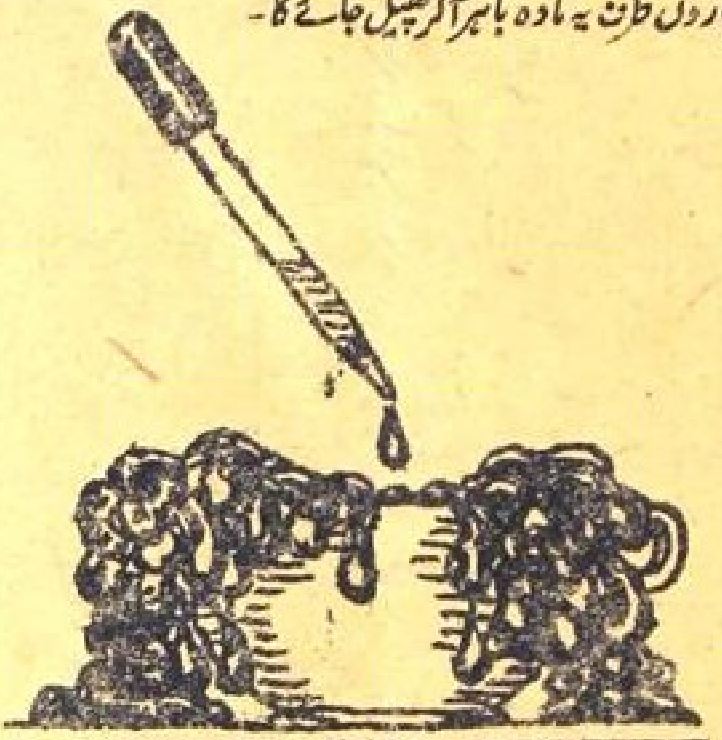

کیوں؟ کاربن ہر چیز میں پایا جاتا ہے اور اس کا رنگ سیاہ ہے، لیکن دوسری چیزوں سے مل کر اس کا رنگ بدل جاتا ہے، اس لئے جب دوسرے اجزا آپ علٰحدہ کر دیں گے تو اخیر میں کوئلہ رہ جائے گا۔

آپ کو یہ سنکر حیرت ہوگی کہ شکر، کوئلہ اور ہیرا سب کاربن ہیں۔

آگ سے نہ جلنے والا کپڑا — فراہم کیجئے:- ململ کے دو ٹکڑے — پیالہ — موم بتی — Amm. Phosphate

پیالہ میں چار چمچ پانی ڈال کر اس میں ایک چمچ امونیم فاسفیٹ ڈالئے۔ جب دونوں حل ہو جائیں تو ململ کا ایک ٹکڑا لیکر اس میں اچھی طرح ڈبو لیجئے اور پھر نکالکر بغیر نچوڑے ہوئے خشک کر لیجئے۔ اب اس پر آگ اثر نہ کرے گی۔

موم بتی روشن کرکے پہلے ململ کے اس ٹکڑے کو جلائیے جس میں دوا جذب نہیں ہے اور پھر ململ کے دوسرے ٹکڑے کو۔ دونوں کا فرق معلوم ہو جائے گا۔

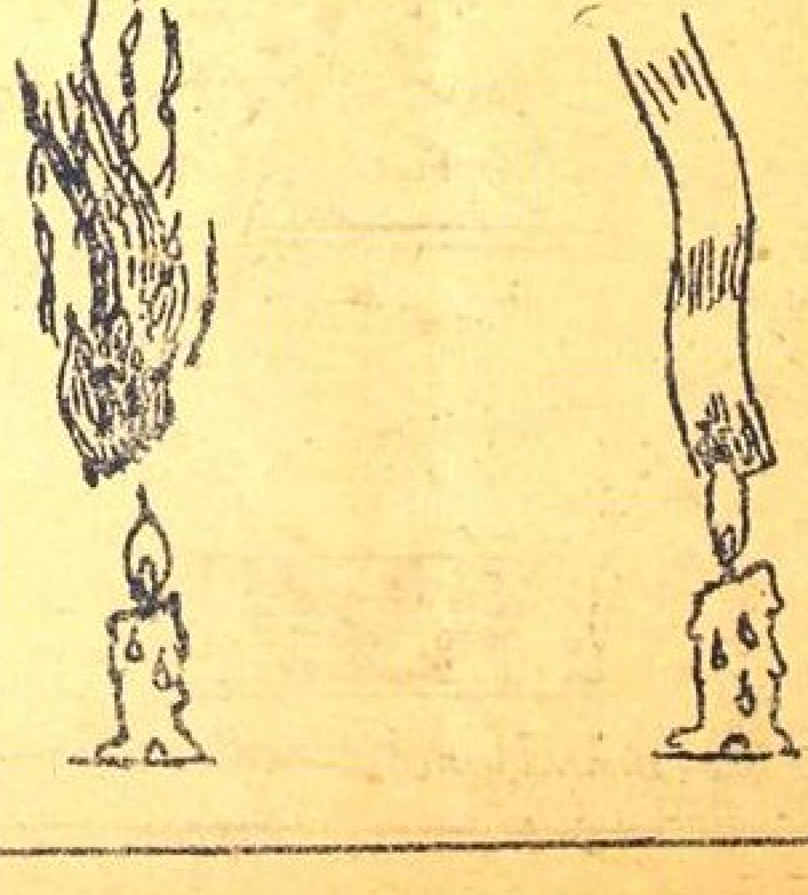

چاقو پر نام کھودنا ـ فراہم کیجئے :ـ Hydrochloric Acid موم بتی ـــ شیشے کا گلاس ـــ نوکدار لکڑی

پہلے موم بتی پگھلا کر اس کا موم چاقو کی سطح پر ٹپکائیے ، جب موم ٹھنڈا ہو جائے تو کسی نوکدار لکڑی سے اپنا نام یا جو کچھ لکھنا ہو موم کی سطح پر لکھئے یہاں تک کہ اس حصہ کا موم نکل کر چاقو کی آہنی سطح نظر آنے لگے ۔ اس کے بعد چاقو کو پانی کے گلاس میں ڈال دیجئے اور ہائڈروکلورک ایسڈ اس میں شامل کر دیجئے ، تھوڑی دیر کے بعد نکال لیجئے اور موم صاف کر ڈالئے ۔ آپ کا نام اس پر منقوش ہوگا ۔

آگ کے جھاگ ـ فراہم کیجئے :ـ Licorice Extract (رب السوس یا ملٹھی کا ست) Aluminium Sulphate ـــ سوڈا (کھانے والا) ـــ گلاس ۔

دو چمچے الومنیم سلفیٹ ، ایک پیالی پانی میں گھول لیجئے ۔ آدھی پیالی سوڈا میں ملٹھی کا ست ملائیے یہاں تک کہ گاڑھا مرہم سا طیار ہو جائے ، پھر اس مرہم میں برابر کا پانی ملا کر رقیق کر لیجئے ۔

ان دونوں محلولوں کو جب ایک ساتھ کسی گلاس میں ڈالیں گے تو آگ کا جھاگ پیدا ہو کر گلاس سے باہر آجائے گا ۔

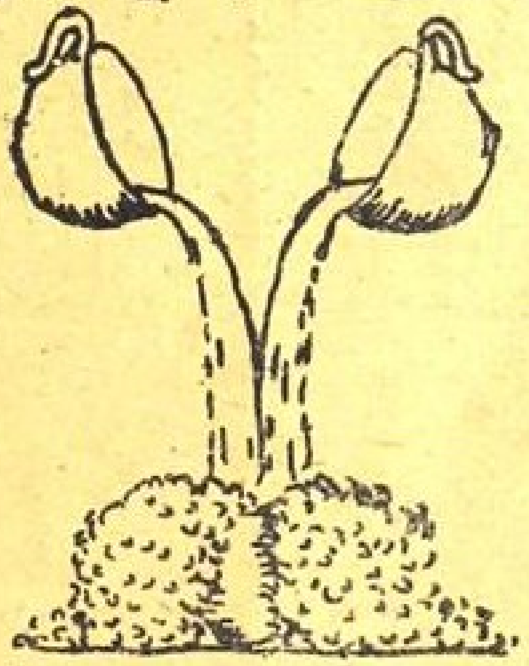

نظر نہ آنے والی سیاہی ـ کوبالٹ کلورائڈ Cobalt Chloride کو پانی میں حل کیجئے یہاں تک کہ وہ ہلکے زرد رنگ کا ہو جائے اس محلول سے کاغذ پر کچھ لکھئے اور خشک ہو جانے دیجئے ۔ جب آپ اس کو آگ دکھائیں گے تو نیلگوں حروف اُبھر آئیں گے ۔

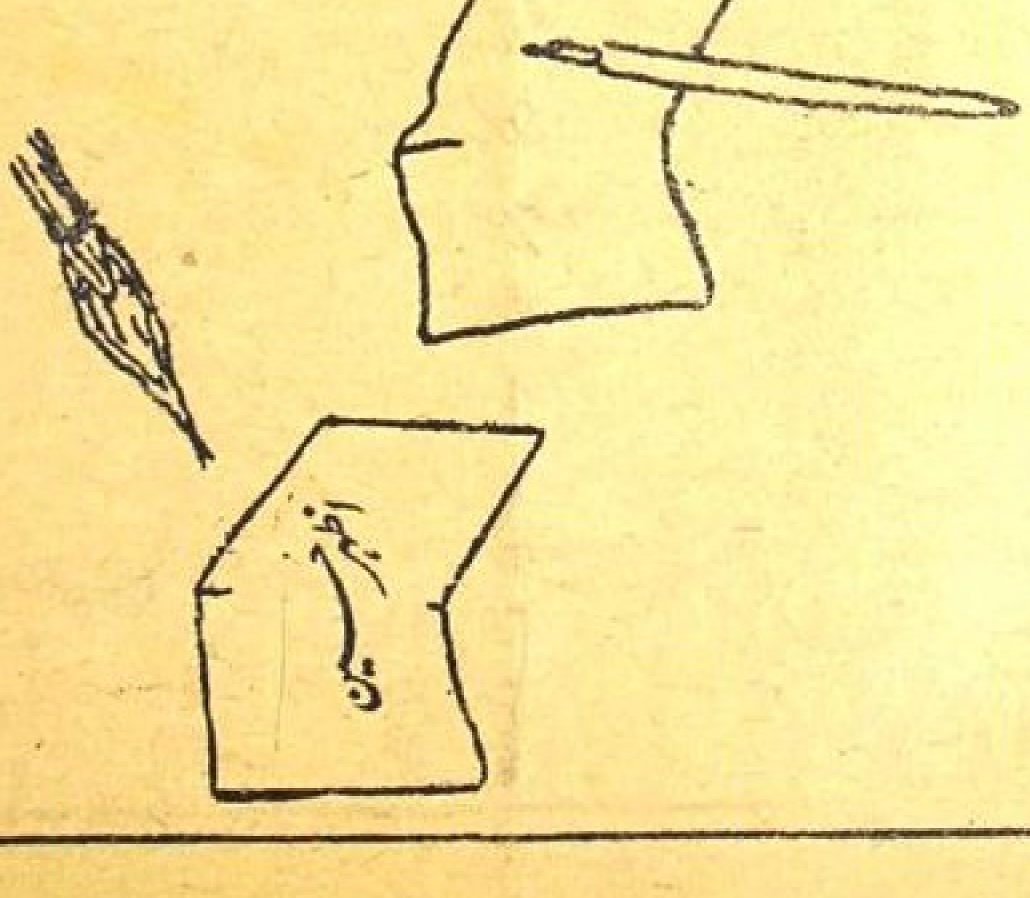

جادو کا رومال ـــ فراہم کیجئے :۔ کوبالٹ کلورائڈ ـــ جلاٹین ـــ رومال ـــ طشت ۔

ایک حصہ کوبالٹ ۔ ۱۰ حصے جلاٹین اور ۱۰۰ حصے پانی ۔ طشت میں ملائیے، پھر طشت کو ہلکی آنچ پر رکھئے یہاں تک کہ یہ سب چیزیں یک جان ایک رومال اس محلول میں اچھی طرح ڈبو کر خشک کر لیجئے ۔ اس کا رنگ زردی مایل نیلا ہوگا ۔ لیکن اگر آپ اس رومال کو بھاپ دیں گے تو سُرخ ہو جائے گا ۔ اسکے بعد آپ ہٹا کر خشک کر لیں گے تو پھر نیلا ہو جائے گا

پانی شراب اور دودھ کے رنگ کا ـــ فراہم کیجئے : (۱) Phenolphthalein ۔ (۲) Ammonia Water ۔ (۳) Hydrochloric Acid ۔ (۴) Silver Nitrate Solution ـــ بوتل ـــ تین گلاس ۔

نمبر (۱) کے چند قطرے ایک بوتل پانی میں ڈال دیجئے ۔ تین گلاس میز پر علٰحدہ علٰحدہ رکھ کر ایک میں نمبر ۲ کے چند قطرے دوسرے میں نمبر ۳ کے چند قطرے اور تیسرے میں نمبر ۴ کے چند قطرے ڈال دیجئے ـــ اس کے بعد بوتل کا پانی پہلے گلاس میں ڈالئے تو شراب کا سا رنگ آئے گا ۔ اب دوسرے گلاس کا سُرخ پانی تیسرے میں ڈالئے تو سفید دودھ کا سا رنگ ہو جائے گا ـــ اگر رنگ خاطر خواہ پیدا نہ ہو تو دواؤں کی مقدار آپ زیادہ کر سکتے ہیں ۔

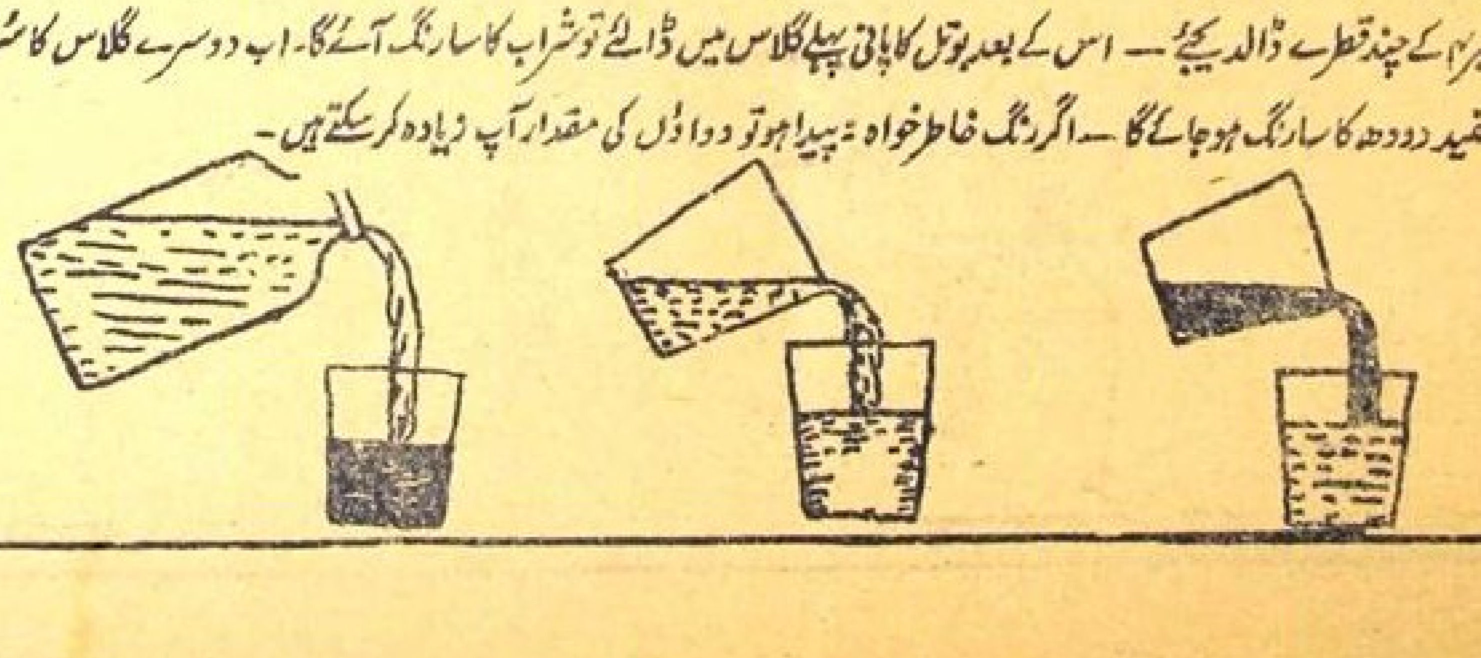

جادو کی سائنس — چونے کی ایک ڈلی لیکر اس پر پانی ڈالئے، جب چونا گھل کر حل ہو جائے تو تھوڑا سا پانی اور ڈال کر چونا تہ نشین ہو جانے دیجئے۔ اس کے بعد اوپر کا صاف پانی کسی برتن میں لے لیجئے — کسی چھوٹی شیشی میں یہ چونے کا پانی لیکر اس میں ایک قطرہ محلول Phenolphthalein کا ملا دیجئے تو اس کا رنگ سُرخ ہو جائے گا۔ لیکن جب آپ کسی ٹیوب کے ذریعہ سے اپنی سانس اس میں داخل کریں گے تو وہ پھر سفید رنگ کا ہو جائے گا۔ کیونکہ آپ کی سانس میں کاربن تھا اور اس نے رنگ بدل دیا۔

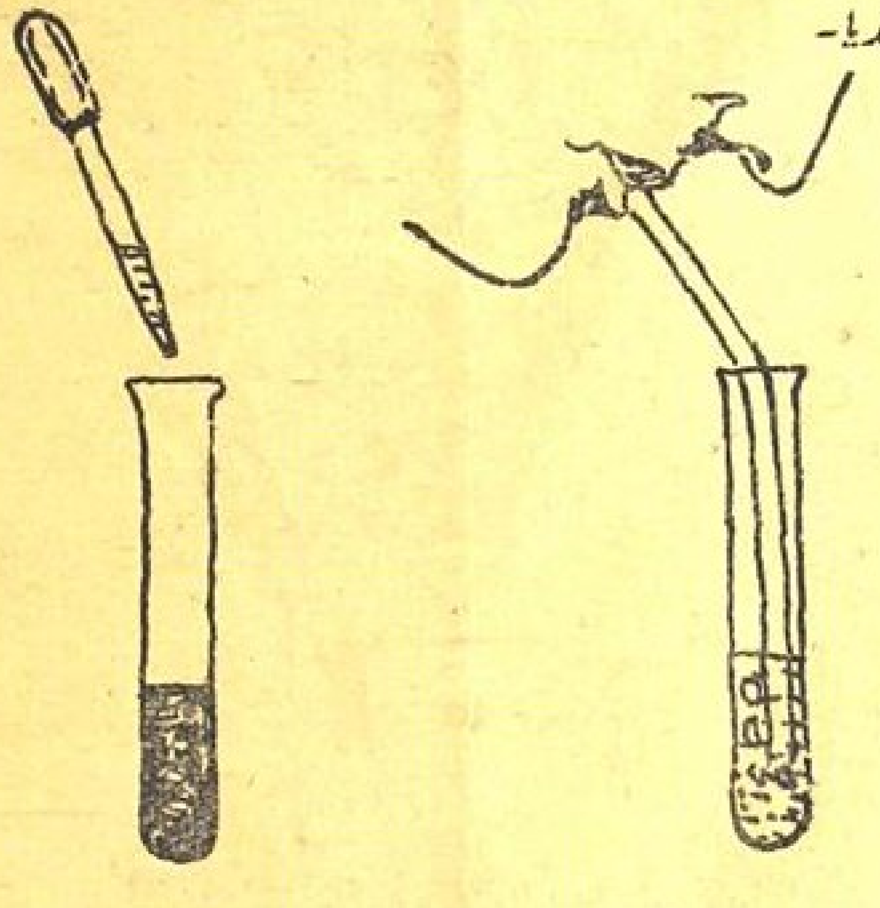

کیمیاوی درخت — جست کا ایک پتر لیکر شکل الف کی طرح قینچی سے کاٹ لیجئے اور پھر کٹے ہوئے حصوں کو موڑ کر شکل ب کی طرح گویا ایک درخت کی صورت دیجئے۔ نیچے کے حصے کو اس طرح جھکا دیجئے کہ جست کا درخت زمین پر ٹھہر سکے۔ کسی چوڑے منہ کے شیشے کے برتن میں پانی بھر کر ایک چمچ Lead Acetate ملا دیجئے اور اس میں جست کے درخت کو رکھ دیجئے۔ چند گھنٹے کے بعد یہ واقعی اصلی درخت معلوم ہونے لگے گا۔

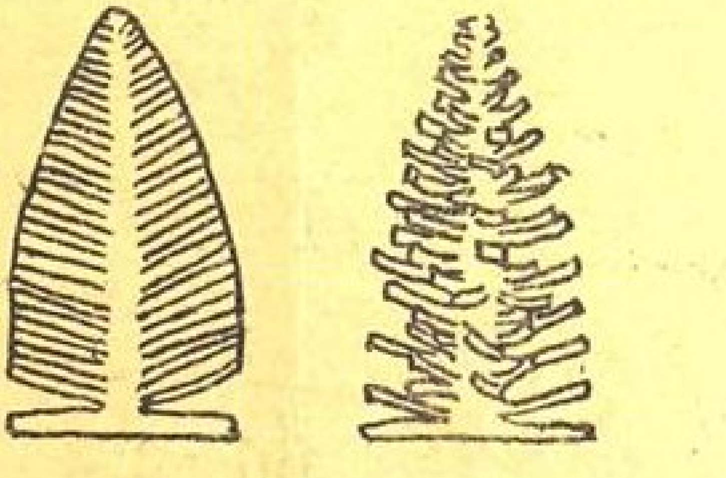

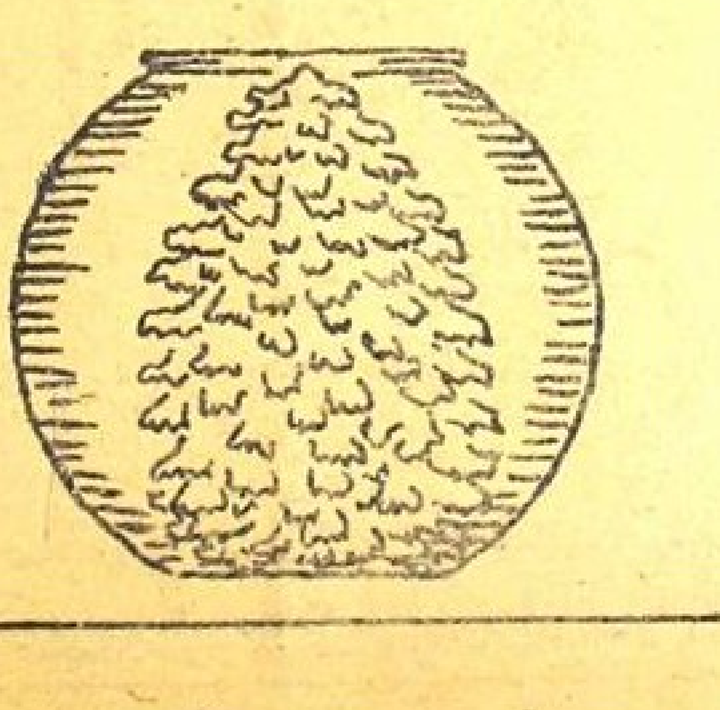

جادو کی آگ — فراہم کیجئے:- (۱) گندھک کا تیزاب — (۲) گندھک — (۳) Potassium Permanganate — اینٹ

نمبر۳ نصف چمچ اینٹ یا سلیٹ پر رکھ کر چند قطرے پانی کے ڈال کر تر کیجئے۔ پھر چند قطرے نمبر۱ کے ڈالئے اس کے بعد ایک چٹکی گندھک کے سفوف کی چھڑکئے تو شعلہ پیدا ہو جائے گا۔

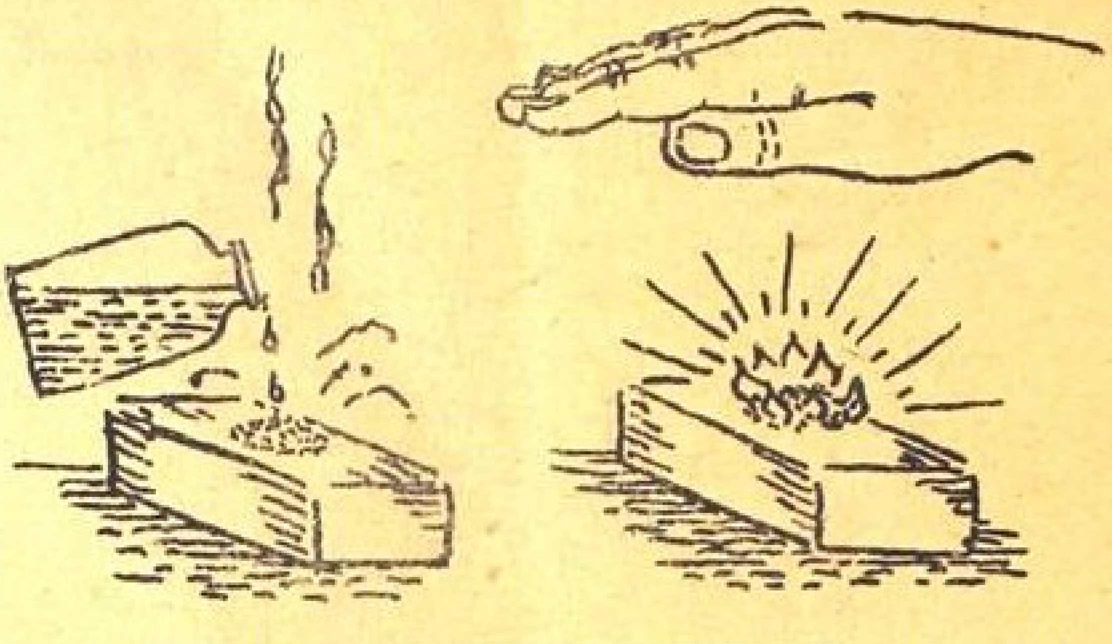

پھلجھڑی بنانا — فراہم کیجئے:- (۱) Potassium Chlorate — (۲) المونیم کا برادہ — (۳) کوئلہ — Dextrin (۴) — پتلا تار۔

دو اونس نمبر۴ ایک بوتل پانی میں حل کر کے رکھ لیجئے۔ پھر ۱۰ اونس نمبر۱، دو اونس نمبر۲ اور $\frac{1}{16}$ اونس نمبر۳ ملا کر بوتل والا محلول ڈالئے یہاں تک کہ سب ملکر گاڑھی گوندکی طرح ہو جائے۔ اسے تار پر لگا کر خشک ہو جانے دیجئے۔ جب آپ اسے روشن کریں گے تو خوشنما سفید پھول پیدا ہوں گے۔

اگر آپ ۱½ اونس Stronitum nitrate کا سفوف ملا دیں گے تو پھول سُرخ پیدا ہوں گے اور دو اونس Barium Nitrate ملا دیں گے تو سبز پھول نمودار ہوں گے۔

جادو کا سانپ — فراہم کیجئے:- (۱) Potassium Bichromate — (۲) Potassium Nitrate (۳) شکر — (۴) الکحل۔

ٹھیک ٹھیک وزن کر کے تین اونس نمبر۱، ۱½ اونس نمبر۲، اور تین اونس شکر لیجئے۔ ان کو علٰحدہ علٰحدہ باریک کر کے چھان لیجئے اور پھر تینوں کو ملا کر تھوڑا سا الکحل اس میں ڈالئے یہاں تک کہ وہ موم کی طرح ہو جائے۔ اس سے چھوٹی چھوٹی مخروطی شکل کی گولیاں بنا کر خشک کر لیجئے۔ ان کو جب آپ آگ

دیں گے تو سیاہ رنگ کا سانپ اس سے پیدا ہوگا۔

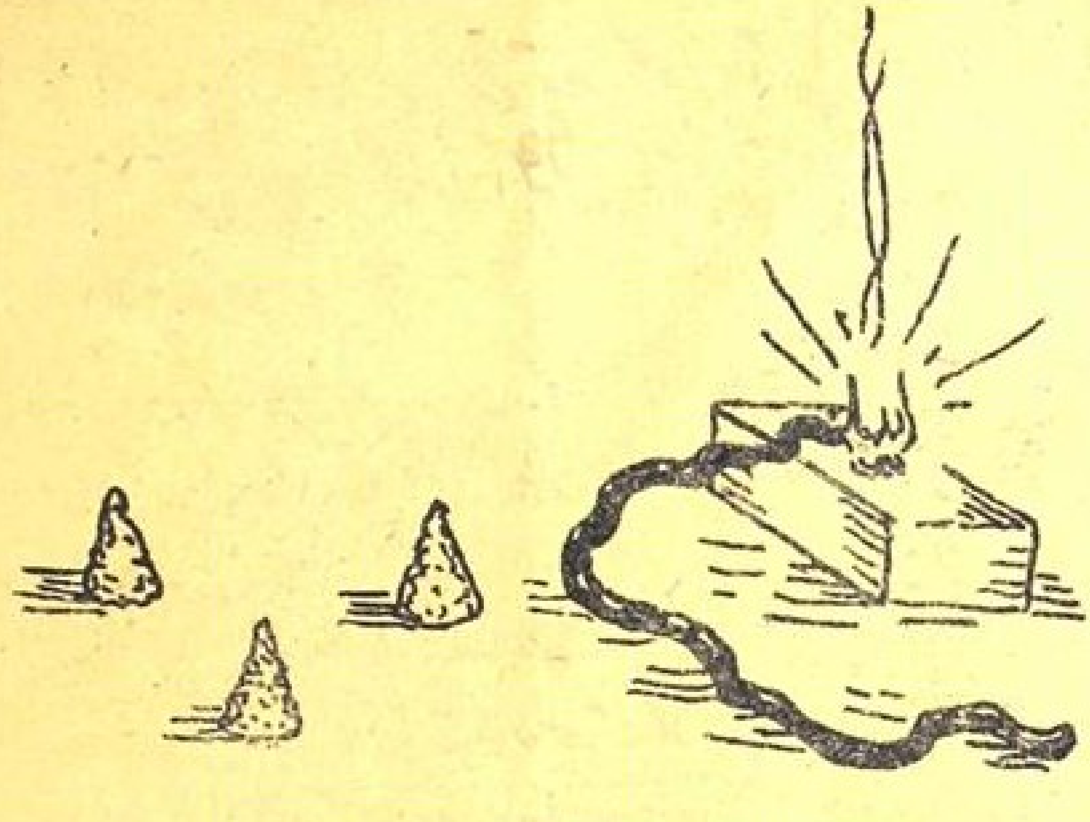

سُنہرا فوارہ ــــ فراہم کیجئے: (۱) Potassium Nitrate ــــ (۲) گندھک ــــ (۳) کاجل۔
ٹھیک ٹھیک وزن کرکے ۹ اونس نمبر(۱)، ۴ اونس نمبر(۲) اور ڈھائی اونس نمبر(۳) لیجئے۔ نمبر(۱) اور نمبر(۲) کو علٰحدہ علٰحدہ باریک کرکے چھان لیجئے اور نمبر ۳ کے ساتھ خوب ملا دیجئے۔ ایک چمچ کسی کاغذ پر رکھ کر کنارے آگ لگا دیجئے اور ہٹ جائیے۔

کاغذی تصویروں میں جان ــــ شیشے کا ایک ٹکڑا، آٹھ نو انچ لمبا اور ۶ انچ چوڑا لیجئے۔ دو کتابیں کم از کم ۲/۱ انچ موٹی رکھ کر ان پر یہ شیشہ اس طرح رکھ دیجئے گویا اس کا ایک پُل سا بن گیا۔ نیچے دونوں کتابوں کے درمیان جو جگہ ہے، اس میں موٹی کاغذ کی چھوٹی چھوٹی تصویریں کاٹ کر ڈال دیجئے۔ جب آپ ریشمی رومال سے اس شیشے کو رگڑیں گے تو یہ کاغذی تصویریں اُچھلنے لگیں گی۔

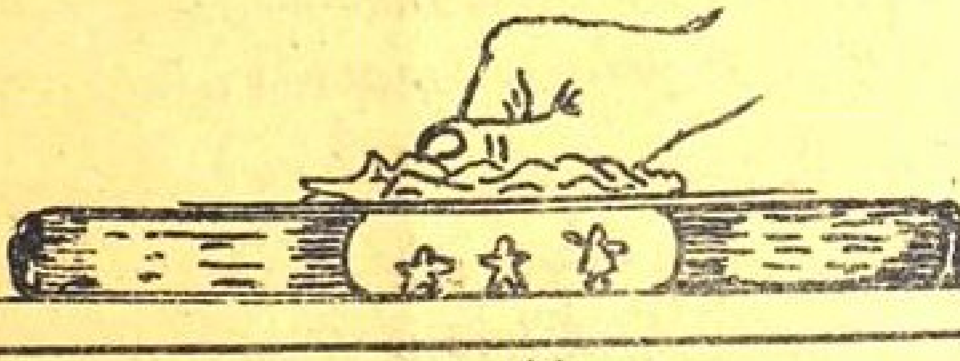

نگار

جنوری فروری سنہ ۴۱ء اور جنوری فروری سنہ ۴۲ء

یہ دونوں پرچے آپ کے پاس ہیں یا نہیں۔ اگر نہیں ہیں تو اب طلب فرما لیجئے یا ان میں سے کوئی ایک ہے اور دوسرا نہیں، تو دوسرا بھی منگا لیجئے، ورنہ ایک وقت آئے گا کہ مومن نمبر، ظفر نمبر، اردو شاعری نمبر، ہندی شاعری نمبر کی طرح یہ دونوں نمبر بھی کسی قیمت پر نہ مل سکیں گے۔ ان دونوں نمبروں کی اہمیت کا اندازہ اگر آپ اس وقت نہ کریں گے تو بعد میں کریں گے، لیکن یہ وقت وہ ہوگا جب آپ انھیں حاصل نہ کر سکیں گے۔ دونوں کی قیمت تین روپیہ (علاوہ محصول)

مینیجر نگار۔

نواب مرزا شوق کی مثنویاں

ایک زمانہ میں جبکہ میرا دماغ صرف طالبِ علمانہ ذہنیت کا رہینِ منت تھا، مجھے مولانا حالی مرحوم کے مقدمہ شعر و شاعری کو سمجھنے سے زیادہ رٹنے پر مجبور ہونا اور تحقیق و تدقیق کے بجائے اس بات پر ایمان لانا پڑا تھا کہ نواب مرزا شوق کی بنیاد خواب و خیال کے ان ۴۰ - ۴۵ اشعار پر رکھی گئی ہے جن کا ذکر مولانا نے اپنے بعض احباب سے سُنا تھا۔

زمانہ گزرتا رہا۔ یہاں تک کہ ایک عرصہ بعد میں آخری تاجدار اودھ واجد علی شاہ اور ان کی بیگم بادشاہ محل صاحبہ کی مثنویات کے مطالعہ سے بہرہ اندوز ہو سکا۔ اسوقت میرے دماغ کے وہ نقوش جو محو ہونے کے قریب تھے پھر اُبھر آئے اور ان باتوں کی یاد پھر دماغ میں چکر لگاتے ہوئے محسوس ہونے لگی جو مولانا حالی کے "محدود مطالعہ" نے ان کے دماغ میں پیدا کر دی تھیں۔ اس وقت میں نے مقدمہ شعر و شاعری کا دوبارہ بغور مطالعہ کیا اور اسی کے ساتھ مثنوی خواب و خیال کا وہ مقدمہ بھی دیکھا جو ہمارے محترم مولوی عبدالحق صاحب بی۔ اے نے اس مثنوی کی طباعت کے وقت اس میں شامل کر کے اپنی عادت مستمرہ کے بموجب شعرائے دہلی کے مقابلہ میں شعرائے لکھنؤ کو گرانے کی سعی لاحاصل کی تھی۔

مولانا حالی مرحوم اور ان کی تائید میں مولوی عبدالحق صاحب مدظلہ نے اپنے خیال میں یہ مسئلہ قائم کرنے کی سعی کی ہے کہ شعرائے لکھنؤ میں صاف، سلیس اور روزمرہ کی زبان لکھنے کی اہلیت ہی مفقود تھی اس لئے نواب مرزا شوق کو لکھنؤ چھوڑ کر دہلی کی ایک غیر مشہور اور مجہول مثنوی کو اپنا نمونہ بنانا پڑا۔ اس موقع پر ممکن ہے کہ لوگ یہ ایراد کریں کہ مثنوی خواب و خیال کو مجہول کہنا درست نہیں۔ کیونکہ وہ اسوقت انجمن ترقی اُردو کی طرف سے شایع ہو کر ہندوستان کے ہر بڑے کتابخانہ میں موجود ہے لیکن ہم جس زمانہ کا ذکر کر رہے ہیں اس وقت اس کی اس سے زیادہ حیثیت نہ تھی۔ یہاں تک کہ مولانا حالی کی نظروں سے بھی یہ مثنوی نہ گزر سکی اور انھیں اپنے بعض احباب کے کہنے پر اعتماد کرنا پڑا۔ اس لئے یہ کہنا کہ نواب مرزا نے اپنی مثنویوں کی بنیاد "خواب و خیال" پر رکھی سراسر عصبیت و طرفداری اور لاعلمی پر ہے۔ جن حضرات نے ادبِ اُردو کا وسیع مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ نواب مرزا شوق کی مثنویوں سے بہت ہی کم مدت پہلے واجد علی شاہ اور بادشاہ محل صاحبہ کی مثنویاں عالمِ وجود میں آچکی تھیں جن میں زبان کا وہ لطف اور چٹخارا بدرجۂ اتم موجود ہے جو میر اثر تو کیا دہلی کے کسی شاعر کو نصیب نہ ہو سکا۔ یہ اور بات ہے کہ ہمارے اُدبائے اُردو ان مثنویوں کے مطالعہ سے محروم رہے ہوں۔ اس وقت یہ چاروں مثنویاں ہمارے پیش نظر ہیں جو واجد علی شاہ کے سرکاری مطبع سلطانی میں طبع ہو کر ہندوستان کے اکثر کتبخانوں میں پائی جاتی ہیں۔ لیکن ہمارے خیال میں مولانا حالی اور مولوی عبدالحق صاحب کی نظر سے یہ کمیاب مثنویاں نہیں گزریں ورنہ مقدمہ شعر و شاعری و خواب و خیال کے مقدمہ میں یہ نہ لکھا جاتا کہ "مرزا شوق کے زمانہ میں لکھنؤ کی شاعری لفظوں کا گورکھ دھندا ہو کر رہ گئی تھی اور تصنع و تکلف انتہا درجہ پر پہونچ گیا تھا" یہ ایک حد تک درست کہا جا سکتا ہے کہ خواجہ آتش اور میر تعشق کے علاوہ دیگر شعرائے لکھنؤ نے غزلگوئی کے مذاق میں قصیدہ گوئی کی سی شان پیدا کر دی تھی۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ تمام اصنافِ شاعری میں ایسا ہی تھا۔ اہلِ ذوق اقرار کرتے ہیں کہ لکھنؤ ہی ہے جس نے شاعری کی بہت وسیع اور اہم صنف مرثیہ گوئی کو معراجِ کمال تک پہونچا دیا اور سارے ہندوستان پر ثابت کر دیا کہ اس میدان میں اہل دہلی باوجود کوشش بلیغ کے بھی محروم و ناکام رہے اور آخر کار انھیں اپنے عجز و مجبوری کا اظہار کرنا پڑا۔

اس کے بعد ہمیں کی مثنوی نگاری پر نظر ڈالئے۔ اس میں اہلِ لکھنؤ نے جو کمال پیدا کیا اس کا مولانا حالی کو بھی اقرار کرنا پڑا۔ صرف مثنوی سحر البیان ایک ایسی مثنوی ہے جس کو دہلی سے منسوب شاعر میر حسن کی کہکر اہلِ دہلی فخر و ناز کا علم بلند کرتے رہتے ہیں حالانکہ اگر میر حسن کے سوانح حیات پر نظر ڈالی جائے تو ان کو دہلوی کہنا ایسا ہی معلوم ہوگا جس طرح ہندوستان کے لوگوں کا اپنے آپ کو اکثر بخاری - افغانی - شیرازی اور نجفی وغیرہ کہنا۔ جن حضرات کی

شعرائے اُردو کے تذکروں پر نظر ہے انھیں بخوبی علم ہے کہ میر حسن ۱۲ سال کے سن میں دہلی چھوڑ کر اودھ آئے اور آخر کار یہیں پیوند خاک ہوگئے بلاشبہ دہلی کو میر حسن کے مولد ہونے کا فخر حاصل ہے لیکن اگر موری ہی کو موطن قرار دیا جا سکتا ہے تو مرزا غالب اور میر تقی میر اکبر آبادی کہلائے جانے کے زیادہ سزاوار ہیں۔ لیکن اگر ان دونوں کا منشا دہلی قرار دیکر وطنیت کا سہرا بھی اس کے سر پر باندھا جا سکتا ہے تو پھر میر حسن کو لکھنوی کہتے ہوئے کسی قسم کا تکلف نہیں ہونا چاہئے اور اس کے بعد بے چون وچرا یہ تسلیم کر لینا چاہئے کہ انھوں نے یہیں کے زمانہ قیام میں اور یہیں کے ماحول سے متاثر ہو کر وہ مثنوی لکھی جس پر اہل دہلی کو تو کیا اہل لکھنؤ کو بجا طور پر ناز ہو سکتا ہے۔

اب زبان لکھنے والے مثنوی نگاروں کی فہرست میں خواب وخیال کے باعث صرف میر اثر باقی رہ جاتے ہیں۔ لیکن جنھوں نے اس مثنوی کو بغور پڑھا ہے وہ بخوبی جانتے ہیں کہ اس میں مثنویت کی کیا شان ہے اور اس میں مثنوی نگاری کی کون کون سی خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ بجز اس کے کہ انھوں نے اپنی طبیعت کا زور چند بے سر وپا باتوں پر صرف کر ڈالا ہے۔

اس کے بعد ہم بلا خوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ صرف تنہا لکھنؤ ہی ہے جس کو اُردو کے مثنوی نگاروں کے مولد ومنشا ہونے کا بجا طور پر فخر وامتیاز حاصل ہے اور اس خاک پاک نے ادب اُردو میں ان بے مثال مثنویوں کا اضافہ کیا ہے جن پر ادب اُردو صدیوں تک ناز کرے گا۔ لکھنؤ کی مثنویوں میں سے مندرجۂ ذیل کو امتیازی صورت میں پیش کیا جا سکتا ہے :-

(۱) سحر البیان از میر حسن - (۲) گلزار نسیم از پنڈت دیا شنکر نسیم - (۳) دریائے تعشق - (۴) افسانۂ عشق - (۵) بحر اُلفت از واجد علی شاہ اختر - (۶) لذتِ عشق از آغا حسن نظم لکھنوی - (۷) مثنوی عالم از بادشاہ محل صاحبہ - (۸) طلسم اُلفت از قلق لکھنوی - (۹) فریب عشق - (۱۰) بہارِ عشق (۱۱) زہرِ عشق از نواب مرزا شوق لکھنوی - ان کے بعد - (۱۲) حزن اختر از واجد علی شاہ - (۱۳) معراج المضامین از منیر لکھنوی (۱۴) ترانۂ شوق اور (۱۵) عالم خیال از شوق قدوائی لکھنوی وغیرہ - ان میں زیادہ تر وہ مثنویاں ہیں جو ملک میں دائر وسائر ہیں۔ صرف واجد علی شاہ اور بادشاہ محل صاحبہ کی مثنویاں کمیاب ہونے کی وجہ سے ناظرین سے جیسا کہ چاہئے خراج تحسین نہ حاصل کر سکیں اور اسی وجہ سے مولانا حالی اور مولوی عبدالحق صاحب کی نظر سے بھی نہ گزر سکیں۔ یہ وہ مثنویاں ہیں جو مرزا شوق کی مثنویوں سے کچھ ہی مدت پہلے عالم وجود میں آئی تھیں - ان میں سے ہم واجد علی شاہ کی مثنوی بحر اُلفت اور بادشاہ محل صاحبہ کی مثنوی عالم کے نمونے ذیل میں درج کرتے ہیں - ان کو پڑھکر سوچئے کہ کیا اس قسم کی زبان کے اپنے گردوپیش ہوتے ہوئے نواب مرزا شوق کو کئی سو میل دور کی اس مثنوی (خواب وخیال) کو نمونہ بنانے کا خیال پیدا ہو سکتا تھا جو اس زمانہ میں اپنے بے سر وپا مضامین کے باعث قعر گمنامی میں پڑی ہوئی تھی -

بحر الفت کا نمونہ ملاحظہ فرمایئے :-

تیرے دیدے تے ڈرے اے رنڈی — کیوں لگے مرتی ہے مجھے رنڈی
مجھ سے چار آنکھ کیجئے گا ذرا — صاف دیدہ ہے دیکھنا کیسا
تم خفا ہو کہ خوش مری جان، — اتنا ہنسئے کہ رو نہ دے انساں
اے پر برو مضائقہ کیا ہے — آدمی آدمی پہ ہنستا ہے
تم تو صاحب ہنسی میں روتی ہو — سیدھی باتوں میں ٹیڑھی ہوتی ہو
رمزیں سننے کی دل کو تاب نہیں — اب مرے پاس کچھ جواب نہیں
پاس آداب پھر اُٹھا دوں گی — لاکھوں صلواتیں پھر سُنا دوں گی
اب کہاں تک بھلا میں ضبط کروں — آخرش میں بھی پتا رکھتی ہوں،
خوب کیا مجھ میں پانی مرتا ہے — کیا مجھے بھی وہ پیار کرتا ہے
یہی ہوتے ہیں فعل انساں میں — منو تو ڈالو ذرا گر بیاں میں
فقرے کیجے یہ بائکے او۔ کہیں، — یہاں خوشامد پسند طبع نہیں،
چلو اتنی بناوٹیں نہ کرو — ہٹو مجھ سے لگاوٹیں نہ کرو
یہ کہیں اور جا کے دم دیجے — بس بس اب آپ کے قدم لیجے
کتنی بھولی ہیں آپ تو واللہ — کوئی جانے کہ کچھ نہیں آگاہ،
مردوے دل میں اپنے کچھ شرما — چل الگ ہٹ ذرا برائے خدا
میں یہ سب جانتی ہوں بدذاتی — کچھ تجھے شرم بھی نہیں آتی،
مجھ سے پھر آنکھ چار کرتا ہے — دیدہ دانستہ تو مکرتا ہے
تو بھی کیا جعلساز ہے واللہ — کس قدر فقرہ باز ہے واللہ
ارے او فیلسوف او بدذات — تیرے آگے تو ہے قسم اک بات
تو بڑی چیز بھی اگرچہ اُٹھائے — تو بھی دل کو مرے یقین نہ آئے
تو دبائے بغل میں ایماں ہے — سر تو جھوٹوں کا رحل قرآں ہے
اب ترے جُل میں کب میں آتی ہوں — تجھ سے خود لاکھوں جل میں لاتی ہوں

جبکہ اس نے نہ کوئی ڈھب پایا
جان دینے پہ اپنی دھمکایا

بولی کس ناز سے وہ ماہ لقا
لو خدا راس لائے سچ کہنا

جان دینے پہ کیا دلیر ہے تو
کس قدر زندگی سے سیر ہے تو

اپنی دانست میں ڈراتے ہو
لو مرے دل کو آزماتے ہو

چل پرے مردوے حواس میں آ
یہ کسی بیوقوف کو دھمکا،

گر پٹنے کا اس نے قصد کیا
غصے کے تیوروں سے ڈانٹ دیا

خوب کھل کھیلے تم بلانے سے
اچھے چل نکلے منھ لگانے سے

دیکھو کمبختیاں نہ آجائیں
بس زیادہ نہ آپ اترائیں

خوب آکر اودھم مچایا ہے
کیا مجھے مسخرہ بنایا ہے

اتنا کرتے نہیں چبلا پن،،
خبط میں مبتلا ہیں کیا دشمن

میں بھی پھر کہنے پر جو آؤں گی
سیکڑوں بے نقط سناؤں گی

یاں سے ذلت اُٹھاکے جاؤگے
بیحیا ہوگے پھر جو آؤگے

مجھ سے بھونڈے نہ اختلاط کرو
یہ کہیں اور ارتباط کرو

اور مستانیاں وہ ہوتی ہیں
آبرو جو کہ اپنی کھوتی ہیں

بندی ایسی نہیں ہے اوداتی
رال میری نہیں بہی جاتی

اب بھلا اور تو امید کہاں
دل کے تو کچھ نکال لو ارماں

چلو تم جی تو اپنا بہلا لو
کچھ گریبان میں تو منھ ڈالو

میں تو قایل ہوں اس ڈھٹائی کی
اور اس دیدے کی صفائی کی

اوروں سے گرمیاں کرو صاحب
ٹھنڈی سانسیں نہ یوں بھرو صاحب

اور کہنا یہ تھا ادا کے ساتھ
ٹوٹ جاویں خدا کرے یہ ہاتھ

اور کہنا ملال سے کہ ہٹو
آگ لگ جائے ایسی باتوں کو

سر جو رکھ دیتے ہیں یہ زانو پر
وہ ہٹاتی ہے مار کر ٹھوکر

کہتی ہے کیا یہ غمزے لائے ہو
خوب کچھ تم مزے میں آئے ہو

آج کل تم کو جوشِ خوں تو نہیں،
فصد لو فصد لو جنوں تو نہیں،

مثنوی عالم کا نمونہ :-

تم نے اتنی کہاں اُڑائی ہے
جس قدر میں نے بھون کھائی ہے

دونوں یہ لڑکیاں جو ہیں شتاہ
ان کے دم میں نہ آنا تم للہ،

بکتی بکتی ہوئی میں دیوانی
ان کے دیدوں کا ڈھل گیا پانی

تھگلی بادل میں یہ لگائیں گی
دیکھنا کیسے گل کھلائیں گی،

میں ادب کرتی ہوں تمھارا بس
اب یہ نخرے نہیں گوارا بس

کھل گئی جس گھڑی کہ میری زباں
کچھ اُٹھا رکھوں گی نہ میں بھی ہاں

مجھ کو جو رنج ہے وہ کس سے کہوں
نوج یہ بوڑھے چوچلے میں سہوں

میں تو بچپن سے اس محل میں پلی
اور گلی کوچے میں پھری نہ چلی،

آپ کی آنکھ میں جو کھٹکی ہوں،
کیا روتے سے میں بھی اٹکی ہوں

کرتہ شنگرفی میں رنگاتی ہوں
چھری پیڑو کی میں دکھاتی ہوں

یا کہ درباری سے ہے آنکھ لڑی
یا کسی مرد پر پھسل میں پڑی

میری خاطر ہزاری روتا ہے
بوڑھے چونڈے میں وہم ہوتا ہے

سُن کے انا کے یوں مرچ لگی
بولی جھلا کے کیوں ری چھتیسی

مرنے جوگی ہوئی تو ناشدنی
ایسی باتوں سے کیا ہے جی میں ٹھنی

تجھ سے جنتی نہ تیری ماں دختر
تیرے بدلے نہ نکلا کیوں پتھر

ابھی میں اپنے گھر کو جاؤں گی
بھتی انا کی آج کھاؤں گی

تجھ کو کھڑپیچ انھیں سے بنتی ہے
جو نہ کہنا ہے ان کو کہتی ہے

بے سبب جب سے تو اکھنے لگی،
میری نظروں میں تو کھٹکنے لگی،

اتنا بک بک کے مجھ کو تم نہ ستاؤ
مغز میرا نہ کھاؤ گھر جاؤ،

کانٹے گلشن کے جھاڑ کے لپٹے
بے طرح پنجے جھاڑ کے لپٹے

اک ذرا ہٹ کے پاس سے بیٹھو
سنبھلو صاحب حواس سے بیٹھو

دیکھنا اختلاط کی خوبی،
مجھ کو یہ دلپذیر سے ڈوبی

باغ میں آکے خار میں ہوں پھنسی
میں تو کوا گہار میں ہوں پھنسی

ان اشعار کے مطالعہ کے بعد کیا کوئی منصف مزاج یہ کہنے کی جرأت کر سکتا ہے کہ نواب مرزا شوق کی مثنویوں کی بنیاد خواب وخیال پر رکھی گئی تھی -

اس سلسلہ میں یہ دلیل بھی لائی جاتی ہے کہ مرزا شوق کی مثنویوں کے بعض اشعار خواب وخیال کے اشعار سے تقریباً لڑ گئے ہیں - چنانچہ مولانا حالی نے اپنے مقدمہ میں لکھا ہے کہ "اس کا بڑا ثبوت یہ ہے کہ خواب وخیال کے اکثر مصرعے اور شعر تھوڑے تھوڑے تفاوت سے بہار عشق میں موجود ہیں جن میں سے دو ایک شعر ہم کو بھی یاد ہیں" مولانا عبدالحق صاحب نے اس موقع کے تین شعر بہار عشق اور خواب وخیال سے نقل کرکے لکھا ہے کہ "اگر دونوں مثنویوں کے اس قسم کے اشعار برابر برابر رکھ کر پڑھے جائیں تو صاف معلوم ہوجائے گا کہ مرزا شوق نے خواب وخیال ہی کو اپنا نمونہ بنایا اور اسی مثنوی پر انھیں اس قسم کی زبان لکھنے کا خیال پیدا ہوا"۔

غالباً ان دونوں محترم ہستیوں نے مزید مثنویوں کے مطالعہ کی زحمت گوارا نہیں فرمائی ورنہ ان کے قلم سے اس قسم کے غیر ذمہ دارانہ الفاظ نہ نکلتے۔ جنھوں نے اُردو کی دیگر مثنویوں کو بھی دیکھا ہے وہ جانتے ہیں کہ مرزا شوق کی مثنویوں کے اشعار کا ایسا توارد اور مثنویوں کے اشعار سے بھی ہوا ہے۔ اس سلسلہ میں مثنوی خواب و خیال کے ساتھ میر تقی میر کی مثنوی دریائے عشق۔ واجد علی شاہ کی مثنوی بحر اُلفت اور بادشاہ محل صاحبہ کی مثنوی عالم کے ناموں کو بھی ناظرین کے سامنے پیش کیا جا سکتا ہے۔ ہم ناظرین کی آگاہی کے لئے ان مثنویوں کے اشعار مرزا شوق کی مثنویوں کے متواتر اشعار کے ساتھ برابر برابر رکھ کر نتیجہ کو ناظرین پر چھوڑتے ہیں ملاحظہ فرمائیے :۔

دریائے عشق :۔ ایک دن بیکلی سے گھبرایا - زہر عشق :۔ دل مرا بیٹھے بیٹھے گھبرایا
„ سیر کرنے کو باغ میں آیا „ سیر کرنے کو بام پر آیا
„ ہوش جاتا رہا نگاہ کے ساتھ „ ہوش جاتا رہا نگاہ کے ساتھ
„ صبر رخصت ہوا اک آہ کے ساتھ „ صبر رخصت ہوا اک آہ کے ساتھ
„ رفتہ رفتہ ہوا ہوں سودائی „ ہو گئے تم اگرچہ سودائی
„ دور پہونچی ہے میری رسوائی „ دور پہونچے گی اسکی رسوائی

خواب و خیال :۔ ہاتھا پائی سے ہانپتے جانا بہار عشق :۔ ہاتھا پائی میں ہانپتے جانا
„ کھلتے جانے سے ڈھانپتے جانا „ چھوٹے کپڑوں کو ڈھانپتے جانا
„ وہ ترا منھ سے منھ بھڑا دینا „ کبھی منھ سے دیا چبا کر پان
„ وہ ترا جیب کا لڑا دینا „ کبھی ملکر لڑی زباں سے زبان
„ وہ ترا پیار سے لپٹ جانا „ کھول کر دل چمٹ چمٹ کے ملا
„ اور دل کھول کر چمٹ جانا „ کیسا کیسا لپٹ لپٹ کے ملا
„ ہونے ہولے پکارنے لگنا „ چپکے چپکے پکارتی تھی کبھی
„ ڈھیلے ہاتھوں سے مارنے لگنا „ ڈھیلے ہاتھوں سے مارتی تھی کبھی
„ کس لئے بے حواس رہتا ہے - فریب عشق :۔ بولی جی کیسا ہے اُداس ہو کیوں
„ کس لئے یوں اُداس رہتا ہے „ کس کا صدمہ ہے بے حواس ہو کیوں
„ کس لئے ٹھنڈی سانس بھرتا ہے - زہر عشق :۔ کس لئے ٹھنڈی سانسیں بھرتا ہے
„ کس لئے آہ و نالہ کرتا ہے „ کیوں مرے دل کے ٹکڑے کرتا ہے
„ نہ رہا لطف زندگانی کا „ پھل اُٹھایا نہ زندگانی کا
„ کچھ نہ پایا مزہ جوانی کا „ نہ ملا کچھ مزہ جوانی کا

بحر الفت :۔ وہ گورا سی بدن کی وہ پھرتی - بہار عشق :۔ آستینوں کی وہ پھنسی کرتی
„ تنگ تنگ وہ اونچی ارچی وہ کرتی „ جسم میں وہ شباب کی پھرتی
„ تو بڑی چیز بھی اگرچہ اُٹھائے „ تو بڑی روئی بھی اگرچہ اُٹھائے
„ تو بھی دلکو مرے یقیں نہ آئے „ سنتیا ناس ہو جو باور آئے

بحر اُلفت :۔ مجھ سے بھونڈا نہ اختلاط کرو - بہار عشق :۔ آدمیت سے ارتباط کرو
„ یہ کہیں اور ارتباط کرو „ ایسا بھونڈا نہ اختلاط کرو
„ میں تو قایل ہوں اس ڈھٹائی کی „ بولی قائل ہوں اس ڈھٹائی کی
„ اور اس دیدے کی صفائی کی „ اے لو خوبی تری صفائی کی
„ بندی ایسی نہیں ہے اُدماتی „ بات مجھ کو نہیں یہ خوش آتی
„ دال میری نہیں یہی جاتی „ بندی ایسی نہیں ہے اُدماتی
„ کہتے ہی کیا یہ غمزے لائے ہو „ اچھے آتے ہی اختلاط بڑھائے
„ خوب کچھ تم مزے میں آئے ہو „ خوب نام خدا مزے میں آئے
„ تو بھی کیا جعلساز ہے ڈھٹ - فریب عشق :۔ ارے او فقرہ باز کیا کہنا
„ کس قدر فقرہ باز ہے واللہ „ واہ رے جعلساز کیا کہنا
„ چل پَرے مردوے حواس میں آ „ میرے آگے سوانہ کر گرگٹ بڑ
„ یہ کسی بے وقوف کو دھمکا „ چل پرے مردوے حواس پکڑ

مثنوی عالم :۔ بہار عشق :۔
„ تم نے اتنی کہاں اُڑائی ہیں „ تم نے صاحب کہاں اُڑائی ہیں
„ جس قدر میں نے بھون کھائی ہیں „ ہم نے بھی بھون بھون کھائی ہیں
„ غنچہ و گل چٹکتے کھلتے ہیں - فریب عشق :۔ جھٹپٹا ہیں کہیں نکلتے ہیں
„ دیکھنا دونوں وقت ملتے ہیں „ بیٹھو بھی دونوں وقت ملتے ہیں
„ اسکے منھ پر پڑی جو اسکی نگاہ - زہر عشق :۔ ہوئی میری جو اسکی چار نگاہ
„ دل سے بے اختیار نکلی آہ „ منھ سے بے ساختہ نکل گئی آہ
„ غنچہ و گل چٹکتے کھلتے ہیں „ رُخ پہ گیسو ہوا سے ملتے ہیں
„ دیکھنا دونوں وقت ملتے ہیں چلئے اب دونوں وقت ملتے ہیں
„ طور کچھ اس کا ہو گیا بے طور „ کچھ عجب ہو رہا ہے جان کا طور
„ کبھی تھی کچھ نکلتا تھا کچھ اور „ کہتی ہوں کچھ نکلتا ہے کچھ اور

اس کے بعد ہمیں یہ لکھنے کی ضرورت نہیں رہتی کہ نمونے کے لئے مرزا شوق کے سامنے صرف مثنوی خواب و خیال ہی تھی یا اپنے زمانہ میں لکھنؤ ہی کی چند اور بھی

مثنویوں تک ان کی رسائی ہو چکی تھی -

اس کا فیصلہ کہ مرزا شوق کی اس حرکت کو توارد کا جامہ پہنایا جائے یا سرقہ کا الزام ان کے سر تھوپا جائے، صاحبانِ بصیرت پر چھوڑتے ہیں لیکن اسی کے ساتھ اب میں اس موقع پر یہ ضرور عرض کروں گا کہ اگر شوق کی مثنویوں کے مقابلہ میں زیر بحث مثنویاں زبان کے لحاظ سے کوئی حیثیت نہیں رکھتیں - اور اگر اس کو توارد کے بجائے سرقہ قرار دیا جائے تو بھی ایسا سرقہ فنِ شعر میں جایز و محمود قرار دیا گیا ہے جو اپنے ماخذ سے الگ ہو کر اپنے لطف و خوبی کو زیادہ کر دے اور اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ مرزا شوق کی مثنویوں کی زبان سے کوئی دوسری مثنوی کی زبان لگّا نہیں کھا سکتی اس لئے ہم اگر اس کو زیادہ سے زیادہ سرقۂ حسنہ کہیں تو قابلِ اعتراض نہیں -

ساحل بلگرامی

تصانیف نیاز فتحپوری

نگارستان: حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور افسانوں کا مجموعہ نگارستان نے ملک میں جو درجۂ قبول حاصل کیا اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل ہو چکے ہیں - قیمت دو روپیہ (عہ) علاوہ محصول

جمالستان: - اڈیٹر نگار کے مقالات ادبی کا دوسرا مجموعہ جس میں ۱۹۲۲ء سے ۱۹۳۳ء تک کے افسانے درج ہیں - قیمت چار روپیہ (للعہ) علاوہ محصول

شہاب کی سرگزشت: - حضرت نیاز کا وہ عدیم النظیر افسانہ جو اردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہے - قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول

مکتوبات نیاز: - اڈیٹر نگار کے تمام وہ خطوط جو نگار میں شایع ہوئے ہیں نیز وہ جو شایع نہیں ہوئے - جذبات نگاری اور سلاست بیان، رنگینی اور ادبیت کے لحاظ سے فنِ انشاء میں یہ بالکل پہلی چیز ہے - جس کے سامنے خطوطِ غالب بھی پھیکے معلوم ہوتے ہیں - مع تصویر حضرت نیاز، ۲۸ پونڈ کے کاغذ پر مجلد شایع ہوئی ہے -

قیمت دو روپیہ آٹھ آنے (عہ) علاوہ محصول

نقاب اٹھ جانے کے بعد: - نیاز فتحپوری کے تین افسانوں کا مجموعہ جو عرصہ ہوا ختم ہو گیا تھا اب دوبارہ شایع کیا گیا ہے قیمت علاوہ محصول آٹھ آنے -

ترغیباتِ جنسی (یا) شہوانیات: - اس کتاب میں فحاشی کی تمام فطری اور غیر فطری قسموں کے حالات اور ان کی تاریخی و نفسیاتی اہمیت پر نہایت شرح و بسط کے ساتھ محققانہ تبصرہ کیا گیا ہے - قیمت علاوہ محصول تین روپیہ (سے)

مجموعۂ استفسار و جواب ہر سہ جلد: - ان تینوں جلدوں میں ۱۹۲۲ء سے لیکر ۱۹۳۲ء تک کے استفسار و جواب شایع کئے گئے ہیں - قیمت فی جلد تین روپیہ علاوہ محصول

جذباتِ بھاشا: - جناب نیاز نے ایک دلچسپ تمہید کے ساتھ بہترین ہندی شاعری کے نمونے پیش کر کے ان کی تشریح کی ہے - قیمت علاوہ محصول بارہ آنے (۱۲ر)

فلاسفۂ قدیم: - اس مجموعہ میں حضرت نیاز کے تین علمی مضامین شامل ہیں: ۱ - چند گھنٹے فلاسفۂ قدیم کی روحوں کے ساتھ - ۲ - مادئین کا مذہب - ۳ - حرکت کے کرشمے - نہایت مفید و دلچسپ کتاب ہے - قیمت علاوہ محصول ایک روپیہ (عہ)

شاعر کا انجام: - جناب نیاز کے عنفوانِ شباب کا لکھا ہوا افسانہ حسن و عشق کی تمام نشہ بخش کیفیات اس کے ایک ایک جملہ میں موجود ہیں، یہ افسانہ اپنے پلاٹ اور انشاء کے لحاظ سے اس قدر بلند چیز ہے کہ دوسری جگہ اس کی نظیر نہیں مل سکتی - قیمت دس آنے (۱۰ر) علاوہ محصول

فراستُ الید: - مولفہ نیاز فتحپوری، جس کے مطالعہ سے ایک شخص بآسانی ہاتھ کی شناخت اور اس کی لکیروں کو دیکھ کر اپنے یا دوسرے شخص کے مستقبل سیرت، عروج و زوال، موت و حیات، صحت و بیماری، شہرت و نیکنامی وغیرہ پر صحیح پیشین گوئی کر سکتا ہے - قیمت علاوہ محصول ایک روپیہ (عہ)

مذاکراتِ نیاز: - یعنے حضرت نیاز کی ڈائری جو ادبیات و تنقید عالیہ کا عجیب و غریب ذخیرہ ہے - ایک بار اس کو شروع کر دینا آخیر تک پڑھ لینا ہے - اس کتاب کی بہت کم جلدیں باقی رہ گئی ہیں -

قیمت علاوہ محصول ایک روپیہ آٹھ آنے (عہ)

گہوارۂ تمدن: - یہ وہ معرکۃ الآرا کتاب ہے جس میں تاریخ و اساطیر سے ثابت کیا گیا ہے کہ تمدن کی ترقی میں عورت نے کتنا زبردست حصہ لیا اور دنیا کی تہذیب و شایستگی اس کی کس قدر ممنون ہے - اردو میں اس موضوع پر اس سے قبل کوئی کتاب نہیں لکھی گئی -

مصنف کو اس کتاب پر ریاست بھوپال سے ایک ہزار روپیہ انعام ملا تھا -

قیمت علاوہ محصول دو روپیہ (عہ)

نگار بک ایجنسی لکھنؤ

اُردو میں اعداد کا ناقص طرزِ تحریر

دنیا کی مروجہ زبانوں میں چینی زبان کے علاوہ جس کا رسم الخط عمودی ہے بقیہ کل زبانیں دائیں سے بائیں کو لکھی جاتی ہیں اور ان میں عربی فارسی اور اُردو دیگر السنۂ شرقیہ و غربیہ سے اپنے مخصوص طرزِ تحریر کے لحاظ سے ممتاز نظر آتی ہیں لیکن جہاں تک علم الحساب میں اعداد و شمار کا تعلق ہے ان سب میں قطعی طور پر یکسانیت پائی جاتی ہے اور اعداد ہمیشہ بائیں جانب سے دائیں جانب لکھے پڑھے جاتے ہیں۔ صحیح طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ اس سلسلہ میں کون سی زبان کس زبان کی رہین منت ہے اور بالخصوص فارسی عربی کی ممنونِ احسان ہے یا نہیں البتہ اُردو نے جہاں اپنے حروفِ تہجی اور رسم الخط وغیرہ کو عربی فارسی زبانوں سے مستعار لیا وہاں اعداد و شمار کے انداز نگارش میں بھی انھیں زبانوں کی کُل طور پر تقلید کی۔ بہرکیف اس وقت جو کچھ بھی ہوا خواہ عمداً خواہ غیر ارادی طور پر اپنے مقام پر درست و مناسب سہی لیکن اب جبکہ وہ ابتدائی دور ختم ہو چکا ہے اور اُردو اپنی فطری رواداری و ہمہ گیری کے سبب اتنی قلیل عمر کے باوصف دُنیا کی ترقی یافتہ زبانوں کے دوش بدوش نظر آتی ہے۔ ضروری ہے کہ اس باب میں زبان اپنے مخصوص قواعد و نظم ایجاد مرتب کرنے میں آزاد و خود مختار ہو اور دیگر زبانوں کی کورانہ تقلید سے گریز کرکے اپنے دساتیر و قوانین خود وضع کرے۔ چنانچہ سطور ذیل میں اعداد اُردو کے ناقص طرزِ تحریر سے بحث کی گئی ہے اور ساتھ ہی ساتھ اس مسئلہ کا معقول حل بھی پیش کیا گیا ہے۔

اس وقت تک تمام زبانوں کے اعداد میں اکائیاں دہائیاں وغیرہ دائیں طرف سے بائیں طرف پڑھی جاتی ہیں مثلاً ۴۳۲ میں ۲ اکائیاں دائیں طرف ہیں، تین دہائیاں ۲ اکائیوں کے بائیں جانب اور چار سیکڑے تین دہائیوں کی بائیں طرف ہیں۔ لیکن اعداد کی اکائیوں دہائیوں وغیرہ کی یہ ترتیب صرف ان کے سمجھنے تک ہی محدود رہتی ہے اور تحریر و تقریر میں معاملہ بالکل برعکس ہو جاتا ہے چنانچہ لکھنے پڑھنے میں بھی یہی ترتیب قائم رہتی ہے۔ چنانچہ مندرجہ بالا عدد چار سو بتیس پڑھا جاتا ہے۔ اور چونکہ یہ طریقہ بائیں جانب سے دائیں جانب لکھی جانے والی زبانوں کے طرزِ تحریر کے عین مطابق ہے لہٰذا اس معاملے میں وہ زبانیں حق بجانب ہیں لیکن اُردو میں صورت حالات مختلف ہے جہاں تحریر کی ابتدا دائیں جانب سے ہوتی ہے۔

اعداد اگر جداگانہ طور پر لکھے یا پڑھے جائیں تو مروجہ ترتیب سے زیادہ حرج نہیں ہوتا اور ان کو کسی جانب سے بھی شروع کیا جا سکتا ہے لیکن جہاں عبارت کے درمیان میں اعداد آ جاتے ہیں اصل دقت وہیں سے شروع ہو جاتی ہے۔ ایسے موقع پر لکھنے والا بالعموم آخری لفظ کے بعد کچھ جگہ چھوڑ کر بائیں جانب سے ہندسے لکھنا آغاز کرتا ہے اور عدد کو دائیں طرف ختم کرکے از سرِ نو اس کے بائیں جانب سے لکھنے لگتا ہے۔ یہ بات مندرجہ ذیل شکل سے اچھی طرح سمجھ میں آ جاتی ہے:-

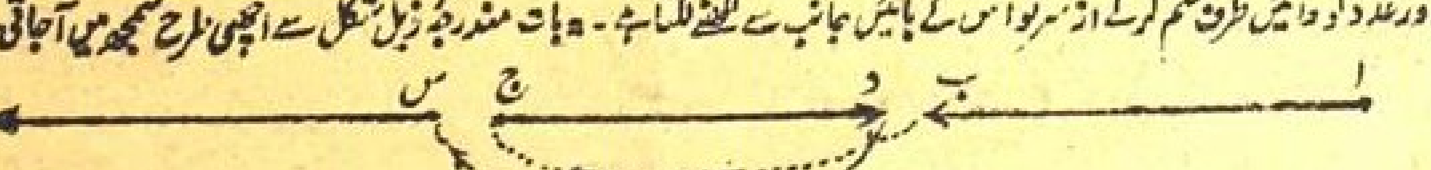

آ سے شروع ہو کر جس وقت عبارت مقام ب پر پہونچتی ہے لکھنے والا اپنی نگاہ و توجہ کے ساتھ ساتھ اپنے ہاتھ کو بھی مقام ج تک لے جاتا ہے اور تحریر کو مخالف سمت شروع کرکے مقام د پر ختم کرتا ہے۔ پھر دفعتہً اس کی نگاہ و توجہ مقام د سے جست کرکے مقام س تک پہونچتی ہے اور ان کے ساتھ کاتب اپنے ہاتھ کو جنبش دے کر وہاں تک لے جاتا ہے۔

یہ طریقہ اُردو کی فطرت نگارش کے خلاف بھی ہے اور دقت طلب بھی۔ خلاف فطرت یوں ہے کہ لکھنے والے کو اپنی تمام توجہ دائیں جانب سے بائیں جانب اور بائیں جانب سے دائیں جانب دفعتہً مبذول کرنا پڑتی ہے پھر یہی نہیں بلکہ نگاہ پر بھی بار زیادہ ہو جاتا ہے۔ نفسیاتی نقطۂ نظر سے صحت دماغ پر اس کا خراب اثر پڑتا ہے چنانچہ ہوتا بھی یہی ہے کہ اس قسم کی تحریر سے دماغ جلد تھک جاتا ہے اور طبیعت اُکتا جاتی ہے۔ دقت طلب یوں ہے کہ اکثر اعداد کی جسامت کا صحیح اندازہ نہ ہونے کے باعث خالی جگہ یا تو کم چھوٹ جاتی ہے یا زیادہ۔ چنانچہ پہلی صورت میں عدد کے آخری ہندسے مجبوراً چھوٹے کر دئے جاتے ہیں اور دوسری صورت آخری ہندسو

کا درمیانی فاصلہ بڑھا دیا جاتا ہے یا خلا باقی رہ جاتا ہے۔ بہر حال تحریر دونوں طرح بدنما ہو جاتی ہے۔

یہ تو رہیں وہ دقتیں جو الفاظ اور ہندسوں کے ساتھ ساتھ لکھے جانے سے رونما ہوتی ہیں اور جو علی العموم پیش آیا کرتی ہیں۔ ان کے علاوہ ایک مختلف قسم کی دشواری جس کی اہمیت سررشتۂ تعلیم سے مختص ہے اور عوام سے اس کو زیادہ تعلق نہیں ہوتا حساب کے ابتدائی قاعدوں کے سوالات میں اساتذہ و طلبہ کو اُردو مدارس میں کم اور انگریزی مدارس میں خاص طور پر محسوس ہوتی ہے۔

جمع اور ضرب کے سوالات میں تو بہر صورت نبھ جاتی ہے لیکن تقسیم و تفریق کے موقع پر غلطی کا امکان پیدا ہوتا ہے اور بالخصوص ایسی حالت میں جبکہ ہمارے محکمۂ تعلیم کے ناخداؤں اور پیشواؤں نے انگریزی ہندسوں کو اُردو ہندی میں بھی لازمی قرار دے رکھا ہے یہ امکان واقعہ کی حد تک پہونچ کر یقین کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ مثلاً ½ ÷ ¼ کو انگریزی ہندسوں میں لکھ کر انگریزی تحریر کے مطابق پڑھنے سے اس کا جواب ۲ آتا ہے لیکن اُردو ہندسوں میں لکھنے پڑھنے سے اس کا جواب ½ نکلتا ہے۔ یہ مصیبت بھی اُردو پڑھنے والے بچے کے لئے کم نہ تھی کہ اس پر حساب کی درسی کتابیں لکھنے والوں نے بالعموم یہ اور قیامت ڈھائی ہے کہ اس قسم کے سوالات کو کہیں اُردو کے قاعدے سے لکھا ہے اور کہیں انگریزی طریقے سے تحریر کیا ہے اور اس پر ستم ظریفی یہ کہ ہمارے محکمۂ تعلیم نے ان کتابوں کو بچوں کے نصابِ تعلیم میں منظور بھی فرما لیا ہے۔

نفی کے سوالات میں البتہ اس غلطی کا امکان کم ہے اس لئے کہ ہمیشہ بڑے عدد میں سے چھوٹا عدد منہا کیا جاتا ہے لہذا حل کرنے والا اپنی غلطی محسوس کر سکتا ہے۔ لیکن کسر کے طولانی سوالات میں بچے کے لئے اس قسم کا احساس دشوار ہے اور اگر ہو بھی سکتا ہے تو حل کے بالکل آخری حصے میں جبکہ وہ اپنا کافی وقت اور پوری دماغی قوت صرف کر چکتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ ہم اپنی غلطی کا بار بچے کے سر رکھتے ہیں اور اسی کو اس کا ذمہ دار قرار دیتے ہیں۔ یہ ایک صریح ظلم ہے کہ ہم اپنے ضمیر کو بھی دھوکا دیتے ہیں اور دوسرے کو بھی فریب دینا روا رکھتے ہیں۔

اس بحث کے بعد ہم اس نتیجے پر پہونچتے ہیں کہ ان تمام مشکلات کا ذمہ دار اعداد اُردو کا ناقص طرزِ تحریر ہے اور اس ناقص طرزِ تحریر کا تمام تر بار ہماری کورانہ تقلید قدامت پرستی اور سہل انگاری کے سر ہے اس لئے کہ ذراسی توجہ سے یہ معاملہ بالکل طے ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اگر ہم اعداد کو بھی الفاظ کے اندازِ نگارش کے مطابق لکھنے لگیں تو یہ دشواریاں یکقلم موقوف ہو جائیں۔ یعنی اکائی کو دائیں طرف نہ رکھ کر بائیں جانب قائم کریں مثلاً چار سو بتیس کو بجائے ۴۳۲ کے ۲۳۴ لکھنے لگیں تو تحریر و تقریر دونوں میں سہولت پیدا ہو جائے۔ اس طرح ہندسوں کے مقامات تبدیل کرنے سے ہماری گنتی یوں ہونا چاہیے:-

۱، ۲، ۳، ۴، ۵، ۶، ۷، ۸، ۹، ۰۱، ۱۱، ۲۱، ۳۱، ۴۱، ۵۱، ۶۱، ۷۱، ۸۱، ۹۱، ۰۲، ۱۲، ۲۲، ۳۲، ۴۲، ۵۲، ۶۲، ۷۲، ۸۲، ۹۲، ۰۳، ۱۳، ۲۳،
۳۳، ۴۳، ۵۳، ۶۳، ۷۳، ۸۳، ۹۳، ۰۴، ۱۴، ۲۴، ۳۴، ۴۴، ۵۴، ۶۴، ۷۴، ۸۴، ۹۴، ۰۵، ۱۵، ۲۵، ۳۵، ۴۵، ۵۵، ۶۵، ۷۵، ۸۵، ۹۵، ۰۶،
۱۶، ۲۶، ۳۶، ۴۶، ۵۶، ۶۶، ۷۶، ۸۶، ۹۶، ۰۷، ۱۷، ۲۷، ۳۷، ۴۷، ۵۷، ۶۷، ۷۷، ۸۷، ۹۷، ۰۸، ۱۸، ۲۸، ۳۸، ۴۸، ۵۸، ۶۸، ۷۸، ۸۸،
۹۸، ۰۹، ۱۹، ۲۹، ۳۹، ۴۹، ۵۹، ۶۹، ۷۹، ۸۹، ۹۹، ۰۰۱۔

اب اگر ہم ہندسوں میں پینسٹھ لاکھ اٹھتر ہزار نو سو باون لکھنا ہے تو یوں لکھیں گے۔ (۲۵۹۸۷۵۶) اور اکائی دہائی سیکڑہ وغیرہ دائیں سے بائیں کے بجائے بائیں سے دائیں کو شمار کریں گے۔ یا اگر بیالیس اعشاریہ چار تین آٹھ لکھنا ہے تو یوں لکھیں گے (۲۴٫۴۳۸) اور اعشاریہ کے مراتب کو دائیں سے بائیں دسواں، سواں، ہزارواں، حصہ سمجھیں گے۔ یا مثلاً پونے چار آنے کو ۳۰٫ لکھیں گے اور بڑی بڑی رقوم تو ہمیشہ سے اسی طرز پر لکھی جا رہی ہیں مثلاً ایک ہزار پانچ سو ستاون روپیہ — الصامعصے ؍ لکھے جاتے ہیں۔

الغرض اعداد اُردو کو اس طرح لکھنے سے تمام دقتیں ازخود غائب ہو جائیں گی اور تحریر میں روانی ہمواری اور سہولت پیدا ہو جائے گی۔ علاوہ ازیں اس امتیازی طریقے سے طلبہ کی مشکلات کا بھی خاتمہ ہو جائے گا اور وہ انگریزی ہندسوں میں لکھے ہوئے سوالات کو انگریزی قاعدے سے اور اُردو ہندسوں میں لکھے ہوئے سوالات کو اُردو قاعدے سے حل کرنے لگیں گے۔ اُردو سے دلچسپی رکھنے والے اصحاب سے امید ہے کہ وہ اس باب میں ٹھنڈے دل سے غور فرما کر اپنی گرانقدر رائے سے اس تاریک پہلو پر بھی روشنی ڈالیں گے اور مجھے میری تجویز کی صحت و عدمِ صحت سے آگاہی بخشیں گے۔

سید محمود نقوی سہیل

شاعرِ فطرت

فطرت تری آواز ہے، فطرت ہی تیرا ساز ہے
فطرت کا تو ہمراز ہے، اے شاعرِ رنگیں نوا

جوہر دکھائے نطق کے، دیگر زباں جذبات کو
کیا سحر رنگیں انداز ہے، اے شاعرِ رنگیں نوا

کہسار تیرے منتظر، گلشن کو تیری آرزو
آغوش صحرا باز ہے، اے شاعرِ رنگیں نوا

ساحل کی ہو لب تشنگی، یا اضطراب موج ہو
تو دونوں کا غماز ہے، اے شاعرِ رنگیں نوا

بالا نشاط و غم سے ہے، بازیچہ گاہ دہر میں
سب کا مگر دمساز ہے، اے شاعرِ رنگیں نوا

نغموں کے گل بکھرا دئے سازِ محبت چھیڑ کر
کیا نغمے ہیں، کیا ساز ہے، اے شاعرِ رنگیں نوا

اک جنبشِ لب نے تری گمنام کو نامی کیا
آواز یا اعجاز ہے! اے شاعرِ رنگیں نوا

قربانی و ایثار ہیں زندہ ترے الفاظ ہیں
تو غیب کی آواز ہے، اے شاعرِ رنگیں نوا

ہر نالۂ موزوں ترا، تاثیر میں ڈوبا ہوا
اک شاہدِ طناز ہے، اے شاعرِ رنگیں نوا

تجھ سے فروغِ حسن ہے، تجھ سے ہے شہرہ عشق کا
تو نقشبندِ راز ہے، اے شاعرِ رنگیں نوا

انجام ہر آغاز کا تجھ پر ہوا ہے آشکار
عالی تری پرواز ہے، اے شاعرِ رنگیں نوا

وجداں ترا الہام ہے، پیغام تیرا عشق ہے
دل خوابگاہِ ناز ہے، اے شاعرِ رنگیں نوا

شہبازِ عقل و ہوش کے جلتے ہیں پر جس اوج پر
تیرا وہ پا انداز ہے، اے شاعرِ رنگیں نوا

سائنس اور حکمت جہاں تاریکیاں ہیں جہل کی
تو آئینہ پرداز ہے، اے شاعرِ رنگیں نوا

وہ گیت گا، وہ سوز بھر، یا جاگ اُٹھے یا جل اُٹھے
دُنیا کہ محوِ آز ہے، اے شاعرِ رنگیں نوا

خان بہادر مرزا جعفر علی خاں اثر لکھنؤ

روس کی موجودہ صحافت

سوویٹ یونین میں اس وقت نو ہزار اخبار، ستر زبانوں میں شایع ہو رہے ہیں، اور حملۂ جرمنی کے وقت ان اخباروں کی کاپیوں کی مجموعی تعداد تین کروڑ تیس لاکھ تھی۔ یہ اخبار تین قسم کے ہیں، ایک وہ جو حکومت کے قومی ادارہ سے شایع ہوتے ہیں اور ان کی اشاعت ایک کروڑ ہے، اور دوسرے وہ جو ماسکو سے باہر روس کی یونین ریپبلکوں کے پندرہ صدر مقاموں اور دوسرے بڑے بڑے شہروں سے شایع ہوتے ہیں اور ان کی اشاعت ایک کروڑ ۲۰ لاکھ ہے اور تیسرے وہ جو ضلاع کے زراعتی و صنعتی اداروں سے متعلق ہیں اور ان کی اشاعت ایک کروڑ ۶۰ لاکھ ہے۔

ہر چند یہ اعداد و شمار ایسے نہیں جو یورپ کے دوسرے ممالک کے مقابلہ میں کوئی خاص اہمیت رکھتے ہوں، لیکن حکومت زار کے مقابلہ میں یقیناً بہت حیرتناک ہیں۔

زار کی حکومت میں انقلاب سے قبل (۱۹۱۳ء) یہاں صرف ۸۵۹ اخبار شایع ہوتے تھے جن کی مجموعی تعداد اشاعت پونے تین کروڑ سے زیادہ نہ تھی ان میں ۷۷۵ اخبار روسی زبان میں شایع ہوتے تھے اور انھیں کی اشاعت زیادہ تھی۔ باقی ۸۴ اخبار جو غیر روسی زبان کے تھے وہ بہت کم تعداد میں چھپتے تھے۔

۱۹۳۹ء میں روسی زبان کے اخباروں کی تعداد اٹھ گنی ہو گئی (یعنی ۶۳۶۲) اور غیر روسی زبان کے اخباروں کی تعداد ۲۶ گنا بڑھ گئی (یعنی ۲۱۶۱) اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ سوویٹ حکومت نے عام تعلیم کی طرف کتنی توجہ کی اور ملک کی غیر روسی قوموں کو روسی قوم کی سطح تک لانے میں کس قدر جد و جہد سے کام لیا۔ لیکن فرق یہ ہے کہ برطانوی اخباروں کی اس ترقی میں زیادہ تر لندن کے اخباروں کا حصہ تھا اور روس میں ماسکو سے باہر ملک کے اضلاع کو ترقی کا زیادہ موقع دیا گیا۔ اس لئے جس حد تک ملکی صحافت کا تعلق ہے، روس کو برطانیہ کے مقابلہ میں بھی درجۂ امتیاز حاصل ہے۔

اب سے ۲۵ سال پہلے روسی اخباروں کے لئے کاغذ تمام تر باہر سے آتا تھا، کیونکہ یہ صنعت وہاں بہت پیچھے تھی، لیکن جب انقلاب ہوا تو یہ بھی طے کیا گیا کہ اخباروں کے لئے کاغذ باہر سے نہ آئے گا بلکہ ملک کے اندر ہی بنایا جائے گا۔ ظاہر ہے کہ اس کا اثر وہاں کے اخباروں پر پڑنا چاہئے تھا، کیونکہ کاغذ اس قدر جلد تو طیار ہو نہ سکتا تھا اور اسی لئے اخباروں کی اشاعت ایک کروڑ سے کم رہ گئی، لیکن گیارہ سال کے اندر ہی اندر کاغذ سازی کی صنعت نے وہاں اس قدر ترقی کر لی کہ ۱۹۳۰ء میں تقریباً چار کروڑ کاپیوں کا کاغذ ملک کے اندر طیار ہونے لگا۔

روسی صحافت کے اس قدر ترقی کر لینے کا خاص سبب وہاں کا نظام حکومت ہے جس نے شخصی وانفرادی ملکیت کو ختم کر دیا ہے، چنانچہ اب سے ۲۵ سال پہلے جب بالشیوک حکومت نے ذاتی ملکیت کی جگہ قومی و اجتماعی ملکیت کے اصول کو رائج کیا تو وہاں کے اخبار بھی اسی اصول پر شایع ہونے لگے اور ذاتی ملکیت سے آزاد ہو گئے۔

ماسکو میں اس وقت جتنے اخبار نکل رہے ہیں ان میں سے بعض وہ ہیں جنھیں حکومت کے مختلف محکمے اور تجارتی ادارے ملکر نکال رہے ہیں، بعض وہ ہیں جنھیں تنہا حکومت چلا رہی ہے، بعض اخبار محکمۂ بحریہ کے ہیں اور بعض فوج کے۔ ان میں سے چند یہ ہیں:۔

۱- ازدوستیار (Izvestia) جس کی اشاعت تقریباً پانچ لاکھ ہے، حکومت کا اخبار ہے۔
۲- پراودا (Pravda) جس کی اشاعت ۲۲ لاکھ ہے، کمیونسٹ پارٹی کا اخبار ہے۔
۳- کامس کومولکایا (Komsocomoloskaya) جس کی اشاعت سات لاکھ ہے۔ نوجوان طبقہ کا اخبار ہے۔

۴- پائینر سکایا (Pionerskaya) جس کی اشاعت ۸ لاکھ ۵۰ ہزار ہے، بچوں کا اخبار ہے جسے نوجوانوں کی کمیونسٹ لیگ شایع کرتی ہے۔

۵- ٹرڈ (Trud) تجارتی اداروں کی مرکزی کونسل کا اخبار ہے۔

ماسکو سے باہر صوبوں کے بڑے بڑے اخبار وہاں کے مختلف اداروں کے ہاتھ میں ہیں، چنانچہ سنہ ۳۹ء میں اس قسم کے ۵۰۰ روزانہ اخبار صوبوں کی حکومتوں کی طرف سے شایع ہوتے تھے، ۵۰۰ ۳ اخبار زراعتی اضلاع کی طرف سے اور ۴۰۰ ۶ کارخانوں کی طرف سے۔

سوویٹ اخبار خواہ وہ کسی طبقہ کی نمایندگی کریں، ملک کی نہ صرف عام سیاسیات میں نمایاں حصہ لیتے ہیں بلکہ تمام اقتصادی صنعتی، تجارتی اور سوشل مسایل میں بھی اپنی مستقل آواز رکھتے ہیں، اور یہی سبب ہے کہ ۲۵ سال کے اندر ملک کی حالت بدل گئی اور وہاں کے ایک ایک بچہ میں قومی جوش و ولولہ پیدا ہوگیا ہے۔ وہاں کا ہر ہر فرد سمجھتا ہے کہ ملک اُس کا ہے اور ملک کی حفاظت و ترقی میں حصہ لینا اس کا فرض ہے۔

جب سے جنگ شروع ہوئی ہے اہلِ ملک اور ملک کے اخباروں کی توجہ دوسرے مسایل سے ہٹ کر صرف سامانِ جنگ کی طیاری و فراہمی کی طرف مبذول ہوگئی ہے اور روس کے ۵۰ ہزار صحافیوں کی زندگی صرف صحافت کے لئے وقف نہیں ہے بلکہ وہ میدانِ جنگ میں جاکر لڑتے بھی ہیں، اسلحہ سازی کے کارخانوں میں بھی کام کرتے ہیں اور وہ ہر اس خدمت کے لئے آمادہ نظر آتے ہیں جو اُن کے قومی وقار اور ان کی ملکی عزت کو قایم رکھنے کے لئے ضروری ہے۔

روس کی صحافت کا ایک خاص شعبہ "دیوار کی صحافت" بھی ہے، اس سے کاغذ کے وہ بڑے بڑے تختے مراد ہیں جن پر خبریں یا کارٹون وغیرہ چھاپ کر مکانوں سڑکوں، گلیوں اور کارخانوں کی دیواروں پر چسپاں کر دیتے ہیں اور اسی سے وہاں کی صحافت کی تعلیم ہوتی ہے۔ اس صحافت کو وہاں کے والنٹیر انجام دیتے ہیں اور اس طرح ملک کے تمام اعداد و شمار، اہم واقعات، ضروری خبریں، دلچسپ تصویریں، عام معلومات، اور دنیا کے سیاسی رجحانات پبلک کے سامنے بیک وقت آسانی کے ساتھ آجاتے ہیں۔

اس وقت روس کے جتنے بڑے بڑے صحافی ہیں، ان سب کی ابتدائی صحافتی زندگی اسی دیوار والی صحافت سے شروع ہوئی تھی اور آیندہ جو صحافی پیدا ہونے والے ہیں وہ بھی اسی طرح اُٹھیں گے۔

لینن کا قول تھا کہ "روس کے ایک ایک باورچی کو عنانِ سلطنت ہاتھ میں لینا سیکھنا چاہئے" اور اس میں شک نہیں کہ روس کی صحافت نے جو عام ذہنی انقلاب ملک میں پیدا کر دیا ہے، وہ لینن کی اس خواہش کو پورا کرکے رہیگا۔

مطبوعات طاق بستاں

خواب کی دُنیا :- اس موضوع پر یہ کتاب آخری لفظ کی حیثیت رکھتی ہے اگر آپ کو بھی اس عالم سے دلچسپی ہے تو اس کتاب کو ملاحظہ فرمائیے جس میں مولانا عبدالمالک آروی نے فرایڈ کی تحقیقات کو بہت سے مفید حواشی کے ساتھ اُردو میں پیش کیا ہے۔ قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول

الہامات شاد :- شاد عظیم آبادی کے رتبۂ شاعری سے ہر شخص واقف ہے لیکن ان کے کلام کا انتخاب معہ ایک انتقادی و تاریخی مقدمہ کے دیکھنا چاہتے ہیں تو مولانا عبدالمالک کی اس تالیف کو ملاحظہ فرمائیے۔ قیمت ۸ ر علاوہ محصول

اقبال کی شاعری :- یہ کتاب مولانا عبدالمالک کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے۔ اقبال پر اردو میں اس سے بہتر نقد و تبصرہ شاید ہی کہیں اور نظر آئے اس کی مقبولیت کا ثبوت یہ ہے کہ اس کا پہلا اڈیشن ہاتھوں ہاتھ بک گیا۔ قیمت دس آنے علاوہ محصول۔

مقام محمود :- مولانا عبدالمالک کے ادبی مقالات کا مجموعہ۔ قیمت دو روپیہ چار آنہ۔ علاوہ محصول

نگار بک ایجنسی۔ لکھنؤ

سرودِ پس منظر

(بلیک آؤٹ)

جو نپڑے تیرہ، فضا تاریک، دُنیا سوگوار، وقت کے سینے میں رُکتی سانس سے پیہم فشار
اک دُھواں سا چارسو اُٹھتا ہے منڈلاتا ہوا ہر طرف ابرِ سیہ کاجل سا برساتا ہوا
تیرگی کی وادیاں، تاریکیوں کے کوہسار ہوگیا بیدار گویا دیو انسانیت شکار
اک سیہ طوفاں میں فطرت غسل سا کرتی ہوئی ساحلوں تک موج بھی آتی ہے اب ڈرتی ہوئی
ظلمت آلودہ نگاہیں، ظلمت آلودہ دماغ، ہوش کے سینے میں روشن بدگمانی کے چراغ
آئینوں پر ہنس رہے ہیں بدنما چہروں کے داغ ہیں کفِ ظلمات پر روشن تمدّن کے چراغ،

جیب و دامن خاک سے، خاشاک سے بھرتے ہوئے
وہ اُٹھے کالے بگولے رقص سا کرتے ہوئے!

یہ اندھیرے، آہ یہ کالی چٹانوں کے محل آہ، یہ خوننابہ افشاں داستانوں کے محل،
وہ محل، قوموں کی تاریخیں بدلتی ہیں جہاں، وہ محل تاریکیاں سورج اُگلتی ہیں جہاں

وقت کی تقدیر ڈھلتی ہے اسی ظلمات میں
زندگی کروٹ بدلتی ہے انہی سکرات میں!

جن کی راتوں میں اماں لیتے ہیں بیداری کے خواب جن کے ہاتھوں سے بدل جاتے ہیں تاریخوں کے باب
جن کے دھاروں سے بدل جاتی ہیں تقدیریں تمام جن کے انگاروں سے گل جاتی ہیں زنجیریں تمام،
ظلمتوں میں ڈھل رہے ہیں ہم نشیں وہ آفتاب جن کے پنجوں میں سسکتے ہیں ہزاروں انقلاب
مُسکراتی ہیں خراشیں سینۂ آلام کی خوں سے آلودہ ہیں پھر پیشانیاں ایام کی
قہقہوں کے جائزے گریانیاں لینے کو ہیں کلفتیں ہاتھوں میں شمشیر و سناں لینے کو ہیں،
اب اُتارے جائیں گے لعل و گہر کے سر سے تاج اطلس و کمخواب سے عریانیاں لیں گی خراج

اب لگا دی جائے گی ہر ہیکلِ عشرت میں آگ
زندگی پائے گی پھر لُوٹا ہوا اپنا سہاگ!

پروفیسر شورؔ

چین کی ایک خفیہ سوسائٹی

فرانس کا کونٹ پایولا کاسلی جب ایک سیاح کی حیثیت سے چین گیا تو وہاں اسے ایک خفیہ سوسائٹی میں بھی شرکت کا موقع ملا۔ اس کے دلچسپ حالات اس نے اس طرح قلمبند کئے ہیں۔

"چین میں خفیہ سوسائٹیاں بہت پائی جاتی ہیں اور اگر وہاں کی بڑی آبادی اور اس کے اُن مصائب کو سامنے رکھا جائے، جو سیلابوں، وباؤں خانہ جنگیوں اور بیرونی حملوں کی وجہ سے وہاں نازل ہوتے رہتے ہیں تو حیرت نہ کرنا چاہئے کہ وہاں اس قسم کی سوسائٹیاں بکثرت پائی جاتی ہیں۔

چند سال اُس طرف جب میں چین میں رہتا تھا تو مجھے وہاں کی ایک خفیہ سوسائٹی کے ممبر بننے کی بھی عزت حاصل ہوئی تھی۔ یہ سوسائٹی چین کے نوجوانوں کی تھی جن کا مقصد یہ تھا کہ ملک کو جاپانی خطرہ اور سوویٹ اثرات سے محفوظ رکھا جائے۔

میں بالکل پہلا یوریپین تھا جسے یہاں کی کسی خفیہ سوسائٹی میں جگہ ملی ہو، اس کا سبب یہ نہ تھا کہ میں چین کی قومی فوج میں ایک معلم کی حیثیت رکھتا تھا بلکہ صرف یہ کہ مجھے واقعی چین کے مقاصد سے بہت دلچسپی تھی اور میں نہایت ہمدردی سے ان کی اس تحریک میں شریک ہوتا تھا۔

میں نے بود و باش اور وضع و معاشرت بھی بالکل چینیوں کی سی اختیار کرلی تھی اور میں وہاں کے یوریپین عنصر سے بالکل الگ تھلگ رہتا تھا۔ میں نے چینی زبان بھی بقدر ضرورت سیکھ لی تھی اور یہی وہ تمام باتیں تھیں جو مجھے یہاں کی ایک خفیہ سوسائٹی تک پہونچانے میں کامیاب ہوئیں۔

میری ممبری کی سفارش حسب قاعدہ پہلے دو چینی ممبروں نے کی اور ابتدائی مراحل کی معلومات میں نے انھیں سے حاصل کیں۔ میں نے انکی ہدایت کے مطابق تمام ان سوالوں کے جواب یاد کرلئے جو مجھ سے پوچھے جانے والے تھے اور سوسائٹی کے بعض نشانات و اشارات اور مراسم وغیرہ بھی ذہن نشین کرلئے

ایک شام وہی دو ممبر میرے پاس آئے اور رسم داخلہ پوری کرنے کے لئے مجھے ساتھ چلنے کے لئے کہا۔ میں نے سوچا کہ ریوالور لیجانا زیادہ مناسب ہوگا لیکن بعد کو میں نے یہ خیال دور کردیا اور اچھا ہی ہوا کہ میں نے ایسا نہیں کیا، کیونکہ میری تلاشی کے وقت بعد کو یہ راز کھل جاتا۔

ایک پُرانا بوسیدہ مکان اس رسم کے لئے تجویز کیا گیا تھا۔ اس کے ایک کمرے میں جو بالکل خالی تھا مجھے لے گئے۔ یہاں مجھے اپنے سارے کپڑے اُتار کر ایک سفید عبا پہننا پڑی اور جوتہ اُتار کر چپل!

اس کے بعد میں خاص کمرے کے دروازہ پر گیا جہاں ایک دربان کھڑا تھا۔ اس نے مجھ سے بہت سے سوال کئے اور میں نے جو جوابات دئے ان کا خلاصہ یہ تھا کہ — "میں بڑے دور دراز ملک سے آیا ہوں" — "میں نے خشکی اور سمندر پر جاترا کے لئے بڑا سفر کیا ہے" — اور — "اب میں روشنی، صداقت اور انصاف کی جستجو میں یہاں آیا ہوں"

اس کے بعد ایک ایسے کمرے میں پہونچا جہاں صرف چٹائی بچھی ہوئی تھی اور ایک انگیٹھی روشن تھی۔ مجھ سے کہا گیا کہ چٹائی پر بیٹھ جاؤں۔ اسکے بعد مجھ سے بہت سے سوال کئے گئے اور پھر مجھ سے گردن جھکانے کے لئے کہا گیا۔ جب میں نے گردن جھکالی، تو میری گدی سے بالوں کی ایک لٹ کاٹ لیگئی!

مجھے پہلے ہی معلوم تھا کہ یہ رسم ادا کی جائے گی اس لئے جس وقت میری گدی پر قینچی پہونچی تو میں بہت مطمئن تھا۔ میں نے ایک طالب علم کی طرح تمام سوالوں کے جواب کاغذ کے ایک ٹکڑے پر پنسل سے لکھ لئے تھے اور ہر سوال پر کنکھیوں سے اس کاغذ کو دیکھتا جاتا تھا تاکہ کوئی غلطی نہ ہوجائے۔

جب بالوں کی لٹ کاٹی جاچکی تو میں، اُٹھ کر اپنے دونوں ساتھیوں کے ساتھ کھڑا ہوگیا اس کے بعد انگیٹھی میں کوئی سفوف ڈالا گیا جس سے

دھواں اُٹھنے لگا اور مجھ سے کہا گیا کہ انگیٹھی کو پھاند کر دوسری طرف چلا جاؤں - اس سے مقصود یہ تھا کہ میں مصائب کے بادلوں سے بچا رہوں !

اس کے بعد میں مرکزی دروازہ پر پہونچا - یہاں بھی ایک دربان موجود تھا جو ہاتھ میں سُرخ عصا لئے ہوئے تھا - میں نے عصا پکڑ کر اس سے پانچ سوال کئے (جو مجھے بتا دئے گئے تھے) پھر خود اس نے مجھ سے بعض سوالات کئے، میں نے جواب دینے کے بعد ایک چینی سکّہ اس کے ہاتھ میں رکھا اور اندر داخل ہوا - یہ کمرا بڑا تھا جس میں روشنی کافی تھی اور بیچ میں ایک بڑی قندیل لٹک رہی تھی -

کمرے کے درمیان ایک بڑا ظرف لکڑی کا تھا جو چاولوں سے بھرا ہوا تھا، اسی کے پاس ایک تیغہ ایک بیضاوی آئینہ اور ایک سفید ریشم کا پنکھا رکھا ہوا تھا اور چاروں طرف کرسیاں بچھی ہوئی تھیں جن پر سفید عبائیں پہنے ہوئے کچھ لوگ بیٹھے ہوئے تھے - اس مجمع کا صدر ایک بڑھا چینی تھا جسکے داڑھی بھی تھی اور جو عینک لگائے ہوئے تھا - میں نے پوچھا تو مجھ سے تقریباً ۲۰۰ سوالات کئے گئے جن میں سے بعض کا جواب مجھے کھڑے ہو کر اور بعض کا بیٹھ کر دینا پڑا - انھیں سوالوں میں ایک سوال میری جنسیت کے متعلق بھی تھا - اس سے مقصود یہ معلوم کرنا تھا کہ میں عورت یا مخنث تو نہیں ہوں کیونکہ ان کو ممبر نہیں بنایا جا سکتا - اس کے بعد آئینہ، تیغہ اور پنکھا میرے سامنے پیش کئے گئے، میں نے پہلے آئینہ میں اپنا منھ دیکھا، پھر تیغہ ہاتھ میں لیا اور اس کے بعد پنکھے سے مُنھ پر ہوا دینے لگا - اسی کے ساتھ مجھے کچھ منتر بھی پڑھنا پڑے -

اس کے بعد میرے ہاتھ کے داہنے انگوٹھے سے خون نکال کر پیالے میں جمع کرنے کی رسم ادا کی گئی، جو بالکل فرضی تھی، یعنی انگوٹھے سے خون تو نہیں نکالا گیا لیکن رسم اسی طرح کی ادا کی گئی - اس کے بعد مجھ سے وفاداری کا حلف لیا گیا اور یہ عہد کہ مشرق و مغرب میں جہاں کہیں چین کا دشمن پایا جائے گا میں اس سے لڑوں گا - میرا ایک نام بھی مقرر کیا گیا اور تین پھل مجھے دئے گئے، ان میں سے ایک شفتالو اور دوسرا بادام تھا یہ دونوں میں نے کھا لئے اور تیسرے پھل کو جس کا نام مجھے معلوم نہیں واپس کر دیا (از روے رسم مجھے یہی کرنا چاہئے تھا) - اس کے بعد مجھے تین نشانیاں بتائی گئیں تاکہ میں سوسائٹی کے ممبروں کو ہر جگہ پہچان سکوں - ایک نشانی کھانے کے وقت کی تھی، دوسری راستہ میں چلتے پھرتے معلوم کرنے کی اور تیسری تحریر میں استعمال کرنے کی - یہ رسمیں شام کے نو بجے سے رات کے دو بجے تک جاری رہیں اور چلتے وقت مجھے ممبری کا ایک بلّا دیا گیا تھا جو چین کا ایک قدیم سکّہ تھا -

نگار کے خاص نمبر

منیجر نگار بک ایجنسی لکھنؤ

جنوری سنہ ۳۱ء	جنوری سنہ ۳۹ء	جنوری سنہ ۴۰ء	جنوری سنہ ۴۱ء	جنوری سنہ ۴۲ء
انسان کی تحریر اور دستخط سے سیرت کا مطالعہ اگر آپ کرنا چاہتے ہیں تو نگار کے اس خاص نمبر کو پڑھئے، اس میں تحریروں اور دستخطوں کے بہت سے نمونے دیکر علمی طور سے اس فن پر بحث کی گئی ہے - قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول	(مصحفی نمبر) اس کے بعض عنوانات یہ ہیں :- حیات مصحفی - اردو غزلگوئی میں مصحفی کا مرتبہ - مصحفی کی غیر مطبوعہ مثنویاں - انتخاب کلام مطبوعہ و غیر مطبوعہ - صفحات ۱۶۴ قیمت ایک روپیہ (عہ) علاوہ محصول	(نظیر نمبر) اس کے بعض عنوانات یہ ہیں :- نظیر کا مسلک - شاعری پر تبصرہ - نظیر اور عوام - انتخاب کلام مطبوعہ و غیر مطبوعہ - صفحات ۱۶۸ قیمت ایک روپیہ (عہ) علاوہ محصول	یہ نمبر دنیائے تذکرہ میں بالکل پہلی چیز ہے یعنی اسوقت کے تمام مشہور غزلگو شعراء نے خود اپنے حالات لکھے ہیں اور خود اپنے کلام کا انتخاب کیا ہے اسی کے ساتھ ایک مقالہ غزل گوئی پر بھی ہے جو دیکھنے کے قابل ہے - قیمت دو روپیہ (عہ) علاوہ محصول	اس نمبر میں ملک کے پانچ مشہور نقادوں نے اُن شاعروں کے کلام پر تبصرہ کیا ہے جنکی غزلوں کا انتخاب جنوری سنہ ۴۱ء میں شایع ہوا تھا، یہ نمبر گویا تتمہ ہے جنوری سنہ ۴۱ء کا اور اس کے ساتھ ہی اسکا مطالعہ بھی ضروری ہے - ان دونوں نمبروں سے ملکر ایک ایسا تذکرہ مرتب ہو جاتا ہے جو اس وقت تک پیش نہیں کیا جا سکا - قیمت ایکروپیہ علاوہ محصول

مکتوبات نیاز

حضرت ، کہئے آپ کے "گیسو دراز" آج کل کہاں ہیں ؟ خصوصیت کے ساتھ اُن کے یاد آجانے کا سبب یہ ہے کہ آج کل انھیں کے ٹکّر کے ایک صاحب میرے مکان کے قریب مقیم ہیں - سر سے پاؤں تک بالکل عطر و رنگ ۔۔ خوش گل بھی ہیں اور خوش گلو بھی - وہ تو کسی کو دھوکا دینا نہیں چاہتے، لیکن ان کی وضع وصورت کو دیکھ کر خود کوئی دھوکے میں آجائے تو وہ کچھ کہتے بھی نہیں - بہت تجربہ کار شخص ہیں !

مجھ سے کبھی کبھی ملتے ہیں، لیکن بالکل "دامن کشاں" انداز سے، حالانکہ میں گاہ گاہ اُن کی "کھُل کھیلنے والی" صحبتوں میں بھی شریک ہونا چاہتا ہوں

اگر وہ یہاں ہوتے تو شاید میں اس میں آسانی سے کامیاب ہوجاتا، اس لئے پوچھتا ہوں کہ کہاں ہیں - پتہ معلوم ہو تو لکھئے، انھیں چند دن کے لئے پکڑ لاؤں

چھوڑئے اس قصہ کو، آپ بھی کیا باتیں کرتے ہیں،

غالب خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں

آپ کی محبت کا ہمیشہ سے زیر بار ہوں، کیوں آپ بار بار مجھے کانٹوں میں گھسیٹتے ہیں - میں اپنی ہستی سے زیادہ واقف ہوں اور انتہائی عالم کیف و سرشاری میں بھی اپنی جگہ "پائیں" کے علاوہ کہیں نہیں پاتا - جو حضرات اپنے آپ کو مسند نشین سمجھتے ہیں ان کو دعوائے صدارت مُبارک، لیکن میں بھی اس کی تصدیق کروں، یہ محال ہے، کیونکہ میں تو انھیں پائیں سے بھی کچھ نیچے، اپنے سے بھی کچھ فروتر پاتا ہوں

آپ کو نہیں معلوم کہ ان "خانوادگان علم و مذہب" میں کس کبر و ریا کی تعلیم دیجاتی ہے - اور کیسا کیسا "زبردست عزازیل" وہاں سانس لے رہا ہے - انھوں نے انسانی آبادی کو گھٹا کر صرف اپنی چار دیواری میں محدود سمجھ رکھا ہے اور خدا کو اس سے بھی زیادہ مختصر کرکے اپنے جیب و آستین میں لئے پھرتے ہیں

ان کے یہاں "خلیفۃ اللہ فی الارض" وہ نہیں ہے جو نوامیس قدرت کی جستجو کرکے خدا کو پہچانتا ہے، بلکہ وہ خدا کو خدا

سمجھتا ہے، صرف اس لئے کہ اس نے مُرغ و ماہی کو پیدا کیا اور انسان کو ان کے کھانے کی توفیق عطا فرمائی - اس نے جنت بنائی اور جنّت کی خوبصورت حوروں پر انھیں تصرف کی اجازت دی!

آپ کہیں گے مذہب تنہا اسی کا نام تو نہیں، میں کہوں گا مذہب میں اس کا ذکر ہی کیوں ہے، آپ فرمائیں گے اس میں حرج بھی کیا ہے، میں عرض کروں گا، کہ پھر دُنیا میں کیوں اس کی آزادی نہیں - وہی انسان، وہی اس کے جذبات لیکن یہاں مجبور، وہاں مختار - کیوں؟ ــــ شاید اس لئے کہ یہاں سوشل نظام کے لئے جبر و منع کی ضرورت ہے ــــ تو کیا وہاں کا نظام سوائے اس "آویزش" کے اور کچھ نہ ہوگا ــــ معاذ اللہ! انسان کو چھوڑئے، کیا خدا کی توہین اس سے زیادہ کچھ اور ہو سکتی ہے؟ لیکن کیا کیجئے

بیداد تواں دید و ستمگر نتواں گفت!

جی ہاں، اب اچھا ہوں لیکن زندگی بدمزگی سے بسر ہو رہی ہے، اس لئے نہیں کہ اب "دھمکی" نہیں ملتی (بقولِ شجاعت) بلکہ صرف اس لئے کہ شاید میں اُن انقلابات کو نہ دیکھ سکوں گا جنھیں دیکھنا چاہتا ہوں!

آپ کے عتاب نامہ کا جواب صرف یہ سوال ہونا چاہئے تھا کہ

در کشتنِ من اینہمہ بیباک چرائی؟

لیکن جانتا ہوں کہ جب "ناز و غمزہ" کا مفہوم صرف "دشنہ و خنجر" رہ جائے تو پھر سوائے شہید ہو جانے کے چارہ بھی کیا ہے!

منم کہ بر دل و دینِ خود اعتمادم ہست
بہ نیم غمزہ، ہم ایں را رُبائے دہم آں را

میں نے بہت کوشش کی کہ اپنے آپ کو "مجروح راوی" سمجھ کر، آپ کو اپنے یقین سے شرمندہ نہ ہونے دوں، لیکن اس کا کیا علاج کہ "نقل و روایت" سے دور اس مسئلہ میں، اپنی رائے مجھے "نصِ قطعی" معلوم ہوتی ہے

در خود نمی شناسم جز دوستی گناہے!

تاہم یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی کہ آپ محبت کو "ورزشِ ایمان بالغیب" کیوں نہ قرار دیں - اس صورت میں کیا جبرئیل کو بھی جھوٹا کہا جا سکتا ہے

باور کیجئے میرا مقصود یہ نہ تھا کہ خواہ مخواہ آپ کے دل میں کوئی ناروا خلش پیدا کر دوں، اور یہ بات میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھی کہ اتنی پختگی کے بعد بھی آپ میں اس قدر خامکاری باقی رہ گئی، لیکن اگر میری تحریر سے آپ کو واقعی کوئی صدمہ پہونچا ہے تو مجھے اس کا سخت افسوس ہے، معذرت چاہتا ہوں!

آپ ازراہ شکایت پوچھتی ہیں کہ وہ قاعدۂ مہر و محبت کیا ہوا - اس کا جواب یہ ہے کہ

رسمے کہنے بود ، بہ عہدِ تو بر افتاد !

بولئے ، کچھ اور فرمایئے گا ؟

حیران ہوں کہ یوں تو مہینوں خاموش رہنا ، لیکن جب اس "گناہِ سکوت" کا احساس ہو تو اس کی تلافی میں دوسرے کو اس طرح الزام دینا گویا آپ نگاہ سے بھی کبھی دور نہ ہوئی تھیں ! " اللہ ، اللہ ، چہ جمال ست بدیں بوالعجبی ! "

یہ میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ آپ یہی سننا چاہتی ہیں ، آپ انھیں باتوں سے خوش ہوتی ہیں - آپ کی بڑی مسرت اسی میں ہے کہ آپ کی بے نیازی کو محسوس بھی کیا جائے اور اس کا ذکر بھی ہو ، لیجئے ، یہ فرض بھی ادا ہو گیا - اب کیا ارادہ ہے ، وہی سکوت ! وہی متبسم روگردانی ! اور وہی

نازبرخویش و خود نمائیِ خویش !

کیا مہمل باتیں ہیں - پیرِ کنعاں کی طرح ، پیراہن پرستی چھوڑئے - یوسف یوں نہیں ملتا - اب ان کتابوں میں کیا رکھا ہے - انھیں دیمک اور خاک کے لئے دفن کیجئے اور آفتاب کی روشنی میں آفتاب کا مطالعہ کیجئے

کتنی مدت کے بعد تو دنیا کی آنکھ کھلی ہے اور آپ پھر اس پر اندھیری چڑھانا چاہتے ہیں - وہ زمانہ جب زمین چپٹی تھی اور آسمان اس کے چاروں طرف گھومتا تھا ، ختم ہو چکا ہے - اب زمین گول ہے اور آپ بھی اس کے ساتھ ہر وقت گردش میں مصروف ہیں - کب تک جامد بنے رہیے گا

میں ایک بات کہتا ہوں اس زمانہ کی اور آپ اس کی سند ڈھونڈھتے ہیں اب سے تیرہ سو برس پہلے کی کتابوں میں - کوئی سنے گا تو کیا کہے گا - اگر آپ سمجھتے ہیں کہ یہ زمانہ آپ لوگوں کے زندہ رہنے کا نہیں ہے تو مر جایئے ، لیکن خدارا نئی زندگی پانے والی نسل کی راہ میں موانع حایل نہ کیجئے !

عشق اگر مرد ست مردے تاب دیدار آورد

ورنہ چوں موسیٰ بسے آورد و بسیار آورد !

قبلہ ! خط پہونچا ، آپ اپنے آپ کو ذرۂ بیمقدار کہتے ہیں ، لیکن اگر یہ صحیح ہے تو پھر

مہر جہانتاب کیست !

آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ اس نوع کا انکسار سخت گناہ ہے - آپ کے اکتسابات سے اگر قوم استفادہ نہ کر سکی ، تو کیا اسے قوم کی بدنصیبی نہ کہیں گے - آپ کو پس و پیش غالباً صرف اس لئے ہے کہ اہل مذہب آپ پر طعن کریں گے ،

لیکن آپ جانتے ہیں کہ یہ کیا اور ان کا طعن کیا ؟ یہ خود بھی جانتے ہیں کہ ان کے ہتھیار کتنے کند ہیں اور ــــ پھر ــــ اسی لئے تو میں آپ کو میدان میں بلاتا ہوں کہ آپ انھیں میں سے ہیں اور آپ ہی کی شہادت اُن کے خلاف زیادہ کارگر ہوگی ۔ مشکل سے اس گروہ میں آپ ہی تو ایک صاحبدل ملے ہیں ، آپ ہی دل چرائیں گے تو کام کیونکر چلے گا ۔ آپ اُٹھئے تو سہی ، اس رسوائی میں بھی خاص لطف ہے !

محترمہ ۔ مجید صاحب سے معلوم ہوا کہ آپ علیل ہیں ۔ علالت کی تفصیل تو وہ بتا نہ سکے ، تاہم اتنا پتہ ضرور چلا کہ اس کا تعلق " دل " سے ہے

چونکہ میں عورت کے دل (اور خصوصیت کے ساتھ " برہم دل ") سے بہت گھبراتا ہوں ، اس لئے زحمت نہ ہو تو مطلع فرمائیے کہ خدانخواستہ اختلاجی کیفیت تو نہیں ہے ۔ جب میں علیل تھا تو آپ نے میرا حال پوچھا اور میں اچھا ہو گیا اب آپ علیل ہیں اور میں پوچھ رہا ہوں لیکن نتیجہ کی طرف سے غیر مطمئن !

خدا کرے آپ اپنے جواب سے میرے اس تذبذب کو دور سکیں ۔ علیگڈھ کی آب و ہوا اگر لکھنؤ سے بہتر نہ ہوتی تو میں مشورہ دیتا کہ یہاں چلی آئیے ، تاہم مقام کی تبدیلی کا اثر صحت پر ضرور پڑتا ہے ۔ لکھنؤ نہ سہی ، کہیں اور سہی ،

جواب کا منتظر ہوں

دی مغل لائن لمیٹیڈ

مسلمانوں کی قائم کی ہوئی واحد جہازران کمپنی

تھوڑے تھوڑے وقفہ سے بمبئی اور کراچی سے عدن اور پورٹ سوڈان ، جدہ اور سویز تک جہازوں کی روانگی کا معقول انتظام

سفری اور باربرداری کے جہازات بمبئی اور کراچی سے عدن ۔ پورٹ ۔ سوڈان ۔ جدہ اور سویز تک
مُسافر اور مال و اسباب لیجاتے ہیں ، نیز بمبئی اور کراچی سے پورٹ لوئی اور ماریشس تک سفر کرتے ہیں

تمام سرویس اور تاریخیں بغیر کسی پیشگی اطلاع کے منسوخ کیجا سکتی ہیں

مزید تفصیلات کے لئے لکھئے :- **ٹرنر ماریسن ۔ اینڈ کمپنی لمیٹیڈ ۱۶ بنک اسٹریٹ ۔ بمبئی**

پاتال پانی

مہر کی برہم مزاجی سے فضا سہمی ہوئی
جابجا خود رو درختوں میں ہوا ٹھٹھکی ہوئی

حبس کی شدت سے خوں کھولا ہوا خاشاک کا
دُودِ نادیدہ سے دم گھٹتا ہوا ادراک کا

گردنیں ڈالے ہوئے جامن کی ننھی ڈالیاں
سر بہ سجدہ دھوپ کے قدموں پہ خود رو جھاڑیاں

جھاڑیوں کی جڑ میں گہرے سائے یوں سمٹے ہوئے
جیسے بچے سینۂ مادر سے ہوں چمٹے ہوئے

آگ اُگلتے پتھروں کے سامنے دوزخ بھی ماند
سانس کی دشمن پہاڑی گھاس کی کڑوی بساند

دل پہ دہشت کا تسلط ہوش پر توڑے ہوئے
گہری گہری کھائیوں میں موت منہ کھولے ہوئے

دوستوں کے ساتھ میں بھی راہ طے کرتا ہوا
چل رہا تھا اپنے دل سے مشورے کرتا ہوا

گدگداتا تھا خیالِ قربِ منزل پے بہ پے
اُٹھ رہی تھی دل کے گوشہ سے اک مدھم سی لے

کرتا جاتا تھا دلِ پرشوق سے کیا کیا سوال
چُپکے چپکے جلوۂ پاتال پانی کا خیال،

یوں تھی مجھ کو اپنے خاکی باغِ رضواں کی تلاش
چشم اسکندر کو جیسے آبِ حیواں کی تلاش

پے بہ پے چومی نگاہوں نے جبینِ آبشار
روح پر پڑنے لگی کیف و مسرت کی پھُوار،

سرمدی نغمے مے آسودگی میں گھل گئے
روح پر فردوس کے گویا دریچے کھل گئے،

یوں نگاہ و دل پہ اک خود رفتگی سی چھا گئی
بے بصر آنکھوں میں گویا روشنی سی چھا گئی

حلقۂ کہسار میں موجوں کی وہ رامشگری
جس طرح بھوتوں کی آبادی میں آنکلے پری

ڈوبتا جاتا تھا گر کر کنڈ میں یوں آبشار
کھنچ رہا ہو دروپدی کا جیسے آنچل بے کنار

عالمِ فانی میں آوارہ بہشتی جوئے شیر
یا شبِ تاریک کے سینے پہ نورانی لکیر،

اک حسیں چشمہ چٹانوں کے کنارے چومتا
ناچتا گاتا تھرکتا گنگناتا گھومتا،

حُسن والوں کو پیامِ ذوقِ رم دیتا ہوا
بہہ رہا تھا پتھروں کے دل کو نم دیتا ہوا

اُگ رہے تھے یوں چٹانوں کے شگافوں سے درخت
اتفاقاً جاگ اُٹھیں جیسے سیہ بختوں کے تخت،

میں یہ کہتا یہ دل صحرا کی تصویریں نہ ہوں
دشت کے سنسان خوابوں کی یہ تعبیریں نہ ہوں

آہ کیا کہئے مناظر کی ہمہ رنگی کا حال،
روبرو تھا ہر طرف فطرت کا بے پردہ جمال،

تھیں نمایاں حسنِ رنگارنگ کی رعنائیاں
یا تھیں رقصاں میرے احساسات کی پرچھائیاں

اے مرے اللہ میں بے ہوش تھا یا ہوش میں
نزہتوں کی پرورش اور کوہ کی آغوش میں!

ادیب سہارنپوری

لہ مالوے کا ایک دلکش آبشار -

باب الاستفسار

اسلام اور قانون وراثت

(م - صاحبہ - بھوپال)

معظمی مکرمی، آداب -

ازراہ نوازش میرے اس سوال کا جواب نگار میں مرحمت فرماکر مشکور فرمائیے - مجھ کو ایک مسلمان عورت کی حیثیت سے شاید یہ سوال نہ کرنا چاہئے لیکن تسکین قلب کے لئے کر رہی ہوں اکثر اصحاب سے معلوم کرنے کی کوشش کی مگر "مداخلت فی الدین" کہکر خاموش کر دیا گیا معلوم نہیں یہ چیز کس حد تک مداخلت فی الدین ہے امید ہے آپ یہ کہکر مجھ کو خاموش نہ کریں گے دوسرے یہ بھی نہ فرمائیں گے کہ کسی عالم سے دریافت کرو کیونکہ علماء کا سمجھانا میری سمجھ سے بالاتر ہوگا آپ کا جواب میرے لئے انتہائی ممنونیت کا باعث ہوگا -

(۱) زید اگر اپنے والدین کی حیات میں فوت ہوجاتا ہے تو اس کے بچوں و نیز بیوہ کو ترکہ پدری سے کوئی حصہ نہیں دیا جاتا بلکہ محروم قرار دئے جاتے ہیں زید کے والدین پر یا بھائیوں پر شاید شرعاً ان کی پرورش کی کوئی ذمہ داری عاید نہیں ہوتی -

(۲) دوسرا رخ یہ کہ زید اپنی قوت بازو سے کماتا ہے اور والدین کی حیات میں فوت ہوجاتا ہے لیکن خود صاحب اولاد رہنے کی حالت میں بھی اسکے باپ (دیگر) کو اسی دولت سے حصہ ملتا ہے یہ ٹھیک نہیں بتا سکتی کہ کس قدر پہونچتا ہے -

(۳) تیسرا رخ یہ کہ زید اگر اولاد ذکور نہیں چھوڑتا بلکہ ۲ - ۴ لڑکیاں ہوتی ہیں تو زید کے ترکہ پدری سے اور خود کی دولت سے زید کے بھائیوں کو حصہ حصہ کی صورت میں ملتا ہے جو شاید روپیہ میں چار آنہ کے حساب سے ہوتا ہے لیکن پرورش کی کوئی ذمہ داری عاید نہیں ہے -

اسلام میں ہر مسئلہ آیات قرآنی سے لیا گیا ہے تو بتائیے کہ یہ مسئلہ قرآن کریم کی کن آیات سے لیا گیا ہے اور جناب رسول خدا کے زمانہ کی کوئی ایسی مثال ہے - قرآن کریم میں جا بجا یتیموں کے ساتھ حسن سلوک کی سخت تاکید ہے تو سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسا سخت مسئلہ کس مصلحت کی بنا پر ہے -

---

(نگار) آپ کے استفسار کے کئی پہلو ہیں، ایک یہ کہ جو صورتیں آپ نے پیش کی ہیں ان میں اُصول وراثت کی رو سے کس کو کتنا ملنا چاہئے دوسرے یہ کہ آیا یہ اُصول وراثت درست بھی ہے یا نہیں، تیسرے یہ کہ قرآن کی کن آیات سے یہ اُصول مرتب کئے گئے ہیں اور چوتھے یہ کہ اگر ان اُصول سے یتیموں کے حقوق پر خراب اثر پڑتا ہے، تو کیوں انھیں قابل قبول سمجھا جائے -

عہد رسالت سے قبل، عرب میں کوئی قانون وراثت نہ پایا جاتا تھا - وہاں تو استحقاق نام تھا صرف نیزہ و شمشیر کا اور اسی لئے ایک بہادر باپ کے بہادر بیٹے کے علاوہ ترکہ کا کوئی مستحق نہ سمجھا جاتا تھا اور اس طرح چھوٹے بچے اور عورتیں قطعاً محروم رہتی تھیں -

چونکہ بانی اسلام معاشرت کی اصلاح کے سلسلہ میں عورت کی پوزیشن کو بھی بلند کرنا چاہتے تھے، اس لئے انھوں نے ضروری سمجھا کہ وراثت میں عورت کو بھی نمایاں جگہ دیجائے اور یہ حد درجہ ضروری، برمحل و مفید اقدام تھا -

اگر آپ سورۂ نساء کی اُن آیات کا مطالعہ کریں گی جن میں اُصول وراثت کو ظاہر کیا گیا ہے تو آپ کو ماننا پڑے گا کہ ترکہ کی کوئی صورت ایسی نہیں ہے

جس میں عورت کو استفادہ کا حق نہ دیا گیا ہو۔ البتہ آپ یہ اعتراض کرسکتی ہیں کہ اولاد نرینہ کو بہ نسبت لڑکیوں کے کیوں زیادہ حصہ ملتا ہے، لیکن یہ اعتراض صحیح نہ ہوگا کیونکہ لڑکیوں کا حق شوہروں کے ترکہ میں بھی ہوتا ہے اور اس طرح یہ کمی پوری ہوجاتی ہے۔

ہرچند میں یہ نہیں کہ سکتا کہ جو قانون اب سے تیرہ سو سال پہلے، عربوں کی معاشرت و زندگی کو سامنے رکھ کر مرتب کیا گیا تھا، وہ اس وقت بھی ہر ملک کے مسلمانوں کے لئے مفید و کار آمد ہو سکتا ہے، کیونکہ قانون کو ہمیشہ وقت و ماحول کے لحاظ سے بدلنا چاہئے اور اس میں اتنی لچک پائی جانا ضروری ہے لیکن یہ ماننا پڑے گا کہ جس زمانہ میں وراثت کا یہ قانون پیش کیا گیا تھا اُس وقت کے لئے یہ نہایت موزوں قانون تھا اور اگر ہم آیات قرآنی سے مستنبط ہونے والے اس اُصول کو سامنے رکھیں کہ مسئلۂ وراثت میں عورت کو کبھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، تو ہم کہ سکتے ہیں کہ اس باب میں قرآن کا فیصلہ اُصول کے لحاظ سے ایسا فیصلہ ہے جس میں اب کسی تغیر کی گنجائش نہیں۔

ظاہر ہے کہ قرآن کی چند آیات میں وراثت کی تمام ممکن صورتیں پیش نہ کی جا سکتی تھیں، اس لئے بعد کو روایات و اجتہاد سے بھی کام لیا گیا، یہاں تک کہ رفتہ رفتہ یہ ایک مستقل علم ہوگیا۔ اب میں آپ کی ظاہر کی ہوئی صورتوں کو سامنے رکھ کر اپنی رائے پیش کرتا ہوں:-

۱- آپ کا پہلا استفسار واضح نہیں ہے۔ آپ فرماتی ہیں کہ زید اگر اپنے والدین کی حیات میں فوت ہوجاتا ہے تو اس کے بچوں و نیز بیوہ کو ترکۂ پدری میں کچھ نہیں ملتا" ترکۂ پدری سے آپ کی کیا مراد ہے۔ اگر اس سے مراد فوت ہونے والے کا ترکہ ہے تو اسکا ایک حصہ یقیناً اس کی اولاد کو بھی ملے گا لیکن اگر ترکۂ پدری سے زید کے باپ کا ترکہ ہے تو بیشک اس کی اولاد محجوب الارث سمجھی جائے گی۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ اُصول صرف اس لئے مقرر کیا گیا تھا کہ joint-family system کو دور کیا جائے، اور ہر شخص میں خود اپنی قوت بازو سے کمانے اور اپنی اولاد کی پرورش کرنے کا جذبہ پیدا کیا جائے۔ اگر ایک شخص بیوی اور اولاد رکھنے کے باوجود اپنے باپ کی جایداد پر بھروسہ رکھتا ہے تو یہ اس کی غلطی ہے اور باپ کی ملکیت سے اس کی اولاد کو محروم رکھنے کی وجہ یہی ہوسکتی ہے کہ یہ غلط اعتماد لوگوں کے دلوں سے دور کیا جائے۔

رہا مرنے والے کے یتیم بچوں کی پرورش کا سوال سو اس کا تعلق ترکہ سے نہیں بلکہ یتامیٰ کی پرورش سے ہے اور اس فرض کو قوم پورا کرے گی۔

۲- اگر زید کی وفات کے بعد اس کی جایداد کا کچھ حصہ اس کے باپ کو بھی ملتا ہے تو ملنا چاہئے، کیونکہ اس کی پرورش اور تعلیم و تربیت پر جو کچھ اسکے باپ نے صرف کیا ہے اس کا معاوضہ کچھ تو ہونا چاہئے۔

۳- آپ کا تیسرا استفسار بہت مبہم ہے۔ تاہم اتنا سمجھ میں آتا ہے کہ ایک بھائی کے ترکہ میں دوسرے بھائی کا شریک ہونا آپ کے نزدیک قابل اعتراض ہے۔ لیکن آپ نے غور نہیں کیا کہ اس میں فایدہ سبھی کا ہے۔ فرض کیجئے اگر زید کی جگہ اس کا دوسرا بھائی مرتا تو کیا زید اور اس کی اولاد یہ فایدہ نہ اُٹھاتی۔

آپ کے ان استفسارات سے میں اس نتیجہ پر پہونچا ہوں کہ کوئی خاص صورت آپ کے سامنے ہے اور چونکہ اس میں کچھ حق تلفیاں ہورہی ہیں اس لئے آپ سرے سے اُصولِ وراثت ہی کو قابلِ اعتراض سمجھتی ہیں، حالانکہ اعزہ میں باہمی ہمدردی و تعاون کا مسئلہ اس سے بالکل علٰحدہ ایک ایسا مسئلہ ہے جو قانونِ وراثت و ترکہ سے کوئی تعلق نہیں رکھتا اور اگر کوئی شخص فطرتاً ایسا ہے جو اپنے خاندان کی بیواؤں اور یتیموں سے ہمدردی نہیں رکھتا تو اس کی پاداش کے لئے قانون وراثت تو بدلا نہیں جا سکتا، البتہ سوسائٹی اس کو سزا دے سکتی ہے۔

یاد رکھئے کہ انفرادی غلطیوں و ناحق کوشیوں کو آج تک نہ کوئی مذہب دور کرسکا نہ کوئی قانون، اس لئے دُنیا کی یہ سوگواریاں یونہی رہیں گی اور انھیں پر شاید کارزارِ حیات کی رونق موقوف ہے۔

تذکرۂ معرکۂ سخن

اپنے رنگ کا بالکل پہلا تذکرہ جس میں بتایا گیا ہے کہ بڑے بڑے اساتذہ کے کلام پر کیا کیا اعتراض کئے اور یہ کہ ان کا کوئی جواب ہو سکتا ہے یا نہیں، یہ تذکرہ انتہائی کاوش کے بعد مرتب کیا گیا ہے اور فن شعر کے متعلق بے بہا معلومات کا ذخیرہ ہے۔ قیمت علاوہ محصول دو روپیہ آٹھ آنے (عہ) **مینجر نگار**

جنونِ محبت

اسی درد ہوں مجھ کو نہ آزماؤ تم

یہ آسماں - یہ کہر - یہ نکھار - یہ جنگل، یہ چاندنی - یہ لطافت - یہ نقرئی بادل
یہ سبزہ زار - یہ پھولوں کی دلنشیں جدول یہ ہنس راج - یہ بگلے - یہ بط - یہ گنگا جل

ستا رہے ہیں مجھے ان کو اب ستاؤ تم

نشاط و رنگ میں ڈوبا ہوا گلستاں ہے ہوا نہیں ہے یہ - مطرب کوئی غزلخواں ہے،
پہاڑیوں پہ خمِ زلفِ ماہِ تاباں ہے یہ کہکشاں ہے کہ اک موجِ آبِ حیواں ہے

برس رہی ہے محبت چلے بھی آؤ تم،

کبھی ہواؤں کا جھونکا جو چھیڑ کرتا ہے مزاجِ عشق پہ اک حادثہ گزرتا ہے
دلِ شکستہ مرا سسکیاں سی بھرتا ہے یہ نامراد، نہ جیتا ہے اور نہ مرتا ہے،

حجابِ ناز میں چھپ کر نہ مسکراؤ تم

غرض ہو صبحِ طرب یا ہو شامِ میخانہ سرودِ ہوش ہو یا ہاے و ہوے دیوانہ
چمن کا شور ہو یا ہو سکوتِ ویرانہ نواحِ صومعہ ہو یا جوارِ بُت خانہ

کہیں قرار نہیں ہے اب آ بھی جاؤ تم

ستم نصیب ہوں غم سے نباہ کر لوں گا ہر ایک سانس کو میں اپنی آہ کر لوں گا
یہ ننگِ عشق ہے لیکن گناہ کر لوں گا تمہارے دھیان میں سب کچھ تباہ کر لوں گا

یہ دل ہے - درد کی دُنیا یہاں بساؤ تم

کاوش حیدرآبادی

تمثیل

دنیا کی بہاروں سے آنکھیں یوں پھیریں جانے والے جیسے کوئی لمبے قصے کو پڑھتے پڑھتے اُکتا جائے
جب دل ہی نہ کوئی تھام سکا پھر عشق کا رونا کون سُنے کس نے یہ کہا تھا تنکے سے وہ بجلی سے ٹکرا جائے
اک آس جو دل کی ٹوٹ گئی پھر دل کی خوشی باقی نہ رہی جیسے کہ اندھیرے گھر کا دیا گل ہو تو اندھیرا چھا جائے
بچپن کے نرالے کھیلوں میں اس طرح جوانی آتی ہے جیسے کہ اچانک البم کا رنگین ورق اُلٹا جائے
امید کی جانب جب انساں بڑھتا ہے تو یوں سہما سہما جیسے کہ پہاڑی پر کوئی چڑھتا جائے ڈرتا جائے
کنگھے سے گھنیری زلفوں میں یوں لہریں اُٹھتی جاتی ہیں جیسے کہ دھندلکا سا دن کا بڑھتا جائے بڑھتا جائے
آنکھوں کی سفیدی میں ایسے ہلکے سے گلابی ڈورے ہیں جیسے کوئی دودھ اور سے لے کر ان نینوں میں ٹپکا جائے

دل ہے کہ نشور اک باجا ہے سینے کے اندر تاروں کا
جب چوٹ پڑے جھنکار اُٹھے جب ٹھیس لگے تھرا جائے

نشور واحدی

غزل

جہاں بجلیاں گر رہی ہوں وہیں پر نشیمن بنانے کو جی چاہتا ہے
یہ پُر پیچ راہیں! یہ منزل کی وسعت! قدم اب بڑھانے کو جی چاہتا ہے
جہاں صرف دو دل دھڑکتے ہوں پیہم وہ دُنیا بسانے کو جی چاہتا ہے

علی سجاد قہر

کشکول

انسان خدا

انسان کوشش سے خدا بن سکے یا نہ بن سکے، لیکن اس کے پیدائشی خدا ہونے کی مثال ہمیں اس دُنیا میں ملجاتی ہیں، چنانچہ جاپان کا بادشاہ اسی قسم کا خدا ہے اور کروروں جاپانی اس کی عظمت و پرستش یہی سمجھ کر کرتے ہیں۔

جاپانی فوجیں جس وقت سنگاپور، ملایا اور فلپائن میں مصروفِ جنگ تھیں، اس وقت بھی وہ صبح شام دو منٹ کے لئے اپنا سر جاپان کی طرف رُخ کرکے جھکا دیتی تھیں تاکہ بادشاہ کی پرستش ناغہ نہ ہو۔

موجودہ جاپانی بادشاہ کا نام ہیروہٹو (Hirohito) ہے، اس کی عمر ۴۰ سال کی ہے اور ہر وقت محل کے اندر رہتا ہے۔ لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ وہ دنیا اور اس کے حالات سے بے خبر ہے۔ اس نے یوروپ کی سیاحت کی ہے اور وہ مغربی سیاست کا بھی ماہر ہے۔

جو کچھ حکومت کی طرف سے اسے ملتا ہے، اس کے علاوہ اس کے ذاتی ذرائع آمدنی اتنے وسیع ہیں کہ شاید ہی دُنیا کا کوئی شخص اس کا مقابلہ کر سکے۔ کہا جاتا ہے کہ جاپان کے شاہی خاندان امریکہ کے بڑے بڑے دولتمند لوگوں سے زیادہ مالدار ہے۔ جاپان کا بادشاہ، ملک کے تمام جنگل کا مالک ہے اور اس کی تمام آمدنی اسی کو ملتی ہے، علاوہ اس کے اس کی ذاتی ملکیت کی قیمت کا اندازہ ساڑھے چھ کرور پونڈ کیا جاتا ہے۔ سوا کرور پونڈ کے قریب سرمایہ کاروبار میں بھی لگا ہوا ہے اور اس وقت جاپان کا کوئی بڑا کاروبار ایسا نہیں جس میں بادشاہ کا روپیہ نہ لگا ہو۔

یہ شوا (Showa) خاندان کا ایک سو چوبیسواں بادشاہ ہے۔ جاپان کے بادشاہوں کا اصلی نام مشہور نہیں ہوتا، بلکہ جو تخت نشینی کے بعد وہ خود ایک نام اختیار کرتا ہے اور اسی کے نام سے وہ مشہور ہوتا ہے۔ چنانچہ موجودہ بادشاہ بھی اپنے اصلی نام سے نہیں بلکہ شوا کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس کے عادات بالکل امریکن ہیں۔ یہ پہلے مغربی لباس میں رہتا تھا اور گاف بھی کھیلتا تھا، لیکن یہاں کے مدبرین نے اس کو سمجھایا کہ وہ اپنا قومی لباس ہی اختیار کرے کیونکہ دیوتاؤں کے لئے وہی مناسب ہے۔

ناشتہ میں وہ نارنگی کا عرق، قہوہ اور سُور کا گوشت جو امریکہ کا طیار کیا ہوا ہوتا ہے، استعمال کرتا ہے۔ لیکن کھانا وہی مچھلی چاول ہے جس کی طیاری اس کی ملکہ نگاکو کی نگرانی میں ہوتی ہے۔ شاہی خاندان بہت بڑا ہے اور ولی عہد کی عمر ۹ سال کی ہے جو انگریزی بھی بول سکتا ہے۔ وہاں کا قاعدہ ہے کہ ولی عہد تین سال کی عمر ہی میں والدین سے علحدہ کرکے دوسرے مکان میں رکھا جاتا ہے، چنانچہ یہ بھی اپنے تمام اسٹاف کے ساتھ ٹوکیو کے ایک قصر رومیا میں ماں باپ سے علحدہ رہتا ہے۔

جاپان کا موجودہ بادشاہ انگریزی بھی خوب جانتا ہے اور ادبی ذوق بھی رکھتا ہے، چنانچہ اس کی نظموں کا ایک مجموعہ ہے جو چھاپا تو نہیں جا سکتا کیونکہ خدا کے الفاظ کو چھاپنا اس کی توہین ہے، لیکن لوگوں کو زبانی یاد ہے اور اس سے رجز خوانی کا کام لیا جاتا ہے۔

جب سے لڑائی شروع ہوئی ہے اس نے مغربی لباس بالکل ترک کر دیا ہے، قومی لباس پہنتا ہے جو روز کے روز اُتار دیا جاتا ہے اور درباریوں میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ آغاز جنگ سے وہ باہر پبلک میں بھی نہیں آیا، اسکی بڑی وجہ یہ ہے کہ لوگ بادشاہ کے چہرہ کی طرف نگاہ اُٹھا کر نہیں دیکھ سکتے اور اس صورت میں باہر نکلنا نہ نکلنا برابر ہے۔ جب کبھی وہ باہر نکلتا ہے تو پہلے وہاں کی پولیس تمام راستوں پر یہ انتظام کرتی ہے کہ لوگوں کی آمد و رفت روک دی جائے اور مکانوں کی کھڑکیاں تک بند کر دی جائیں۔ وہاں فوجی پولیس کے ہیڈ کوارٹر کے لئے ایک بلند تعمیر تجویز ہوئی جس میں ایک بہت اونچا برج بھی بننا تھا تاکہ وہاں سے سرچ لائٹ سارے شہر پر ڈالی جا سکے۔ لیکن یہ عمارت ناتمام رہی صرف اس وجہ سے کہ اس برج سے

شاہی محلات کے اندر کا بھی نظارہ ممکن تھا۔

پانچ منٹ میں خاک سے پاک

۱۷۱۵ء کی بات ہے۔ پیٹر اعظم روس کا حکمراں ہے اور سنٹ پیٹرسبرگ کے قصر شاہی کے دروازہ پر ایک سنتری پہرا دے رہا ہے۔ دفعتاً وزیر اعظم شاہزادہ منسچکوف آتا ہے اور اندر جانا چاہتا ہے۔ سنتری عرض کرتا ہے کہ "جہاں پناہ کا حکم نہیں ہے کہ کوئی شخص اندر جائے، اس لئے میں مجبور ہوں اور آپ کے لئے دروازہ نہیں کھول سکتا"

منسچکوف: "بیوقوف، کیا تجھے نہیں معلوم کہ میں بادشاہ کا وزیر اعظم ہوں اور میرے لئے کوئی ممانعت نہیں ہے"۔

سنتری: "میں جانتا ہوں کہ جناب وزیر اعظم ہیں، لیکن مجھے جو حکم دیا گیا ہے وہ عام ہے اور میں اس کی تعمیل کروں گا"۔

وزیر اعظم کو غصہ آگیا اور اس نے سنتری کے چہرہ پر کوڑا مارتے ہوئے کہا کہ "ہٹ سامنے سے"

سنتری بولا کہ "آپ جتنا چاہے مارئے، لیکن میں نہ جانے دوں گا"

اس پر وزیر نے لگاتار اس کے چہرہ پر کوڑے مارنے شروع کئے، یہاں تک کہ خود بادشاہ دروازہ کھول کر باہر گیا۔ دیکھا کہ وزیر غصہ سے بھرا ہوا کوڑے مار رہا ہے اور سنتری کا چہرہ لہولہان ہے۔

بادشاہ نے سنتری کا نام پوچھکر حکم دیا کہ "تم کسی اور سپاہی کو چارج دیکر اپنا منہ پانی سے صاف کرو" اور وزیر کو اندر بلا کرلے گیا۔

اسی دن شام کو وہ سنتری زار کے حضور میں طلب کیا گیا جہاں وزیر بھی بیٹھا ہوا تھا۔ بادشاہ نے سنتری سے کہا "آج صبح اس آدمی نے تمھیں کوڑے سے مارا ہے اس حال میں کہ تم اپنی ڈیوٹی انجام دے رہے تھے۔ اس لئے یہ کوڑا لو اور تم بھی مارو"

وزیر بولا کہ: "لیکن یہ معمولی سپاہی مجھے کیونکر مار سکتا ہے"

بادشاہ نے کہا کہ "میں اس کو کپتان کا عہدہ دیتا ہوں"

وزیر: "لیکن میں تو شاہی محافظ فوج کا بھی افسر ہوں"

بادشاہ: "اگر ایسا ہے تو میں اسے باڈی گارڈ میں کرنل کے عہدہ پر ترقی دیتا ہوں"

وزیر: "لیکن میرا عہدہ تو جنرل کا ہے"

بادشاہ: "تو میں اسے بھی جنرل بنائے دیتا ہوں، تاکہ تمھیں یہ شکایت نہ ہو کہ کسی ادنیٰ آدمی نے تمھیں مارا"

یہ کہکر بادشاہ نے سنتری سے مخاطب ہوکر کہا کہ "اے جنرل کونٹ اورنیاف، یہ کوڑا لو اور اپنا کام کرو"

اس نے تعمیل حکم کی اور دوسرے دن وہ کونٹ بنا دیا گیا اور روس کے ایک بڑے ذی اثر خاندان کا مورث اعلیٰ ثابت ہوا۔

لوہے کا دل

انسانی تعمیر میں دل و دماغ دو ہی چیزیں ایسی ہیں جو بہت زیادہ نازک سمجھی جاتی ہیں اور جن کی شکایت کا علاج واقعی بہت مشکل ہے۔ جراحی نے اس حد تک تو ترقی کرلی ہے کہ اگر دل یا اس کی جھلی کو زخم پہونچ جائے تو ٹانکہ دیکر اسے درست کرلیتے ہیں، لیکن دل کے اندر اس کے valves میں اگر کوئی خرابی پیدا ہوجائے تو اس کا علاج دشوار ہے، کیونکہ یہ ہر وقت حرکت کرتے رہتے ہیں اور اگر ان کی حرکت کو بند کرکے عمل جراحی کیا جائے تو انسان ختم ہوجاتا ہے۔ اس دشواری کو دیکھ کر امریکہ کے ایک ڈاکٹر نے سوچا کہ اگر کوئی مصنوعی دل ایسا بنایا جاسکے جو کچھ دیر کے لئے اصلی دل کا کام دے سکے تو جراحی کے لئے کافی وقت مل سکتا ہے۔ چنانچہ اس نے اس غرض کے لئے لوہے کا دل اور پھیپھڑا طیار کیا ہے جو بیس منٹ تک خون کے دوران کو جسم میں قایم رکھ سکتا ہے۔

اس مصنوعی دل کے لگانے سے اصلی دل تھوڑی دیر کے لئے معطل ہوجاتا ہے اور اس عرصہ میں عمل جراحی آسانی سے ہوسکتا ہے۔ ایک بیماری ہے جس میں خون کا ذرہ عروق میں کسی جگہ پھنسکر رہ جاتا ہے اور دوران خون بند ہوجانے سے موت واقع ہوجاتی ہے۔ اس بیماری کے علاج کے لئے یہ مصنوعی دل اور پھیپھڑا بہت مفید ثابت ہوگا، کیونکہ جب اس قسم کی شکایت پیدا ہوگی تو فوراً یہ مصنوعی دل لگاکر اصلی دل کو ساکن کردیا جائیگا اور جراحی ہوجائے گی۔

مطبوعات موصولہ

قرآن مجید و نظام شمسی میاں محمد اسماعیل صاحب نے اس ایک جزو کے رسالہ میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ موجودہ ہیئت کا نظام شمسی، قرآن کی بعض صراحتوں سے باہر نہیں ہے — اول تو نظام شمسی ایسی بسیط بحث پر صرف ایک جزو کے رسالہ کو کافی سمجھنا، یہی بڑی غلطی ہے اور اس پر طرہ یہ کہ قرآن سے بھی اسے ثابت کیا جاتا ہے۔ اس قسم کی غلطی اکثر ان حضرات سے صادر ہوتی ہے جو مذہب و عقل کی تطبیق میں حد سے گزر جاتے ہیں۔

اول تو قرآن کوئی ہیئت کی کتاب نہیں کہ ہم اس میں نظام شمسی کی بحث تلاش کریں اور اگر کہیں کہیں بعض مبہم اشارات اس میں پائے جاتے ہیں تو ان کو علمی حیثیت دینا درست نہیں۔ کیونکہ ہیئت ہو یا کوئی اور علم ابھی تک تکمیل کو نہیں پہونچے اور کون کہہ سکتا ہے کہ انسان کی آئندہ کاوش و جستجو موجودہ نظریوں کے خلاف اور کیا کیا نظریے پیش کرنے والی ہے۔ پھر کیا اُس وقت قرآن کی آیتوں کی دوبارہ توجیہ کیجائے گی — قرآن صرف اخلاق و معاشرت کی اصلاح کے لئے نازل ہوا تھا اور ہمیں اخلاقی تعلیم ہی کی جستجو کرنا چاہئے علمی بحثوں سے اسے کوئی واسطہ نہیں۔ یہ رسالہ ۳ر میں بیت الکریم چوک مرینہ باغبان پورہ لاہور سے ملسکتا ہے۔

انسان اور تورات یہ بھی میاں محمد اسماعیل صاحب کا رسالہ ہے جس میں انھوں نے قرآن سے یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ تخلیق کی ابتدا ایک عورت سے ہوئی اس کے بطن سے ایک مرد پیدا ہوا اور پھر نسل انسان کا یہ سلسلہ عرصہ تک ارتقائی مدارج طے کرتا ہوا حضرت آدم تک پہونچا جن کی اولاد کو خلیفۃ اللہ فی الارض کہتے ہیں۔ گویا تورات کی اس روایت سے اختلاف کیا گیا ہے جو تخلیق آدم سے متعلق ہے اور جسے مسلم مفسرین نے بھی بیان کیا ہے۔ میاں صاحب کو اس کوشش کے سلسلہ میں قرآن کی بعض آیتوں کے ترجمے بھی کچھ اور کرنے پڑے ہیں جو کہیں کہیں نامناسب تاویل کی حد تک پہونچ گئے ہیں۔ یہ کوشش بھی مذہب و علم کی تطبیق کے سلسلہ کی چیز ہے یہ رسالہ صرف ایک آنہ میں ملسکتا ہے۔

لالہ زار جناب محمودہ رضویہ کے بعض ادبی مقالات کا مجموعہ ہے جسے آصف جاہ درانی ایم۔ اے نے مرتب کیا ہے۔ اس سے قبل ان کے پہلے مجموعۂ "دُر دانہ" پر جو اظہار خیال کر چکا ہوں وہ "لالہ زار" کے مقالات پر بھی صادق آتا ہے۔ اس پر صحیح نقد تو اس وقت ہو سکتا تھا جب ان مقالات کے مطالعہ کے بعد فاضل ادیبہ کی ادبی زندگی کے اصلی سررشتہ کو ڈھونڈھا جاتا، لیکن چونکہ اس جسارت کے لئے وقت و اجازت دونوں کی ضرورت ہے، اس لئے سوائے اس کے کہ ایک مشاعرہ کی غزل کی طرح اسکی داد دیکر سکوت اختیار کیا جائے اور کیا ہو سکتا ہے۔ تاہم اگر کبھی موقعہ ملا تو میں ان سے پوچھوں گا کہ یہ مقالے انھوں نے کیوں اور کس تحریک سے متاثر ہو کر لکھے اور مشورہ دوں گا کہ دوسرے اڈیشن میں وہ اس بیان کو بھی شامل کر دیں۔ قیمت ایک روپیہ۔ ملنے کا پتہ انجمن ترقی اُردو کراچی۔

تاریخ ادب ہندی سید ظہیر الدین احمد علوی ام۔ اے (شعبہ اُردو مسلم یونیورسٹی علیگڈھ) کی تالیف ہے۔ اس میں ہندی ادب کے مختلف دور قایم کر کے ہر دور کی تاریخ لکھی گئی ہے اور مشہور ہندی ادیبوں، شاعروں کے کلام کے نمونے بھی دئے گئے ہیں۔ اخیر میں موجودہ ہندی اداروں کا بھی حال درج کیا ہے۔

کتاب بہ لحاظ معلومات اچھی ہے اور خاصکر ان طلبہ کے لئے جو اُردو میں ام۔ اے کرنا چاہتے ہیں بہت زیادہ مفید ہے کیونکہ انھیں ایک پرچہ ہندی کا بھی کرنا پڑتا ہے۔ قیمت دو روپیہ۔ ملنے کا پتہ: لالہ رام نرائن لال کتب فروش الہ آباد

چراغ لالہ پنجاب کے ایک بست سالہ نوجوان صائب عاصمی کی غزلوں اور نظموں کا مجموعہ ہے، ابتدا میں اس نوجوان شاعر نے اپنے حالات بھی لکھے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ حد درجہ نامساعدت حالات میں ان کی شاعری کی ابتدا ہوئی لیکن میں دیکھتا ہوں کہ شاید یہی نامساعدت اسکی ترقی کا باعث ہوئی — یقیناً کلام میں وہ پختگی نہیں ہے جو کافی مشق کے بعد ہی پیدا ہو سکتی ہے، لیکن پھر بھی جو کچھ اس مجموعہ میں نظر آتا ہے وہ اتنے کمسن شاعر کی طرف سے یقیناً حیرتناک ہے — یقین ہے کہ سرزمین پنجاب اپنے اس جوہر کی قدر کرے گی اور اگر عاصمی صاحب برا نہ مانیں تو میں انھیں مشورہ دوں گا کہ وہ فنی حیثیت سے بھی اپنے اکتسابات کو جاری رکھیں — خیال کے حُسن کے ساتھ اگر ذریعۂ اظہار بھی بے عیب ہو تو لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔

یہ مجموعہ ایک روپیہ آٹھ آنہ میں مصنف سے معرفت عطر چند کپور چند میکلوڈ روڈ لاہور سے ملسکتا ہے۔

(بہ سلسلہ صفحہ نمبر ۲) روس نے اسوقت تک جس جرأت و پامردی کے ساتھ نازی فوجوں کا مقابلہ کیا ہے، اس نے یہ بات اصولاً طے کردی ہے کہ اگر روس کو جرمنی کے خلاف کامیابی نہیں ہوسکتی تو جرمنی بھی روس کو فتح نہیں کرسکتا، اور روسی آبادی کی ہلاکت سے روسی روح فنا نہیں ہوسکتی، اور جب تک رعایا کی روح راعی کے ساتھ نہ ہو، ابکسی کی حکمرانی دنیا میں قایم نہیں رہ سکتی۔ یہ تو ہوا جنگ کا اخلاقی پہلو جو نہ صرف جرمنی بلکہ ہراس قوم و حکومت کی مخالفت میں پیش کیا جاسکتا ہے جو جرمنی ہی کی طرح تسلط قایم رکھنا چاہے۔ اب رہا مادی پہلو سو اسکا توازن البتہ عارضی طور سے ناکامی وکامیابی پر اثر انداز ہوسکتا ہے اور وہ فی الحال بالکل مساوی نظر آتا ہے

جرمنی کا تسلط اسوقت ناروے سے لیکر یونان تک اور سواحل فرانس سے لیکر سواحل بحر کاسپین تک کم وبیش ہر جگہ نظر آتا ہے اور یہ حصۂ زمین اپنی زرعی، صناعتی اور معدنی پیداوار کے لحاظ سے اتنا بڑا اور اہم حصہ ہے کہ اگر خود جرمنی کے اندر کوئی انقلاب نہ پیدا ہو تو وہ عرصہ تک ان ذرایع کی مدد سے لڑائی جاری رکھنے میں کامیاب ہوسکتا ہے۔ دوسری طرف برطانیہ و امریکہ کی طیاریوں کو دیکھئے تو ان کی وسعت و ترقی میں روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے اور جو اعداد و شمار اس وقت تک معلوم ہوئے ہیں اُن سے پتہ چلتا ہے کہ سال آیندہ تک وہ غالباً اس قابل ہوجائیں گے کہ نازیوں کے خلاف جارحانہ اقدام عمل میں لاسکیں، اس لئے مادی نقطۂ نظر سے بھی فی الحال اس جنگ کے اختتام کی کوئی توقع نہیں ہوسکتی۔ اب رہا اس دوران میں بعض ایسی پیچیدگیوں کا پیدا ہوجانا جو فریقین میں سے کسی ایک کو جنگ ختم کردینے پر مجبور کردیں، سو ان کا امکان البتہ ہر وقت پایا جاتا ہے اور اگر اس لڑائی کی عمر کو کسی چیز نے مختصر کیا تو وہ یہی پیچیدگیاں ہوں گی جن کا تعلق ملکوں کی داخلی و خارجی سیاست دونوں سے ہوسکتا ہے — اگر جرمنی اسٹالن گراڈ قفقاز اور بحر اسود کے تمام ساحلی مقامات فتح کرنے میں کامیاب ہوگیا جو بعید از امکان نہیں، تو ایک بڑی اُلجھن روس کی اس بحری قوت سے متعلق ہوگی جو بحر اسود میں پائی جاتی ہے ظاہر ہے کہ روس کے بحری جہاز بحر اسود میں قیام نہ کرسکیں گے اور سمندر چھوڑ کر انھیں باہر جانا پڑے گا۔ پھر چونکہ اُن کے باہر جانے کا راستہ سوائے آبنائے باسفورس اور درۂ دانیال کے کوئی اور نہیں ہوسکتا، اس لئے جرمنی، ترکی کو مجبور کرے گا کہ وہ یہ راستہ روسی جہازوں کے لئے بند کردے اور ہوسکتا ہے کہ اس وقت ترکی کو بھی کسی نہ کسی فریق کے ساتھ ہوکر میدان میں آنا پڑے — فی الحال یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ ترکی کس فریق کا ساتھ دے گا، کیونکہ اسے دونوں ہی سے ڈر ہے۔ اگر وہ جرمنی کے خلاف فیصلہ کرتا ہے تو بلغاریا کی طرف سے جرمن فوجیں آسانی کے ساتھ اس پر حملہ کرسکتی ہیں جن کا مقابلہ اسکے لئے ممکن نہیں اور اگر وہ برطانیہ کے خلاف قدم اُٹھاتا ہے تو اس کی جنوبی سرحد اور مشرق ادنیٰ میں پھیلی ہوئی اتحادی فوجیں اسپر حملہ کردیں گی اور ظاہر ہے کہ وہ ان کا بھی مقابلہ نہیں کرسکتا — اس میں شک نہیں کہ برطانیہ کے ساتھ اس وقت تک ترکی کے تعلقات بہت دوستانہ ہیں اور ہوسکتا ہے کہ اسکا رجحان اتحادیوں کی طرف ہو، لیکن محض خواہش یا رجحان سے کچھ نہیں ہوتا اور بسا اوقات جان بوجھکر اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا پڑتا ہے اس لئے اگر یہ پیچیدگی پیدا ہوگئی تو اس کے نتیجہ کے متعلق فی الحال کوئی حکم نہیں لگایا جاسکتا، لیکن یقینی ہے کہ ایسی صورت میں لڑائی کا سارا زور مشرق قریب میں ہوجائے گا اور پھر ہم اسکی آگ سے نزدیک تر ہوجائیں گے — دوسری پیچیدگی پیدا ہونے کا اندیشہ ہمیں جاپان کی طرف سے ہے۔ یعنی اگر اسنے اس موسم سرما میں سائبیریا یا ہندوستان پر حملہ کردیا تو پھر یورپ میں دوسرا محاذ قایم کرنا سنہ ۴۳ء میں بھی اتحادیوں کے لئے آسان نہ ہوگا اور نازی حکومت کو طیاریاں کرنے اور مفتوحہ علاقوں پر تسلط مضبوط کرنے کا زیادہ موقعہ مل جائے گا جاپان کو جزائر سلیمان میں جو ناکامیاں ہوئی ہیں انھوں نے آسٹریلیا کے خلاف اسکے اقدام کو ضرور دشوار بنادیا ہے، لیکن سائبیریا اور ہندوستان پر حملہ کرنے کے امکانات بدستور باقی رہتے ہیں۔ اُس طرف منچوریا میں جاپانی فوجوں کا زبردست اجتماع اور اس طرف برما و سنگاپور پر اسکے تسلط سے دونوں کا امکان باقی رہتا ہے — سائبیریا پر حملہ ہونے کی صورت میں، امریکہ یہ ضرور کرسکتا ہے کہ ولاڈی واسٹک کی روسی بندرگاہ سے روس کو کمک پہونچاتا رہے اور ٹوکیو پر بھی فضائی تاخت کرتا رہے، لیکن منچوریا کی طرف سے یلغار کرنے والی جاپانی فوج کو اس طرح روکنا آسان نہ ہوگا، چین البتہ پشت کی طرف سے حملہ کرکے اس اقدام کو روک سکتا ہے لیکن وہ ایسا نہیں کرے گا کیونکہ اس صورت میں اسکا اصل محاذ کمزور ہوجائے گا اور برما کی طرف سے جاپانی فوجیں اسپر زیادہ کامیاب حملہ کرسکیں گی — رہ گیا ہندوستان سو اسپر اگر جاپان نے حملہ کیا تو اسکی ابتدا ہوائی حملوں سے ہوگی کیونکہ برما کے تمام ہوائی مرکز اس کے قبضہ میں ہیں اور اسکے جہاز آسانی سے مشرق ہند پر حملہ کرکے واپس جاسکتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ جاپان کی ہوائی طاقت اچھی نہیں ہے، لیکن برطانیہ کو مغرب کی طرف سے مشرق کی طرف متوجہ کرنے کے لئے یہ چھیڑ چھاڑ کافی ہوگی — یہ ہیں وہ تمام پیچیدگیاں جنکا نازی محور کے حق میں پیدا ہونا ممکن ہے، لیکن ان امکانات کے مقابلہ میں ایک یقینی بات اتحادیوں کے حق میں بڑی زبردست پائی جاتی ہے اور وہ قوت صبر و تحمل ہے یعنی لڑائی کے بار کو عرصہ تک برداشت کرنے اور تمام ناموافق حالات میں بھی مضبوطی کے ساتھ ڈٹے رہنے کی اہلیت ان میں بہت زیادہ ہے اور اس کا تعلق کیرکٹر کے علاوہ مادی اسباب سے بھی ہے۔ چین نے جاپان کے مقابلہ میں اور روس نے جرمنی کے خلاف جس قوت برداشت کا ثبوت دیا ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں، رہ گئے برطانیہ و امریکہ، سو انھوں نے اگر نازی قوت کو دنیا سے محو کرنے کا اخلاقی عہد نہ کیا ہوتا، تو بھی ان کی وسیع طیاریاں مادی حیثیت سے نازی قوت کے لئے اتنا زبردست خطرہ ہیں کہ سارا یورپ و ایشیا لے لینے کے بعد بھی محوری قوتوں کے پاس اسکا کوئی علاج نہیں — بہر حال جو صورتیں اسوقت پیدا ہیں انکو دیکھکر لڑائی کے جلد ختم ہوجانے کی توقع کسی طرح قایم نہیں کی جاسکتی اور ہم سمجھتے ہیں کہ آیندہ زمانہ اس سے بھی زیادہ سخت آنے والا ہے جسکو وہی قوم جھیل سکتی ہے جو اخلاق و اصول پر جان دینے کے لئے طیار ہو!

آیندہ جنوری کا نگار ریاض نمبر ہوگا

بزم اسیر و امیر کے آخری یادگار، ریاض خیرآبادی (مرحوم) کی شاعری سے کون واقف نہیں، لیکن اس زندہ دل ہستی کے ادب اُردو پر اور کتنے احسانات ہیں، اس سے کم لوگ آگاہ ہوں گے۔ نگار کے اس خاص نمبر میں آپ کو ریاض مرحوم کے لطائف شعر و سخن، ان کے خود نوشت سوانح حیات، نثر نگاری کے معیاری نمونے، ان کی شاعری کے مختلف پہلوؤں پر بسیط تبصرہ اور انتخاب کلام سبھی کچھ نظر آئے گا۔ ریاض مرحوم کی زندگی کا وہ زمانہ جب ان کے ریاض الاخبار اور فتنہ کی دھوم مچی ہوئی تھی، اب بالکل بھلایا جا چکا ہے، لیکن نگار کے اس نمبر میں اس کو پھر سامنے لایا جائے گا اور اُن لطیف صحبتوں کی یاد پھر تازہ کیجائے گی جو ریاض اور اُن کے زمانہ کے لئے مخصوص تھیں۔

اس نمبر میں ریاض کی تمام تصانیف کے سلسلہ میں ناول نظارہ کا بھی اقتباس دیا جائے گا جو اس وقت تک شایع نہیں ہو سکا۔ الغرض یہ نمبر ادبی دلچسپیوں کا نہایت عجیب و غریب مجموعہ ہوگا اور اس کی ضخامت نگار کی موجودہ ضخامت سے کم از کم تگنی ہوگی اور اگر کاغذ میسر آگیا تو شاید اس سے بھی زیادہ۔ حضرت ریاض کی تصویریں بھی دیجائے گی اور سرورق بھی نفیس کاغذ کا ہوگا۔

غیر خریداران نگار سے اس کی قیمت علاوہ محصول ڈاک ڈیڑھ روپیہ سے کم نہ ہوگی۔ لیکن خریداران نگار کو حسب دستور یہ نمبر ان کے سالانہ چندہ ہی میں دیا جائے گا۔

منیجر

کچھ "نگار" کے متعلق

نگار کا موجودہ حجم اور اس کا باریک خط صرف اسی وقت تک قایم رہے گا جب تک کاغذ نہیں مل رہا، لیکن جب یہ دشواری جاتی رہے گی تو نگار پھر اُسی کاغذ اور اسی سطر پر شایع ہوگا جو جنگ سے پہلے تھا اور سرورق بھی بہترین کاغذ کا علحدہ لگایا جائے گا اور ضخامت بھی بڑھ جائے گی۔

ہر چند مضامین کے لحاظ سے اب بھی نگار میں ۸۰ صفحات سے زیادہ کا مواد دیا جاتا ہے، لیکن خط باریک ہونے کی وجہ سے بعض حضرات کو دقت ہوتی ہے، جس کا ہمیں احساس ہے۔

ہر چند جو زمانہ آنے والا ہے اس میں کاغذ کی کمیابی، نایابی کی حد تک بڑھ جائے گی، لیکن آپ مطمئن رہئے، نگار بہرحال جاری رہے گا اور مضامین کے لحاظ سے اس میں کوئی کمی نہ ہوگی، گو ظاہری شکل و صورت اس کی اچھی نظر نہ آئے۔

نگار اہلِ نظر کا پرچہ ہے نہ کہ تماشائیوں کا اس لئے ہمیں امید ہے کہ قارئین نگار اس کی عارضی بدنمائی کی پروا نہ کریں گے۔

منیجر "نگار"

نگار

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

جلد ۵۷ | فہرست مضامین اپریل سنہ ۵۰ء | شمار- ۴

ملاحظات ---------- ۵
اقبال کا نظریۂ ارتقاء -- (پروفیسر) راجیندر ناتھ شیدا ام-اے ۹
روس کی پنج سالہ اسکیمیں -------- ۲۰
اردو شاعری میں گل و بلبل کے اشارے -- (ڈاکٹر) عبادت بریلوی ۲۹
انیس کی مرثیہ نگاری -- مرزا جعفر علی خاں اثر ---- ۳۸
جدید شاعری کا پس منظر -- بسم اللہ بیگم ----- ۴۶
کیا کیا نہ کیا - دولت کی خاطر! -- رشید احمد صدیقی ۵۴
باب الاسئلۃ والمناظرہ ------ ۶۰
ہمارے شاعر اور مشاعرے (نظم) -- پروفیسر شور ۶۳

ملاحظات

گوشت و ناخن کی جدائی

مشرقی و مغربی بنگال کے حالیہ واقعات نے بھارت اور پاکستان کی سیاسی فضا کو پھر غبار آلود کر دیا۔ اس سے قبل بھی دونوں طرف تناؤ تھا، لیکن کچھ دن سے ایسا محسوس ہو چلا تھا کہ شاید اس میں کچھ کمی پیدا ہو چلی ہے، اور لوگ امن و سکون کی صحیح قیمت کا اندازہ کرنے لگے ہیں، لیکن بنگال کے فسادات نے دونوں ملکوں کے تیور پھر بدل دئے ہیں اور انسانیت پھر خطرات میں گھری ہوئی نظر آتی ہے۔

دنیا میں جب کوئی تکلیف دہ واقعہ معمول سے ہٹا ہوا سامنے آتا ہے، تو قدرتاً ذہن انسانی اس کا سبب معلوم کرنے کی کوشش کرتا ہے اور اگر سبب کی صحیح تشخیص ہو جاتی ہے تو آئندہ کے لئے اس کا سدباب بھی ہو سکتا ہے، لیکن کم ایسا ہوتا ہے کہ اس کا حقیقی سبب دریافت ہو سکے اور اس سے بھی زیادہ کم یہ کہ اس سبب کے دور کرنے کا صحیح راستہ اختیار کیا جائے۔

پوچھئے کہ مشرقی بنگال میں کیوں فساد ہوا، تو اس کا جواب ملتا ہے کہ یہ ردِ عمل تھا مغربی بنگال کے فساد کا۔ جب مغربی بنگال والوں کے سامنے یہ سوال پیش کیا جاتا ہے تو وہ بھی یہی کہتے ہیں کہ یہ جواب تھا مشرقی بنگال کی بدامنی کا۔ انتقامی حدود سے ہٹ کر نہ غور کرتے ہیں نہ وہ اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ گتھی بجائے سلجھنے کے اور زیادہ الجھتی جاتی ہے۔

کتب خانہ انجمن ترقی اردو دہلی

ابتدا فساد کی اِدھر ہوئی ہو یا اُدھر، غور کرنے کی بات یہ ہے کہ ہوئی کیوں اور اسی سبب کو دور کرنے کی کوشش کرنا چاہئے اس سے انکار ممکن نہیں کہ نزاع کی اصل بنیاد صرف یہ ہے کہ ہندو مسلمانوں کے دل ایک دوسرے سے صاف نہیں ہیں نہ بھارت، باوجود غیر مذہبی جمہوریت ہونے کے مسلمانوں کو مطمئن کر سکی ہے، نہ پاکستان باوصف اسلامی روایات کے حامی ہونے کے ہندوؤں میں اعتماد و دلجمعی پیدا کر سکا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ یہ صرف "شائبۂ خوبیِ تقدیر" ہے یا اسکی ذمہ داری حکومتوں پر بھی عاید ہوتی ہے ؟

یہ بالکل درست ہے کہ عوامی حکومتیں جذبات عامہ کو نظر انداز کر کے اپنے آپ کو قایم نہیں رکھ سکتیں، لیکن یہ بھی غلط نہیں کہ جمہوری حکومتوں کا اولین فرض عوام کے جذبات کی روک تھام ہے۔ اگر کوئی برسرِ اقتدار جماعت اپنے نمایندوں کا انتخاب کر کے زمام حکومت ان کے ہاتھ میں سپرد کر دیتی ہے تو اس کے معنے صرف یہ ہیں کہ وہ بھی اپنے آپ کو قانون کا پابند بنا دیتی ہے اور اسے اس امر کا کوئی حق حاصل نہیں رہتا کہ وہ قانون اپنے ہاتھ میں لے۔ گویا بہ الفاظ دیگر وہ اس بات کا عہد کرتی ہے کہ اگر حکومت نے اسکی اصلاح یا ملک کی فلاح کے لئے کوئی راہ متعین کی تو وہ اس پر چلے گی اور بہ صورت انحراف حکومت کو تادیب و تعزیر کا بھی حق حاصل ہوگا۔ لیکن اس مقصد میں کامیابی اسی وقت ہو سکتی ہے، جب حکومت بھی اپنی جگہ یہ طے کرے کہ وہ اپنے قایم کئے ہوئے اصول سے کبھی منحرف نہ ہوگی اور عوام کے وقتی و ہنگامی یا غلط جذبات و مطالبات سے اپنے آپ کو متاثر نہ ہونے دیگی۔

اب آئیے اس اساسی اصول کو سامنے رکھ کر غور کریں کہ بھارت و پاکستان کی حکومتیں کس حد تک اس فرض کو پورا کر رہی ہیں۔ پاکستان نے ابھی تک اپنے غیر مذہبی حکومت ہونے کا اعلان نہیں کیا، لیکن اگر وہ واقعی اسلامی اصول حکومت کو سامنے رکھے، جیسا کہ اس کا دعویٰ ہے، تو اس پر غیر مذہبی حکومت سے زیادہ عدل و انصاف کی ذمہ داری عاید ہوتی ہے، اور اس ذمہ داری کو پورا کرنے پر وہ مذہباً مجبور ہے۔

اگر آج ہندوستان اپنے اصول عدل و انصاف کو ترک کر دے، تو وہ صرف بین الاقوامی عدالت کے سامنے جوابدہ ہوگا، لیکن پاکستان کو تو خدا کے سامنے جوابدہ ہونا پڑے گا، اور ان دونوں کا فرق ظاہر ہے۔

پاکستان کو سمجھنا چاہئے کہ اپنے آپ کو اسلامی حکومت کہدینا کوئی معمولی بات نہیں، کوئی معمولی دعویٰ نہیں، کوئی دنیاوی عہد و پیمان نہیں، جس کا تعلق صرف زبان سے ہو، بلکہ یہ عہد ہے جو اس نے خدا کے سامنے کیا ہے اور اس سے روگردانی، گویا خدا سے روگردانی کرنا ہے۔

پھر جو عہد خدا کے سامنے کیا جاتا ہے وہ تمام انسانی جذبات، تمام دنیاوی اغراض سے زیادہ بلند و مقدس ہوتا ہے اور اسکے توڑنے کے جواز میں کوئی دلیل پیش نہیں کی جا سکتی۔ اگر آج ہندوستان کی تمام مسلم آبادی فنا کر دیجائے تو بھی پاکستان کی اس ذمہ داری میں ذرہ برابر فرق نہیں ہوتا کہ وہ اپنے یہاں کی ہندو اقلیت کے امن و سکون کی ضامن ہے اور اگر وہاں کی پبلک حکومت کی اس پالیسی کے سامنے حایل ہوتی ہے تو پوری قوت کے ساتھ اس کا استیصال کرنا چاہئے۔ لیکن افسوس ہے کہ ہم یہ احساس

پاکستان کے ارکان حکومت میں بہت ضعیف پاتے ہیں - ہم یہ نہیں کہتے کہ بنگال میں جو زیادتیاں ہندو اقلیت پر ہوئی ہیں، وہ حکومت کی تحریک سے ہوئی ہیں یا حکومت انھیں اچھا سمجھتی ہے - لیکن اس کے استیصال کے لئے جس جوش و صداقت کا اظہار اسکی طرف سے ہونا چاہئے تھا وہ نہیں ہوا - ضرورت تھی کہ فساد شروع ہوتے ہی تمام اکابر فوراً وہاں پہونچ جاتے، اور اس فساد کو محدود حلقہ سے نہ بڑھنے دیتے - لیکن ایسا نہیں ہوا اور پہونچنے والے اس وقت تک وہاں نہیں پہونچے جب تک آگ و خون کا یہ کھیل پوری طرح کھیل نہیں لیا گیا اور وہاں پہونچنے کے بعد بھی جو بیان انھوں نے دیا اس سے ان کے کسی شدید تاثر کا اظہار نہیں ہوتا -

پاکستانی نقطۂ نظر سے اس مسئلہ پر ایک اور پہلو سے بھی غور کیا جا سکتا ہے، وہ یہ کہ چونکہ پاکستان اسلامی حکومت ہے اس لئے وہ ہندوستان کے مسلمانوں کی طرف سے غافل نہیں رہ سکتی اور وہ مذہباً اس کی ذمہ دار ہے کہ اس کے ہم مذہب افراد پر یہاں ظلم نہ ہونے پائے (جیسا کہ بعض اکابر پاکستان نے اظہار ہمدردی میں بارہا ظاہر کیا ہے) اس سلسلہ میں ہم کو صرف دو باتیں عرض کرنا ہیں، ایک یہ اگر قیام پاکستان کا واقعی مقصود یہی تھا تو اس پر اُسی وقت غور کرنا چاہئے تھا جب ملک تقسیم ہوا تھا اور مکمل تبادلۂ آبادی کو تقسیم کی ضروری شرط قرار دینا چاہئے تھی، لیکن جب پاکستان کی تخلیق کے لئے ۴ - ۵ کروڑ مسلمانوں کی قربانی کو بھی گوارا کر لینا طے کر لیا گیا اور ہندوستان کے مسلمانوں کو خزاں رسیدہ پتی کی طرح ان کو ناقابل التفات قرار دیدیا گیا، تو پھر اب کیوں ان کی زبوں حالی پر دل دُکھایا جاتا ہے - لیکن اگر پاکستان یہ کہتا ہے کہ اپنے فرائض کا احساس اُسے اِس وقت ہوا ہے تو پھر اس صورت میں شرعی حکم صرف ایک ہی ہو سکتا ہے اور وہ یہ کہ ہندوستان میں چونکہ مسلمانوں پر ظلم ہو رہا ہے اس لئے وہ دار الحرب ہے اور دار الحرب کے خلاف جہاد و فوج کشی ایک مسلم حکومت کا فرض اولین ہے - الغرض پاکستان کے سامنے صرف دو راہ ہیں یا تو وہ اپنی اقلیت کی پوری حفاظت کرے قطع نظر اس سے کہ ہندوستان کے مسلمانوں پر کیا گزر رہی ہے - یا اگر اس کا جذبۂ ایمانی مسلمانوں کی ہمدردی پر مجبور کرتا ہے تو وہ ہندوستان پر حملہ کر دے اور اسے دار السلام بنائے - ان دو کے علاوہ درمیان کی جو راہ پاکستان نے اختیار کی ہے وہ نہ صرف یہ کہ اسکے دعوئے اسلام کے منافی ہے، بلکہ خود مسلمانوں کے لئے بھی بہت نقصان رساں ہے -

اب اسی اصول کو سامنے رکھ کر بھارت کی حکومت پر غور کیجئے تو ہم کو یہاں بھی بالکل وہی نقص نظر آئے گا جو پاکستان میں نظر آتا ہے - بھارتی حکومت کا دعویٰ ہے کہ وہ غیر مذہبی جمہوریت ہے جہاں بلا امتیاز مذہب و ملت سب کو یکساں شہری حقوق حاصل ہیں - یقیناً آجکل ایک ترقی یافتہ حکومت کا یہی معیار ہونا چاہئے، لیکن اس معیار پر کسی حکومت کو جانچنے کا معیار ملک کی اکثریت نہیں بلکہ اقلیت ہوا کرتی ہے اور جب ہم بھارت کی اقلیت پر نگاہ ڈالتے ہیں تو ہمیں افسوس ہوتا ہے کہ جس بلند نظری و مساوات کا اظہار کانسٹی ٹیوشن میں کیا گیا ہے عملاً اس کا ثبوت ہمیں بہت کم ملتا ہے - سب سے پہلی چیز جس پر یہاں کی حکومت کو متوجہ ہونا چاہئے وہ اقلیت کے جذبات کا مطالعہ ہے - اور اگر انصاف سے کام لیا جائے تو حکومت کو ماننا پڑے گا کہ اس کی اقلیت بحالت موجودہ حد درجہ تشویش و اضطراب کے دور سے گزر رہی ہے -

قطع نظر اس سے کہ ملازمت کے دروازے اس پر تقریباً بند ہو چکے ہیں اور اس کی زبان و کلچر کو مٹایا جا رہا ہے، وہ اپنے

جان و مال کو بھی خطرہ میں باقی ہے وہ ہر ہر قدم پر محسوس کر رہی ہے کہ اس کی زندگی حکومت نہیں بلکہ اکثریت کے رحم و کرم پر ہے۔ یہ خوف دراصل پچھلے فسادات کے وقت پیدا ہوا تھا جب فوج اور پولیس نے بھی اقلیت کی حفاظت ترک کر دی تھی اور یہ اتنا تلخ تجربہ تھا کہ اس کے اثرات آج تک اس کے دل سے نہیں مٹے۔ اس دوران میں یہ ہیجان کم ہو گیا تھا لیکن بنگال کے فسادات نے پھر سارے زخم ہرے کر دئے اور یہاں کی اکثریت نے مشرقی بنگال کا انتقام لینے کے لئے ان دور دراز صوبوں کے بے گناہ مسلمانوں کو بھی نہ چھوڑا جنھوں نے کبھی سرزمین بنگال پر قدم بھی نہ رکھا تھا۔ حکومت کے لئے یہ بات فخر کی نہیں ہے کہ وہ فسادات کو زیادہ نہ پھیلنے دے، یا اس کو جلد فرو کر دے بلکہ اس کا اصل کارنامہ یہ ہونا چاہئے کہ وہ فساد ہونے ہی نہ دے اور ان عناصر کو جن سے اشتعال پیدا ہو سکتا ہے اُبھرنے کا موقعہ ہی نہ دے، جس میں وہ ناکام رہی۔ فساد بنگال شروع بھی نہیں ہوا تھا کہ بعض ہندو جماعتوں کے لیڈروں نے فضا کو خراب کر رکھا تھا اور وہ صاف صاف کہہ رہے تھے کہ مسلمانوں کے لئے یہاں کوئی جگہ نہیں ہے پھر ہولی کے موقعہ پر تو یہ جذبۂ انتقام اور زیادہ شدید ہو گیا اور ایسی غیر ذمہ دارانہ تقریریں کی گئیں کہ ان کا لازمی نتیجہ خونریزی تھا۔ لیکن حکومت نے ان لوگوں کی زبان بندی کے لئے کوئی قدم نہیں اُٹھایا، حالانکہ اگر اسی قسم کی کوئی بات کسی مسلمان کی زبان سے نکل جاتی تو اسے فوراً گرفتار کر لیا جاتا۔ اس سے مسلمانوں کو عام طور پر یہ خیال کرنے کا موقعہ ملتا ہے کہ غالباً حکومت بھی انکے وجود کو گوارا نہیں کرتی اور اسی لئے تبادلۂ آبادی کا ذکر ان لوگوں کی زبان پر بھی آنے لگا ہے جن سے خستگی کی داد پانے کی توقع ہو سکتی تھی۔

موجودہ حکومت کانگرس پارٹی کی حکومت کہلاتی ہے، لیکن ملک کی ذہنیت بالکل مہا سبھائی ہے اور حکومت اس ذہنیت کے دور کرنے سے اپنے آپ کو قاصر پاتی ہے۔ پھر ان حالات میں بھارت کی حکومت سے بھی ہم کو وہی سوال کرنا ہے جو پاکستان سے کیا جا سکتا ہے، یعنی یہ کہ اگر وہ اپنے آپ کو غیر مذہبی جمہوریت کہتی ہے تو اسے صحیح معنے میں اپنے تئیں غیر مذہبی ثابت بھی کرنا چاہئے، ورنہ اسے صاف صاف اپنے ہندو حکومت کا اعلان کر دینا چاہئے، تاکہ اقلیت کا تذبذب دور ہو جائے اور وہ یکسو ہو کر اپنی قسمت کا فیصلہ کر سکے، جس طرح پاکستان کے لئے کوئی درمیانی راہ نہیں ہے اسی طرح ہندوستان کے لئے بھی نہیں ہے اور اسے بھی یہ فیصلہ کرنا پڑے گا کہ یا تو وہ یہاں کی ۴ کروڑ مسلم آبادی کی حفاظت کی پوری ذمہ داری اپنے سر لے، خواہ پاکستان کا طرزِ عمل کچھ ہی کیوں نہ ہو یا اس کا اعتراف کرے کہ یہ اس کے اختیار سے باہر ہے لیکن یہ بات سمجھ لینا چاہئے کہ اگر اس کشمکش کا نتیجہ جنگ قرار پایا تو دونوں ملکوں کی تباہی لازمی ہے مغربی حکومتیں اسی دن کی آس لگائے بیٹھی ہیں اور پاکستان و ہندوستان دونوں کو ختم کر دیں گی۔۔۔ کس قدر افسوس کی بات ہے کہ وہی دو قومیں جو حصول آزادی کے لئے کسی وقت دوش بدوش جنگ کر رہی تھیں۔ آج حصول آزادی کے بعد ایک دوسرے کے خون کی پیاسی نظر آتی ہیں اور کوئی شخص ایسا نہیں جو ان دونوں دیوانوں کو ہوش میں لائے۔ ممکن ہے آج مہا سبھائیوں اور سیوک سنگھ والوں کی ذہن میں یہ بات نہ آئے، لیکن میں کہ اپنی اس زندگی میں ہندو مسلم اتحاد کے بڑے روح پرور نظارے دیکھ چکا ہوں، موجودہ حالات دیکھ کر سخت روحانی تکلیف محسوس کرتا ہوں اور منتظر ہوں کہ کسی طرف سے کوئی یہ صدا دینے والا پیدا ہو جائے کہ

ہم کعبہ و ہم بتکدہ سنگ رہِ ما بود
رفتیم و صنم بر سرِ محراب شکستیم

خدا کرے، نواب زادہ لیاقت علی خاں اور پنڈت جواہر لال نہرو کی آیندہ ملاقات کسی ایسے ہی نوید کی تمہید ہو۔

اقبال کا نظریۂ ارتقاء

اقبال کو تحریک و عمل کا پیغمبر کہا جاتا ہے - اور یہ ایک حد تک صحیح بھی ہے کیونکہ ان کے نظریات میں عمل کو فکر سے کہیں زیادہ اہمیت حاصل ہے - انھوں نے تو یہاں تک کہا ہے :-

حکمت و فلسفہ کرد است گراں خیز مرا　　خضرِ من از سرم ایں بار گراں پاک انداز

مگر حقیقت یہ ہے کہ عہد حاضر میں کوئی بڑی تحریک ایک تشفی بخش فلسفیانہ پس منظر کے بغیر وجود میں نہیں آسکتی - اور اقبال کے درسِ عمل میں بھی ہمیں ایسے پس منظر کی کمی محسوس نہیں ہوتی - وہ تو خود "ضرب کلیم" کے ناظرین سے یوں خطاب کرتے ہیں :-

جب تک نہ زندگی کے حقایق پہ ہو نظر　　تیرا زجاج ہو نہ سکے گا حریفِ سنگ
یہ زورِ دست و ضربتِ کاری کا ہے مقام　　میدانِ جنگ میں نہ طلب کر نوائے چنگ
خونِ دل و جگر سے ہے سرمایۂ حیات　　فطرت لہو ترنگ ہے غافل نہ جل ترنگ

آخر گھوم پھر کر پھر وہی فطرتِ انسانی کی نوعیت کا ذکر آیا !

خیر فطرتِ انسانی کے متعلق تو مختلف رائیں ہو سکتی ہیں - ہم اس سلسلہ میں اقبال سے اتفاق بھی کر سکتے ہیں، اختلاف بھی، مگر اتنا تو ماننا ہی پڑے گا کہ حقایق کا علم عمل کا محرک ہوتا ہے - ہم نے یہاں "حقایق" کا لفظ بہت ڈھیلے معنوں میں استعمال کیا ہے - ہم دیکھتے ہیں کہ اکثر اوقات ہمارے فلسفے اور نظریات محض نیم حقیقتیں یا حقیقت کے چھلکوں میں پوشیدہ مغز باطل ہونے کے باوجود قومی تحریکوں کا گہوارہ بن جاتے ہیں مگر غور سے دیکھا جائے تو اُن میں بھی حقیقت نمائی کی ایک شان اور کوئی نہ کوئی منطقی ربط ضرور ہوتا ہے تاکہ عوام کو متاثر کرنے کی صلاحیت پیدا ہو سکے - یہ البتہ صحیح ہے کہ جیسے ہی تاریخ کی قوتیں اُن کے داخلی مغالطوں کو منظرِ عام پر لے آتی ہیں ویسے ہی ان نظریوں پر ٹھہری ہوئی تحریکوں میں انحطاط شروع ہو جاتا ہے -

اقبال غیر معمولی طور پر ذہین طالب علم تھے - تعلیم کے بڑے درجوں میں وہ برابر فلسفہ پڑھتے رہے، اور یوں بھی انھیں زندگی کے ہمہ گیر مسایل سے گہری دلچسپی تھی، چنانچہ مطالعہ اور غور و فکر کا شغل رسمی تعلیم کے بعد بھی بدستور رہا - جب وہ قانون کی تعلیم اور تحقیق کے سلسلہ میں یورپ گئے تو اُن کے فطری ذوق کو اور بھی سازگار ماحول ملا اور ان کا ذہن ہمعصر سماج — خصوصاً اپنی ملی زندگی کی گتھیاں سلجھانے میں پوری طرح مصروف ہو گیا - انھوں نے

اجتماعی زندگی کو سمجھنے سمجھانے کی بھی کوشش کی اور اپنی "قوم" کو بھیانک پستیوں سے اُٹھا کر غیر مرئی بلندیوں تک پہونچانے کی بھی - اس طرح اقبال کی فکر میں جو مقصدیت شامل ہوئی اس کا غلبہ امتدادِ زمانہ کے ساتھ ساتھ برابر بڑھتا ہوا محسوس ہوتا ہے، یہاں تک کہ کچھ دور چلنے کے بعد یہ مقصدیت بے سر و پا عینیت میں گم ہو کر رہ جاتی ہے -

آخری تجزیہ میں اس عینیت کا سوتا بھی اسی مذہبی اُلجھن کے سر چشمہ سے پھوٹتا نظر آتا ہے، کیونکہ جس حد تک اقبال نئے سائنٹفک نظریات کا ساتھ دینے کے لئے قرآن اور اسلام کے نظامِ فکر سے استنباط کر سکتے ہیں وہ اس سے گریز نہیں کرتے، مگر جس مقام پر پہونچ کر اسلام کے بنیادی عقاید اور فکرِ جدید میں سمجھوتا غیر ممکن ہو جاتا ہے وہ اسلام کو حق بجانب قرار دینے پر مجبور ہو جاتے ہیں، چاہے اس کے لئے انھیں کسی خیالی حقیقت تراشی سے کام لینا پڑے یا یہ مبہم بات کہہ کر پیچھا چھڑانا پڑے،

طبِ مغرب میں مزے میٹھے اثر خواب آوری

یہی سبب ہے کہ بہت سے وقتی مسایل کے متعلق ان کے نظریات ایک بڑی حد تک واضح ہونے پر بھی ان میں کسی نہ کسی منزل پر پہونچ کر عجیب و غریب اُلجھنیں پیدا ہو جاتی ہیں -

آیئے اب فلسفۂ اقبال کے چند نمایاں خطوط اور ان کے پیچ و خم پر نظر ڈالنے کی کوشش کریں - اقبال کے زمانہ تک غیر متحرک (سکونی) اور مشینی نظامِ عالم کے تصورات کو جدید معلومات نے ہمیشہ کے لئے معدوم کر دیا تھا - اب اس حقیقت کو پوری طرح ذہن نشین کرانے کے لئے اطمینان بخش شواہد مہیا ہو چکے تھے کہ کائنات کا سارا نظام خاص اُصولوں کے تحت برابر تغیر پذیر رہتا ہے اور تاریخ انسانی بھی اپنے ارتقا میں "خاص اصولوں" کی پابند ہے -

ابتدا میں قدرت اور تاریخ دونوں سے متعلق ان خاص اُصولوں کے بارے میں اختلافِ رائے رہا - فرانس کے مشہور ماہر حیاتیات لمارک نے اُنیسویں صدی کے آغاز میں کہا کہ جانداروں میں یہ تبدیلی ماحول کے اثرات اور اعضا کے استعمال اور عدم استعمال سے پیدا ہوتی ہے - اِس کے علاوہ اُس کے پیرووں نے یہ بھی کہا کہ تبدیلی اُن کی شعوری کوشش کا نتیجہ ہے - لیکن اس تحریک کے سب سے بڑے رہنما چارلس ڈارون نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب "نوعوں کا آغاز" میں جو ۱۸۵۹ء میں شایع ہوئی، شعوری کوشش کے نظریہ کو غلط بتایا اور تبدیلی کے اصول "قدرتی انتخاب" اور "موزوں ترین کی بقا" قرار دئے - ہالینڈ کے ایک اور ماہر حیاتیات ڈی ورائز نے اس نظریہ میں اتنا اور اضافہ کیا کہ تبدیلیاں رفتہ رفتہ واقع نہیں ہوتیں بلکہ کچھ وقفوں کے بعد یکایک رونما ہوتی ہیں -

جہاں تک انسانی زندگی کا تعلق ہے، ہیگل نے سنہ ۲۳-۱۸۲۲ء میں فلسفۂ تاریخ کے متعلق اپنے لکچروں میں عینی ارتقاء کا نظریہ پیش کیا تھا لیکن آیندہ ڈارون کے حیاتیاتی انکشافات اور مارکس کے اقتصادی نظریات نے مغرب کے فلسفۂ تاریخ میں نئے ابواب کا اضافہ کیا - ہیگل تاریخ کے تو سیدھے ارتقا کا قایل تھا مگر قدرت کی جدلیات کو مدور تصور کرتا تھا - نئی معلومات سے لوگوں کو قدرت کے بھی سیدھے ارتقاء کا علم ہو گیا اور قدرت اور انسانی زندگی کے مزید رشتے روشنی میں آ گئے -

ان تمام چیزوں کے ذکر کا مقصد اس حقیقت کو اچھی طرح واضح کرنا تھا کہ جس علمی دُنیا میں اقبال کی ذہنی تربیت ہوئی تھی اس میں ارتقاء کا نظریہ اپنے تاریخی نشیب و فراز سے گزر کر قبول عام کی منزل تک پہونچ چکا تھا۔ اقبال ہی نہیں اس زمانہ کے ہر واقعی تعلیم یافتہ اور سنجیدہ آدمی کے لئے اس حقیقت کا قایل ہونا ضروری ہو گیا تھا اور ہمیں خوشی ہے کہ اقبال بھی اس کے قایل تھے ——— اگرچہ ایک حد تک ! ان کے یہاں اکثر موقعوں پر اس کا اظہار ملتا ہے مثلاً :۔

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید　　کہ آرہی ہے دمادم صدائے کُن فیکون

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں　　ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

گماں مبر کہ بپایاں رسید کار مغاں　　ہزار بادۂ ناخوردہ در رگِ تاک است

لیکن "فلسفۂ عجم" میں رومی کا ذکر کرتے ہوئے، جس طرح اقبال نے اس انقلابی تحقیق کا ذکر کیا ہے، اُسے پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جدید نظریۂ ارتقاء اُن کے لئے کوئی حیرت انگیز انکشاف نہیں تھا کیونکہ ان کی نظر میں ابن مسکویہ (متوفی ۱۰۳۰ء) اور رومی (۱۲۰۷ء–۱۲۷۳ء) صدیوں پیشتر اس کی پیشین گوئی کر چکے تھے۔ اس کی شہادت میں ابن مسکویہ کے متعلق تو خیر شبلی کی "علم الکلام" سے محض ایک طویل اقتباس ہی نقل کرنے پر اکتفا کی گئی مگر رومی کے حسب ذیل اشعار بھی پیش کئے گئے ہیں :۔

آمدہ اول بہ اقلیمِ جماد　　وز جمادی در نباتی اوفتاد

سالہا اندر نباتی عمر کرد　　وز جمادی یاد ناورد از نبرد

وز نباتی چوں بہ حیواں اوفتاد　　نامدش حال نباتی ہیچ یاد

جز ہماں میلے کہ دارد سوئے آں　　خاصہ در وقتِ بہار و در خزاں

باز از حیواں سوئے انسانیش　　می کشد آں خالقے کہ دانیش

ہم چنیں اقلیم تا اقلیم رفت　　تا شد اکنوں عاقل و دانا و زفت

اقبال نے ابن مسکویہ کے نظریات اس کی کتاب "الفوز الاصغر" مطبوعہ بیروت سے اخذ کئے ہیں حُسن اتفاق سے اس کتاب کا ایک اُردو ترجمہ دلّی یونیورسٹی کے کتب خانہ میں موجود ہے جو ہماری نظر سے گزر چکا ہے۔ اس ترجمہ اور شبلی کے مذکورہ اقتباس میں ہمیں کوئی ایسی خاص بات نظر نہیں آئی جس کا ذکر ناگزیر ہو یا رومی نے نہ کیا ہو۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ رومی خود کسی نہ کسی طرح، جہاں تک اس نظریہ کا تعلق ہے، ابن مسکویہ سے ضرور متاثر ہوئے۔ اس لئے ہم یہاں ابن مسکویہ کو تو آسانی سے نظر انداز کر سکتے ہیں لیکن رومی کو سمجھنے کی ضرور کوشش کریں گے۔

رومی اسی نظریہ کو مثنوی میں ایک اور موقعہ پر بھی بیان کرتے ہیں۔ (بحوالۂ فلسفۂ اقبال کا مطالعہ (انگریزی) صفحہ ۳۹، از بشیر احمد ڈار) جس کا اُردو ترجمہ حسب ذیل ہے :۔

"میں صورت جمادی میں فنا ہو کر پودا بن گیا اور پھر شکل نباتی میں فنا ہو کر حیوان تک پہونچا۔ فنائے حیوان پر انسان بنا

اس لئے مجھے ڈر کیا ہے؟ میں فنا ہو کر کمتر کب ہوا؟ آیندہ منزل پر میں انسان میں فنا ہو جاؤں گا تاکہ بلندیوں میں پرواز کرتا ہوا فرشتوں میں سرفراز ہو سکوں۔ میں ایک بار پھر بہیئت فرشتہ میں بھی فنا ہوں گا اور وہ ہو جاؤنگا جو قیاس میں بھی نہیں آسکتا۔ موت کو وہ سمجھ جس پر جماعت متفق ہے، (یعنی) آبِ حیات ظلمات میں پوشیدہ ہے۔"

جیساکہ ظاہر ہے یہاں ضمیر متکلم میں وہی بات بیان کی گئی ہے اور ساتھ ہی انسان سے دو بلند تر مدارج یعنی فرشتہ اور خدا کا بھی ذکر ہے۔ اس طرح ہمیں رومی کے نظریۂ ارتقاء کی مدور شکل نظر آجاتی ہے اور اس حلقۂ خیال کی باقی کھوئی ہوئی کڑیاں بھی مل جاتی ہیں۔

اس نظریہ میں موجودات کے جو مدارج قایم کئے گئے ہیں وہ رومی کے زمانہ میں بھی کچھ نئے نہیں تھے۔ ان سے بہت قبل یونان کے حکماء موالید ثلاثہ جمادات، نباتات اور حیوانات کی تقسیم اور ان کے مدارج کا تعین کر چکے تھے۔ اس کے علاوہ انسان کے اشرف المخلوقات ہونے اور فرشتہ اور خدا کو انسان پر درجہ بدرجہ فوقیت حاصل ہونے کا تصور بھی نہ جانے کب سے موجود ہے ہاں رومی نے جو بات نئی کہی ہے وہ ایک ہی چیز کی تدریجی ترقی ہے جو ایک کی فنا سے دوسرے کی حیات کا دامن وابستہ کرتی چلی جاتی ہے۔ جس سے ڈارون کے نظریۂ ارتقا اور اس خیال میں ہلکی سی مشابہت پیدا ہو گئی ہے۔

دنیا میں ہمیشہ چراغ سے چراغ جلا ہے۔ نئی نسلیں اسلاف سے مستفید ہوتی آئی ہیں، اور ہمیں بھی ابن مسکویہ یا رومی کے کام کے لئے ان کا شکر گزار ہونا چاہئے لیکن رومی کے نظریات کو ڈارون کی پیش گوئی کہنا موخرالذکر کے ساتھ سراسر بے انصافی ہے۔

جیساکہ ظاہر ہے ڈارون نے انسان کے سلسلۂ ارتقاء کے جن مدارج کا ذکر کیا ہے وہ رومی سے بہت مختلف ہیں ڈارون کی نظر میں حیوانات نباتات سے پیدا نہیں ہوتے۔ اتنی بات البتہ ہے کہ اپنی ابتدائی شکل میں حیوانات اور نباتات کے کچھ خواص میں مشابہت ہوتی ہے۔ اس کے بعد دونوں کا ارتقا بالکل مختلف اور آزاد ہے۔ اور پھر حیوانات اور نباتات کا یہ تعلق کہ:-

وز نباتی چوں بہ حیواں اوفتاد	نامدش حال نباتی ہیچ یاد
جز ہماں میلے کہ دارد سوئے آں	خاصہ در وقتِ بہار و در خزاں

محض حسن ظن اور شاعری ہے۔ سوئے اتفاق سے ڈارون اس نعمتِ عظمیٰ سے محروم تھا!

حقیقت یہ ہے کہ ڈارون کے نظریہ کی بنیاد تجربات پر ہے اور رومی کی محض قیاس پر۔ ڈارون کا ارتقاء مادہ کا ارتقاء ہے اور رومی کا روح کا۔ ڈارون حیات کے سیدھے ارتقا کا قایل ہے اور رومی مدور کا، جس میں روح مختلف مظاہر قدرت میں منازل فنا کے ذریعہ درجہ بدرجہ ترقی کرتی ہوئی اپنے مرکز کی طرف مراجعت کرتی ہے۔

اب براہ راست اقبال کے نظریہ پر آیئے۔ اقبال تخلیق کے عمل کو خالق کے ایک مقصد خاص سے وابستہ کرتے ہیں۔

صوفی نے تخلیقِ کائنات کا مقصد یہ بتایا تھا کہ حسنِ مطلق پہچانے جانے کا آرزو مند تھا، چنانچہ اس نے تماشا گاہِ عالم کو اپنے پرتو سے نورانی کیا اور مشاہدۂ جمال کے لئے انسان کا مضطرب دل ظہور پذیر ہوا۔ علامہ اقبال اس حقیقت سے بخوبی واقف تھے وہ خود تصوف کے فلسفہ کا ارتقا بیان کرتے ہوئے "فلسفۂ عجم" میں لکھتے ہیں :-

"سید شریف حسین کہتے ہیں کہ تخلیق کی علت اظہارِ حسن ہے اور محبت پہلی مخلوق ہے۔ اس حسن کا تحقق عالمگیر محبت کے ذریعہ ہو سکتا ہے۔"

ظاہر ہے کہ اس میں بھی خالق کا ایک مقصد خاص نہاں ہے۔ لیکن اقبال نے خالق کا مقصد خاص انسان کے ذریعہ "تسخیرِ فطرت" اور خدا تک مدارجِ ارتقائی طے کرنا بتا کر اپنے نظریہ کو کسی قدر جدید اور واقعاتی رنگ میں پیش کرنے کی کوشش کی۔ اقبال کی نظر میں تخلیق خاص کے بعد خدا کا کام تخلیقی نہیں رہتا بلکہ محض امر تک محدود ہو جاتا ہے۔ کیونکہ مزید تخلیق کا کام اس کا خلیفۃ الارض یعنی انسان سنبھال لیتا ہے۔ خدا کے امر کو ملحوظ رکھنے کے علاوہ انسان مختار کل ہے اور اپنی ضرورت اور شعور کے مطابق نظامِ عالم میں ہر قسم کا تغیر و تبدل اور ترمیم و تعمیر کر سکتا ہے۔

آغازِ آفرینش میں انسان بیچارگی اور سراسیمگی کا مجسمہ تھا اور اسے معمولی سے معمولی ضروریات زندگی حاصل کرنے کے لئے بھی بڑی محنت کرنی ہوتی تھی لیکن لامحدود فطری صلاحیتیں موجود ہونے کی وجہ سے وہ تب سے اب تک برابر اپنے نامساعد ماحول کے خلاف برسرِ پیکار ہے اور اس کا بے پایاں ذوقِ نمو نظامِ قدرت پر پے در پے فتح حاصل کرتا جا رہا ہے تقریباً اسی بات کو رومی نے بھی کہا تھا :-

حق تعالیٰ گرم و سرد و رنج و درد　　بر تنِ ما می نہد اے شیر مرد
خوف و جوع و نقصِ اموال و بدن　　جملہ بہرِ نقدِ جاں ظاہر شدن

ہاں تو یہی پیکار انسان کی فطری صلاحیتوں کو بروئے کار لانے اور اجاگر کرنے کا ذریعہ ہے۔ ہماری پوری تاریخ اس حقیقت کی شاہد ہے۔

اس سلسلہ میں اقبال کے جن نظریات کا ذکر آیا ہے انھیں اچھی طرح ذہن نشین کرانے کے لئے ان کی شاعری سے چند مثالیں پیش کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے :-

"محاورۂ مابین خدا و انسان" میں انسان خدا سے اپنے تعمیری کاموں کا اس طرح ذکر کرتا ہے :-

تو شب آفریدی چراغ آفریدم　　سفال آفریدی ایاغ آفریدم
بیابان و کہسار و راغ آفریدی　　خیابان و گلزار و باغ آفریدم
من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم　　من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم

مگر یہ سب تقریباً ابتدائی معرکوں کی فتحیں ہیں۔ موجودہ عہد میں انسان فکر و عمل کے متعدد حیرت انگیز کارنامے پیش کر چکا ہے

جن کے سبب اُس کی طاقت میں بے اندازہ اضافہ ہوگیا۔ ان کارناموں میں ایک ہوائی جہاز کی ایجاد ہے۔ جس پر اقبال فخریہ کہتے ہیں:-

زطیارہ ما بال و پر ساختیم | سوئے آسماں رہگذر ساختیم
چہ طیارہ آں مرغِ گردوں سیر | پر او ز بالِ ملک تیز تر
بہ پرواز شاہیں بہ نیرو عقاب | بجنبش زلاہور تا فاریاب
بگردوں خروشندہ و تیز جوش | میانِ نشیمن چہ ماہی خموش

قرآن میں حضرت آدم کے فریب ابلیس میں گرفتار ہو کر دنیا میں نازل ہونے کا جو ذکر ہے، اس میں بھی اقبال مصلحت ایزدی تصور کرتے ہیں، کیونکہ ان کی نظر میں اس کا مقصد انسان کو دنیوی زندگی سے گزار کر روحانی منازل ارتقائی طے کرانا تھا۔ اقبال نے کئی نظموں میں اس خیال کی وضاحت کی ہے۔ "پیام مشرق" میں مشمولہ نظم "تسخیر فطرت" میں ابلیس حضرت آدم کو یہ کہہ کر جنت سے اغوا کرتا ہے:-

زندگی سوز و ساز بہ ز سکونِ دوام | فاختہ شاہیں شود از تپشِ زیرِ دام
ہیچ نیاید زتو غیر سجودِ نیاز | خیز چو سروِ بلند اے بعمل تیز گام
کوثر و تسنیم برد از تو نشاطِ عمل | گیر ز مینائے تاک بادۂ آئینہ فام
زشت و نکو زادۂ وہم خداوند تست | لذت کردار گیر، گام بنہ، جوئے کام
خیز کہ بنمائمت مملکتِ تازۂ، | چشم جہاں بیں کشا بہر تماشا خرام
قطرۂ بے مایۂ گوہرِ تابندہ شو، | از سرِ گردوں بیفت گیر بدریا مقام
تیغِ درخشندہ، جانِ جہانے گسل | جوہرِ خود را نمائے، آئے بروں از نیام
بازوئے شاہیں کشا، خونِ تدرواں بریز | مرگ بود باز را زیستن اندر کنام

تو نہ شناسی ہنوز شوق بمیرد ز وصل
چیست حیاتِ دوام؟ سوختنِ ناتمام

ابلیس کے ان الفاظ میں اقبال نے حیات انسانی کی تخلیق، غایت اور نوعیت سے متعلق اپنے پورے فلسفہ کو سمونے کی کوشش کی ہے۔

مشیت ایزدی کے مطابق زندگی کے تمام تجربے حاصل کرنے، اس کی پوری جدوجہد سے گزرنے اور ارتقا کی کُل منزلیں طے کرنے کے بعد حضرت آدم پھر خدا سے آملتے ہیں اور صبح قیامت کو حضورِ باری میں اپنی سیاحت دنیوی کے تجربے اور کامیابیاں یوں بیان کرتے ہیں:-

اے کہ ز خورشید تو کوکبِ جاں مستنیر — از دمم افروختی شمعِ جہانِ ضمیر
ریخت ہنر ہائے من بحر بیک نائے آب — تیشۂ من آورد از جگرِ خارہ شیر
زہرہ گرفتارِ من، ماہ پرستارِ من — عقل کلاں کارِ من بہر جہاں دارو گیر
من بزمیں در شدم، من بفلک بر شدم — بستۂ جادوئے من ذرہ و مہرِ منیر

یہاں پہونچ کر وہ ابلیسی فریب میں گرفتار ہونے کی توجیہ کرتے ہیں اور آخر کار اسی واقعہ کو ابلیسیت پر غالب آنے کا وسیلہ بھی قرار دیتے ہیں:-

گرچہ فسونش مرا برد ز راہِ ثواب — از غلطم در گذر عذرِ گناہم پذیر
رام نگردد جہاں تانہ فسونش خوریم — جز بکمندِ نیاز ناز نگردد اسیر
تا شود از آہِ گرم ایں بتِ سنگیں گداز — بستنِ زنارِ او بود مرا ناگزیر

عقل بدام آورد فطرتِ چالاک را
اہرمنِ شعلہ زاد سجدہ کند خاک را

یہ وہ کام تھا جس میں روزِ ازل خدا کو بھی کامیابی نہیں ہوئی تھی !

"بالِ جبرئیل" میں اسی بات کو مختصراً ایک شعر میں بھی بیان کیا گیا ہے:-

باغِ بہشت سے مجھے حکمِ سفر دیا تھا کیوں — کارِ جہاں دراز ہے اب مرا انتظار کر

ان مثالوں سے یہ حقیقت پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ اقبال کا ارتقا تصوف کی طرح خالصتاً انفرادی نہیں ہے۔ اس میں انسان کی پوری نوع قدرت کے خلاف جہاد اور تعمیری کاموں میں کم و بیش مصروف نظر آتی ہے۔ اس طرح وہ تخلیق خاص کے معتقد ہونے کے باوجود ایک حد تک فکرِ جدید کے قریب آجاتے ہیں۔

یہاں یہ بات بھی ملحوظ خاطر رہنی چاہئے کہ اقبال، رومی اور ڈارون کی طرح حیات انسانی سے قبل اور بعد کے جھگڑوں میں نہیں پڑتے۔ ان کی فکر کے پورے کنواس پر انسانی زندگی اور اس کا ارتقا پھیلا ہوا ہے، کیونکہ ان کا ارتقا اکثر و بیشتر روحِ انسانی ہی کا ارتقا ہے۔

بہر حال اگرچہ اقبال کے یہاں ارتقائے قدرت کے معاملہ میں اکثر ہیگل جھلکتا ہوا محسوس ہوتا ہے، مثلاً:-

فروغ آدم خاکی ز تازہ کاری ہاست — مہ و ستارہ کنند انچہ پیش ازیں کردند

اور یوں بھی ان کا نظریہ ایک بڑی حد تک عینی ہے، پھر بھی اتنی بات یقینی ہے کہ وہ انسانی زندگی میں حرکت اور ارتقا کے قایل ضرور تھے۔ اصولِ ارتقا کے ماننے والا شخص عموماً رجعت پسند نہیں ہوتا۔ اقبال - کے بھی اکثر اشعار پڑھ کر یہی خیال ہوتا ہے کہ وہ واقعی زندگی میں ترقی چاہتے تھے۔

تہی زندگی سے نہیں یہ فضائیں، یہاں سینکڑوں کارواں اور بھی ہیں
تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں

غمیں نہ ہو کہ بہت دور ہیں ابھی باقی نئے ستاروں سے خالی نہیں سپہر کبود

قبائے زندگی بر قامتش راست کہ او نو آفرین و تازہ کار است

چہ خوش بودے اگر مرد نکو پے، ز بندِ پاستاں آزاد رفتے
اگر تقلید بودے شیوۂ خوب پیمبر ہم رہِ اجداد رفتے

یہاں تک کہ —— کریں گے اہلِ ہنر تازہ بستیاں آباد میری نگاہ نہیں سوئے کوفہ و بغداد

ان اشعار میں بظاہر مستقبل کی نئی دُنیا، نئی زندگی اور نئی تعمیر کی بشارت ہے مگر در اصل یہ زمین بہت پھسلنی ہے۔ اقبال کے اکثر ناقدوں کو ایسے ہی اشعار سے دھوکا ہوا ہے۔ اب ذرا یہ شعر بھی ملاحظہ فرمائیے :-

سرودِ رفتہ باز آید کہ ناید نسیمے از حجاز آید کہ ناید

بہ افرنگی بتاں خود را سپردی چہ نامردانہ در بتخانہ مُردی
خرد بیگانۂ دل، سینۂ بے سوز کہ از تاکِ نیاگاں مے نخوردی

چاک اس بلبلِ تنہا کی نوا سے دل ہوں جاگنے والے اسی بانگِ درا سے دل ہوں
یعنی پھر زندہ نئے عہدِ وفا سے دل ہوں پھر اسی بادۂ دیرینہ کے پیاسے دل ہوں

عجمی خم ہے تو کیا مے تو حجازی ہے مری
نغمہ ہندی ہے تو کیا لے تو حجازی ہے مری

شراب کہن پھر پلا ساقیا، وہی جام گردش میں لا ساقیا

ہمت ہو اگر تو ڈھونڈ وہ فقر جس فقر کی اصل ہو حجازی

یہاں پہونچ کر ہمیں پھر حیرت ہوتی ہے کہ آخر یہ حجاز کی طرف مراجعت کرنے والا ارتقا کس قسم کا ہے! مگر پھر اقبال ہی اس حیرت کدہ سے باہر آنے میں بھی ہماری مدد کرتے ہیں۔

ہاں یہ سچ ہے چشم بر عہدِ کہن رہتا ہوں میں اہلِ محفل سے پرانی داستاں کہتا ہوں میں
یادِ عہدِ رفتہ میری خاک کو اکسیر ہے میرا ماضی میرے استقبال کی تفسیر ہے
سامنے رکھتا ہوں اس دورِ نشاط افزا کو میں دیکھتا ہوں دوش کے آئینہ میں فردا کو میں

یا دلم بر دوش و نگاہم بہ عبرتِ امروز شہیدِ جلوۂ فردا و تازہ آئینم

ان اشعار پر غور کرنے سے اقبال کی رجعت اور ترقی کا معمہ ایک بڑی حد تک حل ہو جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اقبال مسلسل

ترقی کے خواہاں تو تھے اور ظاہر ہے کہ یہ ترقی مستقبل ہی میں ممکن بھی تھی لیکن ان کا نصب العین حجازی زندگی تھی جس کے اصولوں کو موجودہ حیات پہ منطبق کرکے وہ انسان کو "آں سوئے افلاک" تک اُڑا کرلے جانے کے متمنی تھے۔ ان کے سارے نظامِ فکر کا تجزیہ کرنے سے اس بیان کی صداقت کا پتہ چل سکتا ہے۔ اسی لئے وہ "چشم بر عہدِ کہن" اور "دل بدوش" ہنے کے باوصف "دوش کے آئینہ میں فردا" کا بھی نظارہ کرتے تھے۔ اس طرح حیاتِ جدید کے جامہ کو بے وجہ چاک کرکے اس پر ماضی کے بوسیدہ پیوند لگانا بھی دراصل اسی مذہب پسندی کی اُلجھن کا نتیجہ ہے۔

ہمیں اس سے انکار نہیں ہے کہ نئے تصورات ہمیشہ ماضی کی کوکھ سے پیدا ہوتے ہیں اور انتہائی انقلاب کے بعد بھی نئی زندگی میں پرانی زندگی کے کچھ نہ کچھ آثار ضرور باقی رہتے ہیں مگر ان آثار کی نوعیت کو سمجھنا چاہئے۔ انقلاب کی صورت میں یہ آثارِ حیات کی فروعات تک محدود ہو جاتے ہیں کیونکہ اگر حیات کے اصولوں اور بنیادوں ہی میں تبدیلی واقع نہ ہو تو اسے انقلاب نہیں بلکہ اصلاح کہنا چاہئے۔ آج افزائشِ علم نے ہمارے نظریات کی دُنیا میں صحیح معنوں میں انقلاب پیدا کردیا ہے اس لئے ہمیں اپنے عقیدوں کی فروعات میں نہیں بلکہ بنیادوں میں تبدیلی کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔ عہدِ حاضر انسان کے شعور سے اسی کا مطالبہ کرتا ہے۔ اقبالؔ کے ساتھ دقت یہ ہے کہ وہ فروعی باتوں میں تو تبدیلی کے لئے طیار بلکہ مصر ہیں لیکن اصولی باتوں میں کسی تبدیلی کے لئے طیار نہیں ہوتے۔ بڑی سے بڑی بات وہ یہ کرسکتے ہیں کہ قدیم کو جدید سے ہم آہنگ کرنے کے لئے پُرانی شراب کو نئی بوتلوں میں بھر کر اُن پر جدت اور ترقی کے لیبل چسپاں کردیں۔

رجعت پسندی اور اعادہ پرستی کے متعلق بہت سے لوگوں کو ایک غلط فہمی سی ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اعادہ پرستی سے مراد یہ ہے کہ موجودہ زندگی کے پورے نظام کو فنا کرکے عہدِ قدیم کے کسی نظام کی تخم ریزی کردی جائے، تاکہ پھر اسی سنہرے دور کا کھیت لہلہاتا نظر آنے لگے۔ عملی زندگی میں ایسے اعادہ کا تصور بھی دیوانہ کے خواب سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ موجودہ حالات میں اعادہ پرستی مستقبل میں اپنی زندگی کو ماضی کے فرسودہ اور غیر معقول تصورات کے سانچوں میں ڈھالنے کی کوشش ہی کا نام ہے۔ یہی کوشش اکثر اوقات وقت کا ساتھ نہ دے سکنے والی ذہنیت کی پستی سے فائدہ اُٹھا کر ردِ عمل کی قوت بن جاتی ہے —— اگرچہ ردِ عمل آخرِ کار ارتقائے حیات کا محض ایک عارضی اور گریز پا منظر ثابت ہوتا ہے! ترقی پسندی مستقبل میں ترقی کا تصور کرتے رہنے میں مضمر نہیں ہوتی بلکہ ان اُصولوں کے مطابق زندگی کو تعمیر کرنے کی تمنا اور کوشش میں مضمر ہوتی ہے جو پرانے عقاید کو اُبھرتی ہوئی زندگی کا سب سے بڑا چیلنج ہیں —— خواہ وہ عقاید حجازی ہوں یا ہندی، مشرقی ہوں یا مغربی!

بہرحال اقبالؔ انسان کی آنکھیں اس کے ماتھے پر لگانا چاہتے ہوں یا گدی پر، اتنا یقین ہے کہ وہ اپنے زمانہ کے انسان کی زندگی سے قطعی غیر مطمئن تھے۔ اس میں اقبالؔ ہی کی کوئی خصوصیت نہیں ہے۔ اس معاملہ میں مشرق و مغرب کا سارا ہمعصر دماغ ان کا ہمنوا ہے۔ خواہ اس ہمنوائی کی وجہ کچھ بھی کیوں نہ ہوں۔ اور پھر یہ بھی ظاہر ہے کہ اِس دور کے

انسانوں کی ایک بڑی اکثریت میں افسوسناک بلکہ خوفناک اخلاقی اور روحانی نقایص بھی موجود ہیں۔ اس لئے وہ بہتر انسان یا فوق البشر کا ظہور چاہتے تھے۔ انھوں نے خدا سے بھی یہ اپیل کی تھی

نقش دگر طراز دہ آدم پختہ تر بیار
لعبت خاک ساختن می نہ سزد خدائے را

یہاں پہونچ کر اقبال جرمنی کے مشہور فلسفی نیٹشے کے بہت قریب آجاتے ہیں اور یوں بھی اپنے بہت سے نظریات میں وہ نیٹشے سے براہِ راست متاثر تھے مثلاً:-

خطر پسند طبیعت کو ساز گار نہیں
وہ گلستاں کہ جہاں گھات میں نہ ہو صیاد

تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے
ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات

بازوئے شاہین کشا خون قدر واں بریز
مرگ بود باز را زیستن اندر کنام

شدای باشہ نخچیرِ نخچیر خویش
کہ گیرد ز صیدِ خود آئینِ خویش

چہ خوش گفت فرزند خود را عقاب
کہ یک قطرہ خوں بہتر از لعل ناب

پر شاہباز اں بساط است سنگ
کہ بر سنگ رفتن کند تیز چنگ،

تو از زرد چشمانِ صحرا استی
بگو ہر چہ سیمرغ والا ستی

جوانے اصیلے کہ در روز جنگ
برد مرد ملک را ز چشم پلنگ

جو کبوتر پر جھپٹنے میں مزا ہے اے پسر
وہ مزا شاید کبوتر کے لہو میں بھی نہیں

"وہی جہد برائے قوت برتری" وہی "اذیت میں استلذاذ" وہی "غلبہ کا اخلاق" اور "جنگ کی تہذیب" ہے جب نیٹشے عوام اور جمہوریت کا خاکہ اڑاتا ہے تو اقبال بھی جمہوریت کی جڑیں کھودنے لگتے ہیں اور کہتے ہیں:-

گریز از طرز جمہوری غلام پختہ کارے شو
کہ از مغزِ دو صد خر فکرِ انسانے نمی آید

جب وہ کلیسا کی مخالفت کرتا ہے تو اقبال بھی فرماتے ہیں:-

کلیسا کی بنیاد رہبانیت تھی
سماتی کہاں سے فقیری میں میری

جب وہ یورپ کی تمام تہذیب کو بیمار اور وبائی بتاتا ہے تو اقبال بھی ہمنوا ہیں:-

عجب آں نیست کہ اعجازِ مسیحا داری
عجب اینست کہ بیمارِ تو بیمار تر است

اس ہم خیالی سے قطع نظر یوں بھی اقبال نے نیٹشے کی کئی جگہ دل کھول کر تعریف کی ہے۔ "پیام مشرق" میں اسکے متعلق دو شعر ہیں:-

از مستی عناصر انساں دلش تپید
فکر حکیم پیکر محکم تر آفرید

افگند در فرنگ صد آشوب تازہ
دیوانۂ بکارگہ شیشہ گر رسید

ابھی نیٹشے پھر انیسویں صدی کے یورپ کا مفکر تھا۔ جہاں وہ ان تمام چیزوں کا مخالف تھا وہیں وہ یہ بھی کہتا تھا کہ خدا

کبھی کا مرچکا ہے - یہ وہ مقام تھا جہاں ہم خیالی الحاد کی مترادف ہوکر مذہب کی بنیادوں کو چھوتی ہے - یہ اقبال کو کیسے گوارا ہو سکتا تھا؟ - چنانچہ انھیں اسی "پیکر محکم تر" کے خالق "حکیم" کے متعلق یہ بھی کہنا پڑا کہ اگرچہ

نیشتر اندر دلِ مغرب فشرد		دستش از خونِ چلیپا احمر است
آنکہ بر طرح حرم بتخانہ ساخت		قلب او مومن دماغش کافر است

ہمیں نطشے کے فلسفۂ اخلاق سے اُصولی اختلافات ہیں۔ لیکن چونکہ اقبال کو اس میں اس قدر دلچسپی تھی، اس لئے اگر اس فلسفہ کو صحیح فرض کرکے اس کا تمام ایشیا اور افریقہ میں بسنے والے انسانوں کی زندگی پر عموماً اور مسلمانوں کی زندگی پر خصوصاً انطباق کرکے دیکھیں تو ہم اس منطقی نتیجہ پر آئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ یورپ کی قوموں کو زندگی کی جدوجہد اور ارتقاء میں مشرق والوں سے بہت آگے ہونے کی وجہ سے ہمیں مغلوب کرنے اور رکھنے کا پورا اخلاقی حق حاصل ہے اور اگر "جرم ضعیفی کی سزا مرگ مفاجات" کو بھی پیش نظر رکھا جائے تو ہمیں اپنی قوموں کے مستقبل کے متعلق کسی غلط فہمی میں مبتلا نہیں رہنا چاہئے۔

اقبال یقیناً اس منطقی نتیجہ کے لئے طیار نہیں ہو سکتے تھے۔ اس لئے قوت افزونی اور غلبہ کی اس خطرناک بازیگری میں دین کی دہی مانوس قید لگانا ضروری ہوگیا۔ "ضرب کلیم" میں ایک نظم "قوت اور دین" ہی کے عنوان سے ہے۔

اسکندر و چنگیز کے ہاتھوں سے جہاں میں		سو بار ہوئی حضرتِ انساں کی قبا چاک
تاریخ امم کا یہ پیام ازلی ہے		صاحب نظراں نشۂ قوت ہے خطرناک
اس سیل سبک سیر و زمیں گیر کے آگے		عقل و نظر و علم و ہنر ہیں خس و خاشاک
لادیں ہو تو ہے زہر ہلاہل سے بھی بڑھ کر		ہو دیں کی حفاظت میں تو ہر زہر کا تریاک

ہمیں یقین آجاتا اگر دین کی حفاظت میں نشۂ قوت کی خونیں داستانیں تاریخ کے صفحات کی زینت نہ ہوتیں!

قدرت کی ستم ظریفی دیکھئے! اپنے عہد میں مغرب کی بے دین قوموں کے نشۂ قوت سے پناہ حاصل کرنے کے لئے اقبال کو جرمنی کے ایک اور ملحد فلسفی سے نظریاتی سمجھوتا کرنا پڑا۔ مگر اس میں بھی وہ اپنے بنیادی عقاید ترک کرنے والے نہیں تھے جیسے ہی اس فلسفی کے ایک بڑے شاگرد کا انتقال ہوا، اقبال نے عالم خیال میں اُس کی روح کو اپنے تصورات کی زنجیروں میں باندھا اور خدا کے حضور میں پیش کرکے مادہ پرستی اور الحاد کے لئے معذرت کرائی۔

معلوم نہیں غریب کے گناہ بخشے بھی گئے یا نہیں!

(پروفیسر) راجیندر ناتھ شیدا ایم-اے

روس کی پنج سالہ اسکیمیں

روس غالبًا دُنیا کا سب سے پہلا ملک ہے جس نے ملک کی اصلاح و ترقی کے لئے کوئی اسکیم سوچکر اس کی تکمیل کا زمانہ بھی پہلے ہی سے معین کر دیا ہو اور زمانہ بھی نہایت محدود و مختصر

حکومتیں ترقی کرتی ہیں، ملک میں اصلاحیں ہوتی ہیں، لوگوں کی اقتصادی حالت درست کی جاتی ہے، لیکن نفسیاتی وطبعی حالات کے تحت نہایت تدریج کے ساتھ اور اسی لئے کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ کسی سوچی ہوئی اصلاح و ترقی کو کب تک حاصل کیا جاسکتا ہے، لیکن روس کا کمال یہ ہے کہ وہ ترقی کی ایک وسیع اسکیم طیار کرتا ہے جو ملک کے تمام اقتصادی وصنعتی ذرائع اور جملہ طبقات پر حاوی ہے اور اسی کے ساتھ یہ بھی دعویٰ کرتا ہے وہ صرف پانچ سال میں اس کو مکمل کرے گا اور مکمل کرکے دکھا بھی دیتا ہے۔

یوروپ میں جس وقت روس کی پہلی پنج سالہ اسکیم کا چرچا ہوا تو بعض نے اسٹالین کو دیوانہ سمجھ کر کوئی توجہ ہی نہیں کی اور بعض نے یہ جان کر کہ اسکیم کو بروئے کار لانے میں وہ اور زیادہ تباہ ہوجائے گا، طنز آمیز اظہار مسرت بھی کیا۔ لیکن جس وقت دُنیا کو یہ معلوم ہوا کہ اسٹالین نے جو اسکیم طیار کی تھی وہ پانچ سال کی جگہ چار ہی سال میں پوری ہوگئی تو اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی اور ان "اسکیم سازیوں" کی تقلید ہر جگہ ہونے لگی۔

آج ہندوستان میں بھی اسی قسم کی منصوبہ بندیاں جاری ہیں، لیکن ہمارے اسکیم بنانے والوں نے اس حقیقت پر بہت کم غور کیا ہے کہ روس کو کیوں اس میں کامیابی ہوئی اور وہ کیا چیز تھی جو روس ایسے پست ملک کو دفعتًا گڑھے سے نکال کر بلندی پر لے آئی۔

یقینًا ہر ملک میں انقلاب کا بنیادی تعلق اس کے اقتصادیات سے ہوتا ہے اور جس ملک کی اقتصادی حالت جتنی زیادہ خراب ہوگی، اتنا ہی جلد اور تیز انقلاب اس میں پیدا ہوگا، لیکن محض انقلاب نہ صرف یہ کہ بالکل بیکار چیز ہے بلکہ خطرناک بھی ہے کیونکہ اگر جذبۂ انقلاب سے کوئی تعمیری کام نہ لیا جائے تو ملک کا انتظام درہم برہم ہوجاتا ہے اور ترقی کے بجائے وہ اور زیادہ تنزل پذیر ہوجاتا ہے۔

انقلاب نتیجہ ہوا کرتا ہے، ان طبعی ونفسیاتی رجحانات کا جو انسان کے غم وغصہ اور احساس تکلیف سے متعلق ہوتے ہیں اور اسی لئے جب ایک بار ان میں ہیجان پیدا ہوجاتا ہے تو وہ اس وقت تک دور نہیں ہوتا جب تک عوام کا جذبہ

انتقام پورا نہ ہوجائے یا حالات میں تبدیلی نہ پیدا ہو۔ اور یہی وقت ہے جب ملک کو صحیح لیڈر، دل کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ وہ عوام کے جوش کو جایز حدود سے آگے نہ بڑھنے دیں اور اس سے کوئی مفید کام لے سکیں۔

پھر اگر آپ روس کی پنج سالہ اسکیم کا مطالعہ کریں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اس کامیابی کا راز صرف یہ تھا کہ اسنے عوام کے جوش کو صحیح راستہ پر لگا دیا اور اس کا رُخ تخریب سے تعمیر کی طرف پھیر دیا۔

یقیناً یہ کوئی ایسی بات نہیں جس کو دنیا نہ جانتی ہو اور اکثر ایسا ہی ہوا ہے کہ ایسے وقت میں ہر ملک کے اندر کوئی نہ کوئی شخص ایسا پیدا ہو ہی گیا جس کی آواز کو عوام نے سُنا، لیکن ایسا بہت کم ہوا ہے کہ اس انقلاب کا اثر دیر پا ثابت ہوا ہو، یا امن و سکون کے ساتھ جلد اس سے کوئی فایدہ اُٹھایا جاسکا ہو۔۔۔ روس کی پنج سالہ اسکیم کی طرف جو ساری دُنیا کا رُخ پھیر گیا اس کا سبب یہی تھا کہ کسی انقلاب کا اتنا صحیح صرف اور اس کا اس قدر جلد بار آور ہونا، اس کی سمجھ سے باہر تھا۔

دُنیا کی ہر حکومت یہی چاہتی ہے کہ وہ دولتمند ہو، خوشحال ہو اور اس کی آبادی امن و سکون کے ساتھ زندگی بسر کرسکے، لیکن اس میں کوئی حکومت کامیاب نہیں ہوسکتی، جب تک ملک کی آبادی بھی اس کے ساتھ تعاون نہ کرے اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب ہم اسکیمیں بنانے سے پہلے اہل ملک کے طبعی و نفسیاتی میلانات کو بھی اپنا ہم آہنگ بنالیں۔

روس کی کامیابی کا راز صرف یہی تھا کہ اسنے عوام ہی میں اس تحریک کو پھیلایا اور انھیں میں اس کو کامیاب بنانیکا جذبہ پیدا کیا۔ لیکن یہ اس لئے ممکن ہوسکا کہ خود عوام اس کے لئے طیار تھے، حکومت سے زیادہ وہ خود اپنی اصلاح و ترقی کے آرزومند تھے اور انھوں نے اپنے آپ کو نہایت آسانی کے ساتھ اس سانچہ میں ڈھال لیا جو حکومت نے ان کی ترقی کے لئے بنایا تھا۔ پھر اگر ہندوستان بھی یہی چاہتا ہے کہ اس کی اصلاحی اسکیمیں کامیاب ہوں، تو اسکو بھی یہی راستہ اختیار کرنا پڑے گا اور حکومت سے زیادہ خود یہاں کی آبادی کو سوچنا پڑے گا کہ کسی قوم کی ترقی و فلاح محض فتنہ و فساد سے نہیں ہوسکتی، بلکہ ان اسباب کے دور کرنے پر منحصر ہے جو اس کی ترقی کی راہ میں حایل ہیں اور یہ صرف اسی طرح ممکن ہے کہ وہ اپنی ساری عملی قوت بجائے تخریب کے تعمیر پر صرف کریں اور اس لئے محنت نہ کریں کہ انھیں صرف اپنا پیٹ بھرنا ہے بلکہ اس خیال سے بھی کہ انفرادی آسودگی، اجتماعی آسودگی کے بغیر قایم رہنے والی چیز نہیں۔

آج تمام دُنیا کی طرح ہندوستان میں بھی سرمایہ و عمل کی جنگ جاری ہے اور کسی کی سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کا انجام کیا ہوگا، نہ سرمایہ داروں کے ہوس کی کوئی انتہا ہے نہ مزدوروں کے مطالبات کی کوئی حد، لیکن اگر ہم روس کی مثال کو اپنے سامنے رکھ کر غور کریں تو کوئی درمیانی راستہ مفاہمت کا پیدا ہوجانا مشکل نہیں اور اسی لئے ہم آج کی صحبت میں روس کی پنج سالہ اسکیموں کی مختصر تاریخ پیش کرنا چاہتے ہیں، اس توقع کے ساتھ کہ خود حکومت سے زیادہ خود یہاں کی آبادی اس پر غور کرے گی۔

روس کے اشتراکی لیڈر شروع ہی سے جانتے تھے کہ جب تک وہ اپنے ملک کے طبعی ذرایع پیداوار کی تنظیم نہ کرینگے

وہ ہمیشہ سرمایہ دار حکومتوں کے رحم و کرم پر رہیں گے۔ لینن صاف صاف کہہ چکا تھا کہ "اگر ہم اپنے ملک میں بھاری صنعتوں کی تنظیم نہ کر سکیں گے تو ہم بہت جلد تباہ ہو جائیں گے"۔

چنانچہ لینن نے سب سے پہلے بجلی کی طرف توجہ کی اور ۱۹۲۰ء میں سارے روس کے اندر برقی قوت پہونچانے کے لئے ایک کمیشن مقرر کیا اور اس کا زبردست پروپاگنڈا شروع کر دیا۔

یقیناً یہ بڑی بنیادی چیز تھی اور لینن جانتا تھا کہ جب تک ملک برقی قوت کے لحاظ سے ترقی نہ کرے گا، کوئی صنعت یہاں کامیاب نہیں ہو سکتی۔ لیکن خود اس کی زندگی میں اس تحریک کا کوئی نتیجہ نہ نکلا، ہاں یہ ضرور ہوا کہ روس کی اشتراکی آبادی کو صنعتی ترقی کی طرف توجہ ہو گئی۔

صنعتی منصوبہ بندی

اسکے بعد ۱۹۲۵ء میں سب سے پہلے اقتصادی منصوبہ بندی کا کام شروع کیا گیا۔ ملک کے ہر یونین میں ایک اقتصادی کونسل قایم کی گئی اور اس کا تعلق سودیٹ حکومت کی اعلیٰ یا مرکزی اقتصادی کونسل سے رکھا گیا۔ اس کے بعد ہر یونین کی حکومت سے درخواست کی گئی کہ وہ اپنے یہاں کے کارخانوں کھدانوں اور ٹرسٹوں کی پیداوار کے نقشے طیار کرائے، جن سے معلوم ہو سکے کہ ہر کارخانہ میں سالانہ کس مقدار میں کیا کیا چیزیں طیار ہوتی ہیں اور زیادہ سے زیادہ کتنی طیار ہو سکتی ہیں۔

نقشے پہلے یونین کی کونسل کے سامنے پیش ہوتے تھے اور پھر وہ جانچ کے بعد مرکزی کونسل کو بھیج دیتی تھی۔ جب تمام نقشے مرکزی کونسل کے پاس پہونچ گئے تو اس نے ... ماہرین فن کی ایک مجلس قایم کی جسے "GOSPLAN" کہتے تھے اس نے ان تمام نقشوں پر غور کر کے اپنی رپورٹ اعلیٰ کونسل کے سامنے پیش کی کہ ہر کارخانہ کی پیداوار مناسب ہے یا نہیں اور اس میں کتنا اضافہ کیونکر ہو سکتا ہے۔ اس رپورٹ پر اعلیٰ کونسل نے آئے ہوئے نقشے کارخانوں کو واپس کر دئے اور ہدایت کی کہ سال آیندہ کی پیداوار ماہرین کے اندازہ کے لحاظ سے ہونا چاہئے۔

یہ تھا آغاز اس پنج سالہ اسکیم کا جو ۱۹۲۸ء میں اسٹالین نے مرتب کی تھی۔ اس وقت اس کا حریف ٹروٹسکی مر چکا تھا اور دوسری مخالف پارٹیاں بھی ختم ہو چکی تھیں اس لئے اس کو موقعہ مل گیا کہ وہ اپنی اسکیم کو متحدہ قوت کے ساتھ چلائے۔

اس اسکیم کے تین مقصد اس کے سامنے تھے ایک یہ کہ روس محض کاشتکار ملک نہ رہے، بلکہ صنعتی ملک بھی بن جائے اور خود پرور (Self Supporting) ہو کر سرمایہ دار حکومتوں کا محتاج نہ بنا رہے، دوسرے یہ کہ انفرادی کاشت کے سلسلہ کو ختم کر کے اس کا انتظام بڑے بڑے فارموں کی صورت میں کیا جائے اور مشینوں سے کام لیکر زیادہ سے زیادہ کاشت کی جائے۔ تیسرے یہ کہ روسی کاشتکاروں اور مزدوروں کو اتنا لکھنا پڑھنا سکھا دیا جائے کہ وہ ایک صنعتی حکومت میں حصّہ لینے کے قابل ہو سکیں۔

اس تحریک کا آغاز یکم اکتوبر ۱۹۲۸ء کو ہوا اور مزدوروں سے کہا گیا کہ چونکہ ملک کی مالی حالت ایسی نہیں ہے کہ

وہ خود روپیہ لگا سکے یا دوسرے سرمایہ دار ملکوں سے قرض لے سکے۔ اس لئے ان کو چاہئے کہ وہ اپنی ایک ہفتہ یا ایک مہینے کی اُجرت بطور قرض کے حکومت کو دیں۔ اول اول تو انھوں نے اسے شک وشبہ کی نگاہ سے دیکھا، لیکن چونکہ اس وقت ملک کی حالت نازک تھی اور سرمایہ دار حکومتیں حملہ کی دھمکیاں دے رہی تھیں اس لئے انھوں نے سوچا کہ اگر واقعی ایسا ہو گیا تو وہ بالکل ہی تباہ ہو جائیں گے اور یہ سوچکر وہ پوری سپاہیانہ ذہنیت کے ساتھ ملک کی خدمت کے لئے آمادہ ہو گئے اور انھوں نے نہ صرف یہ کیا کہ فنڈ میں چندہ دیا بلکہ معمول سے زیادہ محنت کرنے لگے اور زاید وقت تک کام کرنے کا بھی الگ معاوضہ طلب نہ کیا۔ اس کا نتیجہ ہوا کہ سارے ملک میں زندگی کی ایک لہر دوڑ گئی اور ملک کے سنسان گوشوں سے بھی مشینوں کے چلنے کی آوازیں آنے لگیں۔

Dnieprpostoi میں دریا کا بند باندھ کر بہت بڑا بجلی گھر قایم کیا گیا۔ کوہستان یورال کے علاقہ میں Magnitogorsk نام سے ایک نیا شہر ایک لاکھ ۸۰ ہزار مزدوروں کا آباد ہو گیا جو فولاد کے ایک بڑے کارخانہ میں کام کرتے تھے۔ اسٹالن گراڈ میں ٹریکٹر بنانے کی مشینیں لگائی گئیں جو سال میں ہزاروں ٹریکٹر طیار کرتی تھیں۔ اور قاف کے علاقہ میں چھوٹے چھوٹے پیمانہ پر پیٹرول نکالنے والوں کو علٰحدہ کر کے، ایک بڑے پیمانہ پر سرکاری کارخانہ قایم کیا گیا اور ۶۰۰ میل کی لمبی پائپ لائن ڈال کر باکو سے باطوم تک (جو بحر اسود کا مشہور ساحلی مقام ہے) پیٹرول پہونچایا جانے لگا۔ مزدوروں کی حالت درست کرنے کے لئے مدارس، اسپتال وغیرہ تعمیر کئے گئے باغات نصب کر کے ان میں مزدوروں کے لئے صاف ستھرے مکانات بنائے گئے۔ ان کو کارخانہ تک لانے لیجانے کے لئے برقی ریلوے تعمیر کی گئی، الغرض چند دن میں قاف کا یہ خشک و ویران علاقہ چمنستان بن گیا اور پیٹرول کی پیداوار دوچند ہو گئی۔

اس اسکیم میں صنعت کے ساتھ ساتھ تجارت کی ترقی کا سوال بھی سامنے رکھا گیا تھا اور اس پر بھی خاص توجہ کی گئی۔ سنہ ۲۸ء میں سوویٹ حکومت کی خوردہ تجارت کا چوتھائی حصہ پرائیویٹ تاجروں کے ہاتھ میں تھا۔ حکومت نے اس کو بھی اپنے ہاتھ میں لیکر اس کی تین صورتیں قرار دی گئیں۔ ایک Consumers' cooperatives (دکانوں کی انجمن) دوسری سرکاری دوکانیں، تیسرے صرف مزدوروں کی ضروریات مہیا کرنے والے ادارے جو ہر بڑے صنعتی کارخانہ سے متعلق ہوں اور راشن کارڈ پر مزدوروں کو اشیاء فراہم کریں۔ یہ تینوں طریقے بہت کامیاب ثابت ہوئے جسمانی محنت کرنے والے مزدوروں کو خصوصیت سے زیادہ راشن دیا جاتا تھا۔ اور آسان کام کرنے والوں کو کم، جو کچھ کام نہ کرتے تھے نہ انھیں راشن کارڈ ملتا تھا نہ وہ ووٹ دینے کا حق رکھتے تھے۔ یونین کے ممبروں کے لئے اس دوکانیں تھیں جہاں سے انھیں چیزیں نسبتاً ارزاں ملتی تھیں۔ غیر ملکیوں کے لئے دوکانیں بالکل علٰحدہ تھیں جہاں غیر ملکی سکے لیکر مال دیا جاتا تھا۔ ان دوکانوں کا اسٹاک بہت بڑا ہوتا تھا۔ کیونکہ حکومت چاہتی تھی کہ غیر ملکیوں کو ہر قسم کا مال بافراط فراہم کیا جائے اور ان سے زیادہ از زیادہ غیر ملکی سکے حاصل کئے جائیں۔

فلاحتی منصوبہ بندی

پنج سالہ اسکیم کے نفاذ سے پہلے سوویٹ حکومت کے اندر ہر دس آدمیوں میں آٹھ کاشتکار تھے۔ انقلاب کے وقت جو زمین جس کے پاس آگئی تھی اس پر وہ خانہ جنگی اور قحط کے مصائب سے گزرنے کے بعد بھی قابض چلا آتا تھا اور ان کی تعداد ۱۹۲۶ء میں ڈھائی کروڑ سے کم نہ تھی۔ ان کے پاس چھوٹی چھوٹی زمینیں تھیں اور ان کی کاشت پرانے طریقہ پر ہوتی تھی اور یہاں کے کاشتکار اپنے حال پر قانع تھے اور انقلاب کے خواہش مند نہ تھے۔

لینن نے کاشتکاروں کو زمین صرف اس لئے دے رکھی تھی کہ وہ سمجھتا تھا ان کو یہی مراعات دیکر انقلاب کا حامی بنایا سکتا ہے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ کسی خاص جماعت کو زمین کے مالکانہ حقوق دیکر سوویٹ حکومت کیونکر قایم ہو سکتی تھی اور اس طرح خود کاشتکاری کو بھی کیا ترقی ہو سکتی تھی، اس لئے جب سوویٹ حکومت قایم ہوگئی اور روس کا پرانا نظام بالکل ختم ہوگیا تو کاشتکاروں کی طرف توجہ کی گئی۔

اشتراکی منصوبہ یہ تھا کہ وہاں کے قدیم نظام کاشتکاری کو بدل کر دو صورتوں میں تبدیل کر دیا جائے ایک یہ کہ حکومت فارم قایم کرکے خود کاشت کرے اور کاشتکار اس میں مزدور کی حیثیت سے کام کرے۔ دوسری صورت (Collective farms) کی تھی۔ یعنی یہ کہ متعدد کاشتکار مل کر ایک فارم قایم کریں اور جو نفع ہو آپس میں برابر تقسیم کرلیں۔

پہلی صورت تو چلی نہیں اور سرکاری ملازموں کی طرف سے کاشتکاروں کو بہت شکایت پیدا ہوگئی، لیکن دوسری صورت ضرور ایک حد تک کامیاب ہوگئی، کیونکہ چھوٹے چھوٹے کاشتکاروں یا زمینداروں کی ایک جماعت (قلاق) ایسی بھی تھی جو اس اشتراکی کاشتکاری کے مخالف تھی اور ان کو زیر کرنے کے لئے حکومت کو کافی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا اور خانہ جنگی کی سی صورت پیدا ہوگئی۔

حکومت نے زمیندار طبقہ (قلاق) کو ختم کرنے کے لئے زیادہ سختی سے کام لیا اور مخالفین کو پکڑ پکڑ کے سائبیریا کی طرف بھیجنا شروع کر دیا۔ لیکن اس سے یہ طوفان رکا نہیں، ملک میں بدنظمی بہت پھیل گئی، اشتراکی حکومت اور پنج سالہ اسکیم کی مخالفت ہونے لگی، کھیتیاں جلائے جانے لگیں، مویشی ہلاک کئے جانے لگے، اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ غلہ کی پیداوار اتنی کم ہوگئی کہ شہری آبادی فاقہ کرنے لگی۔

اسٹالین نے ان حالات کو دیکھ کر تدابیر کا رخ بدلا اور مارچ سنہ ۳۰ء میں اس نے اخباروں میں اعلان شایع کیا کہ "عمالِ حکومت کی طرف سے جو سختیاں کاشتکاروں اور زمینداروں پر کی جارہی ہیں وہ فوراً بند ہونا چاہئے اشتراکی کاشتکاری میں حصہ لینے کے لئے کسانوں پر جو جبر کیا جارہا ہے، وہ بھی نادرست ہے، اگر کوئی کسان اس پر آمادہ نہیں تو اسے مجبور نہ کیا جائے۔

تمام کاشتکاروں اور زمینداروں کو بلا استثنا پنج سالہ اسکیم کا مخالف قرار دیکر انھیں پریشان کرنا کسی طرح جائز نہیں
اسٹالین کے اس اعلان کا بڑا اچھا اثر ہوا اور کسانوں نے بڑا سکون محسوس کیا، لیکن چند دن کے بعد یہ دیکھ کر کہ پرائیویٹ
کاشتکاروں کی پیداوار کو بازار میں نہیں پوچھا جاتا تو رفتہ رفتہ وہ پھر اسی اشتراکی فارموں میں شامل ہونے لگے اور
سنہ ۳۰ء میں بڑی اچھی پیداوار ہوئی، لیکن اس کے بعد ہی تمام سرمایہ دار ملکوں میں کساد بازاری شروع ہوگئی اور
چیزوں کی قیمت گرنے لگی، روس نے اس کساد بازاری سے یہ فایدہ تو ضرور اُٹھایا کہ اس نے یوروپ سے ہر قسم کی مشینیں
کثرت سے ارزاں قیمت پر حاصل کرلیں، لیکن ان کی قیمت ادا کرنے کے لئے اسے کسانوں سے غلہ بھی زیادہ وصول کرنا پڑا۔

کسان یہ دیکھ کر کہ جب وہ اپنی زاید پیداوار سے کوئی فایدہ نہیں اُٹھا سکتے اور حکومت سب کا سب دوسرے
ملکوں کے مطالبات پورے کرنے کے لئے لے لیتی ہے، ہری بھری کھیتیاں چھوڑ کر ماسکو اور دوسرے بڑے بڑے
شہروں میں پہونچنے لگے اور فارم کے فارم خالی ہوگئے۔

حکومت نے اس کا تدارک اس طرح کیا کہ گاؤں گاؤں پروپاگنڈا کر کے محنتی کسانوں کو خاص انعامات دیئے
شروع کئے، اور اشتراکی فارموں کو قرض دے دیکر چلایا۔ اسی کے ساتھ پاسپورٹ سسٹم جاری کر دیا تاکہ دیہی
آبادی آسانی سے شہروں تک نہ پہونچ سکے۔ ہر چند کاشتکار طبقہ میں اس کے بعد بھی کچھ نہ کچھ بے چینی سنہ ۳۲ء کے اخیر
تک برابر جاری رہی۔ لیکن اس تمام جد و جہد و کشاکش کا نتیجہ ضرور نکلا کہ جب پنج سالہ اسکیم کی مدت سنہ ۳۳ء میں ختم ہوئی
تو زمیندار طبقہ بالکل ختم ہوگیا اور ۶۰ فی صدی کاشتکار اشتراکی یا سرکاری فارموں میں شامل ہوگئے۔

تعلیم

سوویٹ حکومت کی پنج سالہ منصوبہ بندی یقیناً ناکام رہتی اگر وہاں کی آبادی کو جاہل رہنے دیا جاتا
اور اسی لئے عام تعلیم اس منصوبہ بندی کا اہم ترین حصہ تھا، جس میں اس کو بڑی کامیابی حاصل
ہوئی۔ روس میں جہاں ۶۰ مختلف زبانیں بولی جاتی ہیں، عام تعلیم کا رواج آسان نہ تھا، لیکن حکومت نے اس
دشوار کا پوری طرح مقابلہ کر کے اس کو کامیاب بنایا اور ہر طبقہ کی ہر زبان کی تعلیم کا انتظام کیا۔

سنہ ۱۹۱۴ء میں ۷۳ فی صدی آبادی روس کی بالکل جاہل تھی جو لکھنا پڑھنا بالکل نہ جانتی تھی، لیکن سنہ ۳۲ء
میں جاہل آبادی صرف ۹ فی صدی رہ گئی۔ سنہ ۱۴ء میں ۷۰ لاکھ طلبہ ابتدائی مدارس میں اور پانچ لاکھ ثانوی مدارس
میں تعلیم پاتے تھے۔ سنہ ۳۲ء میں یہ تعداد ایک کرور ۹۰ لاکھ اور ۴۵ لاکھ ۵۰ ہزار تک پہونچ گئی۔

اس سلسلہ میں کاریگروں کو جدید مکمل صنعتوں کی تعلیم دینے کی غرض سے یہ بھی کیا گیا کہ تمام کارخانوں میں ایک ایک
اسکول قایم کیا گیا تاکہ وہاں نوجوان کاریگروں کو فنی مہارت حاصل کرنے کے علمی اصول بھی بتائے جائیں۔ ان
اسکولوں میں پرانے مشاق کاریگروں کو بھی داخل کیا جاتا تھا تاکہ وہ مزید آگاہی حاصل کر کے یونیورسٹی
کے معیار پر آجائیں۔

علمی ریسرچ اور فنی علوم کی تحقیقات کی غرض سے جن میں ڈاکٹری سے لیکر انجنیری تک تمام علوم شامل ہیں یونیورسٹیوں کو جتنی مدد دی گئی، اس کی مثال کسی ملک میں نہیں ملتی - مذہبی تعلیم البتہ ختم کر دی گئی لیکن علم الآثار، لسانیات، تاریخ اور فنِ تعمیر پر کافی توجہ کی گئی -

اس سلسلہ میں روس پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ وہاں کی تعلیم تاریخ مارکسیت کے سوا کچھ نہیں ہے لیکن اس کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ سرمایہ دار ملکوں کی تاریخ میں بھی تو بادشاہوں جنرلوں اور کلیساؤں کے ذکر کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا پنج سالہ اسکیم کے سلسلہ میں روس کے فنکاروں اور ادیبوں کے رجحانات پر بھی اثر ڈالا گیا اور محکمۂ احتساب قایم کرکے اس کی کافی احتیاط کی گئی کہ فن و ادب کی طرف سے جو کچھ پیش کیا جائے وہ اشتراکی حکومت کے خلاف نہ ہو۔ اس کا اثر فنی ترقی پر اچھا نہیں پڑا لیکن بعد کو جب سنہ ۳۲ء میں یہ سختی روک دی گئی تو روسی ادب میں پھر از سرِ نو جان آئی اور اس کا تنوع بڑھ گیا۔

دوسری پنج سالہ اسکیم

پہلی پنج سالہ اسکیم کامیاب تو بہت ہوئی، لیکن اس کے مصنوعات اچھے قسم کی نہ تھیں اور ایسا ہونا لازم تھا کیونکہ وہاں کے کاریگر نئے آلات کے استعمال سے واقف نہ تھے۔ دوسری کمی یہ تھی کہ مال کے نقل و حمل کے ذرایع ناکافی تھے یہاں تک کہ magnitorgorosk ایسے عظیم الشان فولادی کارخانہ کی مصنوعات باہر بھیجنے کے لئے صرف ایک ہی لائن تھی۔ دوسری کمی مکانات کا نہ ہونا تھا۔ خود ماسکو میں یہ حالت تھی کہ وہاں کی ۳۰ فی صدی آبادی (سنہ ۲۵ء میں) پانچ نفوس فی کمرہ کے حساب سے زندگی بسر کرتی تھی ہر چند نئی اسکیم کے سلسلہ میں دو کرور پونڈ جدید مکانات کی تعمیر پر بھی صرف کئے گئے، لیکن ماسکو کی آبادی اتنی بڑھ گئی تھی کہ یہ رقم بالکل ناکافی ثابت ہوئی۔

ان تمام نقایص کے دور کرنے کے لئے دوسری پنج سالہ اسکیم مرتب کی گئی جسے سنہ ۳۳ء سے شروع ہو کر سنہ ۳۷ء پر ختم ہونا تھا۔ اس اسکیم کا مقصود یہ تھا کہ صنعتی انقلاب کو زیادہ مضبوط بنایا جائے اور تمام آبادی کو طبقاتی تفریق سے علٰحدہ کر کے صرف ایک ہی جماعت میں تبدیل کر دیا جائے۔ اس غرض کے لئے دوسری پنج سالہ اسکیم میں مندرجۂ ذیل چھ باتوں کو سامنے رکھا گیا۔

۱- اس مال کی پیداوار کو جسے عوام روزانہ استعمال کرتے ہیں تگنا کر دیا جائے۔

۲- تجارتی مال کی طیاری کو ڈھائی گنے سے تین گنا کر دیا جائے۔

۳- اشیاء کی قیمت میں ۳۵ سے ۴۰ فی صدی تک کمی کر دی جائے۔

۴- اس وقت تک جتنے مزدوروں اور کسانوں کے لئے فراہمی غذا کا انتظام تھا اسے ڈھائی گنا بڑھا دیا جائے۔

۵- مزدوری و اُجرت دو چند کر دی جائے۔

۶ - سرکاری اور پبلک کی اشتراکی دوکانوں میں ۳۰ فی صدی اضافہ کیا جائے۔

ابتدائی دو سال میں اس اسکیم نے کافی ترقی کی لیکن شہروں کی بڑھتی ہوئی آبادی کے لحاظ سے غذا اور دوسری ضروریات زندگی کی فراہمی میں پھر بھی دشواریاں تھیں۔ دیہات میں اشتراکیت قبول کرنے کے لئے زیادہ جوش نہ تھا پھر بھی اصولی حیثیت سے اشتراکیت نے جڑ پکڑ لی اور سنہ۲۹ء اور سنہ۳۳ء کے درمیان جبکہ تمام سرمایہ دارانہ حکومتیں کساد بازاری کی انتہائی مصیبت میں گرفتار تھیں، سوویٹ حکومت کی پیداوار میں غیر معمولی اضافہ ہو رہا تھا۔

پرائیویٹ تجارت کرنے والے شہروں میں ختم ہو گئے اور دیہات میں بھی ان کا کام نہ چلا یہاں تک کہ اکتوبر سنہ۴۳ء میں اسٹالین کے حکم سے قلاق جماعت کے لوگوں کو بھی معمولی شہری آبادی کی طرح عمومی حقوق دئے جانے لگے۔

فاسزم اور کمیونزم

سرمایہ دارانہ نقطۂ نظر سے بالشویک روس کی تاریخ کے تین دور قرار دئے جاتے ہیں، پہلا دور انقلاب اور خانہ جنگی کا — اس دور کا بالشویک روس سرمایہ دار ملکوں کے نزدیک بہت مکروہ و نامعقول تھا اور دنیا کی ہر سیاسی بدعنوانی کا مرکز اسی کو قرار دیا جاتا تھا۔ دوسرے دور میں جو پنج سالہ اسکیموں کا دور تھا، انھیں ماننا پڑا کہ روس کا انقلاب بھی اپنی جگہ ایک حقیقت تھا اور اُسے کامیابی بھی حاصل ہوئی ہے۔ اب وہ اتنا زیادہ مکروہ خیال نہ کیا جاتا تھا کیونکہ دنیا میں اس سے زیادہ مکروہ چیز فاسزم پیدا ہو گئی تھی۔

ان ملکوں میں جہاں پارلیمنٹری حکومتیں ہیں کہا جاتا ہے کہ فاسزم اور بالشویزم ایک ہی سی چیزیں ہیں۔ لیکن یہ خیال غلط ہے۔ یہ صحیح ہے کہ دونوں عوام کی رائے شماری کو ضروری قرار نہیں دیتیں، دونوں سیاسی اصول پر نکتہ چینی کو گوارا نہیں کرتیں، دونوں افراد کی انفرادیت کو ختم کر دینا چاہتی ہیں، پھر بھی ان دونوں میں بڑا فرق ہے۔ فاسزم میں اقتصادی مدارج یا امیر و غریب کا فرق ضروری ہے، بالشویزم اس فرق کو بالکل مٹا دینا چاہتی ہے۔ فاسزم اقتصادی و سیاسی حیثیت سے عورت کو مرد کا دست نگر قرار دیتی ہے، بالشویزم، مرد و عورت دونوں کی مساوات کی قایل ہے۔

ہٹلر کہتا تھا کہ عورت کا کام صرف یہ ہے کہ وہ کھانا پکائے بچّے کی پرورش کرے یا کلیسا جائے۔ لینن کہتا تھا کہ ایسے کاموں میں عورت کو اُلجھا کر اس کی ذہنیت کو تباہ کرنا ہے۔ فاسزم کہتی ہے کہ حکومت بجائے خود ایک مقصد ہے سوشلزم کے نزدیک حکومت صرف ذریعہ ہے سماج کی اصلاح اور انسانی فرق مراتب کے مٹانے کا۔

مذہب کے باب میں بھی دونوں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ فاسزم مذہب کی حامی ہے لیکن سوشلزم کا کوئی مذہب نہیں ہے۔ سوشلزم کی تاریخ میں کوئی مثال ایسی نہیں ملتی کہ اس نے کسی مذہبی رہنما کو سزا دی ہو، لیکن مذہبی اداروں کی اس نے ضرور مخالفت کی کیونکہ ان کا نظریہ یہ ہے کہ خدا دولتمندوں کا ساتھ دیتا ہے، سوویٹ حکومت نے مذہبی فرایض ادا کرنے سے کسی کو نہیں روکا لیکن کسی کو اس بات کی اجازت نہیں دی کہ وہ مذہبی اصول پر سماج

کی اصلاح کریں۔

سب سے پہلے اس نے اس کلیسائی نظام کو توڑا جو زار کو خدا کا نائب سمجھتا تھا، اس کے بعد اسنے پروٹسٹنٹ مذہب کی طرف توجہ کی اور سنہ ۲۹ء میں ایک قانون کے ذریعہ سے سوائے پرستش و دعا کے پادریوں کے مواعظ وغیرہ کو بند کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سوا اُن علاقوں کے جہاں مسلم آبادی ہے، مذہب کے ادارے بالکل ختم ہو گئے۔ ماسکو میں پادریوں کی جماعت اب بھی موجود ہے اور اُن سے کوئی تعرض نہیں کرتا، وہ اب بھی لوگوں کو مذہبی تلقین کرتے ہیں، بپتسمہ دیتے ہیں، لیکن وہ ملک کی سیاست یا اصلاح میں کوئی عملی حصہ نہیں لے سکتے۔

سنہ ۲۱ء میں ٹراٹسکی نے اپنے ایک خطبہ کے دوران میں کہا تھا کہ سوویٹ یونین ابھی تک اشتراکیت نہیں بن سکی ہے۔ وہ ایک برزخی دور سے گزر رہی ہے جو ماضی کی بہت سی روایات اور حال کی سرمایہ دار حکومتوں کے مخالفت کے بوجھ سے دبی ہوئی ہے۔ اس لئے اکتوبر کا انقلاب تکمیل کار نہیں بلکہ صرف نئی تنظیم کے اُصول کا اعلان ہے“۔

پھر اس امر کا فیصلہ کہ روس کی سوویٹ حکومت اپنی منزل تک پہونچ سکے گی یا نہیں، مستقبل کے مورخین ہی کر سکتے ہیں، لیکن ہم فی الحال صرف عہدِ زار کے روس اور ”روس بعد انقلاب“ کے زمانوں کا مقابلہ ہی کر کے دیکھ سکتے ہیں کہ سوویٹ حکومت کا مستقبل تاریک ہے یا روشن ـــــ سنہ ۱۷ء سے پہلے بھی روس میں آمریت تھی اور اب بھی وہی ہے لیکن فرق یہ ہے کہ پہلے وہاں کا انسان جس بوجھ سے دبا ہوا تھا وہ اب ہلکا ہو گیا ہے۔ بہر چند افراد کو وہاں اس کا حق حاصل نہیں کہ وہ سرمایہ و املاک پیدا کر سکیں اور اپنے بعد اپنے اخلاف کے لئے چھوڑ جائیں، لیکن جس حد تک زبان، کلچر اور شہری حقوق کا تعلق ہے وہاں روسی اور غیر روسی سب برابر ہیں اور ہر شخص اپنی ذہانت سے کام لینے میں پورا آزاد ہے بشرطیکہ وہ سوویٹ اصول کی مخالفت نہ ہو ـــــ وہاں کا کسان اب بھی غریب ہے، لیکن عہد زار کے کسان سے اسکی حالت بہتر ہے غذا حاصل کرنے کے لئے وہاں کے مزدوروں کو اب بھی وقت کا سامنا کرنا پڑتا ہے، لیکن جو راشن ان کو ملتا ہے وہ بہت کافی ہوتا ہے، اس سے قبل اس کا کوئی سوال ہی نہ تھا کہ کسان و مزدور کا پیٹ بھرتا ہے یا نہیں۔ پہلے وہاں تعلیم صرف ایک خاص طبقہ تک محدود تھی اور سارا ملک جاہلوں سے بھرا ہوا تھا، لیکن اب تعلیم عام ہے اور ہر طبقہ اس سے مستفید ہو رہا ہے۔

سنہ ۱۷ء کے انقلاب سے قبل سرمایہ دارانہ نظام رحمتِ خداوندی سمجھا جاتا تھا، لیکن اب سرمایہ دار ملکوں میں بھی یہ احساس پیدا ہو گیا ہے کہ سرمایہ داروں کو بے لگام چھوڑ دینا ٹھیک نہیں ہے اور مزدور طبقہ کو بھی اجتماعی، سماجی، ثقافتی اور سیاسی زندگی میں برابر کا حصہ لینے کا حق حاصل ہے ـــــ حیرت کی بات ہے کہ مغرب بالشویزم سے گھبراتا ہے، حالانکہ اس سے قبل روس میں جب جب کوئی انقلاب ہوا ہے، اس کا ذریعہ مغرب ہی رہا ہے ـــــ ۹۰۰ سال پہلے ولاڈیمیر نے عیسویت کو یونان سے لیا اور جبراً روس کی تمام جاہل و بت پرست آبادی کو عیسائی بنایا۔ اب سے ۲۰۰ سال پہلے پیٹر اعظم نے مغرب ہی کے اسلوب، مغرب ہی کی ٹکنک اور وہیں کی تہذیب کو اختیار کیا اور روس کی وحشی آبادی پر اس کو جبراً مسلط کیا۔ اور آج جن اصول اشتراکیت کو وہاں اختیار کیا گیا ہے وہ بھی ایک مغرب ہی کے مفکر کا بتایا ہوا ہے جس کا نام کارل مارکس تھا۔

اُردو شاعری میں گُل و بُلبُل کے اشارے

اُردو شاعری میں گل و بلبل کے اشاروں کا استعمال بڑی شدت سے کیا گیا ہے۔ ہر دور اور ہر زمانے کے شاعر گل و بلبل کی کہانیاں سناتے رہے ہیں۔ اور اس میں شک نہیں کہ بعضوں نے ان اشارات کو اس طرح بھی استعمال کیا ہے جیسے بقول حالی کوئی چبائے ہوئے نوالوں کو چباتا ہے۔ لیکن ایسے شاعروں کی بھی کمی نہیں ہے جنھوں نے گل و بلبل کے افسانوں میں حقیقت و واقعیت کی وہ بجلیاں بھر دی ہیں، جن کے باعث اُردو شاعری میں حسن و دلکشی کا بسیرا نظر آتا ہے اور جو اپنی اس خصوصیت پر بجا طور پر فخر کر سکتی ہے۔

اُردو شاعری کے ایک خاصے بڑے حصے میں اس خصوصیت کا احساس ہوتا ہے۔ چنانچہ اس کی یہی خصوصیت اس سوال کو جنم دیتی ہے کہ آخر ایسا کیوں ہوا؟ — اور آج تک اس کا سلسلہ کیوں جاری ہے؟۔ بات یہ ہے کہ اُردو شاعری نے ایرانی تہذیب اور فارسی اثرات کی آغوش میں آنکھ کھولی۔ فارسی شاعری ہی کے زیر سایہ اس کا نشو و نما ہوا۔ اس زمانہ میں سماجی زندگی پر ایرانی اثرات چھائے ہوئے تھے۔ ایرانی روایات نے دلوں میں گھر کر لیا تھا۔ وہ مقامی زندگی کی روایات کے ساتھ شیر و شکر کی طرح گھُل مل گئی تھیں۔ چنانچہ اسی وجہ سے اُردو شاعری بھی فارسی روایات کے رنگ میں رنگ گئی۔ اس نے فارسی کے نقش قدم پر چلنا اپنے لئے نہ صرف ضروری جانا، بلکہ حالات نے اس کو ایسا کرنے کے لئے مجبور کیا۔ اس زمانہ میں فارسی حکمراں طبقے کی زبان تھی۔ حکمراں طبقے پر ایرانی کلچر کے اثرات غالب تھے۔ اس لئے اس ملک میں پیدا ہونے والی ہر چیز اپنے آپ کو مقبول بنانے کی خاطر حکمراں طبقہ میں رائج شدہ روایات کا منہ دیکھتی پھر اس حقیقت کو بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا کہ جن لوگوں کے ہاتھوں اُردو شاعری کا چراغ روشن ہوا، ان میں سے اکثریت ایسے لوگوں کی تھی جن کا تعلق حکمراں طبقے سے تھا۔ اگر ان میں سے بعض حکمراں طبقے سے تعلق نہیں رکھتے تھے، تو کم از کم انھوں نے حکمراں طبقے کے ہاتھوں جو ماحول پیدا ہوا تھا، اس کے زیر سایہ پرورش پائی تھی۔ اور اس ماحول کی روایات انکے مزاج کا حصہ بن گئی تھیں، اسلئے جب وہ تخلیقی کاموں کی طرف متوجہ ہوتے تھے تو غیر شعوری طور پر ایرانی روایات کا اثر ان کے یہاں نمایاں ہو جاتا تھا۔ انھیں ان روایات میں اجنبیت اور غیریت کی بو نہیں آتی تھی۔ کیونکہ وہ ان کی زندگی میں پوری طرح گھُل مل گئی تھیں۔ وہ انھیں اپنی چیزیں سمجھتے تھے۔

یہ صورت حال اس بات کی متقاضی تھی کہ اُردو شاعری فارسی شاعری کے نقش قدم پر چلے اور اس میں ایرانی

تہذیب کے اثرات سب سے زیادہ نمایاں ہوں۔ چنانچہ یہی ہوا۔ ابتدا ہی سے اُردو شاعری میں ایران کی بہاروں کا ذکر ہونے لگا۔ انھیں پرندوں کی کہانیاں سنائی جانے لگیں، انھیں بہادروں کے واقعات پیش کئے جانے لگے، جو فارسی شاعری کا حصّہ تھے۔ ظاہر ہے فارسی شاعری کے مرغزاروں میں گل و بلبل ہمیشہ سے جلوہ گر رہے۔ کیونکہ یہ ایران کی خاص چیزیں تھیں۔ اُردو شاعری کے سامنے فارسی کے نمونے تھے، اس لئے اس نے بھی اپنی محفلوں میں گل و بلبل کے ذکر کو ضروری جانا۔ چنانچہ ابتدا ہی سے اس کا سلسلہ ملتا ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ حالات کی مختلف کروٹوں کے باعث وہ نئے نئے روپ اختیار کرتی رہی۔ نئے نئے افکار و خیالات کے ہاتھوں اس کے مفہوم میں اضافے ہوتے رہے اور اس طرح اُردو شاعری میں گل و بلبل کا استعمال تنوع کے سانچے میں ڈھلتا گیا۔ چنانچہ آج وہ جس منزل میں ہے وہاں اس زمانہ کی اُردو شاعری کے تصور کی پرواز بھی نہیں پہونچ سکتی تھی، جنھوں نے ابتدائی زمانہ میں گل و بلبل کو ان کے حقیقی و واقعی معنوں میں استعمال کیا تھا۔

گُل و بُلبُل کے استعمال پر روشنی ڈالتے ہوئے ہمارے ایک نقاد نے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ "اُردو کے شاعروں نے گل و بلبل کا حال شاید ہی کبھی لکھا ہو۔ گل و بلبل کے پردے میں ہمیشہ انسانی زندگی کا کوئی واقعہ بیان کیا ہے۔ یا انسانی فطرت کا کوئی راز کھولا ہے۔" اس خیال کے ایک حصّے سے اختلاف کیا جا سکتا ہے۔ یعنی یہ بات کہ گل و بلبل کا استعمال اُردو شاعری میں حقیقی و واقعی معنوں میں ہوا ہی نہیں، انتہا پسندی پر دلالت کرتی ہے۔ یہ استعمال حقیقی و واقعی معنوں میں بھی ہوا ہے، لیکن یہ حقیقت ہے کہ مجموعی اعتبار سے اگر دیکھا جائے تو اُردو شاعری میں گل و بلبل کا استعمال مجازی معنوں میں زیادہ نظر آئے گا۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ مختلف شاعروں نے گل و بلبل کے پردے میں زندگی کے ایسے ایسے اسرار و رموز بے نقاب کئے ہیں، اور اس سلسلے میں ایسا دل موہ لینے والا اندازِ بیان اختیار کیا ہے، جس کو دیکھ کر عقل حیران رہ جاتی ہے۔

اُردو شاعری میں گل و بلبل کا استعمال جس وقت حقیقی معنوں میں ہوا، وہ ایسا زمانہ تھا جب ہندوستان کے شاعر ایران کی سرزمین پر بسیرا لیتے تھے۔ وہاں کی بہاریں انھیں خوش کرتی تھیں۔ وہاں کے پھلوں اور پھولوں سے انھیں جذباتی وابستگی تھی۔ وہاں کے پرندے ان کا دل لبھاتے تھے۔ لیکن یہ زمانہ اُردو شاعری میں بہت تھوڑا تھا، کیونکہ وقت کے ساتھ ساتھ خود ایرانی اثرات نے دم توڑ دیا تھا اور ہماری شاعری بدلتے ہوئے حالات کے باعث ہندوستانی ڈھنگ اختیار کرتی جا رہی تھی لیکن ان تبدیلیوں کے باوجود گل و بلبل کا استعمال ختم نہیں ہوا۔ اب گُل و بُلبل نے اشارات Symbols کی حیثیت اختیار کر لی۔ اور شاعروں نے بڑے بڑے اہم مسایل ان علامتوں، اشاروں اور کنایوں کے ذریعہ پیش کرنے شروع کر دئے۔ گل و بلبل کا استعمال ختم نہ ہونے کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ان الفاظ سے سماج کے افراد اتنے مانوس ہو چکے تھے اور ان کے ساتھ جذبات و احساسات کی اتنی تصویریں وابستہ ہو گئی تھیں کہ

جن کو چھوڑ دینا کسی طرح بھی ممکن نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ گل و بلبل کے استعمال نے اردو شاعری میں ایک روایت کی صورت اختیار کرلی۔ ادب میں روایت کو ختم کر دینا کوئی آسان کام نہیں ۔ کیونکہ ادب اس کو خود اپنی بقا کی خاطر زندہ رکھتا ہے ۔ اردو شاعری میں گل و بلبل کا استعمال ایک روایت ہے ۔ اسی لئے وہ اب تک زندہ ہے ۔ اور اسی وجہ سے آیندہ بھی اس کے زندہ رہنے کے امکانات ہیں۔

شاعری محض سیدھے سادے انداز میں فلسفیانہ خیالات کی طرح چند باتوں کو پیش کرنے کا نام نہیں۔ بلکہ مختلف حالات اور خیالات کے زیرِ اثر پیدا ہونے والے جذبات و احساسات کا نام شاعری ہے جس کو شاعر علامات و اشارات اور استعارات و تشبیہات میں ملبوس کرکے دنیا کے سامنے رونما کرتا ہے ۔ دنیا جہان کی شاعری میں یہ خصوصیات غالب ہیں ۔ غالب نے اسی حقیقت کی وضاحت ان اشعار میں کی ہے :۔

مقصد ہے ناز و غمزہ ولے گفتگو میں کام چلتا نہیں ہے دشنۂ و خنجر کہے بغیر
ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو بنتی نہیں ہے بادۂ و ساغر کہے بغیر

جس طرح "ناز و غمزہ" کو "دشنہ و خنجر" کہے بغیر کام نہیں چلتا ۔ اور "مشاہدۂ حق" کی گفتگو بغیر "بادۂ و ساغر" کے کی نہیں جا سکتی ۔ اسی طرح زندگی کے ان گنت موضوعات ایسے ہیں جن کو اردو شاعر گل و بلبل کے سہارے کے بغیر بیان نہیں کرسکتا ۔ اور اگر بیان کر بھی دے تو اس کے بیان میں دلکشی کی وہ کیفیت نہیں پیدا ہو سکتی جو شاعری کے لئے ضروری ہوتی ہے ۔ گل و بلبل کی علامات اس کے فن میں زیادہ رس اور زیادہ رعنائی پیدا کر دیتی ہیں ۔ جس کی وجہ سے پڑھنے والوں پر اس کا تاثر زیادہ گہرا ہو جاتا ہے ۔ کیونکہ گل و بلبل کی علامتوں کے ساتھ پڑھنے والوں کو ایک جذباتی وابستگی بھی ہے ۔ جب گل و بلبل کا ذکر کیا جاتا ہے تو نہ جانے کتنے جذبات و احساسات اس محور کے گرد جمع ہو جاتے ہیں اور ان کے ہاتھوں ایک ایسی دنیا تشکیل پاتی ہے جس کو پڑھنے والا اپنی اور اپنے دل کی دنیا سمجھتا ہے ۔

گل و بلبل اردو شاعری کی علامات اور اشارے ہیں، جن کے اندر معانی کی دنیائیں سموئی ہوئی ہیں ۔ دیکھنے میں تو گل و بلبل کی کہانی معمولی سی کہانی معلوم ہوتی ہے ۔ یعنی یہی کہ بلبل گل پر عاشق ہے اور اس کے فراق میں نالے کرتی رہتی ہے ۔ خصوصاً موسمِ بہار میں جب گل کے اوپر شباب پھٹ پڑتا ہے، وہ بے چین ہو کر نالے کرتی رہتی ہے ۔ کبھی صیاد اسے قید کرکے کنجِ قفس میں ڈال دیتا ہے ۔ اس کا آشیاں اجڑ جاتا ہے اور وہ کبھی کبھی قفس ہی کو آشیاں سمجھ لیتی ہے ۔ غرض یہ کہ اس سلسلہ میں جتنی باتیں بھی ہو سکتی ہیں، ان سب کو اردو کے شاعر بیان کرتے ہیں ۔ لیکن ان کا مقصد صرف یہ کہانی نہیں ہوتی ۔ بلکہ وہ اس گورکھ دھندے سے آگے نکل کر ایسی جگہ پہونچ جاتے ہیں، جہاں یہ کہانی پس منظر میں جا پڑتی ہے، اور انکی جگہ زندگی کے بعض اہم واقعات سامنے رونما ہو جاتے ہیں ۔

علامات و اشارات شاعری کے لئے نئی چیزیں نہیں۔ دُنیا بھر کی شاعری میں ان کا پتہ چلتا ہے۔ یہ علامتیں سماجی ماحول، افراد کے ذہنی رجحانات اور انسانوں کی افتادِ طبع کے زیر سایہ تشکیل پاتی ہیں۔ اور ان کی تشکیل انسان کی فطرت میں داخل ہے۔ علم الاصنام یا دیو مالا کے زمانے سے لے کر اس وقت تک ان کی تشکیل کا سلسلہ جاری ہے۔ دیو مالا میں مختلف شخصیتیں، مختلف کردار اور مختلف مواقع مختلف علامتوں سے ظاہر کئے گئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پڑھنے والا ان میں کہانیوں سے زیادہ دلچسپی لیتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ شاعری نے دیو مالا سے خاصا استفادہ کیا ہے۔ ہر ملک کی شاعری میں اس کی دیو مالا اور علم الاصنام کے اثرات ملتے ہیں۔ انگریزی شاعری جس کی اہمیت مسلم ہے یونان و روم کی دیو مالا کی کہانیوں سے بھری پڑی ہے۔ ان دیو مالا کی کہانیوں کے افراد نے انگریزی شاعری میں علامات و اشارات کی صورت اختیار کر کے اپنے آپ کو زندۂ جاوید کر لیا ہے۔ گل و بلبل کا تعلق ظاہر ہے، دیو مالا سے نہیں ہے۔ لیکن دیو مالا کی کہانیوں کے افراد کی طرح شاعری میں وہ علامات و اشارات کی حیثیت ضرور رکھتی ہیں۔ اسی وجہ سے وہ زندہ رہی ہیں، زندہ ہیں، اور زندہ رہیں گی۔

شاید ہی کوئی دور اُردو شاعری کا ایسا ہو جس میں گل و بلبل کے اشارات سے کام نہ لیا گیا ہو۔ جیسا کہ پہلے بھی اشارہ کیا گیا ابتدائی زمانہ سے لے کر آج تک ان علامتوں کے استعمال کا سلسلہ جاری رہا ہے۔ دکنؔ، میرؔ اور دردؔ کے زمانہ سے لیکر غالبؔ و مومنؔ اور چکبستؔ و اقبالؔ تک کے زمانہ کا شاید ہی کوئی باشعور شاعر ایسا ہو جس نے مطلق ان علامتوں کو اپنی شاعری میں جگہ ہی نہ دی ہو۔ شاید ایک بھی مشکل سے ملے۔ میرؔ، اور دردؔ، غالبؔ اور مومنؔ اور ان کے زمانے کے دوسرے شاعروں نے ان علامتوں کو اس میں شک نہیں کہ روایتی انداز میں استعمال کیا ہے۔ لیکن ان کا یہ استعمال محدود نہیں ہے۔ یعنی انھوں نے گل و بلبل کے پردے میں محض روایتی داستانیں ہی نہیں بیان کی ہیں، چند بعید از قیاس واقعات کا رونا ہی نہیں رویا ہے، بلکہ ان کے پردے میں زندگی کے مختلف اسرار و رموز کو بیان کرنے کی کوشش کی ہے اور چکبستؔ و اقبالؔ کے زمانہ تک آتے آتے تو اس میں حالات کے نئے تقاضوں کے پیش نظر نئی روح پھونکی جا چکی تھی۔ مطلب یہ ہے کہ چکبستؔ اور اقبالؔ اور ان کے زمانہ کے بعض دوسرے شاعروں نے گل و بلبل کی ان علامات کو سیاسی و سماجی مسایل پر روشنی ڈالنے کے سلسلہ میں اپنے پیش نظر رکھا ہے۔ ان کی اس خصوصیت نے ان کے کلام کو تاثر کی دولت بخشی ہے جس کی وجہ سے اس میں چار چاند لگ گئے ہیں۔

میرؔ، عشق اور زندگی کا شاعر ہے۔ لیکن ان کو پیش کرنے کے سلسلہ میں، وہ گل و بلبل کی علامتوں اور اشاروں سے کام لیتا ہے۔ جبھی ہمیں اس کے یہاں اس قسم کے شعر نظر آتے ہیں:-

یک نگہ کو وفا نہ کی گویا　　موسمِ گل صفیرِ بلبل تھا
گل و بلبل بہار میں دیکھا　　ایک تجھ کو ہزار میں دیکھا

گل کی جفا بھی دیکھی، دیکھی جفائے بلبل — یک مشت پر پڑے ہیں گلشن میں جائے بلبل

تو زندگی کی بے ثباتی، حسن کی رنگا رنگی لیکن ساتھ ہی ناپائداری اور وقت کے ہاتھوں اس کی پامالی کی ساری تصویریں ہماری آنکھوں کے سامنے بے نقاب ہو جاتی ہے۔ میر کے یہاں اس قسم کے بہت سے اشعار ملتے ہیں، جس میں بظاہر تو وہ گل و بلبل کا تذکرہ کرتا ہے، لیکن اس گل و بلبل کے پردے میں اپنے سارے فلسفۂ حیات کو پیش کر دیتا ہے۔ اور گل و بلبل کے اس بیان سے اس کی شاعری کچھ اور بھی بلند ہو جاتی ہے۔

درد تصوف اور فلسفے کے شاعر ہیں۔ اور ان کے عشق کی تان یہیں پر جا کر ٹوٹتی ہے لیکن وہ بھی اپنے ان خیالات کو گل و بلبل کے پردے میں پیش کرتے ہیں۔ جب ان کے ہاتھوں اس قسم کے اشعار کی تخلیق ہوتی ہے :۔

غنچہ ہے دل گرفتہ، دل کا ہے چاک سینہ — گلشن میں ہے تو یہ کچھ آسودگی کہاں ہے

اے گل تو رخت باندھ اٹھاؤں میں آشیاں — گلچیں تجھے نہ دیکھ سکے باغباں مجھے

بلبل نہ بر آئے باغباں سے — گل کا بھی نہ کچھ چلے خزاں سے

کچھ گل ہی باغ میں نہیں تنہا شکستہ دل — ہر غنچہ دیکھتا ہوں تو ہے گا شکستہ دل

جوشِ جنوں کے ہاتھ سے فصلِ بہار میں — گل سے بھی ہو سکی نہ گریباں کی احتیاط

تو زندگی کی افراتفری، انسان کی شکستہ دلی، اور اس کی خواہشات کی خوں شکستگی کے نقشے ہماری آنکھوں میں پھر جاتے ہیں۔ درد نے بھی ان اشعار میں، اور اسی طرح کے اور بیسیوں اشعار میں بظاہر گل و بلبل کی بات کی ہے، لیکن حقیقت اسکے بالکل برعکس ہے۔ شاعر گل و بلبل کا سہارا لے کر نہ جانے کہاں کہاں جا پہونچتا ہے۔ اس گل و بلبل کے پردے میں معانی و مطالب کی نہ جانے کتنی بجلیاں کوندتی ہوئی نظر آتی ہیں

غالب کی شاعری حسن و عشق اور فلسفہ و تصوف کی تصویر ہے، لیکن غالب کے ایسے شاعر کا فنی شعور بھی ان کو پیش کرنے کے سلسلے میں گل و بلبل کا سہارا لیتا ہے۔ جب ہمیں اس کے یہاں اس انداز کے اشعار ملتے ہیں۔

بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل — کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا

ہے کس قدر ہلاک فریب وفائے گل — بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل

چھڑکے ہے شبنم آئینۂ برگ گل پہ آب — اے عندلیب وقت وداع بہار ہے

تو عشق و عاشقی کی اہمیت اور اس کے اسرار و رموز کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ خصوصاً عشق و عاشقی سے متعلق غالب کے نظریات کی پوری طرح وضاحت ہو جاتی ہے۔ ہر چند غالب کے یہ بہت اچھے اشعار نہیں ہیں، لیکن ان میں بھی انہوں نے اپنے خیالات کو جس بانکپن اور ندرت کے ساتھ پیش کیا ہے، وہ اپنی مثال آپ ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ گل و بلبل کے استعمال نے ان اشعار میں جان نہیں ڈال دی ہے۔

مومن حسن و عشق کی رنگینیوں، رعنائیوں، اور سرمستیوں کا مغنی ہے۔ لیکن وہ بھی اپنے نغموں میں گل و بلبل کی محفلیں سجاتا ہے۔ جب ہمیں اس کے یہاں ایسے اشعار ملتے ہیں :-

وہ ہنسے سُن کے نالۂ بلبل کا | مجھے رونا ہے خندۂ گُل کا

اس نے دِکھا دکھا کے مجھے چھیڑ دیکھنا | گل پھینکے عندلیبِ گرفتار کی طرف

کہاں ہے تابِ نازِ برق اے کاش | جلا دے آتشِ گل آشیاں کو

نالۂ شب نے یہ ہوا باندھی | ہو گیا گل چراغ بلبل کا

تو ہم حُسن و عشق کی رنگینیوں، رعنائیوں اور سرمستیوں کی دُنیا میں پہونچ جاتے ہیں اور مومن کا تصورِ عشق ہمیں صاف نظر آنے لگتا ہے۔

غرض یہ کہ مثالیں کہاں تک دی جائیں۔ گل و بلبل کے استعمال کی یہ خصوصیات جس کی وضاحت اوپر کی گئی صرف میر، درد اور غالب و مومن ہی کے کلام میں نظر نہیں آتیں۔ اُردو کے تقریباً ہر شاعر کے یہاں گل و بلبل کے استعمال میں انھیں خصوصیات کا پتہ چلتا ہے۔ ولی، سودا، مظہر، مصحفی، انشا، رنگین، ذوق، آتش، ناسخ، غرض یہ کہ کسی کے یہاں اس کی کمی نہیں۔

غالب و مومن اور آتش و ناسخ کے بعد حالات بڑی حد تک بدل جاتے ہیں۔ غدر کا انقلاب زندگی کے نقشے کو بدل دیتا ہے۔ بدلتے ہوئے نئے افق پر اصلاح کے بادل منڈلانے لگتے ہیں اور جدت کی بجلیاں کوندنے لگتی ہیں۔ اور ان سب کے زیر اثر اُردو شاعری کو نئے راستوں پر چلانے کا خیال بھی عام ہوتا ہے۔ چنانچہ معنوی اور فنی دونوں اعتبار سے کچھ تبدیلیاں ہوتی ہیں، حالی اس کے علمبردار ہیں۔ ان کا اثر اُردو شاعری پر بڑا گہرا ہے۔

حالی غزل میں اصلاح کے قایل تھے۔ وہ اس کو مبالغہ آرائی سے پاک اور فطرت کے مطابق بنانا چاہتے تھے۔ لیکن اس اصلاح پسندی کے باوجود وہ اپنی غزلیات میں گل و بلبل سے اشارات کو استعمال کرنے کے لئے مجبور ہو گئے ہیں لیکن انھوں نے ان اشارات کو محض روایتی انداز میں استعمال نہیں کیا ہے۔ حالی کی غزلوں میں بڑا تغزل ہے۔ انھوں نے حُسن و عشق اور اس کی مختلف کیفیات کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے اور اس میں بڑی رعنائی اور رنگینی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کی عشقیہ شاعری کا اُردو میں ایک خاص مرتبہ ہے، لیکن ان کی شاعری کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے۔ وہ حُسن و عشق کی دنیا سے نکل کر سماجی زندگی کے تقاضوں کو بھی پورا کرتے ہیں اور افراد کو ایک مخصوص منزل پر لے جانا چاہتے ہیں۔ چنانچہ اس افادی پہلو کے اثرات کہیں کہیں ان کی غزلوں میں بھی نمایاں ہو جاتے ہیں۔ ان دونوں طرح کے مضامین کو پیش کرنے میں انھوں نے گل و بلبل کے اشارات اور علامتوں سے کام لیا ہے۔ اور اس پردے میں وہ سب کچھ کہہ گئے ہیں جو وہ کہنا چاہتے تھے۔ حُسن و عشق کے موضوعات کے ساتھ

ان کے ایسے اشعار میں سماجی زندگی زبوں حالی پر آنسو بھی ملتے ہیں ۔ وہ کچھ کہنا بھی چاہتے ہیں ۔ ان خیالات کو پیش کرنے سے ان کا کوئی مقصد بھی ہے ۔

دیکھ اے بلبل ذرا گلبُن کو آنکھیں کھول کر — پھول ہیں گر آن ہے کانٹے میں بھی اک شان ہے

نہ گل چھوڑے نہ برگ و بار چھوڑے تو نے گلشن میں — یہ گلچینی ہے یا لُٹ ہے گلچیں یا ہے قزاقی

لبک و قمری میں ہے جھگڑا کہ چمن کس کا ہے — کل بتا دے گی خزاں یہ کہ وطن کس کا ہے

فغاں شوق کو مانع نہیں وصل — یہ نکتہ عندلیب زار سے پوچھ

فصل خزاں کمیں میں ہے صیاد گھات میں — مُرغِ چمن کو فرصتِ سیرِ چمن کہاں

گل ونسریں تو کیا فرقت میں جی تک چھوٹ جاتا ہے — ہمارا بھی کبھی لگتا تھا دل سیرِ گلستاں میں

پھونکا ہے فصلِ گل نے صور آکے پھر چمن میں — اک حشر سا ہے برپا مرغانِ نغمہ زن میں

بُلبُل کے آگ سی کچھ تن میں لگ رہی ہے — بجلی گری فلک سے یا گل کھلا چمن میں

بادِ صبا گئی پھونک کیا جانے کان میں کیا — پھولے نہیں سماتے غنچے جو پیرہن میں

بہار نے بھی نہ بلبل تری بجھائی آگ — جگر کے پار ہے اب بھی تری نوا ایک ایک

داستاں گل کی خزاں میں نہ سنا اے بلبل — ہنستے ہنستے ہمیں ظالم نہ رُلانا ہرگز

داغِ مجروح کو سن لو کہ پھر اس گلشن میں — نہ سنے گا کوئی بلبل کا ترانا ہرگز

تھا ہوش یادِ گل کا دورِ خزاں میں کس کو — اے عندلیب نالاں یہ تو نے گل کھلایا

کون کہہ سکتا ہے کہ ان اشعار میں صرف گل و بلبل کی کہانیاں ہیں ۔ یا یہ کہ ان میں محض معاملات حسن وعشق کو پیش کیا گیا ہے ۔ یہ اشعار حالی کی شخصیت، ان کے کردار اور ان کے زاویۂ نظر کو پیش کرتے ہیں ان میں اس سماجی زندگی کے بعض بنیادی اور اہم مسایل ہیں جو حالی کو عزیز تھی، جس کے لئے وہ روتے اور خون کے آنسو بہاتے تھے اور جس کو بہتر بنانا ان کی زندگی کا سب سے بڑا نصب العین تھا ۔ گل و بلبل کے پردے میں انھوں نے ان موضوعات پر کس خوبی سے روشنی ڈالی ہے ۔ چنانچہ یہ کہنا غلط نہیں کہ حالی نے گل و بلبل کے اشارات کو ایک نیا جنم دیا ہے ۔ ایک نئی زندگی بخشی ہے ۔

اُردو شاعری حالی کے بعد نئے راستوں پر چلنے لگتی ہے ۔ اس میں بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ ساتھ حالی کی شعوری کوششوں کو بھی خاصا دخل ہے ۔ حالی نے جو راستہ دکھایا اس پر بہت سے آنے والے شاعر چلنے لگے ۔۔ حالی کے بعد نئے آنے والوں میں چکبست اور اقبال سب سے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں ۔ چکبست اور اقبال کی شاعری ان رجحانات کی نمایندگی کرتی ہے جو بیسویں صدی کے ابتدائی پچیس تیس سالوں میں اُردو شاعری پر چھائے ہوئے تھے

ان دونوں نے بھی گل و بلبل کے اشاروں سے کام لیا ہے - لیکن ان اشاروں کے پردے میں وہ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں وہ اس سے بالکل مختلف ہے جو ان سے پہلے کہا گیا - انھوں نے گل و بلبل کے اشاروں سے اپنے اپنے پیام کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور ظاہر ہے ان کا پیام قومی، ملکی اور وطنی ہے، جس میں سیاست کے اثرات بھی نظر آتے ہیں چنانچہ ان دونوں نے سیاسی موضوعات کے لئے گل و بلبل کے اشاروں کا استعمال کیا ہے -

چکبست وطن پرست تھے - ملک کی سیاست سے انھیں دلچسپی تھی - عملی نہیں، نظریاتی ہی سہی - اس وقت کے سیاسی رجحانات کی انھوں نے پوری طرح ترجمانی کی ہے - ہندوستان کی آزادی کی جد و جہد اور اس سلسلہ میں جو بعض لوگوں کو قید و بند کی مصیبتیں اٹھانی پڑیں ان سب کے نقشے بڑی خوبی سے کھینچے ہیں - اور اس سلسلہ میں گل و بلبل کے اشارات کو نہ صرف انھوں نے استعمال کیا ہے - بلکہ ان سے وہ کام لینے کی کوشش کی ہے جو سیدھے سادے انداز سے ناممکن تھا - وہ ان علامتوں کے پردے میں وہ کچھ کہہ جاتے ہیں، جن پر ان دنوں زبان بندی تھی اور جس کو حکومت برداشت کرنے کے لئے طیار نہیں تھی -

مجھ کو مل جائے چہکنے کے لئے شاخ مری　　　کون کہتا ہے کہ گلشن میں نہ صیاد رہے

گلوں نے باغ چھوڑا تنگ آ کر جو گلچیں سے　　　چمن ویران ہوتا ہے خبر لے باغباں اپنی

شجر سکتے میں ہیں خاموش ہیں بلبل نشیمن میں　　　سدھارا قافلہ پھولوں کا سناٹا ہے گلشن میں

گل نہیں تو بوئے گل ہی سے معطر ہو دماغ　　　کوئی رکھ دیتا قفس میرا ہوا کے سامنے

الٰہی خیر ہو میں نے قفس میں خواب دیکھا ہے　　　کہ شمع صحن گلشن بن گیا ہے آشیاں میرا

ان اشعار میں جو باتیں کہی گئی ہیں، ان کی وضاحت کی ضرورت نہیں - ہر پڑھنے والا سمجھ سکتا ہے کہ شاعر نے حب وطن آزادی اور جمہوریت کے خیالات کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے، اور گل و بلبل، گلشن و صیاد اور نشیمن و گلچیں کے اشاروں میں وہ سب کچھ کہہ دیا ہے جو وہ کہنا چاہتا تھا -

اقبال میں سیاسی، سماجی اور ملکی و ملی شعور چکبست سے کہیں زیادہ تھا - انھوں نے اپنے بعض مخصوص اور نئے اشاروں سے بھی کام لیا ہے، لیکن اس کے باوجود گل و بلبل کے اشارات کو چھوڑا نہیں ہے - بلکہ ان سے خاطر خواہ کام لینے کی کوشش کی ہے - اور اس خصوصیت نے ان کی شاعری میں زیادہ زور اور زیادہ اثر پیدا کر دیا ہے - ذیل کے اشعار سے اس کی وضاحت ہوتی ہے :-

بوئے گل لے گئی بیرونِ چمن رازِ چمن　　　کیا قیامت ہے کہ خود پھول ہے غمازِ چمن

عہدِ گل ختم ہوا ٹوٹ گیا سازِ چمن　　　اُڑ گئے ڈالیوں سے زمزمہ پردازِ چمن

ایک بلبل ہے کہ ہے محو ترنم اب تک　　　اس کے سینے میں ہے نغموں کا تلاطم اب تک

(شکوہ)

اُڑتی پھرتی تھیں ہزاروں بلبلیں گلزار میں
دل میں کیا آئی کہ پابندِ نشیمن ہو گئیں (شمع اور شاعر)

ہاں اسی شاخِ کہن پر پھر بنا لے آشیاں
اہلِ گلشن کو شہیدِ نغمۂ مستانہ کر

اس چمن میں پیرو بلبل ہو یا تلمیذِ گل
یا سراپا نالہ بن جا یا نوا پیدا نہ کر (شمع اور شاعر)

نشانِ برگ گل تک بھی نہ چھوڑ اس باغ میں گلچیں
تری قسمت سے رزم آرائیاں ہیں باغبانوں میں

چھپا کر آستیں میں بجلیاں رکھی ہیں گردوں نے
عنادل باغ کے غافل نہ بیٹھیں آشیانوں میں (تصویرِ درد)

نوا پیرا ہو اے بلبل کہ ہو تیرے ترنم سے
کبوتر کے تنِ نازک میں شاہیں کا جگر پیدا

خروش آموزِ بلبل ہو گرہ غنچے کی وا کر دے
کہ تو اس گلستاں کے واسطے بادِ بہاری ہے (طلوعِ اسلام)

تمیزِ لالہ و گل سے ہے نالۂ بلبل
جہاں میں ورنہ کوئی چشم امتیاز کرے

اقبالؔ کی شاعری میں بڑی وسعت ہے، بڑا زور ہے، بڑے تنوعات ہیں۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود بعض اہم موضوعات کو پیش کرنے کے سلسلہ میں وہ گل و بلبل کے اشارات سے کام لیتے ہیں۔ بلکہ اقبالؔ کی شاعری تو اس بات کو واضح کرتی ہے کہ جہاں کہیں ان کے جذبات میں شدت پیدا ہوتی ہے، اور وہ اس شدت کو پیش کرتے ہیں تو انکے یہاں روایتی انداز بیان زیادہ نمایاں ہو جاتا ہے۔ ایسے ہی مواقع پر وہ گل و بلبل، قفس و آشیانہ اور اسی طرح کے دوسرے اشارات کا سہارا لیتے ہیں۔ مذکورۂ بالا اقتباسات سے یہ حقیقت پوری طرح واضح ہوتی ہے، ظاہر ہے ان میں پیش کئے ہوئے تمام خیالات و نظریات کی نوعیت سیاسی، سماجی یا ملکی و ملی ہے، ان کو صرف گل و بلبل کی داستانیں سمجھ لینا ان کی اصل روح خون کر دینے کے برابر ہے۔

چکبستؔ اور اقبالؔ تو خیر نظم گو شاعر تھے۔ حالیؔ کے بعد غزلوں میں بھی یہی موضوعات گل و بلبل کے پیرائے میں پیش کئے گئے ہیں، وہ روایتی خیالات جو گل و بلبل کے ساتھ وابستہ تھے بہت کم انکے یہاں ان کا پتہ چلتا ہے۔ جدید دور کے تقریباً ہر غزل گو شاعر نے گل و بلبل کے اشاروں کو نہ صرف استعمال کیا ہے، بلکہ ان کے دامن میں وسعت پیدا کی ہے، ان میں ایک نیا رنگ دیا ہے، ان کو ایک نئی زندگی بخشی ہے۔ جدید شاعر تک اس میں پیچھے نہیں ہے ہر چند نئی پود کے اکثر شعراء نے نئی علامتوں اور نئے اشاروں سے اُردو شاعری کو روشناس کیا ہے، لیکن وہ بھی گل و بلبل کے روایتی اشارات کو فراموش نہیں کر سکے ہیں۔ اور اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ گل و بلبل کے اشارات ہر موضوع پر حاوی ہیں۔

(ڈاکٹر) عبادت بریلوی

ملک خطا کے شہزادے
اگر آپ نے اب تک مطالعہ نہیں فرمایا تو اب طلب کر لیجئے، انشاء پردازی کا وہ خاص نمونہ جو آپ کو کسی دوسری کتاب میں نہیں مل سکتا۔ قیمت مع محصول ایک روپیہ۔ منیجر نگار

انیس کی مرثیہ نگاری

اور

"فاروقی صاحب کی ستم ظریفی"

(بہ سلسلۂ ماسبق)

مرثیہ پر موقوف نہیں کوئی ایپک ایسی نہیں جس کا تعلق کسی خاص قوم یا فرقہ کے معتقدات اور رسم و رواج سے نہ ہو تاہم اکثر ایسی ہیں جن کی شہرت مقامی نہیں بلکہ آفاقی ہے۔ فاروقی صاحب ملٹن کے بڑے مداح ہیں، کیا اُس کی "پیراڈائز لاسٹ" اور "پیراڈائز ریگینڈ" عیسائی فرقہ Puritan کے زیر اثر نہیں لکھی گئیں؟ اگر اُن کا "بیان و فلسفہ" اُس خاص فرقہ تک محدود نہ رہا بلکہ عالمگیر شہرت حاصل کی تو انیس کے خلاف مذہب اور عقاید کی بنا پر معاندانہ رائے کیوں قایم کی جائے۔[1] شاید چکبست مرحوم کے ایک مضمون کا اقتباس پیش کرنا بے محل نہ ہوگا۔

"اگر آتش و انیس و غالب کی شاعرانہ وقعت کا صحیح اندازہ ہم سے نہ ہو سکا تو اُن کی شاعری کا قصور نہ تھا بلکہ اپنی قومی بے خبری کے عالم میں جہاں ہم نے زندگی کے بہت سے معاملات میں مغربی تہذیب کے اکثر اصولوں کی غلط تعبیر کی وہاں انگریزی شاعری کے غیر صحیح انداز سے ہم نے اپنا مذاق سخن بھی اُلٹا سیدھا قایم کر لیا۔ زبان و شاعری کی آیندہ اصلاح و ترقی کے لئے قدیم شعرا کے انداز سخن اور رنگ بیان کا صحیح اندازہ کرنا ہمارے لئے نہایت ضروری ہے کیونکہ جس غیر صحیح مذاق سخن کی بنا پر ہم قدیم رنگ سخن کی قدر نہ کر سکے۔ اُس کی مدد سے ہم زبان و شاعری میں نئے جوہر نہیں پیدا کر سکتے۔" (مضامین چکبست صفحہ ۲۶۸)

کاش فاروقی صاحب اپنے گریبان میں منھ ڈال کر دیکھیں۔

---

[1] یقیناً ایپک کا کسی خاص فرقہ کے معتقدات اور رسم و رواج سے ہوتا ہے اور مرثیہ میں بھی یہی ہونا چاہئے، لیکن سوال یہ ہے کہ مراثی کا تعلق کس خاص فرقہ سے ہے۔ اگر اس کا تعلق حسینؓ کی ذات گرامی اور خانوادۂ رسول سے ہے (اور یقیناً ہے) تو کیا ان کے معتقدات یا رسم و رواج وہی تھے جو مراثی میں ظاہر کئے جاتے ہیں۔۔ اگر ملٹن نے اپنی نظم کسی مخصوص عیسائی فرقہ کے معتقدات سے متاثر ہو کر لکھی تھی، تو اُنھیں کے معتقدات کو پیش بھی کیا۔ مراثی میں جو قابل اعتراض بات ہے وہ یہی ہے کہ ان میں کردار تو تاریخ عرب سے لئے ہیں لیکن رسم و رواج اور معتقدات وغیرہ سب لکھنوی ہیں اور اسی چیز کو پیش نظر رکھ کر فاروقی صاحب نے یہ ظاہر کیا تھا کہ مراثی انیس کو کوئی آفاقی حیثیت حاصل نہیں ہے۔ (نیاز)

اُنھوں نے پھر وہی پرانا نعرہ لگایا ہے کہ شیعہ کے لئے رونا مذہبی فرض ہے اور اس سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ مرثیہ گو کے لئے یہ ضروری ٹھہرتا ہے کہ وہ امام علیہ السلام اور اُن کے انصار کے واقعات جرأت و اخلاق سے زیادہ اُن کی مظلومی پر زور دے اور امام کی بابت وہی باتیں بیان کی جائیں جو اُن کی بیکسی و بے چارگی کو ظاہر کرتی ہیں۔ (ص ۹)

کسی مرثیے کے مختلف اجزاء لے لیجئے، اس بیان کی تکذیب ہو جائے گی۔ مرثیے میں پہلی چیز چہرہ ہے جسے فاروقی صاحب کی اصطلاحات مرثیہ سے بے خبری "تشبیب" کہتی ہے، اس میں کبھی تو مناظر فطرت کی عکاسی ہوتی ہے، کبھی کوئی تاریخی واقعہ نظم ہوتا ہے، کبھی شاعرانہ تفاخر ہوتا ہے، پھر جس کے حال کا مرثیہ ہے اُس کی مدح ہوتی ہے، مجملاً اُسکے سوانح حیات کا ذکر ہوتا ہے، شجاعت کا بیان ہوتا ہے، پھر نفس مضمون کی طرف گریز، جہاد کے لئے رخصت طلبی اور روانگی، میدانِ جنگ میں رجز خوانی اور مبارز طلبی، گھوڑے اور تلوار کی تعریف، سنمکھ لڑائی، اس کا تہور (چونکہ حق پر ہے)، فوج مخالف کی بزدلی (کیونکہ نفس ملامت کرتا ہے کہ دنیا اور اُس کے لالچ میں جس کے کلمہ گو ہو اُسی کے خوش خو اور بے خطا لوگوں پہ چھری تیز کر رہے ہو) اس کا لڑتے لڑتے شہید ہونا، امام علیہ السلام کا اظہار الم اور اہلِ بیت کا پُرسا۔

مان بھی لیا جائے کہ مراثی میں امام کی مظلومیت پر زور دیا جاتا ہے تو کیا بے جا ہے[1] جب خود فاروقی صاحب کو اعتراف ہے کہ واقعات ہی ایسے ہیں جن کو سُن کر ہر رقیق القلب انسان کو رونا آ جاتا ہے (ص ۹)۔ جسے وہ عیب سمجھتے ہیں در اصل انیس کے آرٹ کا کمال ہے۔ وہ مورخ نہیں بلکہ شاعر تھے جو کربلا کے خونی منظر کے مرقعے طیار کر رہے تھے۔ لہذا اپنی خدا داد قابلیت اور ذکاوت کی رہنمائی میں واقعات کے اُنھیں پہلوؤں کو اجاگر کیا جس سے اس ٹریجیڈی کی جیتی تصویر آنکھوں میں پھرنے لگے اور حمایت حق میں بلا تامل و بے دریغ جانبازی اور سرفروشی کا جذبہ انگیز ہو۔

فاروقی صاحب فرماتے ہیں کہ باوجودیکہ امام حسین کے کردار میں ہم کو فلسفہ اور اخلاق دونوں کے بلند نکتے ملتے تھے لیکن مرثیے میں اُن کو صرف اس لئے نظر انداز کیا گیا کہ اُن کے بیان سے سامعین پر کوئی رقت طاری نہیں ہو سکتی اور مذہبی نقطۂ نظر سے گریہ و زاری ہی اصل چیز ہے (ص ۱۰)

فاروقی صاحب کی لے ہر جگہ اسی مفروضہ کلیہ پر ٹوٹتی ہے کہ مرثیہ کا جو کچھ حاصل ہے رونا ہے۔ اس قول کا کھوکھلا پن کہیں ثابت کر چکا ہوں۔ انیس کا کوئی مرثیہ لے لیجئے، اگر امام علیہ السلام کے حال میں ہے تو اُن کے بلند کردار اور اخلاق کی طرف لطیف اشارے ملیں گے جن میں شاعرانہ بانکپن بھی ہے اور فاروقی صاحب کو بظاہر منطقی ڈھکوسلے کے علاوہ اور کچھ پسند ہی نہیں آتا۔ رونے کے بعد فاروقی صاحب کو انیس کے مرثیوں میں جو کچھ نظر آیا وہ مداحی شہ ذیجاہ ہے۔ اُن کا ارشاد ہے کہ میر انیس نے مداحی پر اتنا زور دیا ہے کہ ہم یہ نتیجہ نکالنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ وہ مرثیہ نگاری کو مداحی کے سوا کچھ نہ سمجھتے تھے یعنی اُن کے لئے مرثیہ لکھنا اور قصیدہ لکھنا بالکل ایک ہی طرح کے عمل تھے۔ (ص ۱۷)

---

[1] سوال بے جا یا بجا کا نہیں ہے بلکہ صرف یہ کہ آیا مراثی میں یہ چیز زیادہ پائی جاتی ہے یا نہیں۔ (نیاز)

امام علیہ السلام کی مصیبت کا بیان بھی ناروا اور مدح سرائی بھی ناگوار[1]! نہ معلوم فاروقی صاحب انیس سے توقع کیا رکھتے ہیں۔ آنکھیں ہوں تو اسی مداحی میں حسین و رفقائے حسین کے شاندار اور پُر عظمت کردار کے شواہد بھی ملیں۔

انھیں یہ بھی شکایت ہے کہ اس مدح سرائی میں کوئی تنوع نہیں۔ امام حسین کی جو تعریف ہو سکتی ہے وہی حضرت عباس کی ہو سکتی ہے، جو تعریف حضرت علی اکبر کی ہو سکتی ہے، وہی حضرت قاسم کی ہو سکتی ہے۔ فاروقی صاحب کے دل کے چور کا پتہ یوں چلتا ہے کہ جو تشابہ پیدا ہوا وہ ایک طرف مابین امام حسین اور حضرت عباس (بھائی بھائی) پیدا ہوا اور دوسری طرف مابین حضرتِ علی اکبر (پسر امام حسین) اور حضرت قاسم (پسر امام حسن) خدا معلوم کیا جواب دیں، اگر کوئی پوچھے کہ مداحی میں ایسی یکسانیت کا احتمال مثلاً مابین حضرت عباس و حضرت علی اکبر کیوں نہ ہوا۔

اور ملاحظہ فرمایئے، ابتدا میں جس گریہ و زاری پر اتنا زور دیا گیا تھا اب اُس کی کیا حالت ہے۔ فرماتے ہیں کہ:-

"ان میں (یعنی سراپا، رجز، جنگ میں) سب سے زیادہ اہم دو چیزیں ہیں، ایک تلوار اور دوسرا گھوڑا۔ ان دونوں کی تعریف میں شدت سے طبع آزمائی کی گئی ہے۔ حتیٰ کہ اگر میر انیس کے مرثیوں میں سے ؟) تلوار اور گھوڑے دونوں کی تعریفیں نکال دی جائیں تو اُن کے مراثی کی ضخامت آدھی رہ جائے" (ص ۲۱)

کیا میں ایک گستاخانہ سوال کر سکتا ہوں ؟ رونے کی ضخامت کتنی رہ گئی جب نصف مرثیہ گھوڑے اور تلوار کی تعریف میں نکل گیا، باقی نصف میں کچھ حصہ چہرے، کچھ سراپا، رخصت، رجز، جنگ وغیرہ کے کام آیا ؟- خود فاروقی صاحب کا جواب موجود ہے :-

"اس کے بعد شہادت کا کچھ بیان ہوتا ہے اور پھر کچھ بند بین اور واویلا کے ہوتے ہیں"۔ (ص ۱۲)

تاہم وہ مصر ہیں کہ مرثیے کا مقصد[2] رونے رُلانے کے سوا کچھ نہیں !

آگے چل کر فاروقی صاحب نے میر انیس پر یہ الزام لگایا ہے کہ انھیں تاریخ سے کوئی سروکار نہ تھا اس لئے اُن کے مراثی میں واقعیت یا حقیقت کی جستجو بیکار ہے۔

---

[1] فاروقی صاحب تو ماشاء اللہ شیعہ ہیں، لیکن غیر شیعی جماعت کے لئے بھی امام علیہ السلام کی مصیبت کا بیان ناروا اور ان کی مدح سرائی ناگوار نہیں ہے۔ کسی علمی یا ادبی بحث میں ایسے فقرے استعمال کرنا جو مذہبی تعریض معلوم ہوں مناسب نہیں ـــــ فاروقی صاحب نے صرف مراثی انیس کی فنی حیثیت کو سامنے رکھ کر اس پر گفتگو کی تھی اور اسی حیثیت سے اس کو دیکھنا چاہئے۔ ورنہ کون شخص دنیا میں ایسا ہے جو حسینؑ کی ذات گرامی کو جامع صفات حسنہ نہ سمجھتا ہو اور واقعۂ کربلا کو تاریخ کی سخت ٹریجڈی نہ تسلیم کرتا ہو۔ (نیاز)

[2] فاروقی صاحب کا یہ کہنا کہ مرثیہ کا مقصد رونے رُلانے کے سوا کچھ نہیں، غالباً اس بنا پر ہے کہ مرثیہ کا اختتام ایسے ہی بندوں پر ہوتا ہے جن کو سنکر بے اختیار رونا آئے اور اسی حالت میں مجلس برخاست کر دی جائے۔ (نیاز)

انیس کا علمی تبحر تو مسلم ہے کون ایسا معمولی استعداد کا بھی مسلمان ہے جسے کربلا کے تاریخی واقعات کا علم نہیں[1]۔ جہاں تک تاریخ کا تعلق ہے واقعات بہتم بالشان ہوتے ہوئے بھی نہایت مختصر تھے۔ حسین علیہ السلام کا یزید کی بیعت سے انکار، ترک وطن، کربلا کے میدان میں بہتر نفوس کا ہزاروں کے نرغے میں گھر جانا، فوج یزیدی کے مظالم، پانی بند ہو جانا تاہم پائے ثبات کو لغزش نہ ہونا، طرح طرح کی ایذائیں برداشت کرنے پر بھی حق کا باطل کے سامنے نہ جھکنا، مردانہ وار مقابلہ و مجادلہ و شہادت۔

علاوہ برایں ارسطو کے وقت سے اب تک نقاد کہتے آئے ہیں کہ شاعری تاریخ نگاری نہیں[2] ہے۔ مولانا شبلی کے الفاظ میں اگر شاہنامہ کے تمام واقعات غلط ثابت ہو جائیں تو اس سے فردوسی کے کمال شاعری میں کوئی فرق نہ آئے گا۔ شاہنامہ پر موقوف نہیں کسی ادبی شاہکار کا تاریخ یا فاروقی صاحب کے ذہن کی روشنی میں جایزہ لیا جائے تو وہ ناکارہ ثابت ہوگا کیونکہ تاریخی معیار پر ایک بھی پورا نہ اُترے گا، ہومر، کالیداس، ڈانٹے، شیکسپیر، ملٹن سب ناقابل التفات ٹھہریں گے۔ تاریخی شہادت اور شاعرانہ صداقت میں ہمیشہ فرق رہا ہے اور رہے گا۔ اسی ذیل میں وہ اختلاف روایت بھی آجاتا ہے، جس پر فاروقی صاحب نے اپنا زورِ قلم صرف کر دیا ہے کہ شہادت حسین کا علم حضرت رسول اور اُن کے ذریعہ سے حضرت علی و جناب فاطمہ کو ولادت امام حسین کے وقت ہوا یا چند سال بعد۔ اس باب میں خود روایات میں اختلاف ہے، انیس نے بھی کسی مرثیے میں ایک روایت نظم کی کسی میں دوسری۔ اس اختلاف کی بنا پر استدلال کرنا اور شاعر کو حقیقت نگاری سے بیگانہ کہنا ایسا الزام ہے جس کی سطحیت بدیہی ہے۔ یہ فرض کرتے ہوئے بھی کہ اس سے انیس کے مراثی میں جہاں تک اس روایت کا تعلق ہے باہمی تضاد پیدا ہوا اُس کے کمال شاعری میں کوئی فرق نہیں آتا۔ کسی بڑے سے بڑے شاعر کا کلام ایسے تسامحات سے پاک نہیں۔ بقول ہارتیس، ہومر بھی بعض اوقات اونگھ جاتا ہے۔

فاروقی صاحب کو پھر رونا یاد آتا ہے لیکن اس مرتبہ "بین" کے روپ میں۔ جہاں تک محاورہ و زبان کا دخل ہے اُن کا فرمانا درست ہے کہ "بین" عورتوں سے مخصوص ہے۔ اس کے باوجود اگر وہ بھائی کی شہادت پر بھائی کے نالہ و فریاد کو "بین" کا خطاب دیں تو اس "سعیِ بےجا پسندی" کے وہ مرتکب ہوئے کہ انیس؟

یہ الزام تو حیرت انگیز ہے کہ انیس کے یہاں صحیح جذبات نگاری کا فقدان ہے۔ کیا اچھا ہو اگر فاروقی صاحب اُن

---

[1] واقعۂ کربلا کا اجمالی علم تو سب کو حاصل ہے، لیکن وہ جزئیات جو مراثی یا "ذکر الشہادتین" ایسی معمولی کتابوں میں ظاہر کیے جاتے ہیں انھیں تاریخی حقیقت سے کوئی تعلق نہیں اور وہ محض "زیب داستان" کی حیثیت رکھتے ہیں۔ (نیاز)

[2] شاعری یقیناً تاریخ نگاری نہیں ہے۔ لیکن جس زمانہ کی تاریخ وہ پیش کرے اس کے ماحول سے ہٹنے کا حق بھی اسے حاصل نہیں ہے اور مراثی انیس پر اعتراض یہی ہے کہ اس کا ماحول سرزمین عرب کا ماحول نہیں بلکہ شاہان اودھ کے لکھنؤ کا ماحول ہے۔ (نیاز)

مثلوں کو لے کر جو مولانا شبلی نے پیش کی ہیں اُن خامیوں اور نقائص کی طرف توجہ دلائیں جو اُن کے زعم میں صحیح جذبات نگاری کے منافی ہیں۔

فاروقی صاحب کا یہ ادعا بھی عجیب و غریب ہے کہ "ہم بین میں ہر ایک شخص کو اپنے سے زیادہ خراب حالت میں دکھاتے ہیں" حالانکہ واجب الاحترام شخص کا غم بھی واجب الاحترام ہوگا اور اُس کے متعلق کہنا کہ ہم اُسے اپنے سے زیادہ خراب حالت میں دکھاتے ہیں بے تکی سی بات ہے۔ اور ملاحظہ فرمائیے "بین" جو عورتوں سے مخصوص تھا، فاروقی صاحب نے اپنے لئے بھی گوارا کر لیا اور فرمایا "ہم بین میں الخ"[1]

اُنھیں یہ بھی اعتراض ہے کہ ایک طرف تو حضرت امام کے صبر کی غلو کے ساتھ تعریف کی جاتی ہے اور دوسری طرف اُنھیں روتا دھوتا اور آہ و زاری کرتا دکھایا جاتا ہے۔ کون سمجھائے کہ صبر و رضا و ثبات نفس کا مظاہرہ باطل کے مقابلے میں ہوا اور ایسے شخص سے ہوا جس کے پہلو میں نرم و نازک اور جذبات رحم و کرم و لطف و مدارا سے لبریز دل تھا جو ایسا سیر چشم اور دریا دل تھا کہ حُر اور اس کے لشکر کی تشنگی نہ دیکھی گئی اور سب کو بے غل و غش سیراب کر دیا وہ بھی اُس وقت جب وہ کینہ و پرخاش پر آمادہ تھے۔ جو ایسا غیور تھا کہ شبِ عاشورا اپنے رفقا پر سے اپنی بیعت اُٹھا لیتا ہے اور کہتا ہے کہ میں تمھیں بطیب خاطر اجازت دیتا ہوں کہ تاریکیِ شب میں جدھر چاہو چلے جاؤ۔ میں ایک اصول کے لئے اپنی جان قربان کر رہا ہوں تم میرے ساتھ کیوں ہلاک ہو اور اس لئے کہ مبادا کوئی شرماشرمی رک جائے یا کسی کے چہرے کا تغیر دل کا بھید ہے شمع گل کر دیتا ہے تاکہ اندھیرے میں چلے جانے کی آزادی حاصل رہے، نیز آفریں ہے اُن وفاداروں پر کہ چلا جانا تو کیسا جوش میں آکر تلواروں کی میانیں توڑ کر پھینک دیتے ہیں یا آگ میں جلا دیتے ہیں یہ کہکر کہ فرزند رسول جب تک دم میں دم ہے آپ کا ساتھ نہ چھوڑیں گے۔ کس قدر غیر فطری ہوتا یہ امر کہ ایسے شخص کی گود کے پالے، اُس کے نورِ نظر و لختِ جگر، اُس کے قوتِ بازو، اُس کے بچپن کے رفیق، اُس کے انصار و یاور خوشی خوشی طرح طرح کے مصائب اور سختیاں جھیل کر اپنی جانیں اُس پر نثار کر دیں۔ اور وہ اُن کی شجاعت و پامردی کی داد دو آنسوؤں سے بھی نہ دے[2]۔ مگر مغرب زدہ ذہنیت ان نزاکتوں کو کیا سمجھ سکتی ہے۔

---

[1] فاروقی صاحب نے بھی تو آخر اسی بین اور ماتم کی فضا میں پرورش پائی ہے، اس لئے اگر وہ اپنے لئے بین کو گوارا کر لیں تو کیا تعجب ہے۔ لیکن ان کو اعتراض اس بات پر ہے کہ آن کا یا اہل لکھنؤ کا بین، امام حسین اور ان کے متعلقین سے کیوں منسوب کیا جائے۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ مصیبت میں ہم بیشک سر پیٹ سکتے ہیں، لیکن خانوادۂ رسول کے افراد ایسا نہیں کر سکتے تھے، یہ اُن کے لئے بہت فروتر بات تھی۔ (نیاز)

[2] شجاعت و پامردی کی صحیح داد آنسو بہانے سے نہیں بلکہ آنسو پی جانے سے دیجا سکتی ہے۔ عرفی لکھتا ہے:-

برو پیالۂ خونیں بجز رقیباں باں
مشو گدائے شہاں کہ شیری دو شند

اور شہدائے کربلا کی یاد میں رونا بالکل وہی چیز ہے جسے عرفی "گدائے شہاں" ہونے سے تعبیر کرتا ہے۔ (نیاز)

اور اُسے یہ کہنے میں مطلق باک نہیں ہوتا کہ :-

"یورپ کے نقطۂ نظر سے یہ بات بہت عجیب معلوم ہوتی ہے" (ص ۲۶)

وائے ہو ہم پر کہ جو کچھ دیکھتے ہیں یورپ کی آنکھوں اور یورپ کی عینک سے دیکھتے ہیں، خود ہمارا نقطۂ نظر ایک سیاہ حلقے کے سوا کچھ نہیں -

فاروقی صاحب کی کائنات کیا ہے وہ اس جملے سے ظاہر ہوگی جس کو نقل کرنا بھی وجہ تامل و تکدر ہے -

"خیر حضرت امیر لکھنؤ کے سعید داماد کی طرح عرض کرتے ہیں" (ص ۲۸)

ایسی ذہنیت اور شخصیت کا مالک انیس کے کمالِ فن اور مختلف کرداروں کے رکھ رکھاؤ کو کیا خاک سمجھتا ہے، اُس انیس کو جو اطفال خاندان رسالت میں بھی اُن کی عمر اور رتبے کا لحاظ رکھتے ہوئے آداب و اخلاق کے اصول قایم کرتا ہے اور اُن کے لہجے نیز انداز گفتار میں فرق اور امتیازی شان دکھا دیتا ہے -

فاروقی صاحب اپنے نزدیک انیس کی بزم نگاری کی ایک دوسری ناقص مثال پیش کرتے ہیں :-

بابا سے یہ کہنے لگی وہ حور شمائل کیوں ؟ مشک نہیں دو، کہ نہ دوں اُسے شہِ عادل
ہر چند کہ بے آب مری زیست ہے مشکل صدقے گئی، سینے میں دھڑکتا ہے مرا دل
حضرت نے سنیں حضرتِ عباس کی باتیں
ماتم کی خبر دیتی ہیں یہ یاس کی باتیں

فاروقی صاحب فرماتے ہیں کہ سکینہ امام حسینؑ سے متوجہ ہو کر جو باتیں کہتی ہیں ان میں پہلی بات تو بچوں کی سی ہے مگر آگے جو باتیں آتی ہیں وہ اگر کسی بچے کی ہو سکتی ہیں تو ایسے بچے کی جو بوڑھوں کی طرح باتیں کرنا سیکھ ہی نہ گیا ہو، بلکہ بوڑھا بھی ہو گیا ہو -

غالباً بند کے آخری تین مصرعے ہدفِ طنز ہیں - واقعۂ کربلا کے وقت حضرت سکینہ کی کیا عمر تھی اس میں شدید اختلاف ہے - روایتوں اور اُن کی صحت یا عدم صحت سے قطع نظر جہاں تک میرا مطالعہ ہے، مرثیہ گویوں نے اُن کی عمر کے ماہ و سال نہیں گنوائے بس اس قدر کہا ہے کہ کمسن تھیں مگر بات چیت اچھی طرح کر سکتی تھیں - یہ صلاحیت پانچ برس سے کم عمر بچے میں نہیں ہوتی - ہمیں یہ بھی نہ بھولنا چاہئے کہ عرب لڑکی نو برس کی عمر میں بالغ ہو جاتی ہے - عمر کچھ بھی ہو باتیں کرنے والی لڑکی کو آنے والی مصیبت کا احساس اور یاس کی باتوں کا اندازہ ہونا اور کہنا کہ میرا دل دھڑکتا ہے اس قدر بعید از قیاس نہیں کہ رائی کا پربت بنایا جائے - یہ تو عام قرائن تھے اب خاص حالات لیجئے - حضرت سکینہ دیکھ رہی تھیں کہ جو بھی میدان کا رخ کرتا ہے زندہ نہیں پلٹتا - اب اُن کے پیارے چچا عباس رخصت ہو رہے ہیں تو کیا ایسا خیال بعید از قیاس ہوگا کہ حضرت سکینہ کو وہم گزرا کہ یہ بھی نہ پلٹیں گے اور جس طرح دوسرے بچھڑے ہوؤں کا ماتم ہوا

ان کا بھی ہوگا۔ یہ بچپن کا تقاضا تھا کہ دل کا دُبدھا صاف صاف بیان کر دیا۔ جو کچھ عرض کیا گیا نفسیات کی بنا پر تھا میر انیس نے اس سے پہلے کے بند میں مایوسی کے قرائن بھی فراہم کر دئے ہیں:۔

عباس نے گودی میں لیا آکے بصد یاس
بہتے تھے جو آنسو خلفِ شیرِ خدا کے
سوکھے ہوئے لب ملنے لگی منہ سے چچا کے

حضرت عباس کے چہرے سے یاس ٹپک رہی ہے، اشک رواں ہیں، اُدھر سکینہ کی پیاس کی شدت کا یہ حال ہے کہ سوکھے ہوئے ہونٹ اُن کے اشکوں سے تر منہ سے ملنے لگتی ہے کہ شاید یونہی پیاس میں کمی ہو وہ اگر کہے کہ سینے میں دل دھڑکتا ہے اور چچا کی باتیں ماتم کا پیش خیمہ ہیں تو کیا گناہ ہوا، البتہ قابل رحم ہے وہ غلاف کے اندر لپٹی ہوئی بالغ نظری جو شاعرانہ لطافت و نزاکتِ خیال واحساس کے سمجھنے اور داد دینے سے قاصر ہے۔ جس نے دل کے دھڑکنے اور ماتم کے مابین ربط قایم کیا، میں نے کبھی ایک شعر کہا تھا جس کی اب قدر ہوتی ہے:۔

یوں دھڑکتا ہے دل زار اثر راتوں کو دور پر جیسے کہیں سینہ زنی ہوتی ہے

انیس کے بڑے نفسیات نگار ہونے سے فاروقی صاحب کا اختلاف بالکل حق بجانب ہے، وہ نہ صرف یورپ کی کورانہ تقلید کرتے ہیں بلکہ اُس نعمت سے بھی محروم ہیں جس کا نام سخن فہمی ہے۔ انتقاد عالیہ تو بہت بعد کی باتیں ہیں۔

فاروقی صاحب ورق کے ورق سیاہ کر گئے مگر اب تک نہ کھلا کہ اُنھوں نے متداولہ مرثیہ کو کس صنفِ[1] میں جگہ دی ہے اور وہ کون سے اصول ہیں جنھیں معیار قرار دے کر کلام انیس کو پرکھا ہے حالانکہ مضمون کی تمہید میں اس کا وعدہ کیا تھا اور مندرجہ ذیل سوالات قایم کئے تھے:۔

۱۔ مرثیہ کیا چیز ہے؟ ۲۔ اس کی خصوصیات کیا ہیں؟ ۳۔ مرثیہ گو کو کن شاعرانہ اصول کا پابند ہونا چاہیئے؟ ۔ مرثیہ کے کیا اہم اصول ہیں؟ ۵۔ مرثیہ گویوں میں عام طور پر اور میر انیس میں خاص طور پر کیا خصوصیات پائی جاتی ہیں؟ ۶۔ کون سی باتیں اُن کے ماحول اور زمانہ سے تعلق رکھتی ہیں اور کون سی فطری ہیں؟

قدرتی طور پر یہ امید تھی کہ وہ پہلے سوالات کے جوابات دیں گے اور اُن جوابات کی روشنی میں مراثی انیس کا جایزہ لے کر کسی نتیجے پر پہونچیں گے، مگر یہ سب امور معرض التوا میں ہیں۔

اُنھوں نے ابتدا ہی میں یہ شکایت بھی کی تھی کہ انگریزی اصطلاحات ایلیجی، ایپک، ڈرامہ، ٹریجڈی وغیرہ کا مروجہ اُردو ترجمہ غلط ہے، لیکن وہ کہیں نہیں بتاتے کہ صحیح ترجمہ کیا ہے یا کیا ہونا چاہیئے۔ اسی طرح اُنھوں نے ادبی تنقید کو بجائے آرٹ کے سائنس کہکر فرمایا ہے کہ:۔

"تنقید کا مقصد تحلیل وتجزیہ ہے جس کے ذریعہ سے ہر موضوع سخن، ہر شاعر، ہر شاعرانہ یا ادبی تحریک کو اپنے

[1] صنف خطابیات (Rhetorics) میں (نیاز)

ماحول میں رکھ کر دیکھا جاتا اور اُس کی بابت اہم نتائج نکالے جاتے ہیں۔ تنقید کا کام رائے قایم کرنا بعد میں ہے پہلے اس کو کچھ واقعات اور حقیقتوں تک پہونچ جانا ہے۔ ان حقیقتوں کی تلاش اور ان کا صحیح بیان ہی تنقید نگار کا اہم فرض ہے۔"

انگریزی میں اس طرز کے نقد کو (Inductive Criticism) استقرائی انتقاد کہتے ہیں۔ ایسی تنقید میں پیشتر سے مقرر کردہ اصولِ نقد کی پیروی نہیں ہوتی بلکہ خود ہر تصنیف سے ایسے قوانین اخذ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے جن کے تحت اُس کی تخلیق ہوئی، بعد ازاں اُن قوانین یا اصول کو پرکھا جاتا ہے اور اُن کی صحت یا عدم صحت پر حکم لگایا جاتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ سائنٹفک تنقید کتاب کی نوعیت متعین کر دیتی ہے اور یہ فیصلہ پڑھنے والے پر چھوڑ دیا جاتا ہے کہ وہ کس پایہ کی تصنیف ہے، اُس کی ادبی قدر و قیمت کیا ہے اور اُس میں کیا کیا محاسن یا معائب ہیں بالکل جس طرح جمادیات کا ماہر یہ بتا دیتا ہے کہ فلاں پتھر کی یہ قسم ہے یہ عمر ہے، اتنی تہیں ہیں وغیرہ وغیرہ۔ اس میں سنگِ سرخ ہے یا سنگِ مرمر یا سنگِ موسیٰ۔ وہ یہ نہ کہے گا کہ فلاں اچھا ہے اور فلاں برا، فلاں گراں بہا ہے اور فلاں کم ارز۔ چونکہ ہمارے فاضل ادب نے رائے قایم کرنے کو یعنی اچھے برے کا فیصلہ کرنے کو بھی اس قسم کی تنقید میں شامل ہی نہیں کر لیا بلکہ برابر رائے زنی کرتے جاتے ہیں لہذا خود اپنی تردید کی اور اپنے مفروضہ طریق کار کو سائنٹفک تنقید کے دائرے سے خارج کر دیا۔ یوں تو رعب جمانے کو ہر شخص دعوے کر سکتا ہے کہ میری تنقید سائنس کا شگرف کارنامہ ہے۔

یہ بھی نہ بھولنا چاہئے کہ ایک کثیر جماعت معتد بہ ناقدین کی ہے جو ادب اور دیگر فنونِ لطیفہ کے جانچنے میں سائنٹفک تنقید کو ٹکسال باہر سمجھتی ہے اور کہتی ہے کہ ایسی تنقید افادی ادب (Didactic Criticism) فلسفہ، سائنس، تاریخ، سیاسیات وغیرہ کے لئے مختص ہے، اس کو فنونِ لطیفہ سے کوئی علاقہ نہیں کیونکہ ان میں عقل و استدلال کے بجائے ذوق و وجدان کارفرما ہوتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ دونوں اقسام ادب افادی و جذباتی کا تعلق راستی سے ہے لیکن دونوں میں راستی تک پہونچنے کے راستے مختلف ہیں۔ ایک میں دلایل و براہین سے کام لیا جاتا ہے، دوسرے میں جمالیاتی احساس ضیا پاشی کرتا ہے۔ شاعری کی پوری اہمیت یوں ہی واضح ہوتی ہے کہ حیات فطرت و حیات انسانی کی تفسیر و تعبیر تخیل اور جذبات کی سرگرمی میں ہو۔

(باقی) مرزا جعفر علی خاں اثر

انیس کی مرثیہ نگاری

از ڈاکٹر محمد احسن فاروقی (لکھنؤ یونیورسٹی)

ڈاکٹر صاحب موصوف نے اس کتاب میں جدید ترین اصول کو سامنے رکھ کر انیس کی مرثیہ نگاری اور شاعری پر بسیط تبصرہ کیا ہے اور انیس کی صحیح شاعرانہ پوزیشن بتائی ہے۔ قیمت علاوہ محصول ڈیڑھ روپیہ

منیجر نگار لکھنؤ

جدید شاعری کا پس منظر

عظمت اللہ خاں

عظمت اللہ خاں کے وہ گیت جن کے کردار معصوم و مظلوم عورتیں ہیں، بہت اہم ہیں۔ ان کا گیت :- "مرے حسن کے لئے کیوں مرے"۔ بہت زیادہ قابلِ توجہ ہے، ظاہری ٹکنیک کے لحاظ سے اس میں صرف ۱۰ بند پائے جاتے ہیں، لیکن معنوی اعتبار سے یہ ایک دبی ہوئی مگر لمبی چیخ ہے اور عورتوں کے دل کی دھڑکن ہے۔ نظم کے دو کردار ہیں ایک عورتوں کے جذبات سے کھیلنے والا مرد اور دوسری ناتجربہ کار بھولی بھالی لڑکی جسے بھلے برے کی کچھ خبر نہیں اور جس کے لئے دل کو موہ لینے والی محبت کی باتیں عیش دوام کا سامان بنی ہوئی تھیں، اول اول تو مرد نے اپنا سب کچھ اس کے حوالہ کر دیا لیکن جب اس کا دل بھر گیا تو اس نے لڑکی کی طرف سے آنکھیں پھیر لیں۔

مری چاہ لی مرا دل لیا جو طلب کیا وہ تمھیں دیا
جونہی حسن سے مرے دل بھرا وہ پھری نگاہ وہ دل پھرا

عورت اپنی افتاد سے مجبور ہے وہ صرف ایک سے محبت کر سکتی ہے۔ اور محبت کا فریب کھانے کے بعد بھی اس کی نسوانیت اسے انتقام کی طرف نہیں لیجاتی وہ جانتی ہے کہ :- "تمھیں یاد آؤں میں پھر اگر تو یہ پاؤ گے کہ وہ خواب تھا"، لیکن ہائے

مرے دل سے ہوگا یہ کب بھلا تمھیں دے سکوں کوئی بد دعا
وہ ہوا جو ماتھے پہ تھا لکھا میرے دل سے آگئی پر صدا
مرے حسن کے لئے کیوں مرے؟ نہیں یئے تھے تمھیں یوں مرے

اس ترکیب بند میں عورت مجسم سکون و امن کا پیام ہے۔ وہ انتہائے غم و اضطراب میں بھی دوسروں کو اس سے محفوظ رکھنا چاہتی ہے اور اپنے طوفان خیز جذبات کو اسی طرح دبا کر رکھتی ہے، جیسے کوئی اپنی عزیز ترین چیز کو چھپا کر رکھے۔ گیت اپنے موضوع، اپنی زبان۔ اپنے اسلوب اور طرزِ ادا کے اعتبار سے اردو میں بڑا کارنامہ ہے۔

دوسرا گیت "مجھے پیت کا یاں کوئی پھل نہ ملا"۔ کئی حیثیتوں سے اتنا ہی اہم ہے جتنا پہلا۔ اس میں بھی موضوع زبان اور اسلوب کے اعتبار سے گیت کی تمام خصوصیات موجود ہیں۔ اس گیت میں جذبہ سچا۔ واقعہ عام اور بیان سادہ اور اثر میں ڈوبا ہوا ہے۔ مقامی رنگ اتنا گہرا ہے کہ ہندوستان کی سوسائٹی اور ہر طبقہ میں واقع ہونے اور ہو سکنے والی

واردات سامنے آجاتی ہے اور پھر ہر کردار کے فطری جذبات کی عکاسی ہے پہلا بند۔

مجھے پیت کا یاں کوئی پھل نہ ملا مرے جی کو یہ آگ لگا سی گئی
مجھے عیش یہاں کوئی پل نہ ملا مرے تن کو آگ لگا سی گئی

کم عمری میں باپ کا مرنا، تایا کے یہاں پرورش، پیاری پیاری باتوں اور معصوم کردار کے باعث۔ گھر بھر کا پیاری ہوجانا۔ تایا زاد بھائی سے بچپن کی محبت۔ ذرا سیانی ہونے پر، گھر میں شادی کے چرچے وغیرہ پر۔

ڈرامہ کا پہلا سین ختم ہوجاتا ہے، لیکن یہ بچپن کے اختتام اور شباب کے طلوع کا مبہم زمانہ ہے جب شادی کا لفظ سنکر چہرہ پر خون دوڑ جاتا ہے۔ بہرحال

اسی طرح گزر گئے چند برس بڑھی عمر ہماری حیا بھی بڑھی

اس کے بعد چنو پڑھنے لگے اور کھولی کو بھی پڑھایا۔ اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ نوکر ہوئے اور شہرت حاصل کی اچھے اچھے پیغام مینھ کی طرح برسنے لگے۔ بچاری سمجھ نہ سکی کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ "یہ مزے کا نیا ہی شگوفہ کھلا"

لیکن تایا زمانہ شناس تھے اونچے گھرانے میں چنو کی شادی ٹھہرائی، یہ ڈرامہ کا نقطۂ عروج ہے۔

گیا ٹوٹ ساجی گئی ٹوٹ وہ آس میری چاہ کا ہوگیا کام تمام

یہ تھا عورت کا ظرف کہ اس کی جان پر بن گئی لیکن اُف نہ کی۔ اس کی دنیا برباد ہوگئی لیکن "میری چاہ کسی پہ نہ فاش ہوئی" عظمت اللہ خاں نے ہندوستانی عورت کی فطرت کی جو عکاسی کی ہے وہ شاید کسی اور شاعر کے یہاں بھی مل جائے لیکن جو اسلوب بیان انھوں نے اختیار کیا ہے اُردو میں ناپید تھا۔ ایک اور گیت ہے "تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو"۔

اس گیت کا کردار ایک مرد ہے یہ گیت بھی ایسی تصویروں کا فلم ہے جس میں شادی سے پہلے بچپن میں غیر شعوری اور تحت الشعوری طور پر جنسی میلانات سامنے آتے ہیں۔ لیکن جیسا کہ آپ دیکھیں گے یہ ایک ادھورا فلم ہے جو ٹھیک اسوقت ٹوٹ جاتا ہے جب طبیعت میں آگے آنے والے واقعات معلوم کرنے کا ایک چاؤ سا پیدا ہوجاتا ہے واقعہ عام ہے لیکن اس حیثیت سے ضرور اہم ہے کہ اس میں ہندوستانی بچوں کی گھریلو زندگی کا ایک سچا نقشہ ہے۔

دونوں کردار پڑوسی تھے۔ دونوں گھروں میں کھڑکی کھلتی تھی۔ غیر ہونے کے باوجود عزیزوں کی طرح رہتے تھے۔ ہنسی کھیل کی عمر تھی جب کوئی بات "نہ بُری بُری نہ بھلی بھلی" تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ لڑنا، روٹھنا، من جانا، چٹکیاں قہقہے اور آنکھ مچولیاں زندگی کا پروگرام تھا۔ اس گیت میں گڑیا کے بیان کے دو بند لاجواب ہیں:۔

وہ تمھاری گڑیا کی شادیاں وہ مرا برات کا انتظام،
مرا باجہ ٹین کا سیٹیاں بڑا شور وغل بڑی دھوم دھام
تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو،

مرا بن کے قاضی وہ بیٹھنا — کہ بیان اس کا فضول ہے
مرا پوچھنا وہ کڑک کے کیا — میاں گڈے گڑیا قبول ہے

تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

گڈے گڑیا کے بیاہ کے بعد خود کردار "دولہا دلھن" کا کھیل کھیلنے لگے :-

میری تم ہمیشہ بنیں بنی، — بہت اس پہ اُڑتی تھی گو ہنسی

اس کے بعد تصویر دل میں دھندلے نقوش ملتے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاعر پر غنودگی طاری ہوگئی، لیکن باوجود اور ادھورا اور نامکمل نقش ہونے کے اس میں کولرج کی نظم Kubla Khan کی سی شان ہے۔ ٹیپ کا بند ردیف کی شکل میں یونس خاں کے یہاں بھی ملتا ہے۔ اور شاید توارد کے اندیشہ اور نقل کے الزام سے بچنے کے لئے عظمت اللہ خاں کا قلم ایک دم رک گیا۔

"دام میں یاں نہ آیئے دل نہ یہاں لگایئے"۔ عظمت اللہ خاں کا تیسرا شاہکار ہے اس میں بھی موضوع حسن و عشق ہے اور ہندوستان کی معاشرت کا ایک مخصوص نمونہ ہے۔ عورت حال کی نوجوان بیوہ ہے اور حسن کے اعتبار سے

حور کہوں کہ یا پری دل کو مرے لبھا لیا، — بیوہ سہی سہاگ کا ایک برس نہیں ملا

دام میں یاں نہ آیئے دل نہ یہاں لگایئے

تشبیہ اور اس کا امتزاجی رنگ شعریت کی جان ہے :-

پھول کہوں میں یا کلی ایک کلی ابھی کھلی، — رنگ کی دل کشی بڑھی غم کی جھلک گھلی ملی

دام میں یاں نہ آیئے دل نہ یہاں لگایئے

مرد کا کردار بھی صاف اور واضح ہے :-

اک تو شباب اور پھر اس کا نشہ نیا نیا — حسن پرست آنکھ تھی من مرا ایک صاف تھا

دام میں یاں نہ آیئے دل نہ یہاں لگایئے

نفسیاتی طور پر ایسے مرد اور عورت کا عشق جو اس جذبہ سے ناآشنا ہوتے ہیں ان کرداروں کے عشق سے مختلف ہوتا ہے جو اس کی چاشنی سے لذت یاب ہو چکے ہیں۔ یہاں عورت "افتد دوانی" کے مرحلے سے گزر چکی تھی اس لئے تجربہ کی قوت کو عظمت اللہ خاں بڑی بڑی نزاکت اور فن کارانہ چابک دستی سے ادا کیا ہے۔ عورت معلم ہے اور مرد متعلم۔

من کو مرے سکھا دیا پہلا سبق پڑھا دیا — جھپ جھپک مری مٹی مرد مجھے بنا دیا

دام میں یاں نہ آیئے دل نہ یہاں لگایئے

محبت کا سبق پڑھنے کے بعد زمین و آسماں نئی روشنی سے جگمگا اُٹھے۔ حُسن کی دھوپ چھاؤں سے اس کی دُنیا

عیش سے مالا مال ہوگئی اور عیش بھی محبت کا مخصوص عیش جس کے سکھ کے ساتھ دکھ کی چاشنی اور دکھ کے ساتھ سکھ کی ترنگیں مل کر زیست کی کیمیا بن جاتی ہے۔ مرد تو عورت ہوگیا لیکن عورت ایسا پھول نکلی جس میں رنگینی تو تھی لیکن خوشبو نہ تھی حُسن تھا وفا نہ تھی۔ حُسن نمود چاہتا تھا اور دولت ہوس میں مبتلا تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک معمر رئیس کے ساتھ شادی ہوگئی جہاں حسن کو نمود و نام مل گیا، اس کا اثر مرد پر جو پڑنا چاہئے تھا پڑا۔ عظمت اللہ خاں نے مرد کے اس تاثر کو انھیں علامات کا سہارا لیکر بیان کیا ہے جو اُردو میں عام ہیں لیکن انداز بیان میں ایک خاص قسم کی تازگی ہے اور تشبیہ و تراکیب کے پیچ سے بچکر نہایت سادگی اور خوبصورتی سے شعر کا تخئیلی پیکر ڈھال دیا۔

روح میں ایک زلزلہ دل سے مرے اٹھا دھواں دھوپ سیاہ پڑ گئی تیرہ و تار تھا جہاں
دام میں یاں نہ آیئے دل نہ یہاں لگایئے

اس سے بعد کا بند ان کے گیت کے حسین چہرہ پر بدنما داغ ہے، عورت کے منھ سے یہ کہلوائے بغیر بھی کہ:-

"کیا ہوا اب بھی تم پہ ہوں فدا، عیش مزے وہی رہیں وہ ہی رہے معاملا" مرد کے دل میں غم اور غصہ کا جذبہ پیدا کر سکتے تھے۔ ایسے موقعہ پر ہر مرد کا ردِّ عمل یہی ہوتا۔

سنتی ہی جی میں آئی یہ گھونٹ دوں بیوفا گلا خون کا گھونٹ پی کے واں سے چلا یہ کہہ چلا
دام میں یاں نہ آیئے دل نہ یہاں لگایئے

ہندوستانی معاشرت کا ایک اور مذموم اور قبیح رُخ "وہ ہوں پھول جس کا پھل نہیں ہے" والا گیت ہے۔ یہ ایک بازاری عورت کی زندگی کا نفسیاتی تجزیہ ہے۔ جس میں ایک ناگوار و تلخ حقیقت سے پردہ اُٹھایا ہے اور داخلیت کا رنگ بھر دیا ہے۔ اُردو ادب میں اس قسم کا ایک آبدار موتی مرزا ہادی رسوا کا ناول "امراؤ جان ادا" بھی ہے اور اس گیت کو پڑھتے وقت معاً یہ خیال آتا ہے کہ شاید عظمت اللہ خاں کا یہ گیت اُس کا منت پذیر ہو۔

ایک بازاری عورت کے اقدار زندگی ہمارے اقدار زندگی سے بالکل مختلف ہوتے ہیں اور اگر ایسا نہ ہو تو اُس کو زندگی بسر کرنے کا سہارا ہی باقی نہ رہے۔ وہ اس عجیب نتیجہ پر پہونچتی ہے کہ:-

کوئی شے بھلی بری نہیں ہے کوئی بات یاں اٹل نہیں ہے ہے یہ زندگی عجب پہیلی کوئی اس کا یاں تو حل نہیں ہے
وہ ہوں پھول جس کا پھل نہیں ہے وہ ہوں آج جس کی کل نہیں ہے

اسے اپنی زندگی کا کوئی مقصد نظر نہیں آتا اور اگر آتا بھی ہے تو صرف یہ کہ موجودہ عیش میں گم رہے۔ ماں کی ممتا بھری گود اور چین سکھ کی پرورش تھی۔ بڑوں کا سایہ اُٹھ گیا، زمانہ نے پلٹا کھایا۔ اپنے بھی پرائے ہوگئے، فاقوں کی نوبت آگئی۔

اس بے کسی کے عالم میں پڑوس کی طوائف نے پیار سے سر پر ہاتھ رکھا۔ اس کے گھر پہونچ کر نئی دنیا نئے دتیرے، نئی گفتگو نئے طریقے۔ نئی جستجو۔ نئے وسیلے نظر آئے۔

مجھے جاؤ جو چلوں سے پالا مری تربیت کا ڈول ڈالا — مجھے گانا ناچنا سکھایا مرے من کو تن بدن کو ڈھالا
وہ ہوں پھول جس کا پھل نہیں ہے وہ ہوں آج جس کی کل نہیں ہے

اس بند میں الفاظ کا انتخاب خوب ہے۔ پرورش، تربیت، تعلیم اور پیشہ کی طیاری کو ایک مذموم ثابت کرنے کے لئے جاؤ بدچلوں، ڈول ڈالا اور ڈھالا سے بہتر الفاظ کا انتخاب نہیں ہو سکتا تھا۔

آخر کار یہ عورت دُنیاوی کامرانی سے سرشار ہو کر دُنیا کے اخلاقی معیار کا مذاق اُڑاتی ہے۔ اپنے استہزا اور تلخ کامیوں سے حاصل کئے ہوئے نتائج کو دُنیا کے سامنے اس طرح پیش کرتی ہے جیسے وہ کوئی نیا پیغام سنا رہی ہو۔ آخری بندوں میں یہ عورت فلسفہ طرازی کرتی ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ ننگے جسم پر تیز بارش کی بوندیں تیر کی طرح پڑ رہی ہیں اس گیت میں وہ پوشیدہ نشتر ملتے ہیں جو تلخ ظرافت یا شوخ تضحیک کا نمونہ ہیں۔ اس گیت میں عظمت اللہ خاں نے چند ایسے مسایل کو بھی چھیڑ دیا ہے جو جنگ کے بعد دنیائے نسواں میں ہل چل ڈالے ہوئے ہیں۔ یہ ہلچل مشرق میں نہ سہی مغرب ہی میں ہو لیکن خیالات مغرب سے مشرق آتے ہوئے دیر کیا لگتی ہے۔ عورت کی زندگی اس کی زندگی کے مقاصد، شادی کے مسایل، ازدواج کی آزادی، سماجی اور اخلاقی معیار سب کے سب از سرِ نو معرضِ بحث میں آچکے ہیں۔ عورتیں سمجھ رہی ہیں کہ مردوں کے بنائے ہوئے اصول پر زندگی بسر کرنا لازم نہیں۔ وہ اپنے اقدار خود قایم کریں گی، اپنے اسلوب خود معلوم کریں گی۔ اس گیت میں عظمت اللہ خاں نے عورت اور اس سے تعلق رکھنے والے تمام مسایل سامنے رکھدئے ہیں۔ اور یہ بھی بتا دیا ہے کہ مردوں کا اس آنے والے انقلاب سے بے خبر رہنا یا اس مسئلہ کو غلط نقطۂ نگاہ سے دیکھنا یا اس کے وجود ہی سے سراسر انکار کرنا عقلمندی نہیں ہے۔

ہندوستانی عورت کی ازدواجی زندگی کے کئی پہلو ہیں۔ ایک زندگی محبت و خلوص کی ہے ایک ایسی جہاں ہمیشہ جھگڑے ہی جھگڑے رہتے ہیں۔ ایک ایسی بھی ہے جہاں زندگی بیوگی میں گزرتی ہے۔ ایک ایسی بھی ہے جہاں سوکن کا جلاپا رہتا ہے۔ سوکن کے متعلق گیتوں کا ادب بھرا پڑا ہے، لیکن کہیں کہیں ایسا بھی ہوتا ہے کہ یہ سوکن پہلی بیوی یا دوسری بیوی کی رضامندی سے گھر میں آتی ہے۔ پھر تلخیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اسی موضوع کی وضاحت ان کے ایک گیت "مونچھ اور چوٹی" سے ہوتی ہے۔ اس نظم میں ایک مرد ایک عورت سے محبت کرتا تھا لیکن اس کی شادی کسی مالدار شخص سے کر دی گئی تاہم عورت کو زندگی میں خوشی نصیب نہ ہوئی۔

الم کے تیر تھے یہ سینہ تھا — یہ گل سے گال، اوس اشک کی
یہ میٹھے لب پہ تلخ جینا تھا — برس رہا تھا ہن۔ یہ زندگی!

اس عورت کو اپنے مالدار خاوند سے نجات مل جاتی ہے (بیوگی سے یا طلاق سے) اس مرد کی بھی شادی ہو چکی تھی لیکن اس کا پہلا عشق برابر تازہ رہتا ہے اور اس موقعہ سے فایدہ اُٹھا کر وہ پھر عشق کا اظہار کرتا ہے۔

مرد کے اظہار تعشق — عورت وارفتہ ہو جاتی ہے وہ دوسرے کو پالینے سے زیادہ یقینی طور پر خود کو پالیتی ہے اس کے حسیات اور جذبات جن سے وہ خود بھی بے خبر ہوتی ہے، یکایک بیدار ہو جاتے ہیں۔ 'حسن میں خود بینی' پیدا ہو جاتی ہے۔ اظہار عشق پر عورت کہتی ہے -

میں ہو چکی تمھاری ہو چکی، (مرا سانس ٹھہرلے ذرا)
جوانی اپنی غم میں کھو چکی، دوبارہ تم نے زندہ کردیا

خود کو دوبارہ پالینے میں جو تلاطم ہوتا ہے وہ روح سے گزر کر جسمانی کیفیتوں تک پہونچ جاتا ہے۔ سانس پھول جاتا ہے منھ سے بات نہیں نکلتی 'مرا یہ سانس ٹھہر لے ذرا' بلا کا ٹکڑا ہے -

سراپا نگاری کے سلسلہ میں ان کی تین نظمیں بڑے معرکہ کی ہیں (۱) موہنی مورت - (۲) اندھرادیس کی سندرتری (۳) من موہن پن - سراپا نگاری میں عظمت اللہ خاں اُردو کے تمام شعراسے آگے نکل گئے۔ ان سے پہلے بھی سراپا نگاری موجود تھی خاصکر مثنوی میں۔ لیکن مثنوی کی سراپا نگاری کی قوت زیادہ تر لباس زیور، اور آرایش پر صرف ہوتی ہو اور جب وہ حسن جسمانی کی طرف مایل ہوتے ہیں تو ثقافت سے گرجاتے ہیں یا تشبیہ و استعارات کی پیچیدگی سے اتنا بوجھل کردیتے ہیں کہ اثر زایل ہو جاتا ہے۔ عظمت اللہ خاں کے اشارات بہت لطیف نازک اور ثقہ ہوتے ہیں۔

مثال کے طور پر پہلی نظم کو لیجئے۔ "موہنی صورت موہنے والی" - اس گیت کے دو بند پورے نقل کئے جانے کے لایق ہیں:-

چال نشیلی، جھومتا بادل یا کوئی ندی لہراتی
چور جوانی میں اٹھلاتی
ڈرتی ڈرتی، بچتی بچاتی رُکتی رکاتی شرماتی
دل کو ملتی دل ترپاتی
ستھری ستھری میٹھی میٹھی، بانسری کی سی آواز
نفیس چڑھاؤ، نفیس اُتار
ہزار راگوں کا ایک راگ لاکھ سروں کا ایک راز
روح میں بیٹھے، دل کے ہو پار

سراپا نگاری کے بعد جو نادر نمونے عظمت اللہ خاں کی شاعری میں ہیں وہ مناظر فطرت ہیں جنکی ایسے الفاظ میں تصویر کشی کی گئی ہے کہ بقول مولوی عبدالحق صاحب 'خود لفظ بلتے اور چلتے ہوئے نظر آتے ہیں' یوں تو 'صبح' اور 'پیپل' میں بھی فطرت نگاری اچھی خاصی ہے، لیکن 'برکھا رت کا پہلا مہینہ' بہت بلند ہے۔ کیونکہ اس سے مقصود قوم میں

ہمت، ولولہ اور قوت ارادی کا استحکام ہے۔ بارش کے مختلف مناظر کا اتنا سچا عکس اور کہیں نہیں ملتا۔ یہ خاص[1] ہندی چیز ہے۔ ہندی ہی بحر میں ادا کی گئی ہے، جو اس کے لئے موزوں بھی ہے۔ ہندی کے پیارے اور شیریں الفاظ کا میل اُردو فارسی لفظوں کے ساتھ اس طرح ملایا ہے کہ کلام کا حُسن دو بالا ہوگیا ہے اور سریلا پن کہیں ہاتھ سے نہیں جانے پایا، کالے بادل مست ہاتھیوں کی طرح سب کے یہاں جھومتے نظر آتے ہیں لیکن ان کو امڈتا۔ پھیلتا۔ اور جھکتا کسی نے نہیں دکھایا۔ پون کے گھوڑے، کسی کے یہاں سہمے اور ٹھٹکے نہیں۔ آکاش کے تیور نہیں بگڑے۔ آسمان کی تیوری پر عظمت اللہ خاں ہی کے یہاں بل پڑگئے ہیں، نازک خیال شاعر نے اپنے خیالات و جذبات کے اظہار میں بڑی کاوش کی ہے اور تشبیہات کی جدت میں کمال دکھایا ہے۔ بجلی کی تشبیہیں کس قدر سچی ہیں۔ بجلی دوسرے شعراء کے یہاں ناگن کی طرح لہرائی ضرور ہے لیکن لہریا نہیں کاڑھا اور نہ بیل بنائی۔ بجلی صاعقہ بھی بنی اور خاطف بھی تڑپی تڑپائی سب کچھ ہوا لیکن "بھاپ کے دریا میں نور کی مچھلی کی طرح" عظمت اللہ ہی نے تیرایا۔ عظمت اللہ خاں کے یہاں الفاظ صرف ہلتے اور چلتے ہی نظر نہیں آتے بلکہ بولتے ہیں۔ انگریزی شاعری میں ایک شاعرانہ حسن یہ بھی ہے کہ الفاظ کی آواز ہی سے معنی اور اس کی نوعیت خصوصی کا اندازہ ہو جائے۔ مندرجہ ذیل بند میں گرج کی کرخت آواز کے لئے اس نوعیت کے الفاظ کا استعمال کیا گیا ہے۔ ڑ اور ٹ کا تواتر دیکھئے:-

بادل گرجے وہ گھڑگھڑاہٹ آئی لڑھکتی لڑھکاتی
کروڑہا گھوڑے دوڑاتی
باڑھوں پہ باڑھیں داغتی آئی اور کڑکتی کڑکاتی
پہاڑ لڑھکاتی ٹکراتی
گرج اور کڑک سے پون کے گھوڑے بدک گئے
سوندھا سوندھا چھینٹا آیا
پون کے جھکڑ چلے اور زور کا پانی دھا دھائیں برسنے لگا۔

بجلی ناچے تھاپ گرج کی مینھ نے چھیڑ دیا ستار۔
پون کا گانا وہ سائیں سائیں
جب بادل برس چکے تو دم لے لیکر زور سے آیا تھم تھم کر زور گھٹایا۔
بادل اب بھی ہیں
لیکن بھورے بھورے ہو چلے، جیسے دھنکے دھنکائے گالے ہوں۔

جیسے دھواں ہوا میں بل کھا رہا۔ مینھ کی بارش کے ساتھ ساتھ تشبیہ و استعاروں کی بارش بھی دیکھئے۔ بجلی اب ایسی چمک رہی تھی جیسے نور کی چادر پھیل جاتی ہے۔ اور بادلوں کی گرج ایسے معلوم ہوتی تھی کہ کہیں دور ڈھول بج رہے ہوں پہلے بند میں کرخت آواز والے الفاظ کی دھوم سنی، اب ملائم آواز والے الفاظ کا کرشمہ دیکھئے۔

دھیما دھیما مینھ بھی چھم چھم پون ملائم اتراتی -
اٹھکھیلیاں کرتی اٹھلاتی
چکنے چکنے پتوں پر سے موتی سی بوندیں ڈھلکاتی -
کھیلتی آتی چھیڑتی جاتی

---

[1] رسالہ اُردو ۲۳ء عبدالحق صاحب

جہاں پر الفاظ ملتے اور چلتے نظر آتے ہیں اس کی بھی ایک مثال دیکھ لیجئے بادل طرح طرح کی شکل بناتے۔
پھیلتے پھٹتے ملتے ملتے سمٹتے سمٹاتے۔ دوڑتے تھمتے چلتے چلاتے
نگاہوں سے غائب ہو جاتے ہیں۔

انھوں نے ایک نظم "وطن" بھی لکھی ہے، لیکن یہ ان کی زیادہ کامیاب نظم نہیں ہے۔ اس میں وہ غلامی، تفرقہ، جہل۔ ذات پات کی گلیوں میں بھٹک جاتے ہیں۔ اس سے زیادہ کامیاب ان کا 'پیارا پیارا گھر اپنا' ہے جہاں انھیں سکھ چین ملتا ہے۔ دکھ درد کی دوا ملتی ہے، جہاں گھر والی سندر چترا' سیوا کرتی ہے ———— جہاں بچے گھر سر پر اُٹھا لیتے ہیں۔ جہاں ہنسنا ہے ہنسانا ہے'، روٹھنا ہے منانا ہے اور سوتے سلاتے کہانیاں ہوتی ہیں۔ یہی گھر انسان کو انسان بناتا ہے۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ قدرت نے ان کو داخلی گیت گانے کے لئے پیدا کیا تھا اور جب جب انھوں نے خارجی شاعری میں قدم رکھا یا تو ناکامیاب لوٹے یا اسے بھی داخلی بنا دیا۔ خارجی شاعری کی طرح اخلاق اور فلسفہ بھی ان کے بس کی بات نہیں تھی۔ 'جیت کی کنجی' اور 'اگر موت بن خواب کی مثل ہووے' بڑی پھیکی اور غیر دلچسپ چیزیں ہیں۔ لیکن ایک آرٹسٹ اپنا آرٹ دریافت کرنے سے پہلے سیکڑوں نقش بناتا بگاڑتا ہے۔ افسوس ہے کہ عظمت اللہ خاں کی عمر نے وفا نہ کی، اگر وہ اپنی عمر طبیعی کو پہونچتے تو یقیناً گیت کو اور حسن و عشق کے موضوع کو اپنے لئے مختص کر لیتے اور نہ معلوم کیسے کیسے جواہر ریزوں سے اُردو کے دامن کو بھر جاتے۔

بسم اللہ بیگم

طوفان محبت

حضرت ہوشؔ بلگرامی المخاطب بہ ہوش یار جنگ کی معیاری مثنوی۔ جس میں حسن و عشق کی دلدوز داستان اس زبان اور لب و لہجہ میں بیان کی گئی ہے جس کو اب دُنیا ترس رہی ہے اور کہیں نہیں پاتی۔

اس مثنوی کو وہ خصوصیت جو کسی اور مثنوی میں نہیں پائی جاتی یہ ہے کہ اس میں مذہب و اخلاق کے نکات بھی انتہائی دلآویز رنگ میں بیان کئے گئے ہیں۔ ابتدا میں فاضل مصنف نے مثنوی نگاری پر تاریخی و تنقیدی روشنی بھی ڈالی ہے اور حضرت نیاز فتحپوری کا ایک بسیط مقدمہ ہے جس میں وہ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ :- "فنی محاسن اس مثنوی میں جابجا اتنے بکھرے ہوئے ہیں کہ نہ ان کو میں سمیٹ سکتا ہوں اور نہ وجدان ان کی وضاحت سے مطمئن ہو سکتا ہے۔" ظاہری حسن کے متعلق غالباً اس قدر کہنا کافی ہوگا کہ وہ بہترین بیرونی ٹائپ میں چھپی ہے اور نہایت دبیز ولایتی کاغذ استعمال کیا گیا ہے

ضخامت ۲۹۸ صفحات۔ قیمت مجلد سات روپیہ۔ غیر مجلد پانچ روپیہ

ملنے کا پتہ :- سکریٹری نواب ہوش یار جنگ۔ سرفراز منزل۔ برکت پورہ۔ حیدرآباد۔ دکن یا منیجر نگار۔ لکھنؤ

کیا کیا نہ کیا —— دولت کی خاطر!

دولت کی خاطر سب سے پہلے میں نے بھیک مانگنا شروع کیا۔ اس کے لئے کسی اہتمام کی ضرورت نہ تھی، صرف حلیہ کفایت کرتا تھا جو مجھے میسر تھا اور جس پر مجھے ہمیشہ اعتماد رہا۔ اعتماد سے اعتماد پیدا ہوتا ہے، حلیہ پر اعتماد ہونے سے مجھے بھیک مانگنے پر —————— یہاں سے بڑھا تو قرض لینے پر اعتماد ہوا، پھر چوری پر، پھر سینہ زوری پر، پھر شعر و ادب پر، اس سے بڑھا تو پھر اپنی اصلیت پر آ گیا، یعنے بھیک مانگنے پر، اسے کہتے ہیں گھن چکر، میرے حصہ میں یہی چکر آیا۔ بعضوں کے حصے میں اور بہت سے چکر آئے ہیں۔ آپ کیوں اس چکر میں پڑیں۔

میں نے بھیک مانگنا شروع کیا تو بھک منگوں نے شاعری شروع کر دی۔ اب میرے لئے بڑی مشکل تھی۔ وہ یوں کہ لوگ یہ تمیز نہیں کر سکتے تھے کہ بھک منگا کون ہے اور شاعر کون ہے۔ تمیز گھٹتی ہے تو دولت بڑھتی ہے لیکن جہاں دولت پہلے سے نہ ہو وہاں اس کے سوا چارہ نہیں کہ بھک منگے اور شاعر بڑھتے رہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میونسپلٹی نے قانون پاس کر دیا کہ بھیک مانگنا جرم ہے۔ سارے بھک منگے شہر بدر کر دئے جائیں ان کے ساتھ شاعر بھی نکالے گئے انھوں نے خلد سے آدم کے نکالے جانے اور کسی کی گلی سے خود اپنے نکالے جانے کا شعر بھی پڑھا لیکن ایک پیش نہ گئی۔ کہا یہ گیا کہ آدم اس لئے نکالے گئے کہ وہ ضرورت سے زیادہ آدمی تھے اور تم اس لئے نکالے جا رہے ہو کہ سرے سے آدمی نہیں ہو، اتنا بھی کسی نے نہ دیکھا کہ کتنے بھک منگے شاعر تھے یا شاعر بھک منگے۔ اب ان کی اوقات یہ رہ گئی تھی کہ دن بھر بھیک مانگتے، رات کو مشاعرہ کرتے۔ زندگی کا یہ انداز بہت مقبول ہوا، ایک نئی میونسپلٹی وجود میں آ گئی ظاہر ہے کہ کوئی زندگی میونسپلٹی سے خالی نہیں، بھک منگے ممبر بنے، شاعر دو ٹرہ گئے مجھ میں دونوں کے خواص پائے گئے، اس لئے میں چیرمین تسلیم کر لیا گیا۔

لیکن یہاں میں نے جلدی سے کام لیا، کام کی کچھ باتیں چھوٹ گئیں —— دولت کمانے شعر کہنے اور مار کھانے کا کوئی اصول نہیں، طریقے بہت سے ہیں، یہی سبب ہے کہ بھک منگوں اور شاعروں کا آج تک کوئی کچھ نہ بگاڑ سکا۔ انھوں نے سب کچھ بگاڑا ہے، آپ نے سنا ہو گا کسی چیز کے حاصل کرنے کے لئے تین طریقے بہت عام ہیں، بھیک مانگنا، قرض لینا، چوری کرنا ان میں ہر ایک ایسا ہے جو سلیقے سے نہ برتا جائے تو آدمی جیل یا جہنم کو چلا جاتا ہے، اور سلیقے سے برتا جائے تو نورٌ علیٰ نور۔

دولت کمانے کی ان تینوں عیادتوں کو میں نے بڑے سلیقے سے برتا ہے۔ میر نے کہا ہے:۔ "مرے سلیقے سے میری نبھی محبت میں"

میرا کہنا یہ ہے کہ بھیک مانگنے میں بھی کچھ کم سلیقے کی ضرورت نہیں پڑتی مثلاً یہی دیکھئے کہ بھیک اس طرح مانگے کہ لوگ چندہ مانگنا سمجھیں یا چوری اس طرح کرے کہ لوگ سمجھیں مذاق یا قوم کی خدمت کر رہا ہے۔ یا قرض اس طرح مانگے کہ لوگ سمجھیں ملک خطرے میں ہے یا بیک وقت سب کچھ کر رہا ہو اور ہم آپ سمجھیں ترقی پسند ہے۔ یہ سب سلیقہ ہی کا کرشمہ ہے یا کسی اور کا!

بھیک مانگنے والوں نے اس فن کے جواز میں بتایا ہے کہ بھیک مانگنا دراصل بھیک مانگنا نہیں ہے بلکہ بھیک دینے والے کو اس کا موقع دینا ہے کہ وہ خدا کو قرض دے جسے خدا آخرت میں ادا کر دے گا۔ میں اب تک یہ دریافت نہیں کر سکا ہوں کہ دنیا و آخرت میں کون رقبہ "سافٹ کرنسی" میں ہے اور کون "ہارڈ کرنسی" میں اور شرح مبادلہ کیا ہے۔ اقبالؔ نے ایک جگہ کہا ہے کہ اپنی خودی کو اتنا بلند کر دکہ خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے۔ ممکن ہے خودی کے بلند ہو جانے پر خدا بندے کی رضا پوچھنے کے بعد خودی کے مقررہ معیار پر نظر ثانی کر ڈالے۔ مجھے شبہ ہے کہ میری خودی کبھی بھی اتنی بلند ہو سکے گی کہ خدا مجھے میری رضا پوچھنا گوارا کرے گا۔ میں نے بھی بھیک مانگنے میں خدا سے کبھی نہ پوچھا کہ اس کی رضا کیا ہے۔ مجھے تو اکثر اس کا اندیشہ رہا کہ جو لوگ مجھے بھیک دیتے ہیں خدا ان کی رضا طلب کرنے کے بجائے ان سے جواب طلب کرے گا!

چور بازاری کی آمدنی پر خدا کو مقروض کرنا بالخصوص ایسی حالت میں کہ شرح مبادلہ زر طے نہ ہو، میرے نزدیک کوئی خیر خواہانہ فعل نہیں ہے۔ لیکن میں ایمانداری سے بھیک مانگتا ہوں یا نہیں اتنی بات ضرور ایمانداری سے کہوں گا کہ میں نے اتنی بھیک نہیں مانگی کہ بھیک دینے والے کو آخرت میں کچھ زیادہ آمدنی کی توقع ہو۔ مجھے امید ہے خدا میری اس خدمت کا لحاظ ضرور رکھے گا!

میں نے ابھی ابھی عرض کیا تھا کہ دولت کمانے کے تین طریقے بہت مقبول ہیں، ان تینوں میں میں نے بھیک مانگنا اختیار کیا تھا، آپ یہ معلوم کر کے خوش ہوں گے کہ قرض لینا اور چوری کرنا دراصل بھیک مانگنے ہی کی بدلی ہوئی صورتیں ہیں، یہ تو توقع یا مصلحت ہوتی ہے کہ ہم کسی کو بھیک منگا نہیں مقروض یا چور کہتے ہیں اور یہ ہماری کمزوری ہے کہ ہم ایک بھیک منگے کو چور کہتے ہیں اور دوسرے بھیک منگے کو غریب پرور سلامت۔ اور گردش حال یہ بھی ہے کہ غریب پرور سلامت پر بُرے دن آتے ہیں تو ہم ان کو ایسے لقب سے یاد کرتے ہیں جس سے بھیک منگے مقروض اور چور کو بھی شرم آئے!

قرض لینے کا ایک بڑا فائدہ یہ بھی ہے کہ آپ کو پیسے کی اہمیت کا صحیح اندازہ ہو جاتا ہے۔ قرض دینے والا جب آسیب کی طرح آپ کا پیچھا کرنے لگتا ہے اس وقت آپ محسوس کرتے ہیں کہ پیسے کا پاس ہونا یا نہ ہونا کیا اہمیت رکھتا ہے۔ یہ بات میں نے کچھ یوں ہی سی کہہ دی ہے اور آپ کے لئے نہیں ہے بلکہ ان لوگوں کے لئے ہے جو شاید بھیک مانگنے کی بھی اہلیت نہیں رکھتے ــــ لیکن خرچ کرنے میں خاصے فار ورڈ بلاک ہوتے ہیں!

قرض لینا بڑے ریاض کا فن ہے اس میں ذرا سی چوک ہو جائے تو آدمی کہیں کا نہیں رہتا، قرض کا علاج صرف قرض ہے۔ علاج سے ذرا غفلت برتی جائے تو مریض کہیں کا نہیں رہتا۔ قرض میں ٹھہراؤ ہوا نہیں کہ فن کا زوال ہو گیا جس طرح انسانی فضایل کی تکمیل میں عقل اور عشق دونوں کی کارفرمائی ہوتی ہے، اسی طرح قرض کے فن کی تکمیل میں بھی عقل و عشق کا دخل ہوتا ہے۔ یہاں بھی ابتداً عقل کی اور اس کے بعد عشق کی ضرورت قدم قدم پر محسوس ہوتی ہے، اس لئے کہ عقل تو "تماشائے لب بام" سے آگے نہیں بڑھتی، آتش نمرود یا آتش مفروضی میں عشق ہی کود پڑتا ہے۔

دولت کی خاطر قرض لینا پڑتا ہے لیکن جب تک دولت نہ ہو اس وقت تک قرض نصیب بھی نہیں ہوتا۔ دولت نہ ہو اور قرض لینا پڑے تو پھر شخصیت کی ضرورت پڑتی ہے۔ شخصیت کی پہچان یہ ہے کہ قرض آسانی سے لے سکے اور جب ادا کرنا چاہے تو قرض خواہ برا مان جائے! بالفاظ دیگر قرض دار میں شخصیت ہونی چاہئے اور قرض خواہ میں محبت۔ بظاہر بات عجیب معلوم ہوگی لیکن یہ عجیب ہے نہیں اس لئے کہ قرض دینے والا محبت نہ کرے تو میں اس کا قرض کیوں ادا کرنے لگا، میں جس سے قرض لیتا ہوں اس سے ایک طرح کا سمجھوتا ہوتا ہے۔ یعنی قرض لے کر ہم نے ایک دوسرے کو اس کا مچلکہ دیا ہے کہ تا ادائیگی قرض آپس میں شریفانہ طور طریقے برتیں گے۔ اس قرض پر نیک چلنی کے مچلکہ کے بنانے کا تمام تر بار قرض لینے والے پر ہوتا ہے۔ میں صرف اتنی احتیاط برتتا ہوں کہ قرض دینے والے کو اپنے حسنِ سلوک ورنہ صرف حسنِ نیت سے یہ ظاہر کر دیا کرتا ہوں کہ صلح و شرافت کے اعلیٰ مقاصد کے پیشِ نظر حتی الوسع یہ قرض ادا کیا جائے گا، یہی نہیں بلکہ اس قرض میں اضافہ ہوتا رہے گا، بقول شخصے "چو محمل را گراں بینی"!

یہ اس لئے کہ صلح و شرافت کی حیثیت ایک عفیفہ کی ہے جس کے تحفظ اور سلامتی کی متواتر اور مسلسل کوشش نہ کی جائے تو اس کا ہر وقت اندیشہ ہے کہ غیر ذمہ دار اس کی عصمت نوٹ لیں گے۔ اس بنا پر میرے نزدیک بھیک بطور قرض مانگی جا سکتی ہے اور قرض بطور تاوان لیا جا سکتا ہے، چوری بھی اس سے دور نہیں!

دولت کمانے کا تیسرا وسیلہ چوری ہے۔ اس کا رشتہ بھیک اور قرض دونوں سے ہے۔ "دونوں کو اک ادا میں رضامند کر گئی!" کم بھیک یا قرض مانگنے والے ایسے ہیں جو چوری کے مرتکب نہ ہوتے ہوں۔ میں ان کم لوگوں میں نہیں ہوں چوری کا مدار ہمیشہ کسی کی حق تلفی پر نہیں ہوتا، اپنی خوش قسمتی پر بھی ہو سکتا ہے اور دنیا میں کون ایسا بدنصیب ہے جو کسی نہ کسی حد تک خوش قسمت نہ ہو۔ میں بھی خوش قسمت ہوں اس لئے چوری سے باز نہ آیا۔ مجھے ٹھیک یاد نہیں کہ میں نے بھیک قرض یا چوری کا مشغلہ کب سے شروع کیا، ختم کر دینے کے بارے میں بھی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ بقول اقبالؔ "کارِ جہاں دراز ہے" ایک طرح کی رسی بھی دراز ہوتی ہے، میرا خیال ہے کہ آپ کو اس پر اصرار بھی نہ ہوگا کہ میں یہ بتاؤں کہ یہ مشاغل میں نے کب سے شروع کئے۔ خود آپ میں ایسے لوگ موجود ہوں گے جو یہ نہ بتا سکیں گے کہ فطرت یا سوسائٹی کے مطالبات گناہ انھوں نے کب سے ادا کرنے شروع کئے۔ اسی وقت بانزاکت کے پیشِ نظر عقل مندوں نے "گناہِ ازلی" کا نظریہ ایجاد کیا اور ہم نے

آپ نے نکاح ثانی اور مہر شرعی کا! اس طور پر میرا خیال ہے زندگی کی ہر سرگرمی کا شجرہ نسب ان نظریات کی روشنی میں دریافت کیا جا سکتا ہے!

"دولت کی خاطر میں نے کیا کیا نہ کیا" پر اظہار خیال کرنے میں ایک قباحت یہ بھی ہے کہ اس سے میری اس ہر دل عزیزی کو صدمہ پہونچنے کا اندیشہ ہے جو انکم ٹیکس والوں اور چور بازار کے کاروباریوں میں مجھے یکساں طور پر حاصل ہے۔ در اصل میں دولت پیدا کرتا ہی ہوں۔ انہی دونوں کی خاطر۔ میں چور بازار والوں کا احسان مند ہوں اس لئے وہ یہ کبھی نہیں پوچھتے کہ میں نے روپیہ کہاں کمایا اور کیسے کمایا۔ میں انکم ٹیکس والوں کا بھی شکر گزار ہوں کہ وہ اتنا پوچھتے ہیں کہ کتنا کمایا۔ ریڈیو والوں کے بارے میں کیا عرض کروں جو یہ دریافت کرنے پر تلے ہیں کہ کیونکر کمایا، انکم ٹیکس کا تو مقصد یہ ہے کہ اتنے میں اتنا رکھتے جاؤ۔ چور بازار والے اس کے درپے رہتے ہیں کہ سب کچھ رکھ جاؤ۔ ریڈیو اس فکر میں ہے کہ جیل خانے بھی جاؤ!

بھک منگائی، قرض، چوری کے تجربات ابھی پورے نہیں ہوئے تھے کہ میرا سابقہ ایسے زمانے اور ایسے لوگوں سے ہوا ______ جو دولت پیدا کرنے کے بجائے دولت لوٹنے کی عبادت میں مبتلا تھے۔ مجھے لوٹنے والوں کے ہتھکنڈے معلوم تھے لیکن عقل کے اعتبار سے میں کچھ ایسا مرنجاں مرنج واقع ہوا تھا کہ جس آسانی سے دوسروں کی کامیابی دیکھتا اور للچاتا تھا اس سے بدرجہا زیادہ غور و فکر کے بعد بھی اور غالباً اسی وجہ سے، اپنی نالائقی کا اندازہ نہ کر سکتا تھا۔ میں نے لفنگوں کو لیڈر بنتے دیکھا لیکن خود لفنگا بننے کی کوشش شروع کی تو لفنگوں نے مار گرایا، وہ بھی اس شان سے کہ نہ خود لفنگا بن سکا نہ لفنگوں کا کچھ بگاڑ سکا۔ چور بازاری شروع کی تو چور بازار والوں نے مجھے خفیہ پولیس اور خفیہ پولیس نے دہشت پسند قرار دے کر چالان کر دیا اور ایک خاتون مجسٹریٹ نے ناقص العقل قرار دے کر چھوڑ دیا۔

اب میں نے سوچا کہ جمعہ کے دن نمازیوں کی جوتیاں چرا دوں گا۔ گاؤں کی معمولی سی مسجد تھی۔ حلیہ نے دغا دی، نمازی یہ سمجھے کہ میں واعظ ہوں۔ نماز کے بعد ہاتھ چومے، منبر پر بٹھایا اور وعظ سننے کے لئے سر بزانو ہو گئے۔ میں نے زکوٰۃ کی فضیلت اور جوتے چرانے کی معصیت پر تقریر شروع کر دی۔ میرا خیال ہے کہ میرے وعظ کا جو اثر ہونا چاہئے تھا وہ نہیں ہو رہا تھا، اس لئے کہ جن پر زکوٰۃ واجب آتی تھی وہ اونگھنے لگے تھے اور جن کی نیت جوتے پر تھی وہ رہ رہ کر کن انکھیوں سے کچھ اس طرح میری طرف دیکھتے تھے کہ مجھ پر غشی سی طاری ہونے لگتی تھی۔ باہر نکلا تو جوتا غائب! معلوم ہوا کہ اس دیار میں لوگ جوتے پہنتے نہیں لاٹھی پکڑ کر چلتے ہیں اور لاٹھی کندھے پر ہوتی ہے۔ مزید گفتگو پر یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ لوگ بگڑ بیٹھتے ہیں تو جوتا سمیت لاٹھی سے خبر لیتے ہیں اور عدالت اس کا مطلق لحاظ نہیں کرتی کہ آپ لاٹھی کے علاوہ جوتے سے بھی پٹے ہیں!

پھر میں نے خیال کیا کہ مکتب میں مدتوں معلمی کی ہے کیوں نہ کسی شاگرد کے یہاں قسمت آزمائی کی جائے۔ گاؤں میں ایک کھاتے پیتے کاشتکار تھے جنہوں نے مجھ سے سالہا سال حروف تہجی کا درس لیا تھا اس زمانے میں بنیادی تعلیم کا طریقہ

یہ تھا کہ ایک حرف بتایا اور فوراً ہی کان مروڑ دیئے تاکہ وہ حرف فرار نہ ہونے پائے۔ بالآخر کچھ ایسی صورت ہو جاتی تھی کہ تڑے مڑے کان اس قابل نہ رہ جاتے کہ کوئی اور حرف اندر داخل ہو سکے۔ انھوں نے بڑی محبت سے پذیرائی کی۔ کئی دن تک خاطر مدارات رہی۔ اس دوران میں کتنوں کو مذہب کی اہمیت اور فاتحے کی فضیلت بتائی، کتنوں کی جھاڑ پھونک کی، کسی کی صورت دیکھ کر اولاد کی تعداد بتائی اور کسی کا تیور دیکھ کر شادی کی ضرورت جتائی۔ جن کے مقدمے دائر تھے ان کے لئے جھوٹے بیانات تصنیف کئے، پٹواری سے ڈرنے اور زمیندار سے لڑنے کی تلقین کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ چلنے لگا تو اچھا خاصا مالِ غنیمت ساتھ تھا، ایک بوجھ گنے اور گیہوں کی ہری ہری بالیوں کا، چند سیر گڑ، کچھ اچار، ایک تھان گزی کا، ایک عدد مرغ، دو روپے سے کم کی ریزگاری۔ ان سب کو لاد پھاند کر گاؤں سے رخصت ہوا۔ راستے میں تھانے کی چوکی پڑتی تھی، ہیڈ صاحب کی نظر پڑی، پکڑ بلایا۔

ان دنوں آس پاس کے گاؤں میں چوریاں ہو رہی تھیں اور چور کا پتہ نہیں لگتا تھا، جو چیزیں چوری ہوئی تھیں اور جن لوگوں پر شبہ تھا ان کی فہرست اور حلیے قلم بند تھے۔ جو چیزیں متفرق طور پر مختلف اوقات میں چوری گئی تھیں وہ مجموعی طور پر میرے قبضے سے برآمد ہوئیں اور جن لوگوں پر شبہ تھا ان کے حلیے کے مختلف اجزا مجموعی طور پر میرے حلیے میں ملے۔ ہیڈ صاحب نے فرمایا کیوں، "آنچہ خوباں (دزداں) ہمہ دارند تو تنہا داری"! میں نے آہِ سرد کھینچ کر کہا "بہار آفرینا گنہگار ہیں ہم"! نتیجہ یہ ہوا کہ سارا سامان ضبط کر لیا گیا اور مجھے ہدایت کی گئی کہ آئندہ اس نواح میں نہ پایا جاؤں!

دولت کی خاطر میں نے "گرو مور فوڈ" (خوراک زیادہ پیدا کرو) کی تحریک پر بھی عمل کیا ہے۔ اس میں سب سے پہلی یہ دقت محسوس ہوئی کہ جب تک زیادہ کھایا نہ جائے اس وقت تک زیادہ خوراک کیسے پیدا کی جائے۔ یہاں کھانے کو جو کچھ مل رہا تھا وہ پہلے ہی سے "خونِ دل بے منتِ کیموس تھا"! بہرحال ایک قطعہ آراضی حاصل کیا اور مریل بیل اور ایک شکستہ ہل بہم پہونچائے۔ فن کاشتکاری پر ایک کتاب چرائی۔ "گرو مور فوڈ" کے مسئلہ پر شکم سیر لیڈروں کی جتنی تقریریں ہوئی تھیں۔ وہ سب اپنے اوپر دم کیں، قوم کے لئے نعرہ لگایا، اپنے آپ پر لعنت بھیجی، اور باشیوں کے تیور اور دلدروں کے حلیہ میں کھیت پر پہونچا، ہل کو ہاتھ لگایا، چابک کو اونچا کیا اور بیلوں کو دو ایک رسید بھی کر دئے۔ تھوڑی ہی دور گیا تھا کہ ایک جگہ پاؤں مڑا، زمین پر آ رہا لیکن ہل کو نہ چھوڑا اور گھسٹتا چلا گیا جو زمین ہل سے کھدی تھی وہ ہموار ہو گئی اور ایک ایسا طریقہ دریافت ہو گیا جس سے بیک وقت زمین جتتی جائے، بیج پڑتے جائیں اور زمین ہموار ہوتی جائے۔ یہ طریقہ ذرا شکم خراش ضرور تھا، لیکن فوراً ہی کسی بڑے جنرل کا قول یاد آیا کہ فوج پیٹ کے بل مارچ کرتی ہے۔ میں نے دل کو سمجھا دیا کہ گرو مور فوڈ میں بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔

تفصیل میں طوالت ہے، مختصر یہ کہ ایک گڑھے میں برسات کا پانی جمع تھا، اس میں سنگھاڑے کی بیل ڈال دی

...بکھیر دئے، کچھ تریاں بو دیں، دن رات کی کروٹوں کے ساتھ آفاتِ ارضی و سماوی بھی کروٹیں
...خیریت رہی لیکن پودوں کے نمودار ہوتے ہی آفات نے کروٹیں لینا بند کر کے چھلانگیں مارنا شروع
...تھا کہ میں نے کہاں کیا بویا تھا، اور کس قسم کی کاشتکاری شروع کی تھی، لیکن یہ بالکل معلوم نہ تھا کہ
...تی بابرکت تھی۔ سنگھاڑوں کے ساتھ میں نے گڑھے میں بھینسیں اُگتے دیکھیں جن پر کہیں کہیں بندر اُگے
...وں کے علاوہ ہر طرح مویشیاں، مرد، عورت، بچے، مرغیاں، بندر، چوہے، خرگوش، پٹواری جہاں شاعر مسخرے
...لے، نتیجہ یہ ہوا کہ خوراک پیدا کرنے کے بجائے مجھے اس کا اندیشہ ہوا کہ کہیں میں ہی نہ خوراک بن جاؤں۔ ایک
...ب نے مجھے فوٹو لاکر دکھایا جو اس واقعہ سے متعلق تھا، جب میں نے ہل چلا کر گرو مور فوڈ کا افتتاح کیا تھا اس کے
...نیچے لکھا ہوا تھا "ہل من مزید"

میرے ایک آتش نوا شاعر دوست اسی دولت کی خاطر جیل میں پہونچے تو زمانہ اُنکے اس اعلان سے گونج رہا تھا،

ہاں بغاوت آگ بجلی موت آندھی میرا نام	میرے گرد و پیش اجل میری جلو میں قتل عام
میرا مولد مفلسی کا دل ہے عُسرت کا دماغ	میری پیدائش کے حجرے میں نہیں جلتا چراغ

وہاں سے نکلے تو اس عالم میں۔

دیکھو دیکھو رے جوبنا اُبھار
جیسے ترکوں کی فوج
جیسے گدر انار
دیکھو دیکھو رے جوبنا اُبھار! ۔۔ (نئی روشنی)

رشید احمد صدیقی

بال عمر بھر کے لئے سیاہ نکلیں گے

روح حیات

میں نے بیحد تجربات اور کثیر روپیہ خرچ کرنے کے بعد ایسی نادر دوا ایجاد کی ہے جس کے صرف کھانے سے عمر بھر کے لئے تمام بال سیاہ نکلیں گے اور پھر کبھی سفید نہیں نکلیں گے یہ نہایت بیش قیمت دوا ہے ضرور استعمال کریں اور میرے تجربات کی داد دیں یہ ممکن نہیں کہ اس کے استعمال کے بعد بال سفید نکلیں خداوند عالم نے جڑی بوٹیوں میں عجیب و غریب اثرات پیدا کئے ہیں جالینوس لقمان وغیرہ نے اپنی دو دو ہزار برس کی عمریں تجربہ ہی کرنے میں صرف کی تھیں۔۔ قیمت دس روپیہ (عـــ۱۰ـــہ)

اکسیر برص

جسم میں سفید داغ ہو گئے ہوں اور کیسا ہی یہ مرض پرانے سے پرانا ہو گیا ہو اور داغ خواہ کتنے ہی بڑے ہوں قطعی اس دوا سے صحت کاملہ ہو جاتی ہے اور پھر کبھی یہ مرض نہیں اُبھرتا ہے نہایت اکسیر دوا ہے ضرور استعمال کریں، ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے تجربہ خود شاہد ہو جائے گا۔ قیمت تین روپیہ (سے)

(نوٹ) فائدہ نہ ہو تو قیمت واپس، میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر لکھتا ہوں کہ یہ دوائیں نہایت مجرب ہیں میرا پیشہ خلق خدا کو نفع پہونچانے کا ہے، عام مشتہرین کی طرح لوٹنے کا نہیں ہے اب بھی اگر آپ محروم رہیں تو یہ آپ کی قسمت ہے۔

پتہ:- حکیم ثابت علی (رئیس پنجزبان، خوش کلام عالم مثنوی مولانائے روم صاحب)
محمود نگر ۳ لکھنؤ (یو۔پی)

سورت ہو جاتی تھی۔
ے پذیرائی کی۔
کتنوں کی جھاڑ
کے مقدے

باب المراسلۃ والمناظرہ

فقہ و حدیث کے باب میں ماہر القادری مدیر فاران اور جناب پرویز مدیر طلوع اسلام

سے ہوا کہ
بارایک

ایک صاحب نے مارچ کا فاران مجھے بھیجکر درخواست کی ہے کہ جناب ماہر القادری کے مضمون نقش اول پر اپنی رائے کا اظہار کروں۔ افسوس ہے کہ جس تفصیل کے وہ متمنی ہیں، اس کے لئے نہ میرے پاس وقت ہے اور نہ میں اسے چنداں ضروری سمجھتا ہوں، کیونکہ میں اس موضوع پر اس سے پہلے بہت کچھ لکھ چکا ہوں۔ لیکن چونکہ جناب ماہر القادری نے ایک جگہ اس خاکسار کا بھی ذکر کیا ہے اور ایسے انداز میں گویا شریعت اسلامی کی تخریب و توہین کی بنیادی ذمہ داریاں میرے ہی سر عاید ہوتی ہیں اس لئے میں اظہار خیال ضروری سمجھتا ہوں گو وہ مختصر ہی کیوں نہ ہو۔

اس مضمون میں خطاب در اصل پرویز صاحب سے ہے جو ماہنامہ طلوع اسلام کے اڈیٹر ہیں، طلوع اسلام میرے پاس نہیں آتا اس لئے میں نہیں کہہ سکتا کہ اس کے کس مضمون کا جواب ماہر صاحب نے دیا ہے، تاہم اس کے جو اقتباسات خود ماہر صاحب نے دئے ہیں، ان سے پتہ چلتا ہے کہ موضوع گفتگو "فقہ و حدیث" ہے، پرویز صاحب کے مضامین کا خلاصہ ماہر صاحب کے الفاظ میں یہ ہے:-

"فقہ و حدیث دونوں قرآن کے خلاف محاذ ہیں اور محدثین و فقہاء نے اپنی کوششوں سے قرآن کے مقابلہ میں ناروا اجتہادات، بے سروپا روایتوں اور خود تراشیدہ حکایتوں کو ایک طلسم کھڑا کر دیا تھا اور اس طلسم کا توڑنا ہی دین کی سب سے بڑی خدمت ہے اور جب تک حدیث و فقہ کے قلعے مسمار نہ ہوں گے قرآن کی تعلیم کو فروغ نہیں ہو سکتا۔"

اسی سلسلہ میں پرویز صاحب کا تعارف انھوں نے ان الفاظ کے ساتھ کیا ہے:-

"دہلی کے قیام کے زمانہ میں مولانا حافظ محمد اسلم صاحب جیراجپوری صاحب تاریخ الامت کے ساتھ پرویز صاحب کا ملنا جلنا رہا اور وہ مولانا اسلم صاحب کے افکار و معتقدات سے بہت کچھ متاثر ہو گئے۔ مولانا اسلم "اہل قرآن" میں سے ہیں، "احادیث نبوی" کو وہ تاریخ سے زیادہ وقعت نہیں دیتے۔ ان کا مشن یہ رہا ہے کہ مسلمانوں کو احادیث سے جو عقیدت ہے وہ مجروح ہو جائے۔

اس اقتباس کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ احادیث نبوی کی مخالفت ہندوستان میں سب سے پہلے عبد اللہ چکڑالوی نے شروع کی۔ ان کے بعد مولانا اسلم نے اور اب اس مشن کی تبلیغ کا کام پرویز صاحب انجام دے رہے ہیں۔

...ہر صاحب کئی صفحات میں پرویز صاحب کے اس مشن پر اظہار رنج کر چکے تو انھیں یاد آیا کہ اس سلسلہ ...ر وہ بھول ہی گئے اور اس کی تلافی انھوں نے فوراً اس طرح کی کہ :-

"...یٹر نیاز فتحپوری نے بھی سب سے پہلے فقہ ہی پر تنقید کے تیروں کی بوچھاڑ کی تھی اور آخر میں یہاں تک کہہ دیا ...سرمایہ اگر جلا دیا جائے تو اسلام کا ذرہ برابر نقصان نہ ہوگا۔ یہ طوفان اس حد پر نہیں تھما اور تھم بھی نہیں سکتا ...ب میں جب شریعت کا احترام باقی نہ رہے تو اپنی غیرت و اسلامی حمیت کمزور ہوتی چلی جاتی ہے —— رسالہ نگار ...نہ پر مضحکہ انگیز تنقید کے بعد احادیث نبوی پر لے دے ہوئی، اس کے بعد جنت دوزخ کا مذاق اڑایا گیا، پھر ...ہا گیا کہ قرآن سے پانچ وقت کی نماز ثابت نہیں اور اس کے بعد قرآن کو رسول اللہ کی تصنیف بتایا گیا۔ پرویز صاحب نے بھی قریب قریب انھیں لائنوں پر سوچنا شروع کیا اور ماہنامہ طلوع اسلام ان دنوں خیر سے نگار ہی کی نیابت و ترجمانی کا فرض انجام دے رہا ہے۔"

جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں، پرویز صاحب کے مضامین جو طلوع اسلام میں شایع ہوئے ہیں، میرے سامنے نہیں ہیں —— اس لئے میں نہیں کہہ سکتا کہ واقعی انھوں نے کیا لکھا ہے، لیکن اگر ماہر صاحب کے دئے ہوئے اقتباسات غلط نہیں ہیں، تو پرویز صاحب کے مضامین کے لب و لہجہ سے ہمیں بھی اختلاف ہے۔ کیونکہ ایسے مسایل پر بہت سنجیدگی کے ساتھ گفتگو کی ضرورت ہے، اس کو ادبی شاہکار بنانا مناسب نہیں لیکن اس باب میں جو الزام پرویز صاحب پر عاید ہوتا ہے، وہی قریب قریب ماہر صاحب پر بھی قایم کیا جا سکتا ہے، کیونکہ اگر پرویز صاحب کے لب و لہجہ میں سخافت ہے، تو ماہر صاحب کے یہاں غصہ و برہمی ہے، اور ایسے مباحث میں جذبات سے مغلوب ہو جانا بڑی کمزوری کی بات ہے۔

ماہر صاحب نے جو اقتباسات پرویز صاحب کے دئے ہیں، ان کا تعلق دلایل سے نہیں ہے، اس لئے ہمکو نہیں معلوم کہ انھوں نے کس پہلو سے فقہ و حدیث کی مخالفت کی ہے۔ حالانکہ ماہر صاحب کو پرویز صاحب کے مضمون کے وہی حصے سامنے لانا چاہئے تھے جو اصل مسئلہ سے تعلق رکھتے ہیں اور انھیں کا جواب عقلی یا نقلی دینا چاہئے تھا۔ ہر مخالف آواز یا تنقید پر برہم ہو جانا، منھ میں کف اور پیشانی پر شکنیں لے آنا، قطع نظر اس سے کہ کمزوری کا اظہار ہے، خود تعلیم اسلام اور اسوۂ نبوی کے خلاف ہے، کیونکہ رسول اللہ گستاخ ترین معاند و مخالف کا جواب بھی ہمیشہ نہایت نرمی و محبت سے دیا کرتے تھے اور بسا اوقات ان کا یہی بلند اخلاق ان کی فتح ثابت ہوتا تھا۔ ماہر صاحب اگر شریعت اسلامی کا کوئی خاص ڈھانچہ اپنے ذہن میں رکھتے ہیں، تو اس کے معنے یہ نہیں کہ ہر شخص اس کو صحیح باور کرے یا یہ کہ اگر کوئی دوسرا شخص کوئی اور نظریہ پیش کرتا ہے تو اس پر ماہر صاحب آستینیں چڑھالیں۔ اہل مذاہب کا یہی تقشف ان کی بڑی کمزوری ہے اور اسی مولویانہ ذہنیت نے اسلام کو دنیا کے سامنے ہوا بنا دیا ہے۔

میرے متعلق انھوں نے جو کچھ لکھا ہے، وہ بالکل غلط ہے، میں نے کبھی فقہ کے متعلق وہ ظاہر نہیں کیا جو ماہر صاحب

کہتے ہیں۔ میں نے اُصولی حیثیت سے فقہ و حدیث کی کبھی مخالفت نہیں کی، میں نے یہ ضرور کہا ہے کہ صورت ہو جاتی تھی۔ فقہ اسلامی ایک قانون ہے اور چونکہ قانون میں ہر زمانہ کے لحاظ سے تبدیلی کی ضرورت ہوتی ہے اس پذیرائی کی۔ بھی موجودہ ضروریات تمدن کو سامنے رکھ کر تغیر و تبدل ضروری ہے۔ اسی کے ساتھ میں یہ بھی کہتا ہوں کہ جھاڑ وساطت سے اسلام کو سمجھنا غلطی ہے، کیونکہ احادیث میں ہم کو بہت سی چیزیں ایسی ملتی ہیں جو اسلام کے مقدے کر دینے والی ہیں اور حدیث کی معتبر ترین کتابیں بھی جنھیں صحاح ستہ کہتے ہیں اس نقص سے خالی نہیں۔ اگر ان کو خس و خاشاک سے پاک کر کے ایک منقح مجموعۂ احادیث پیش نہیں کیا جا سکتا، تو پھر احادیث سے روگردانی مناسب ہوگی۔

اس سے کس کو انکار ہو سکتا ہے کہ رسول اللہ کے اقوال و افعال ہر طرح واجب تقلید و احترام ہیں اور اس لئے یقیناً حدیث اصولی حیثیت سے بڑی مقدس چیز ہے لیکن اوائل عہدِ اسلام ہی میں یہ شبہ لوگوں کو پیدا ہو چلا تھا کہ رسول اللہ سے غلط روایات منسوب کی جاتی ہیں اور اسی لئے اس کی جانچ کے لئے اسلام میں دو طریقے اختیار کئے گئے ایک اسماء رجال کا دوسرا درایت کا۔ یعنی ایک یہ کہ جن جن لوگوں نے حدیث کی روایت کی ہے وہ اپنے اخلاق کے لحاظ سے کافی دیانت دار تھے یا نہیں اور دوسرا یہ کہ عقل انسانی کا فیصلہ کسی حدیث کے صحت و عدم صحت کے باب میں کیا ہے۔ لیکن باوجود اس کے حدیثوں کا مسئلہ ہمیشہ ما بہ النزاع رہا اور چند احادیث کے سوا جنھیں حدیث قدسی یا حدیث الٰہی کہتے ہیں باقی تمام احادیث جرح و تعدیل کا محل قرار پائیں۔

ماہر صاحب اس میں شک نہیں بڑے جید مسلمان ہیں اور میں ان کے جوش ایمانی کی قدر کرتا ہوں، لیکن اس میں مجھے کلام ہے کہ وہ اس قسم کے مباحث میں بھی کوئی حصہ لینے کے اہل ہیں یا نہیں انھوں نے جو کچھ لکھا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ فقہ و حدیث دونوں کی تاریخ سے بالکل ناواقف ہیں۔ ان کو معلوم ہونا چاہئے کہ فقہ جسے قانون و شریعت کہا جاتا ہے اس میں ہمیشہ حذف و اضافہ ہوا ہے اور احادیث جن کا وہ قرآن سے کم احترام نہیں کرتے، ان کی صحت ہمیشہ مشکوک رہی ہے، افسوس ہے کہ اشاعت حاضرہ میں، اس سے زیادہ تفصیل کا موقعہ نہیں، لیکن آیندہ مہینے میں فقہ و حدیث دونوں کی تاریخ پر روشنی ڈال کر بتاؤں گا کہ ماہر صاحب کے معلومات اس باب میں کس درجہ سطحی ہیں۔ (نیاز)

مذہب اور فلسفۂ مذہب

دونوں مع محصول دو روپے میں

منیجر نگار لکھنؤ